گداز تحریریں • زندگی کی تصویریں
کراچی
سچی کہانیاں
October
2017
A contact loved ones.
ایک رابطہ اپنوں سے
Aik Rabta Apno Se.
پاکستانی پوائنٹ
www.PakistaniPoint.Com
☆.....'مسئلہ یہ ہے' قرآنی آیات کی روشنی میں آپ کے مسائل کا حل
☆.....نیا سلسلے وار ناول 'املتاس' اور دو بدیسی پُراسرار کہانیاں

ماہنامہ سچی کہانیاں کراچی

E-mail:pearlpublications@hotmail.com

بانی سہام مرزا

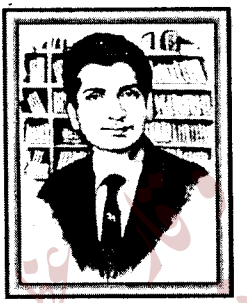

مدیر اعلیٰ: منزہ سہام

گروپ ایڈیٹر: ناصر رضا

مدیر: دانیال شمسی

MEMBER APNS CPNE

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

خط و کتابت کا پتا: C II-88 فرسٹ فلور خیابانِ جامی کمرشل ڈیفنس فیز-7، ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، کراچی

منیجر مارکیٹنگ

زین شمسی

0331-8221212

منیجر سرکولیشن

آفتاب عالم

0334-3193174

انکم ٹیکس ایڈوائزر

مخدوم اینڈ کمپنی (ایڈووکیٹس)

رابطے کے لیے

021-35893122

021-35893123

قیمت فی شمارہ: 60 روپے ✲ جلد: 34 ۔ شمارہ: 10 ✲ اکتوبر 2017ء

ایڈیٹر، پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔

ادارہ کے تحت شائع ہونے والے پرچوں ماہنامہ دوشیزہ اور سچی کہانیاں میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی ادارہ یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پہ ڈراما، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

07 نئے سال کی دعا — منزہ سہام

08 احوال — ناصر رضا

18 وہ قادر ہے — م۔ن۔خ

35 مائی ناجو اور بلیاں — شفق شیکی

47 جنوں کی بددعا — ام مناہل

56 نادیدہ مہربان — سیمیں غزالہ نہال

64 کوئلہ بنا سونا — اے حمید

67 روم میٹ — حنا بشریٰ

75 مجھے محبت ہوگئی ہے — عشیلہ حق

83 روحانی رشتہ — اسما فاطمہ ارمان

88 عبرت کی نشانیاں — ریحانہ راجپوت

91 دو کاسنی پھول — منزہ سہام

96 ہانڈی کا رقص — تبسم زہرا رضوی

100 صحرا کا سفر — ایم حسن نظامی

110 بس وہ خواب — تحسین جونیجو

115 آ آ سیب آ — حسین خواجہ

فون: 021-35893121-35893122 / پرنٹر: حسام محی الدین عباسی، سٹی پریس، OB-7 تاپور روڈ، کراچی

سانپ کا جسم — 120 — نیلوفر خان

اسرار ہستی — 124 — نیلوفر حسین عثمانی

یہ اسرار کیا ہے — 128 — اشعر جواد

املتاس — 132 — شازلی سعید مغل

روح کہانی — 142 — سلیم اختر

وہ ہمارے خاص مہمان — 172 — پروین حیدر

نواب — 184 — حمیرا خان

آپ کی ڈائری — 204 — قارئین

مسئلہ یہ ہے — 214 — ادارہ

اشعار کہانی — 224 — ڈاکٹر یاسمین قریشی

سفر کہانی — 230 — ابوبکر شیخ

دیس کہانی — 233 — زین شمسی

خون آشام — 236 — راجہ

وہ بلائے جان — 224 — نجیب عمر

دیوی کا انتقام — 251 — تشنہ بریلوی

متفرقات — 000 — ☆☆☆

زر سالانہ بذریعہ رجسٹری پاکستان 890 روپے افریقہ 65 ڈالر کینیڈا آسٹریلیا 65 ڈالر ایشیا یورپ 55 ڈالر/ قانونی مشیر جی ایم بھنڈاری ایڈووکیٹ ہائی کورٹ

اب CSS ایک حقیقت

1) والدین کی خواہش ہوتی ہے کہ اُن کی اولاد اُن کا نام روشن کرے مگر فی زمانہ اکثر والدین اپنی خواہش کو بس اپنے دل میں ہی دبا کر رکھ لیتے ہیں۔

2) مشہور تعلیمی اداروں اور ان سے جڑے اساتذہ کی بھاری بھرکم فیس عام والدین کی پہنچ سے بہت دور ہوتی ہیں۔

3) ایسے میں ہم آپ کی رہنمائی کریں گے ہم آپ کی اولاد کو آپ کے لیے باعث فخر بنائیں گے۔

4) علم کی دنیا میں CSS ایک خواب۔

5) اس خواب کی حقیقی تعبیر کے لیے ہم آپ کے ساتھ ہیں۔

6) انتہائی قابل ٹیچرز سے گھر بیٹھے اپنی لاڈلی بیٹی یا ہونہار سپوت کو CSS کی تیاری کرائیں۔

7) CSS میں آپ کی کامیابی کو ہم یقینی بنائیں گے۔

رابطہ کیجیے

www.facebook.com/srasheedkhan

نئے سال کی دعا

سچی کہانیاں کے تمام پڑھنے والوں کو میری جانب سے اسلامی سال کا پہلا مہینہ مبارک ہو..... اللہ یہ سال ہم سب کے لیے امن و آشتی کا پیغام لائے..... دنیا بھر میں جہاں جہاں مسلمان پریشان ہیں اللہ تبارک وتعالیٰ اُن کی پریشانیاں دور فرمائے۔ اللہ ہم سب کو محتاجی سے بچائے' ظالموں کے شر سے بچائے' اللہ ہمارے پاکستان کی حفاظت فرمانا اور اُن جوانوں کو جو اِس کی حفاظت کے لیے ہمہ وقت چوکنا رہتے ہیں' سرخرو رکھنا۔ یا اللہ میرے ہم وطنوں کو شر سے بچانا' ناگہانی سے بچانا' ایک دوسرے کے لیے ہمارے دلوں میں نرمی رہے۔ احساس رہے' یا اللہ یہ نیا سال کل عالم اسلام کے لیے خوشیوں کا پیغام لائے۔

یا اللہ ہمیں معاف فرمادے ہمارا خاتمہ ایمان پر کرنا بے شک تو نہایت مہربان آقا ہے (آمین)۔

منزہ سہام

احوال

قارئین کے درمیان رابطہ' آپ کے خطوط اور اُن کے جواب

محترم احوالی دوستو! سلامت باشد! سچی کہانیاں شمارہ ستمبر 2017ء آپ قارئین کو پسند آیا' میرا دل شاد اور آباد ہوگیا۔ آپ قارئین کی فون کالز اور ایس ایم ایس میرے سر آنکھوں پر' لیکن احوال میں آپ کے خطوط کی اہمیت اپنی جگہ ہے' اپنی اور دوسری مصروفیات میں سے احوال میں خطوط کے لیے وقت نکالیں' آپ کا دلی طور پر شکر گزار ہوں گا۔ شکر گزار تو میں اُن قارئین اور لکھاری دوستوں کا بھی ہوں' جنہوں نے سچی کہانیاں میں لوٹ آنے کی' میری محبت بھری گزارش کا بھرم رکھا' اور مجھ سے پیار بھرا رابطہ کیا ہے..... اور اکثر دوستوں کے اس سوال کے جواب میں کہ میں اتنے عرصے سچی کہانیاں سے کہاں غائب تھا' کیوں غائب تھا' وغیرہ وغیرہ کے جواب میں صرف اتنا ہی کہنا چاہتا ہوں کہ..... زندگی میں جو سفر جیسے اور جس طرح لکھا ہے وہ بندے کو کرنا ہے' سو اب اسی سفر کے بعد دوبارہ اپنی پرانی پسندیدہ دنیاوی منزل پر ہوں' اصل اور حقیقی منزل کے بارے میں تو آپ سب جانتے ہی ہیں' وہ ہم سب کی ایک ہی ہوتی ہے سو اُس سے پہلے زندگی اور بندگی کا حق اپنے کام سے ادا کرنے کی کوشش میں مصروف ہوں' باقی سب اللہ کی مرضی اور حکم پر چھوڑا.....

ہم اکثر قصۂ ماضی ادھورا چھوڑ دیتے ہیں
کتاب زیست کے صفحے کا کونا موڑ دیتے ہیں

☆ یہ سب سے پہلا خط ہے حیدر آباد سے سید سرور ندیم کا' لکھتے ہیں سچی کہانیاں اپنے نہایت ہی خوبصورت ماضی کی طرف لوٹ رہا ہے اس کے لیے آپ کی کوشش قابل تحسین ہے' زیر نظر شمارے میں ماہ حج کے حوالے سے دونوں کہانیاں اور ماہ ستمبر یوم دفاع کے حوالے سے اکلوتی تحریر کا جواب نہیں' اس ماہ کی خاص کہانی 'نہ قفس نہ آشیانہ' لاجواب ہے' باقی کہانیاں بھی اچھی ہیں۔ مگر ڈاکٹر شمیم انصاری کی 'رُخصتی' کی تو بات ہی کچھ اور ہے۔ سفر کہانی اور شعر کہانی' بہترین سلسلہ ہے اسے جاری رکھیے گا' مٹی (شبانہ اعظمی) کی اپنے بابا اور کیریئر سے جڑی یادیں' بہت اعلیٰ' 'دی سگنل مین' بدیسی کہانی کا ترجمہ نجیب عمر صاحب نے بہت ہی خوب کیا ہے۔ اور آخر میں شمارے کی سب سے پہلی چیز اداریہ پہلے تو لو پھر بولو' کی بات' واہ منزہ جی کے خیال اور بیان کی کیا بات ہے۔ بہت ہی لائق تعریف' مرحوم سہام مرزا کی صاحبزادی ہونے کا حق ادا کر دیا۔ آئندہ پھر حاضری کے وعدے کے ساتھ اجازت کا طالب ہوں۔

بھائی سید سرور ندیم اِس سیر حاصل تبصرے کے لیے دل کی گہرائیوں سے شکر گزار ہوں' اور ساتھ ہی سچی کہانیاں کے لیے آپ کی تحاریر کا بھی.....

☆ کراچی سے اشعر جواد لکھتے ہیں' ناصر بھائی آپ کی آمد کے بعد سچی کہانیاں میں اُس کا ایک مخصوص پرانا ادبی رنگ بحال ہو رہا ہے۔ اشعار کہانی میں ڈاکٹر نزہت عباسی کی کتاب وقت کی دستک پر' محترم ڈاکٹر

ایس ایم قریشی کا تبصرہ' جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے' اُن تک میرا سلام اور تعریف پہنچانا' آپ کا فرض ٹھہرا۔

❁ بھائی اشعر جواد ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ اُن کی جانب سے جوابی سلام اور شکریہ قبول کیجیے۔

☆ کراچی سے معروف لکھاری سیمیں غزالہ نہاں لکھتی ہیں ناصر صاحب السلام علیکم! امید ہے خیریت ہوگی۔ اِس ماہ کا سچی کہانیاں آپ کی طرف سے موصول ہوا بہت شکریہ' اس میں اپنے حج کی روداد پڑھ کر خوشی ہوئی آپ میری عزت افزائی اور حوصلہ افزائی کرتے ہیں اس کے لیے بہت شکریہ' اس ماہ کی کہانیاں ساری ہی اچھی ہیں۔ خصوصی طور پر گلزار ابراہیمی اور 'نہ قفس نہ آشیانہ' بہترین تھیں۔ اللہ پر بھروسہ اور ایمان انسان کو تمام مشکلات سے آسانی سے نکال دیتا ہے' تاریخی کہانی ایوب بن حبیب نے منورہ نوری خلیق کی یاد تازہ کر دی۔ اس سلسلے کو پھر سے جاری کر دیں' ویسے سچی کہانیاں اپنی پہلے والی روش پر آ گیا ہے۔ بہت خوشی ہوئی۔ کہانیاں تو سب ہی بہترین ہیں' منزہ صاحبہ کا اداریہ تو ہوتا ہی بروقت اور سبق آموز ہے۔ ساری کہانیاں پڑھ لی ہیں لیکن مکمل تبصرہ اس لیے نہیں کر رہی ہوں کہ اس مہینے میں چھپ نہیں سکے گا۔ عید کا زمانہ ہے مہمانوں کی آمد ہے۔ دعوتیں چل رہی ہیں اس لیے فرصت بھی کم ملی' آئندہ مہینے انشاء اللہ تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں گی۔ ایک کہانی 'قدرت کے فیصلے' ارسال خدمت ہے۔ امید ہے حسب سابق حوصلہ افزائی فرمائیں گے' شکریہ۔

❁ سیمیں غزالہ نہاں صاحبہ! آپ جیسی اچھی کہانی کار کی احوال میں آمد' ہمارے لیے خوشی کا باعث ہوتی ہے۔ منورہ نوری خلیق مرحومہ کی کہانیوں کا سلسلہ دوبارہ شروع کرنا صرف آپ کی نہیں اور بے شمار دوستوں کی خواہش بھی ہے' سو آپ سب کی بات تسلیم کرنا میرا فرض ٹھہرا۔

☆ ایم حسن نظامی قمولہ شریف سے لکھتے ہیں۔ امید ہے آپ اور قارئین سچی کہانیاں بخیریت ہوں گے' میں اتنا بڑا لکھاری تو نہیں کہ تحریر کو صفحہ قرطاس پر بکھیر کر آپ اور قارئین سے دادِ تحسین وصول کروں' مگر استادِ محترم جناب ریاض حسین شاہد کی دعاؤں اور آپ کے فرمان کی روشنی میں ذرا عجلت سے لکھی تحریر حاضر خدمت ہے۔ معیاری ہو اور پسند آئے تو 'پُراسرار نمبر' میں لگا کر مشکور فرمائیں۔ میں نہایت مصروف آدمی ہوں صبح سے شام گئے دکانداری میں گاہکوں سے سر کھپاتا ہوں اور رات گئے شوق کی تکمیل میں قلم کاغذ سے دوستی کرتا ہوں۔ آپ کے خلوص بھرے دو بولوں نے مجھے آپ کا دیوانہ بنا دیا۔ میں اپنی طرف بڑھا ہوا آپ کا دوستی بھرا ہاتھ تھام کر گام گام قلمی تعاون جاری رکھوں گا۔ 'صحرا کا سفر' لکھنے میں کسی حد تک کامیاب ہوا یہ آپ اور قارئین ہی بہتر فیصلہ کر سکتے ہیں۔

❁ بھائی ایم حسن نظامی! آپ نے اپنے استادِ محترم اور ہمارا مان برقرار رکھا۔ دل آپ کا شکر گزار ہے آپ کی کہانی زیرِ نظر شمارے میں شامل ہے۔ اور ہاں! دکانداری میں گاہکوں سے سر کھپانے (رزق حلال کے حصول) کے بعد قلم اور کاغذ سے دوستی کا رشتہ ہمیشہ برقرار رکھیے گا۔ یہ ہماری آپ سے محبت بھری درخواست ہے۔

☆ بھائی حسین خواجہ مغن آباد سے لکھتے ہیں۔ محترم ناصر رضا' السلام علیکم! سب سے پہلے تمام احباب کو نیا اسلامی سال مبارک ہو' میں ناچیز بارگاہ الٰہی میں دعا گو ہوں کہ آنے والا یہ سال سب کے لیے خوشیوں کی نوید لائے آمین۔ اس بار پرچہ خاصی تاخیر سے ملا' اگر عید سے پہلے مل جاتا تو

عید کی رونق مزید بڑھ جاتی' میری زندگی کی یہ پہلی عیدالاضحیٰ تھی جو والدین کے بغیر گزاری ہے' والد صاحب بیرون ملک اور والدہ صاحبہ خالق حقیقی سے جاملیں' اس عید پر ایسی صورت حال تھی جو میں لفظوں میں بیان نہیں کرسکتا' خیر تو میں عرض کررہا تھا کہ پرچہ عید کے پانچویں دن ملا' گویا ایک اور عید ہوگئی اور اوپر سے میری کہانی کو بھی جگہ عنایت فرمادی گئی' اس پر آپ کا بہت بہت شکریہ' ناصر صاحب! میں اپنی ایک اور تحریر ارسال کررہا ہوں' اس امید کے ساتھ کہ آپ سچی کہانیاں میں جگہ عنایت فرمائیں گے۔ میڈم منزہ سہام! 'پہلے تولو پھر بولو' آج کل تو یہ رواج رائج ہے پہلے سو سونا لو' پھر انگریزوں والا سوری کہہ دو' احوال میں تمہیں آمد' بہن شازلی سعید مغل کی تھی وہ انتہائی مختصر تبصرے کے ساتھ محفل میں تشریف لائیں۔

تم نے یہ جو احسان کیا ہے
اس سے اچھا تھا ستم کیا ہوتا

سید سرور ندیم صاحب کا مختصر تبصرہ اچھا تھا' جناب فیضان حسین عثمانی صاحب' آپ تو بابائے سچی کہانیاں نکلے' بیشک آپ ہمارے لیے ایک اسکول کی حیثیت رکھتے ہیں' اور محترم آپ کا تبصرہ سب پر بھاری ہے۔ بہن سیمیں غزالہ نہاں اور بہن نگہت غفار' بہت شاندار تبصرہ تھا آپ کا' شیخ معظم الٰہی صاحب آپ کے نام نے ماضی کی یادیں تازہ کردیں' آپ کی سوچ کا عکس 2011ء کے شمارے میں بنام 'ماں میری ماں' خیال آرائی میں شائع ہوئی تھی جو میرے پاس اب بھی محفوظ ہے۔ شیخ صاحب! میں آپ کے غم میں برابر کا شریک ہوں اور مرحومین کے لیے دعا گو ہوں۔ بارش علی ثمیر علی اصغر الانصاری اور جناب ڈاکٹر فرمان بھٹی بہت خوب تبصرے تھے آپ احباب کے' محترمہ رفعت شبنم صاحبہ! آپ کی رائے تو ناصر صاحب نے فوراً قبول کرلی' آپ کا تبصرہ بھی اچھا تھا ہر دلعزیز عبدالغفار عابد صاحب' آپ کا تبصرہ واقعی سیر حاصل تھا اور بامعنی بھی' آپ کا تبصرہ پڑھ کے دل گارڈن گارڈن ہوگیا' بہن اسماء غفور صاحبہ' آپ کا تبصرہ تو سپر سے بھی اوپر ہے' بہت اچھے بھائی افضل خان' آپ بھی کراچی کے ہیں اور ادارہ بھی کراچی میں ہے پھر یہ ہر دفعہ آپ کا خط آخر میں کیوں آتا ہے؟ اور اوپر سے ہوتا بھی بہت مختصر ہے' کہانیاں یوں تو سب ہی شاندار ہیں لیکن عبدالغفار عابد صاحب کی کہانی 'انجام تو یہی ہونا تھا' سپر ڈپر تھی' بھائی جناب مہر پرویز دولو کی کہانی عبرت کا نشان اپنا کوئی جواب نہیں رکھتی' بہت ہی سبق آموز تھی۔ بہن رضوانہ آفتاب کی تحریر 'قسمت کی لکیریں' من کو بھائی' آپی ویری نائس' ناصر صاحب آپ کا پیغام سرور شاز صاحب تک پہنچا دیا ہے۔ شاز صاحب میرے محسن ہیں میرے اندر لکھنے کی جوت شاز صاحب نے ہی جگائی ہے' ناصر صاحب' میں نے آپ کی آمد کی خبر آپا نزہت جبیں ضیاء صاحبہ اور بہن ارم ناز کو دے دی ہے' اچھا جی' آپ کو مجھ سے شکایت ہے کہ میں نے آپ کو اُن احباب کا نہیں بتایا جنہوں نے مجھے روکا ہے' آپ کی شکایت بجا ہے' بس جی یہ وہی لوگ ہیں جو ماضی میں سچی کہانیاں میں حکومت کرتے رہے ہیں اور آپ کی آمد کے بعد محفل میں حاضر بھی نہیں ہوئے' اچھا جی زندگی رہی تو پھر ملاقات ہوگی۔ آخر میں ایک شعر.....

کھا گیا شوقِ غرور بزم آرائی اُسے
صاحبِ فہم و فراست تھا مگر تنہا گیا

بھائی حسین خواجہ! آپ کا تبصرہ اچھا ہوتا ہے' احوال سے غیر حاضری مت کیجیے گا۔ آپ کی

پراسرار کہانی بھی زیر نظر شمارے کا حصہ ہے۔ شعر کا جواب نہیں ہے..... اور ہاں! آپ کی والدہ کی مغفرت کے لیے دل سے دعا گو ہوں۔

☆ بھائی ڈاکٹر فرمان علی بھٹی' منڈی صادق گنج سے لکھتے ہیں۔ پیارے ناصر! آداب اب اگر منہ پر تعریف کروں تو وہ خوشامد ہوگی اور اگر لوگوں میں کروں تو وہ آپ سے حسد کریں گے باتیں دونوں ہی مطلوب نہیں' مجھے بس اتنا کہنا ہے کہ تیری محفل میں رہنا ہے' مطالعہ میری کمزوری تو پہلے ہی تھا' اب اس میں سچی کہانیاں شہ رگ کا کردار ادا کر رہا ہے' آپ نے اِس کو بہت منفرد بنا دیا ہے اور آپ کی آواز پر بہت سے پرانے ساتھیوں نے لبیک کہا ہے' آپ نے تو یادِ رفتگان تازہ کر دی ہے' پیارے ناصر' محفل دوستاں احوال خوب سجی ہوئی تھی' آپ یقین کریں اہل ادب کی اِس محفل میں جو مزہ ہے وہ اور کہیں بھی نہیں' اور یہ سب آپ کی بدولت ممکن ہوا ہے' احباب کی گفتگو پر تبصرہ کروں اتنی میری بساط نہیں' کہانیاں سب اچھی تھیں' حسین خواجہ صاحب کی سسکتے رہے ارمان اچھی کہانی تھی' بس آخر میں وہ مزہ نہیں آیا جو کہانی کے شروع میں آیا تھا۔ پاسر کی نئی زندگی کے بھی کچھ پہلو قلم بند ہونے چاہیے تھے۔ چیچہ وطنی کی شان پیارے عابد کی کہانی 'انجام تو یہی ہونا تھا' کی خاص بات یہ تھی کہ یہ کہانی کہانی کم اور حقیقت زیادہ تھی' محترمہ رضوانہ آفتاب کی تحریر قسمت کی لکیریں لاجواب تھی' اگر قسمت میں ہوا تو اگلے ماہ پھر محفل میں آؤں گا اِس خیال کے ساتھ اجازت کہ.....

مجھے بس اتنا کہنا ہے
تیرے دل میں رہنا ہے

❖ بھائی ڈاکٹر فرمان علی بھٹی' آپ کی محبت کے لیے میرے پاس شکر گزاری کے الفاظ نہیں ہیں۔ احوال کی محفل کی جان تو آپ سب محترم قارئین اور لکھاری ہیں۔ میں تو بس آپ لوگوں کی محبت اور خیال ایک دوسرے میں تقسیم کرنے کا فریضہ انجام دیتا ہوں۔

☆ اچھے بھتیجے' امیر حمزہ خان لاہور سے لکھتے ہیں' ناصر انکل! آداب' میں آپ کی محفل میں پہلی مرتبہ حاضر ہوا ہوں اس امید کے ساتھ کہ آپ مجھ ناچیز کو بھی احوال میں جگہ عنایت فرمائیں گے' میری وابستگی زیادہ پرچوں کے ساتھ تو نہیں ہے' بس کبھی کبھار پڑھ لیتا ہوں لیکن مطالعہ صرف سچی کہانیاں کا ہی کرتا ہوں۔ میری یہی کوشش ہوتی ہے کہ جو بھی پڑھوں وہ حقیقت پر مبنی ہو اور اس کے لیے سچی کہانیاں سے بڑھ کر کوئی ماہنامہ نہیں ہے' جب سے آپ آئے ہیں آپ نے تو احوالی محفل کی رونق کو چار چاند ہی لگا دیے ہیں' حالیہ پرچہ تو آپ کی محنت کا منہ بولتا ثبوت بھی ہے' آپ کی ڈائری کے لیے ایک عدد تحریر ارسال کر رہا ہوں' امید کرتا ہوں یہ شمارے کی زینت بنے گی' تبصرہ اگلی دفعہ تفصیل سے کروں گا۔

❖ بھتیجے امیر حمزہ خان! احوال کی محفل کو چار نہیں مزید اور چاند لگانے کے لیے آئندہ ماہ بھرپور تبصرے کے ساتھ تمہاری آمد کا انتظار رہے گا۔

☆ بارش علی ثمیر' چک جیوے والا سے لکھتے ہیں' ناصر صاحب' سلام عرض آپ نے مجھے اپنی محفل میں جگہ دی آپ کا بہت بہت شکریہ شمارہ ستمبر رنگا رنگ کہانیوں سے مزین تھا سرورق پر آپ سبقت لے گئے' منزہ آپی نے اداریے میں بہت خوب فرمایا ہے اُن کی بات سو فیصد درست ہے لیکن بڑے

افسوس کے ساتھ لکھنا پڑ رہا ہے کہ اب تو تول کر بولنے والا قانون ہی ختم ہو گیا ہے' احوال کی محفل ا جواب رہی' صدارت کی کرسی پر ہماری بہن شازلی براجمان تھیں اِس ماہ کا سپر ہٹ خط فیضان عثمانی بھائی کا تھا' خواجہ حسین صاحب کا طویل خط بھی اچھا تھا' بھائی عبدالغفار بھی سب پر بھاری رہے' نئے سلسلے جو سب احباب کی پرزور خواہش آپ نے شروع کیے ہیں بہت اچھے ہیں' ناصر صاحب آپ تو عوامی لیڈر نکلے ویلڈن' عبرت کا نشان سبق آموز کہانی تھی اچھی لگی۔ انجام تو یہی ہونا تھا' عبدالغفار عابد صاحب کی کہانی حقیقت پر مبنی تھی۔ سسکتے رہے ارمان کا آغاز اچھا تھا اینڈ بہت جلد ہو گیا مجید جائی آپ کی کہانیوں میں دن بہ دن نکھار آتا جا رہا ہے۔ اب آپ پہلے سے کافی بہتر لکھنے لگے ہو' بہن نازیہ بتول رضا' آپ نے کہانی کا حق ادا کر دیا ہے' بیشک سچی کہانیاں کی ہر کہانی ہی معیاری ہوتی ہے لیکن کچھ بہت ہی خاص ہوتی ہیں' ناول خانقاہ لاجواب سلسلہ تھا جواب اپنے اختتام کو پہنچا' سچی کہانیاں ایک مثالی ڈائجسٹ ہے اس کا کوئی ثانی نہیں' میری دعا ہے یہ دن دگنی رات چوگنی ترقی کرے آمین اب اجازت چاہوں گا۔

بارش علی ثمیر! یہ احوال کی محفل آپ تمام قارئین کی اپنی محفل ہے' آئندہ شمارے پر ایک بھرپور تبصرے کے ساتھ آپ کا انتظار رہے گا۔

☆ نظر علی برمانی دادو سے لکھتے ہیں' محترم ناصر رضا بھائی' السلام علیکم! اور سچی کہانیاں واپسی پر خوش آمدید' آپ کی احوال میں واپسی بہت اچھی لگی۔ ستمبر کا شمارہ سات تاریخ کو ملا' سرورق پر مسکراتی ہوئی مہوش حیات اچھی لگیں۔ اداریے میں منزہ سہام نے نہایت اچھی بات کہی کہ پہلے تو لو پھر بولو' کہانیوں میں ابھی تک دیر آئے درست آئے' چراغ تلے' رخصتی' کس سے فریاد کریں' وہ میری سہیلی اور کچا گھڑا ہی پڑھ پایا ہوں' جو کہ بہت اچھی تھیں۔ باقی کہانیاں بعد میں پڑھوں گا۔

نظر علی برمانی' آپ نے اپنے خط میں اپنی جس کہانی شکاری روح شمارہ اپریل 2000ء کے سرقہ ہونے کی اطلاع دی ہے وہ سو فیصد درست ہے۔ سرقہ کرنے والے لکھاری کا نام ہم ان کی عزت بچانے کے خیال سے شائع نہیں کر رہے۔ لیکن ادارے نے اُن کے خلاف کارروائی کا فیصلہ کیا ہے۔ جس سے آپ کو آئندہ ماہ احوال میں خصوصی طور پر ہم آگاہ کر دیں گے۔ آئندہ ماہ احوال میں آپ کے خط کے ساتھ آپ کی نئی کہانی کا بھی انتظار رہے گا۔

☆ حیدر آباد سے فیضان حسین عثمانی کی احوال میں آمد ہوئی ہے۔ امید کرتا ہوں کہ آپ فضل خدا اور کرم خدا خیریت سے ہوں گے اور اللہ سے دعا گو ہوں کہ وہ آپ کو صحت و تندرستی عطا فرمائے آمین' سچی کہانیاں شمارہ ستمبر کافی انتظار کر کے عید کے بعد پانچ تاریخ کو ملا اور اُس میں اپنا خط شامل احوال دیکھ کر بے انتہا خوشی ہوئی مجھے اُس کے بعد فہرست میں اپنی کہانی کس سے فریاد کریں دیکھ کر بھی بے پناہ خوشی ہوئی۔ اپنے ہر دلعزیز دوست محترم اشعر جواد کو آپ کی ڈائری میں مرتب کے طور پر دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی' جناب آپ نے بہت اچھی طرح سے آپ کی ڈائری ترتیب دی۔ یہاں میں ایک اصلاح کر دوں' ڈائری میں میری پسندیدہ فرحت عباس شاہ کی نظم کے نیچے میرا نام سید فیضان عثمانی شائع ہوا ہے محترم ہم کہاں' سید کہاں' ہم گناہ گار تو سیدوں کے جوتوں کی خاک بھی نہیں' میرا نام محمد فیضان حسین عثمانی ہے اور وہی لکھا جائے۔ شمارہ اگست 2017ء میں شائع ہونے والی لہانی مجرم کون کی جانب مبذول کرانی ہے وہ سو فیصد نقل شدہ ہے پہلے شائع ہو چکی ہے'

2015ء یا 2016ء کے کسی بھی ماہ کے شمارے میں لگی ہے' میں مصروفیت کے باعث وہ شمارہ نہیں نکال پا رہا' بہرحال میری تلاش جاری ہے' وہ شمارہ ملتے ہی تحریر کی فوٹو کاپی آپ کو ارسال کردوں گا۔ سلسلے وار ناول خانقاہ کا اختتام حسب توقع تھا اور خانقاہ جیسی تحریریں آئندہ بھی ہمارے پرچے کی زینت بنتی رہنی چاہئیں' آخر میں اپنے پرانے دوست لکھاریوں سرور شاذ' زوبیہ جہد' محفوظ عطاری' رابیل عطاری' ارشد علی ارشد' ماریہ عرفان اور ایڈیسن سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنے گھر سچی کہانیاں میں لوٹ آئیں۔

بھائی فیضان حسین عثمانی..... آئندہ آپ کے نام کے حوالے سے مکمل احتیاط برتی جائے گی اور مجرم کون کے سلسلے میں آپ کے ثبوت کا شدت سے انتظار رہے گا۔

☆ ساحل ابڑو ڈیرہ اللہ یار بلوچستان سے لکھتے ہیں' ناصر انکل' السلام علیکم! مزاج بخیر' آپ جناب کا نام ادب کی دنیا میں کسی تعارف کا محتاج نہیں' ہم آپ کو سچی کہانیاں میں دوبارہ آنے پر خوش آمدید کہتے ہیں اور مبارکباد دیتے ہیں تمام قارئین کرام کو کہ سچی کہانیاں اب پہلے کی طرح اردو ادبی جریدہ پڑھنے کو ملے گا۔ اور آپ کے آنے سے انشاء اللہ تعالیٰ نئے لکھنے والوں کو ایک پلیٹ فارم ملے گا۔ جس کی ہم سالوں سے آس لگائے بیٹھے ہیں۔ ناصر انکل! آپ نے جو مجھے فون کر کے دوبارہ لکھنے کی دعوت دی اور مجھے جو آپ نے اتنی بڑی عزت بخشی اس کا بہت بہت شکریہ' آپ کی خدمت میں ایک چھوٹی سی تحریر ارسال کر رہا ہوں اسے قریبی اشاعت میں جگہ دے کر شکریہ کا موقع دیں۔

اچھے بھتیجے ساحل ابڑو! سچی کہانیاں تمام سینئر جونیئر اور نئے لکھنے والوں کا اپنا رسالہ ہے آپ سب کی تحریریں ہی اسے کامیاب اور مقبول بنانے کا باعث ہیں' آپ کی تحریر انشاء اللہ آئندہ شمارہ نومبر میں شامل ہوگی' مزید تحاریر کا انتظار رہے گا۔

☆ ایم افضل کراچی سے لکھتے ہیں' محترم ناصر بھائی! السلام علیکم! امید ہے مزاج بخیر ہوں گے ایک بار پھر آپ کی محفل میں حاضری کا شرف ملا یہ آپ کی الفت وعنایت ہے' بخدا دل کی تو یہی خواہش ہوتی ہے کہ احوال ہفتہ روزہ ہونا چاہیے۔ مگر یہ محض خام خیالی ہے ایسا ممکن کہاں ہے اور پھر ہر ماہ آپ کی کاوشیں اور فرض شناسی شمارے کی ہر تحریر میں نظر آتی ہے۔ یہ آپ کا ہی حسن نظر ہے۔ ستمبر کے شمارے میں ہر کہانی کے آغاز میں شعر لکھنے کی پرانی روایت کو پھر سے جلا بخشی بہت اچھا لگا۔ اگر یہ ایسا ہی چلتا رہے تو کیا کہنے۔ کہانیاں اس دفعہ بھی جاندار تھیں' مگر وہ میری سہیلی' روح کا انتقام' اور ڈسٹ بن تو ایسی کہانیاں تھیں جن کو سنا ہوا تھا حالات مختلف تھے مگر پلاٹ وہی پرانا تھا۔ البتہ فیضان حسین عثمانی کی تحریر کس سے فریاد کریں نے غریب کی بے بسی کو کھول کر رکھ دیا یہ المیہ ہر روز میرے وطن میں کہیں نہ کہیں ہوتا رہتا ہے۔ باقی تمام تحاریر اپنی جگہ لاجواب تھیں' مگر تسلیم منیر علوی' اور تبسم زہرا رضوی کی تحاریر سے جو پیغام ملا وہ حاصل مطالعہ ہے۔ اب کلام کو مختصر کرتا ہوں مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ زین شمسی صاحب نے ایک اچھا سلسلہ شروع کیا ہے۔ یہ ایک احسن اقدام ہے ان کا' اچھا اب اس شعر کے ساتھ اجازت دیجیے اپنا خیال رکھیے گا۔ اور دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

رات کھولے تھے کچھ پرانے خط
پھر محبت دراز میں رکھ دی

بھائی ایم افضل' آپ کی احوال میں آمد ہمارے لیے بھی باعث مسرت ہوتی ہے۔ شعر کا جواب

نہیں' سچی کہانیاں کے لیے کہانی لکھنا کب شروع کر رہے ہو؟۔

☆ارشد اقبال چوہان جڑانوالہ سے احوال میں تشریف لائے ہیں۔ السلام علیکم! میرا پچھلے ماہ کا خط دیر کی وجہ سے شائع نہ ہوسکا۔ اس لیے جلدی حاضر ہوں' پرچے میں ایک دم اتنی تبدیلیاں اور وہ بھی خوش گوار..... یہی کہہ سکتا ہوں (شالہ نظر نہ لگے) ٹوکن غائب' بہت اچھے' ٹوکن سے ذرا بچ کے رہنا؟ پہلی کہانی ہی کمال ہے' دیس کہانی اچھا سلسلہ ہے جاری رکھیں۔ نمایاں شخصیات بہت پیارا لگا امید ہے اس سے بہت سے لوگوں کے حالاتِ زندگی سے واقفیت ہوگی۔ کہانی کی سرخی کے ساتھ شعر والا سلسلہ بڑا اچھا ہے۔ یہ سہام مرزا صاحب کے دور میں ہوتا تھا۔ انہیں بھولتے تو کبھی بھی نہیں' لیکن ہر کہانی پر شعر کی شکل میں اس کی تفسیر پڑھ کر وہ بہت یاد آئے..... اللہ اُن کو جنت دے آمین۔ 'وائے مقدر بہت اچھی لگی۔ اس کے آخر میں جو شعر ہے اس کا شاعر ایک تیرہ چودہ سال کا لڑکا تھا۔ کسی مشاعرے میں اُس نے بزرگوں کی اجازت سے یہ ایک ہی شعر پڑھا تھا اور کسی شاعر نے کہا تھا کہ صاحبزادے بچتے نظر نہیں آتے تو وہ جوانی میں ہی دنیا چھوڑ گئے۔ اور اس طرح اُن کی زندگی کا یہ ایک ہی شعر اُن کے ریکارڈ پر ہے۔ میرا مطالعہ تو یہی کہتا ہے اگر کسی کو کوئی اور معلومات ہوں تو آگاہ فرمادیں۔ تمام احوالیوں کو سلام' اللہ سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ ہاں خانقاہ کا انجام بہت اچھا ہے کاش حقیقت میں بھی ہمارے ملک میں ایسا ہو جاوے' آمین۔ ایک تجویز ہے کہ سلسلہ وار کہانی میں اگر گزشتہ اقساط کا تھوڑا سا خلاصہ دے دیا جائے تو نئے پڑھنے والوں کو آسانی ہوگی۔ اللہ کرے سچی کہانیاں اس سے بھی زیادہ خوبصورت ہو امید ہے اس دفعہ میرا خط ضرور شائع ہوگا۔

محترم بھائی ارشد اقبال چوہان صاحب! آپ جیسے صاحبِ علم اور بصیرت کی احوال میں آمد اور سچی کہانیاں میں تبدیلیوں پر پسندیدگی کا اظہار میرے لیے نہایت ہی مسرت اور انبساط کا باعث ہے۔ سہام مرزا مرحوم میرے باس میرے گاڈ فادر تھے' میں آج جو بھی ہوں جہاں بھی ہوں' اُن کی شفقت اور تربیت کے مرہون منت ہی ہوں۔ اللہ انہیں غریق رحمت کرے۔ سلسلے دار ناول کے بارے میں آپ کی تجویز پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کریں گے۔ آئندہ بھی احوال میں آپ کی آمد (جلدی) کا انتظار رہے گا۔

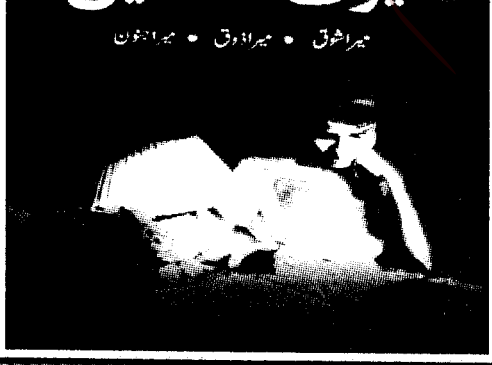

☆اور یہ آخری خط کی صورت میجر (ر) عبدالقدوس لاہور کینٹ سے شاملِ احوال ہوئے ہیں۔ لکھتے ہیں محترمی و مکرمی ناصر رضا! گڈی آپا قلم قبیلہ کی ایک معروف شخصیت تھیں۔ اصلاح معاشرہ کی علمبردار اس لکھاری نے کہانی اور افسانے کو بطور خاص اپنایا' اور کسی ماہر سرجن کی طرح معاشرے کو مہلک ناسوروں سے پاک کرنے کا بیڑا اٹھایا' اُن کی

تحاریر نا صرف مختلف جرائد' رسائل' اخبارات کی زینت بنتی رہیں' ریڈیو پاکستان راولپنڈی سے نشر بھی ہوتی رہیں۔ زندگی کے آخری سالوں میں ماہنامہ سچی کہانیاں بالخصوص اُن کی توجہ کا مرکز رہا۔ لکھنے اور پڑھنے کا ذوق رکھنے والے قارئین سچی کہانیاں اپنی گڈی آپا کو خوب جانتے ہیں۔ میں میجر عبدالقدوس اُن کی ہمہ گیر بلکہ سحر انگیز شخصیت کے بہت سارے پہلوؤں سے شناسا ہوں۔ میں اُن کا دوست' راز دار' وفادار' غمگسار' جاں نثار' اُن کے عشق میں گرفتار اُن کا شریک زندگی' ہمسفر اُن کی انتہائیوں اور اُن کی محفلوں کا واحد ساتھی 28 جولائی 2015ء سے مسلسل اُن کو پکار رہا ہوں' نا جانے کیوں میری پہلی آواز پر لپک کر آنے والی اب مجھے جواب نہیں دیتی۔

دو سال پر محیط اپنی اس سعی مسلسل کو میں نے ایک کتاب بعنوان 'میری تحسین' میرا ذوق میرا شوق میرا جنون' کے نام سے شائع کروا کر اپنے قلبی سکون کا کچھ انتظام کیا ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ 'گڈی آپا' کے شناسا لوگوں کو میری تحسین سے متعارف کرائے گا بلکہ اُس کے اور میرے منفرد تعلق کو بھی کسی حد تک جاننے اور سمجھنے میں مددگار ثابت ہوگا۔ یہ کتاب خواہش مند قارئین کو بطور تحفہ ارسال کی جائے گی بشرطیکہ وہ حسب استطاعت اپنے قرب میں رہنے والے حاجت مندوں کی حاجت روائی بصورت صدقہ جاریہ یا خیرات فی سبیل اللہ کریں' اپنی تحسین کی مغفرت اور درجات کی بلندی کے لیے دعاؤں کا طالب.....

محترم (ر) میجر عبدالقدوس صاحب! میری بہن گڈی آپا اور آپ کی شریک زندگی تحسین بہت ہی کمال انسان دوست لکھاری تھیں۔ سچی کہانیاں میں گڈی آپا کی آمد میرے ہی زمانے میں ہوئی تھی میں اُن سے فرمائش کر کے لکھواتا تھا' اور آپا کی ہر تحریر لاجواب ہوتی تھی۔ آپا اب اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن اُن کی یاد کسی صورت دل کا دامن نہیں چھوڑتی ہے۔

آپ نے میری بہن گڈی آپا اور اپنی شریک حیات تحسین کی محبت اور اُن کی یاد میں جو کتاب کی صورت کام کیا ہے وہ یادگار ہے محبت اور عشق کی جسے میں ایک کاغذی تاج محل کا نام دیتا ہوں۔ آپ کی گڈی آپا سے بحیثیت شوہر شریک زندگی' زندگی تک زندہ تابندہ رہنے والی محبت لازوال عشق کو میرے سات سلام.....! میں اپنی ایک مختصر سی نظم آپ کے اور آپ کی ہمیشہ دلوں میں رہنے والی محبت 'تحسین' کے نام' آپ کی جانب سے کرتا ہوں۔

صرف تم
تم.....!
تم.....!!
اور صرف تم.....!!!
لو ختم ہوگئی ہماری داستان.....!

اور اب اس شعری خیال کے ساتھ اجازت کا طالب ہوں.....

خوب دستور چمن ہے سبزہ و گل کو یہاں
خوفِ نادیدہ خزاں میں مبتلا رکھا گیا
وہ جو اڑ سکتے تھے' اُن پر بندش پرواز تھی
طائرانِ پَر بریدہ کو کھلا رکھا گیا

پھر ملیں گے گر خدا لایا

ناصر رضا

تاریخ کے جھروکوں سے جھانکتی علم سے آباد ایک زندہ تحریر

وہ اقتدار رہے ہے

حسرت موہانی کا خیال

اے زہد عشق تیری ہدایت کے واسطے
سوغاتِ عشق لا رہے ہیں کوئے بتاں سے ہم

م۔ن۔خ

''اے خدا! اے تمام بادشاہی کے مالک! تو جسے چاہے، بادشاہی عطا فرمائے۔ جس سے چاہے، چھین لے۔ جسے چاہے، عزت بخشے۔ جسے چاہے، ذلیل کردے۔ ہر طرح کی بھلائی تیرے ہاتھ میں ہے اور

ہ ملک تو ہی ہے جو ہر شئے پر محیط و قادر ہے۔''
(سورۃ آل عمران۔ آیت نمبر ۲۶)

بادشاہِ یمن عک بن عناب تلاوت کرتے کرتے پلک سا گیا۔ اس نے آیت دوبارہ پڑھی' سہ بارہ پڑھی مگر عقیدت و احترام یا سرشاری کے جذبے سے مجبور ہو کر نہیں' نہ ہی اظہارِ عبدیت کے لیے اور نہ اس قوت کو قلب کی گہرائیوں سے قبول کرنے کی خاطر بلکہ قرآنِ مجید کی اس آیت کے معنی اسے اپنی قوت اور اختیارات کا احساس دلا رہے تھے۔

''اے خدا! اے تمام بادشاہی کے مالک! تو جسے چاہے' بادشاہی عطا فرمائے۔ جس سے چاہے' چھین لے۔ جسے چاہے' عزت بخشے۔ جسے چاہے' ذلیل کردے۔ ہر طرح کی بھلائی تیرے ہی ہاتھ ہے اور بے شک تو ہی ہے جو ہر شئے پر محیط و قادر ہے۔''
(سورۃ آل عمران۔ آیت نمبر ۲۶)

اس نے یہ الفاظ پڑھنے اور سمجھنے کے بعد فخر سے اپنی بادشاہی کا تصور کیا۔ یہاں جس لامحدود طاقت کے مالک اور کُل عالم کے بادشاہ کا ذکر کیا گیا تھا' اس کے اختیارات سے اپنی قوت کا مقابلہ کرتے ہوئے اس کے ذہن میں اپنی قوت' اپنی بادشاہی' اپنی عزت' عیش و آرام اور اپنی مطلق العنانی کا خیال آیا' تب وہ سوچنے لگا۔

'بخشنے اور چھین لینے کی قوت تو مجھ میں بھی ہے۔ عزت دینے اور ذلیل کرنے کا اختیار تو مجھے بھی ہے۔ لوگوں کو لمحہ بھر میں بھلائی اور برائی سے دوچار کرنے کی طاقت تو میں بھی رکھتا ہوں۔ صدیوں سے یہاں کی مطلق العنان حکومت میرے خاندان کا مقدر تھی۔ میں اپنے باپ دادا کے زمانے سے خودمختار چلا آرہا ہوں۔ لڑکپن میں بھی زندگی اور موت کے فیصلے کردیتا تھا اور اب تو خود فرماں رواں ہوں' بھلا پھر میری بادشاہی اور اس کی حکومت میں جس کا ذکر قرآن نے کیا ہے' کیا فرق ہے؟'

اس تصور کے ساتھ ہی اس کے لبوں پر ایک فخریہ تبسم آگیا۔ اس نے پھر سوچنا شروع کیا۔ 'ذلیل و پست ہونے کے لیے بھی کوئی کمی چاہیے۔ جب ہر جانب قوت ہو' علم ہو' تدبر ہو اور دولت ہو' رعایا خیرخواہ ہو' خزانہ دولت سے معمور ہو تو پھر کون ذلیل کر سکتا ہے؟ کوئی نہیں' کوئی بھی نہیں۔' اس نے غرور و فخر کے انداز سے خود ہی اپنے سوال کا جواب دیا اور قرآن مجید کو ایک جانب رکھتے ہوئے مطمئن ذہن کے ساتھ سوچنے لگا۔

'یہ سب اختیارات غریبوں اور ناتوانوں پر چل سکتے ہیں' بھلا وہ کون سا ذریعہ ہے جس سے ایک مطلق العنان سردار کو' ایک طاقت ور حاکم کو ایک دم ذلیل کردیا جائے' ایک عزت دار بادشاہ کی حکومت اس طرح چھین لی جائے کہ پلک جھپکتے ہی بادشاہی رہے نہ عزت۔' اس خیال کے ساتھ ہی اسے اپنے پیٹ میں کوئی شئے اچھلتی محسوس ہوئی۔ اسے لگا کہ وہ اپنی ہنسی برداشت نہیں کرسکے گا اور واقعی وہ ہنس دیا' ایک طنزیہ ہنسی' ایک تمسخرانہ ہنسی پھر وہ ہنستا رہا اور تصورات اس کے فخریہ انداز کو تقویت دیتے رہے۔ وہ اپنی دولت و قوت کے بارے میں غرور سے سوچتا رہا۔

'میرے وسیع اختیارات
زندان میں مقید لاتعداد لوگ جو میرے عتاب کا شکار ہیں۔
انعام پانے والے متعدد مصاحب و مشیر جو میرا نام لے کر سر اونچا کر کے چلتے ہیں اور طاقت ور سرداروں کی جانب سے آنے والے دوستی کے پیغامات۔
یہ سب میرے اختیارات اور لامحدود قوت کے گواہ ہیں۔
پھر وسیع و عریض محل' لاتعداد لونڈیاں اور غلام' دل بستگی کے اَن گنت سامان بھی میرے عزت دار ہونے کی علامت ہی تو ہیں۔ کوئی بھی میری بات کو رد کردینے کی مجال نہیں رکھتا۔ میری فوجی قوت کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی ہے۔

خود پسندی اور خود پرستی کے جذبات اس کے خیالات کو گرفت میں لیتے رہے اور وہ سوچتا رہا کہ یہ آیت صرف غریب اور مجبور لوگوں کے لیے ہوسکتی ہے' یمن کے مطلق العنان بادشاہ کے لیے نہیں۔ وہ دیر تک

انہی سوچوں میں غلطاں رہا پھر دربار کی طرف چل دیا۔

اسلام نے جہاں قلب وروح میں جگہ بنا کر لمحہ بھر میں بڑی بڑی ہستیوں میں انقلاب برپا پیدا کر دیا' وہاں ایسے لوگوں کی کمی بھی نہ تھی جنہوں نے اسے مصلحتِ وقت کے لیے قبول کیا تھا۔ اول اول انہوں نے اسے دبانے اور ختم کرنے کی کوشش کی لیکن پھر مسلمانوں کی پے درپے کامیابیوں کے بعد اندازہ کر لیا کہ وہ اس کا مقابلہ نہ کر سکیں گے' تب اسے تسلیم کیے بنا چارہ نہ رہا اور وہ اس کے دامن میں آ گئے۔ اس وقت بہت سے سردار جزیے کی ادائیگی سے بچنے کے لیے اور بہت سے اس کی روز افزوں ترقی دیکھ کر خود دولت وحکومت حاصل کرنے کے لیے مسلمان ہو گئے تھے اور پھر یہی علاقے تھے جو خلیفۂ اول کے زمانے میں تیزی سے مرتد ہونا شروع ہو گئے۔ ایک زمانہ تھا کہ قریش اور بنوثقیف کے علاوہ تقریباً ہر قبیلے کے کچھ نہ کچھ لوگ مرتد ہوئے۔ انہوں نے خدا سے نہیں بلکہ اس کے احکامات کی تعمیل سے انکار کیا۔ مرتدین صلوٰۃ اور منکرین زکوٰۃ کی کوئی تعداد نہ تھی۔ لگتا تھا کہ ارتداد کی آندھی چل پڑی ہے جس نے بہت سے علاقوں کے لوگوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ان میں اہلِ یمن بھی شامل تھے۔

اسی زمانے میں صحابیٔ رسول حضرت معاذؓ بن جبل یمن کے حاکم مقرر کیے گئے تھے۔ انہوں نے اس علاقے میں قدم رکھتے ہی سب سے پہلے تلاوتِ کلامُ اللہ کی پھر اہلِ یمن کو جمع کر کے تقریر کی جس میں خدا اور خدا کے رسولؐ کی اطاعت کا حکم دے کر ان لوگوں کے ساتھ پورے پورے انصاف کا وعدہ کیا تھا جو پورا کیا گیا اور اہلِ یمن اس دین پر ایمان لے آئے پھر اسود عنسی کی بدولت مرتد ہو گئے۔ حضورؐ نے ان کی اصلاح نامہ وپیام سے فرمائی۔

اس زمانے میں اسود عنسی مارا گیا اور اہلِ یمن پر سے ارتداد کے تمام اثرات بھی زائل ہو گئے لیکن آپ اکے وصال کے بعد دوسرے علاقوں کے ساتھ وہ پھر مرتد ہو گئے۔ اس وقت دیگر تمام مرتدین کی طرح ان کی بھی سرکوبی کی گئی۔ حضرت حدید بن عبداللہ اور حضرت مہاجر بن ابی امیہ کو اس کام پر مامور کیا گیا جنہوں نے یمن کے مرتدین کی قوت توڑ کر ان کے معززین گرفتار کر کے دربارِ خلافت میں پیش کیے۔ ان میں سے قیس بن مکشوح نے اپنی خطا تسلیم کر کے توبہ کی اور صدیقِ اکبرؓ نے اسے باعزت طور پر یمن کی طرف واپس کر دیا پھر قیس بن مکشوح کے دوبارہ ارتداد کی کوئی خبر نہ ملی۔

یمن کے سردار بدلتے گئے اور سچ یہ تھا کہ ان میں سے اکثر وہ لوگ بھی تھے جو احکامِ شریعت پورے کرتے لیکن قوت سے ڈر کر اور بوجھ سمجھ کر۔ بے شک وہ مرتد نہ تھے لیکن گریز کے پہلو ضرور ڈھونڈتے تھے' وہ بت پرست نہ تھے لیکن دولت اور قوت کی پوجا ضرور کرتے تھے۔ دینِ حق کو انہوں نے اختیار کیا تھا' وہ ان میں رچ بس نہ سکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ یمن کے اولین مسلمان امیر کی طرح وہ اپنی امارت کا آغاز تلاوت سے ضرور کرتے تھے لیکن اس کے معنی جانتے ہوئے بھی سمجھ نہ سکتے تھے۔ کلام الٰہی پڑھنا اور عوام سے وعدے کرنا جیسے عادت کے طور پر کیا جاتا تھا پھر وقت کے ساتھ ساتھ دیگر علاقوں کی طرح یمن سے بھی امیر کا تصور رخصت ہوا اور بادشاہت کے انداز آ گئے۔

ان دنوں یہاں کا حاکم تھا عک بن عتاب تھا جس کا سلسلۂ نسب کئی پشتوں کے بعد قیس بن مکشوح سے ملتا تھا۔ اس کی امارت سے عک بن عتاب کی بادشاہت تک ایک انقلاب آ چکا تھا' بس ایک بات مشترک تھی کہ عک اپنے جدِ اعلیٰ کی طرح ہی عبادت کو عادت کے طور پر ادا کرتا۔ وہ خدا کو بزرگ و برتر مانتا لیکن اپنی بڑائی کا تصور ذہن سے نہ جھٹک سکتا تھا۔ وہ سوچتا کہ سب سے جلیل القدر ہستی صرف انسان کی ہے اور انسانوں میں بھی حاکمِ وقت کی جو کہ وہ خود تھا' اس طرح وہ مسلمان تو تھا لیکن دل سے نہیں۔ اسلام کے معنی ہی اطاعت کے ہیں اور اطاعت کا دوسرا نام بندگی ہے۔ ایک معبود کو اپنا مالک ومختار مان کر زبان وقلب سے اقرار کرنا اور معبودِ حقیقی

لے ہر علم کی بجا آوری کو فرض سمجھ لینا عک بن عتاب کا ایمان و اسلام اس تصور سے مختلف تھا۔ اسے بادشاہی لے منصب پر کسی اور صاحب اقتدار ہستی کا تصور مضحکہ خیز لگتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ آج آیت نے اسے ہنسا دیا تھا۔

دربارِ عام میں بیٹھے ہوئے عک بن عتاب کی شان قابلِ دید تھی۔ اس کے گرد خوشامدی مصاحبین کا اجتماع تھا۔ اجازت کے بغیر کسی کو لب کشائی کی جرأت نہ تھی کیونکہ شاہِ یمن نوازنے اور سزا دینے میں تامل نہیں کرتا تھا اور دربار کے اردگرد شمشیر بہ کف محافظوں کی پوری جماعت موجود تھی۔ اس کے خاندان کا پرانا بوڑھا نمک خوار معتصم' خاص مصاحب موریس اور نصیر بھی خاموش تھے۔ شاہ کا مزاج سمجھے بغیر کچھ کہنا ممکن نہ تھا' تبھی خادم نے اطلاع دی۔

''عالی جاہ.....! حاکم نجران کے قاصد باریابی کی اجازت چاہتے ہیں۔''

شاہِ یمن نے اس طرح دیکھا جیسے کسی علاقے کے قاصدوں کا حاضر ہونا معمولی بات ہو' دراصل یہ بھی معمولی بات۔ اس کی تاج پوشی سے اب تک قرب و جوار کے متعدد حاکموں نے پیغامِ تہنیت بھیجے تھے۔ اب اس کی توقع کے مطابق یہ قاصد بھی تہنیت اور دوستی کا پیغام لائے تھے۔ اس نے کہا۔ ''لے آؤ۔''

حکم ملتے ہی غلام لوٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کے ساتھ نجران کے کچھ جوان حاضرِ خدمت ہوئے اور آداب کے اظہار کے لیے شاہِ یمن کے سامنے جھک گئے پھر اس کے اجازت دینے پر سیدھے کھڑے ہوئے اور ان میں سے ایک نے کہا۔

''عالی جاہ.....! ہمارے اعلیٰ مرتبت حاکم نے غلام کہا ہے اور کچھ تحائف بھیجے ہیں جنہیں شرفِ قبولیت بخشا جائے۔''

شاہِ یمن نے ایک خفیف سے تبسم کے ساتھ تحائف حاضر کرنے کا حکم دیا تو چند غلام سر پر بڑے بڑے تھال رکھے حاضرِ خدمت ہوئے۔ شاہِ یمن نے انہیں قبول کیا۔ قاصدوں کو عزت سے بٹھایا' گفتگو کی' جوابی سلام بھیجا اور رخصت کر دیا۔ جب وہ چلے گئے تو بوڑھے معتصم نے کہا۔

''عالی جاہ.....! بس یہی ایک علاقہ باقی تھا' سو اس کے حاکم نے بھی دستِ خلوص بڑھا دیا۔ اس وقت کسی علاقے کا کوئی حاکم بھی حضور کے خلاف نہیں ہے۔''

''ہو بھی کیسے سکتے ہیں؟ یمن کے جلیل القدر شاہ کی حیثیت سے سبھی واقف ہیں۔ وہ حضور کے نام سے ہی لرزتے ہیں' مقابلے پر آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' موریس نے خوشامدی لہجے میں کہا۔

اس تعریف پر شاہِ یمن کے انداز میں فخر و غرور بڑھ گیا۔ سر پر تاج اور قیمتی عبا پہنے وہ سونے کا بت معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے دائیں بائیں نظر کی تو باقی لوگ بھی بڑھ بڑھ کر تعریفیں کرنے لگے۔ نصیر نے کہا۔ ''دانائی کا تقاضا یہی تھا کہ نجران کا حاکم بھی دوستی کا پیغام بھیجتا۔ اس نے تو دیر کر دی ورنہ ہماری فوج کی قوت کے سامنے اس کا پورا علاقہ کچھ نہیں۔''

''ہاں بھئی' شاہِ یمن سے دوستی نہیں بڑھائے گا تو کہاں جائے گا؟'' کسی اور نے کہا۔

دیر تک یہی باتیں ہوتی رہیں۔ خوشامدی اپنی خوشامد سے بادشاہ کے نفس کو بڑھاتے رہے پھر نصیر نے کہا۔ ''جناب' اگر ارشاد فرمائیں تو یہ غلام کچھ عرض کرنا چاہتا ہے؟''

شاہِ یمن نے استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔ اجازت دینے کے لیے یہی انداز بہت تھا۔ نصیر نے عرض کیا۔ ''عالی جاہ.....! آپ نے اپنی تاج پوشی کے بعد سے اب تک شکار کا پروگرام نہیں بنایا؟''

اس سوال پر شاہِ یمن مسکرا دیا۔ اس وقت معتصم نے کہا۔ ''زمانہ شہزادگی کی بات اور تھی لیکن اب جناب بادشاہ ہیں' ذمے داریاں بہت ہیں' شاید اب وقت نہ نکال سکیں۔''

''کچھ بھی ہو۔'' موریس نے بلاوجہ ہنستے ہوئے کہا۔ ''حضور' اس وادی میں قدم رکھے عرصہ گزر گیا جہاں حضور کے ساتھ شکار کھیلا کرتے تھے۔ عالی جاہ' مزید ذمے داریاں بڑھنے سے قبل ایک پروگرام اور

بن جائے۔''

''موریس ٹھیک کہتے ہیں۔'' نصیر نے بات بڑھائی۔ ''وہ وادی نہ سہی' ہمارے علاقے میں اور بھی سبزہ زار ہیں' وسیع میدان بھی ہیں اور گھنے جنگل بھی جو شکار کے لیے موزوں ترین ہیں۔''

سبھی ایک دوسرے کی بات کی تائید کررہے تھے پھر کسی نے شاہِ یمن کے ذوق کی تعریف کی' کسی نے موسم کی' کسی نے جنگل کی قصیدہ خوانی کرتے ہوئے جانوروں کی تفصیل بتانا شروع کردی یہاں تک کہ شاہِ یمن کی طبیعت بھی مائل ہوگئی۔ اس نے رضامندی ظاہر کرتے ہوئے پروگرام مرتب کرنے کا حکم دیا اور اگلے دن صبح روانگی کا فیصلہ سن کر وہ سب تیاری کے لیے رخصت ہوگئے۔

•.....•.....•.....•

آفتاب بلند ہوچکا تھا۔ اس کی زریں شعاعیں یمن کی بلند وبالا عمارات' اونچے درختوں اور شاہی عمارت کے کنگروں سے ٹکرا کر بڑا ہی خوب صورت منظر پیش کررہی تھیں۔ ایسے میں یمنی سرداروں کی پوری جماعت شکار کے ساز وسامان سے آراستہ سفر کرتے ہوئے خاصا راستہ طے کرچکی تھی۔ شاہِ یمن کے گردجاں نثار ساتھی اور خوش کرنے والے مصاحب تھے۔ اول تو وہ کافی عرصے کے بعد اس سفر پر آیا تھا' دوسرے موسم کا حسن عیش پرست طبقوں کے لیے بڑا ہی کارساز تھا۔ انسان بڑا ہی ناقص العقل ہے۔ بس ایک مخصوص زاویۂ نظر رکھتا ہے۔ کچھ چیزوں کا جان لینا ہی اس کے نزدیک علم ہے۔ ان چیزوں کے پسِ پردہ کیا ہے' وہاں تک اس کی نظر نہیں جاتی۔ عک بن عتاب بھی صاحبِ ذوق اور صاحبِ علم تھا۔ بلند ہوتا آفتاب اسے حسین نظر آتا تھا' ماہتاب اس کی توجہ لوٹ لیتا تھا' دریا کی لہریں اس کے اندر ہلچل مچادیتی تھیں اور صحراؤں کی ٹھنڈی ہوا اسے مست کردیتی تھی لیکن اسے یہ غور کرنے کی ضرورت نہ تھی کہ آفتاب اپنے مقررہ وقت پر کس کے حکم سے طلوع ہوکر اپنی مسافت طے کرتا ہے اور آغوشِ مغرب میں جا سوتا ہے۔ طائرانِ خوش نوا کس کی حمد وثناء کے گیت گاتے فضا میں پرواز کرتے ہیں۔ آخر وہ کون سی ہستی ہے جو اس بے زبان مخلوق کو پرواز کی قوت عطا کرکے بلندیوں تک پہنچادیتی ہے۔ یہ ہوائیں کس کے تابع فرماں ہیں؟ عک بن عتاب نے کبھی غور نہ کیا تھا۔ اس وقت بھی وہ فرحت حاصل کرتا اور مصاحبین کی مبالغہ آمیز خوشامد سے خوش ہوا چلا جارہا تھا۔ اس کے خیال میں دنیا کا معزز ترین انسان وہی تھا۔ آبادی کا پورا سفر طے کرنے کے بعد وہ وہاں تک پہنچ گئے جہاں سے جنگل کی حد شروع ہوجاتی تھی۔ اس وقت نصیر نے ایک دم سوال کیا۔ ''عالی جاہ.....! کیا آپ ان راہوں سے واقف ہیں؟''

شاہِ یمن نے چونک کر دیکھا۔ اس کے انداز میں طنز سمٹ آیا۔ اس نے معنی پر نہیں' الفاظ پر غور کیا پھر ایک دم ہی اس کا مزاج بدل گیا۔ اس کے خیال میں ایسا سوال کرنا سراسر گستاخی تھی لہٰذا دوسرے ساتھیوں کو دیکھ کر بولا۔

''سنو! نصیر کا دماغ چل گیا ہے۔ ہم دادا جان کے زمانے سے اس جگہ کے مالک ومختار ہیں۔ یہاں کا چپہ چپہ ہم نے اپنے قدموں تلے روندا ہے۔ اس زمین کو' ان پہاڑوں کو' اس جنگل کو اور جنگل کے ادھر تک کے پورے علاقے کو ہم نے گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر ہزاروں بار عبور کیا ہے۔ آج یہ پوچھتا ہے کہ ہم اس سے واقف ہیں یا نہیں؟''

یہ سن کر لوگوں پر سناٹا چھا گیا۔ نصیر گڑگڑانے لگا۔ ''عالی جاہ.....! غلام کا یہ مطلب تھا۔ آپ کے علم سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔''

''لگتا ہے' تیرا دماغ خراب ہوگیا یا تو اپنی اوقات بھول گیا ہے۔'' شاہِ یمن نے سب کو دیکھا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے؟''

''حضور کا ارشاد بجا ہے' نصیر اپنی اوقات بھول گیا ہے۔'' موریس نے خود کو محفوظ کیا۔

شاہِ یمن نے باری باری سب کی طرف دیکھا' سبھی تائید کررہے تھے مگر بوڑھے معتصم نے عرض کیا۔ ''عالی جاہ.....! میری عمر ساٹھ برس ہے۔ میں حضور کے دادا جان کے زمانے سے غلامی کررہا ہوں اور

مصاحبین کے سب غلاموں کے مزاج کو پہچانتا ہوں۔ میں عرض کروں کہ اس وقت نصیر نے حضور کے بارے میں نہیں بلکہ اس جنگل کے پراسرار راستوں کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ یہ جنگل نہیں' بھول بھلیاں ہیں لہٰذا حضور اس کے بارے بات کرنے کا مقصد پیش نظر رکھ کر اسے معاف کر دیں' بخش دیں۔''

اس وقت نصیر بری طرح خوف زدہ اپنے بے ساختہ بول جانے کے انجام سے لرزتے ہوئے گھوڑا بڑھائے ساتھ ساتھ تھا۔ شاہ کے قہر و مہر کا کوئی وقت نہ ہوتا تھا' جسے دل چاہا' رگڑ دیا' جسے دل چاہا' نواز دیا۔ وہ نہ جانے کیا فیصلہ کرنے والا تھا۔ یہ سوچ کر سبھی خائف تھے اور معتصم کے وجود کو غنیمت جان رہے تھے جس نے بڑھاپے کا سہارا لے کر نصیر کی حمایت کی تھی اور اس وقت شاید منزل قریب تھی یا معتصم کی بات ہی اثر کر گئی تھی کہ شاہِ یمن نے سنگین سزا دینا پسند نہ کیا اور بولا۔

''ٹھیک ہے' ہم اسے بخش دیتے ہیں لیکن ہمارے علم سے ناواقف شخص کو اتنی سزا تو ضرور ملنی چاہیے کہ وہ یہاں سے جنگل تک ہمارے گھوڑے کے ساتھ پیدل دوڑے۔''

یہ سزا تجویز نہیں کی گئی تھی بلکہ جیسے حکم دے دیا گیا تھا۔ مطلق العنان بادشاہ کا حکم جسے سن کر معزز مصاحب لمحہ بھر میں معتوب ہو کر رہ گیا تھا پھر وہ گھوڑے سے اتر کر بادشاہ کے گھوڑے کی رفتار کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگا اور اس کے ہم مرتبہ ساتھی اس کے عقب میں گھوڑے دوڑانے لگے یہاں تک کہ منزلِ مقصود آ گئی جہاں سے انہیں شکار کے لیے گھنے جنگل میں داخل ہو جانا تھا۔

اس وقت ایک بڑے آدمی کے چھوٹے ساتھی کی کیفیت کیا تھی' اس سے کسی کو بھی غرض نہ تھی۔ وہ ایسے نظارے دیکھنے کے عادی تھے یا مدتوں بعد جہاں آئے تھے' وہاں کی کشش نے انہیں متوجہ کر لیا تھا کہ وہ انسان کو نہیں' اس گھنے جنگل میں چھپے جانوروں کو دیکھنے کے مشتاق تھے۔ شاہِ یمن خود بھی سرشار سے انداز میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے گھوڑا بڑھائے چلا جا رہا تھا۔ بچپن سے اب تک وہ اس جنگل میں متعدد بار آ چکا تھا۔ یہاں شکار کے لیے لاتعداد جانور تھے جو خود انسان سے زیادہ تیز نظر رکھتے تھے اور شکاری کو یوں جُل دے جاتے کہ وہ دیکھتا ہی رہ جاتا اسی لیے وہ زمانہ شہزادگی سے اب تک جب بھی آتا' پورے ساز و سامان کے ساتھ آتا تھا۔ اس جنگل کی وسعت لامحدود تھی۔ اگر کوئی سوار صبح سے گھوڑا دوڑانا شروع کرتا تو شام تک ہی دوسری حد تک پہنچ پاتا لیکن دیکھی بھالی جگہ تھی۔ اتنے میں ایک تیز رفتار ہرن نے اس کی توجہ لوٹ لی اور اس کے سامنے سے یوں گزر گیا جیسے اسی کو چھیڑنا مقصود تھا۔ قلانچیں بھرتا ہرن کہاں جا چھپا ہے' یہ تلاش کرنا چنداں دشوار نہ تھا۔ اسی اعتماد کے ساتھ شاہِ یمن جنگل میں داخل ہوا تو جیسے مست ہو گیا۔

بادشاہ نے ساتھیوں کو نظر انداز کیا' گھوڑے کو ایڑ لگائی اور ہرن کے تعاقب میں گھوڑا دوڑانا شروع کر دیا لیکن ہرن کسی مافوق الفطرت شئے کی طرح اوجھل ہو گیا۔ بادشاہ کو حیرت ہوئی لیکن ناکام رہنا اس کی فطرت نہ تھی لہٰذا کئی موڑ مڑے' کئی راستے بدلے' ہرن تو ہاتھ نہ آیا البتہ خود راستے سے بھٹک گیا۔ یہ بھی ناقابلِ یقین اور عجیب سی بات تھی کہ دیکھے بھالے جنگل میں اسے راستہ نہیں مل رہا تھا۔ بادشاہ نے اردگرد دیکھا' پورے عملے کا ایک ساتھی بھی نظر نہ آیا' تب اس نے گھوڑے کو روک کر قدرے بلند آواز سے پکارا۔ ''موریس.....! نصیر.....! معتصم.....! تو ذرا! تم سب کہاں ہو؟''

اس آواز پر کوئی جواب نہ ملا تو بادشاہ نے دوسری طرف رخ موڑا اور اسی انداز سے پکارا۔ ''نصیر.....! موریس.....! کہاں ہو؟''

اب کے بھی کوئی جواب نہ ملا۔ بادشاہ نے سوچا' شاید وہ بہت آگے نکل آیا ہے اسی لیے آواز مصاحبین تک نہیں پہنچ رہی۔ یہ سوچ کر اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور جدھر سے آیا تھا' اسی جانب دوڑا دیا لیکن خاصا فاصلہ طے کرنے کے باوجود ساتھیوں کی شکلیں نظر آئیں نہ آوازیں سنائی دیں۔ اس نے ایک بار پھر گھوڑا روک کر اپنے ساتھیوں کو آوازیں دینا شروع

کردیں۔

''معتصم.....! توزر.....! نصیر.....! تم سب کہاں ہو؟'' اس لمحے یوں محسوس ہوا کہ یہ وہ راستہ نہیں ہے جس پر سے گزر کر وہ ہرن کے تعاقب میں آیا تھا۔ شاید وہ غلط سمت گھوڑا دوڑاتا رہا تھا۔ اس خیال کے ساتھ اس نے پھر صحیح سمت کا تعین کیا اور گھوڑے کو ایڑ لگائی لیکن کافی دیر سفر کرنے کے بعد پھر سے شک نے سر اٹھایا۔ ''شاہِ یمن.....! تم غلط سمت جا رہے ہو۔'' بادشاہ نے تعجب سے دیکھا۔ شک کی تصدیق ہوگئی تھی۔ وہ پھر غلط سمت آ گیا تھا' تب اس نے چڑھتی دوپہر سے ڈھلتے دن تک پورے جنگل میں ہر جانب گھوڑا دوڑایا اور ہر بار رک کر پکارتا رہا۔ ''ارے' کوئی ہے؟''

لیکن جواب میں کسی کی کوئی آواز سنائی نہ دی۔

اس طویل تلاش کے بعد شاہ کو یقین ہوگیا کہ واقعی یہ جنگل نہیں' بھول بھلیاں ہیں۔ اسے حیرت بھی تھی جس میں تردد کا انداز شامل ہوتا جا رہا تھا۔ ہر جانب دوڑنے اور برابر پکارنے کے باوجود وہ اپنے کسی ایک ساتھی کو بھی نہ پا سکا تھا نہ کوئی آواز ہی سنائی دیتی تھی۔ حدِ نظر تک پھیلے ہوئے وسیع و عریض جنگل میں کسی جانور کی آواز بھی نہ تھی۔ وہ پریشان ہو کر صراطِ مستقیم کے لیے دُعا کر سکتا تھا' مالکِ حقیقی سے رہبری کی التجا کر سکتا تھا لیکن نفس اسے اب بھی بھٹکا رہا تھا۔ کسی نے اسے اس وقت بھی جیسے اس کے مقام اور حیثیت کا احساس دلایا اور کہا۔ 'اے ناقابلِ تسخیر قوت کے مالک بادشاہ' اس قدر ہراساں کیوں ہے؟ تیرے ساتھ تو غلاموں کی پوری ایک جماعت ہے جو تیری تلاش میں پورا جنگل چھان مارے گی پھر بھلا تجھے پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟'

اس سوچ نے اسے کسی قدر مطمئن کر دیا۔ وہ گھوڑے سے اترا' چھاگل سے پانی پیا اور ایک سایہ دار درخت کے نیچے ستانے کے لیے بیٹھ گیا۔ عمر میں پہلا اتفاق تھا کہ وہ فرشِ زمیں پر بیٹھا۔ اس سے قبل تو سفر کے دوران خیمے اور آرام دہ گدیلے ساتھ ہوتے تھے۔ جہاں حکم دیا جاتا' غلام آراستہ کر دیتے۔ اب زمین پر بیٹھنے کا مزہ آیا تو بے چینی بڑھ گئی۔ بھوک کا احساس لمحہ بہ لمحہ غالب آتا جا رہا تھا اور تھوڑا سا پانی جو پی چکا تھا' کلیجے کو کاٹ رہا تھا لیکن اس مجبوری میں مایوسی کا رنگ شامل نہیں ہوا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ابھی مصاحبین حاضر ہوں گے' اپنی غفلت کی معافی مانگیں گے' خیمہ نصب کر کے آگ جلائی جائے گی اور کھانا گرم کر کے اس کے سامنے حاضر کیا جائے گا۔ ہاں' ان سوچوں کے ساتھ ساتھ تنہائی کھل رہی تھی۔ دل چاہتا تھا' کوئی بات کرے' کوئی آواز ہو۔ انسانی نہیں تو کسی پرندے کی پھڑپھڑاہٹ ہی سنائی دے لیکن دور دور تک سکوت طاری تھا۔ راستہ بھول جانے کے بارے میں سوچتے سوچتے اس نے ایک بڑے سے پتھر سے ٹیک لگائی۔ آہستہ آہستہ اس پر بھوک' نقاہت اور تھکن غالب آتی گئی۔ وقت گزرتا رہا' یہاں تک کہ جنگل کے بعض حصے تاریکی میں ڈوبنے لگے۔ اس وقت بادشاہ کو وحشت ہونے لگی۔ پوری جماعت ساتھ ہونے کے باوجود کسی نے اسے تلاش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ آخر کیوں؟ کیا وہ سب بھی راستہ بھول کر بھٹک گئے؟ یہ خیالات اسے بری طرح پریشان کر رہے تھے اور رات بڑھنے کے سبب مایوسی بڑھتی جا رہی تھی۔ بھوک اور نقاہت کے سبب نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔ تنہائی تھی کہ لمحہ بہ لمحہ سراسیمگی میں اضافہ کر رہی تھی۔

وہ سوچوں میں گم تھا کہ قریب آتی ٹاپوں نے اسے چونکا دیا۔ اس نے سوچا' اس کے ساتھی تلاش کرتے کرتے یہاں تک آ گئے ہیں۔ اس خیال کے ساتھ ہی دل نے کہا۔ 'کہیں پھر سے کسی اور جانب نہ نکل جائیں لہٰذا دوڑ کر خود ہی بتا دو کہ یہاں ہوں۔' دل کی آواز پر عمل کرتے ہوئے شاہِ یمن تیزی سے اٹھا کہ عقب سے آنے والی ایک کمند نے اسے کس لیا۔ اس کے ساتھ ہی کسی نے للکار کر کہا۔ ''بھاگنے کی ضرورت نہیں غدار..... تم پکڑ لیے گئے ہو۔''

پھر ہر جانب سے دوڑتے گھوڑوں نے اسے گھیر لیا۔ یہ سب اجنبی لوگ تھے۔ ان کی گفتگو کا انداز بھی انوکھا تھا۔ بادشاہ نے متعجب سے لہجے میں کہا۔ ''تم

لوگ کون ہو؟''

''تمہارا تعاقب کرنے والے جنہیں تم دھوکا دے کر نکل گئے تھے۔'' کسی نے جواب دیا۔

بادشاہ کچھ سمجھ نہ سکا۔ وہ لوگ گھوڑوں سے اتر اتر کر اس کے قریب آئے تو اس نے وضاحت کی۔ ''تم لوگ کس کا تعاقب کررہے تھے؟ کون تمہیں دھوکا دے گیا؟ دیکھو' میں وہ نہیں ہوں' تمہیں شاید غلط فہمی ہوگئی ہے۔''

''تمہیں جو کچھ کہنا ہے' امیر کے پاس جا کر کہنا۔ ہمیں تو صرف گرفتار کرنے کا حکم ملا تھا' سو ہم نے کر لیا۔'' یہ کہتے ہوئے ان لوگوں نے بادشاہ کو جو کمند کی گرفت میں تھا' گھوڑے پر ڈالا اور گھوڑے دوڑانا شروع کردیے۔ عجیب بات تھی کہ جو ہستی غفلت کی نیند سو رہی ہوتی' تب بھی کوئی موقع سے فائدہ اٹھانے کی جرأت نہ کرسکتا تھا' وہی ہستی اب پوری طرح بیدار تھی مگر لوگ اسے باندھ کر نہ جانے کہاں لے جا رہے تھے؟

یہ وسیع و عریض جنگل طے کرکے شہ سوار ایک نئے راستے پر روانہ ہوئے اور چند گھنٹوں کے اندر اندر ایک نئے علاقے میں داخل ہوگئے۔ آبادی میں داخل ہوتے ہی بادشاہ کو عجیب صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ جہاں جہاں سے گزرتا' لوگ ان شہ سواروں کو داد اور مبارک باد دیتے' تب یہ جملہ سن کر وہ چونک جاتا۔

''دلیرو..... تم نے انعام جیت لیا۔ دیکھو' اس لٹیرے کو اب کس کر رکھنا۔''

کوئی بولا۔ ''واہ نجران کے بہادرو' گھیر ہی لائے اس بھگوڑے کو۔ اب اس سے پوچھو' چوری کا مال کہاں ہے؟''

دوڑتے ہوئے گھوڑے پر بندھے بادشاہ نے بس اتنا اندازہ لگایا کہ یہ لوگ نجران کے باشندے ہیں اور اسے کسی ڈاکو کے مغالطے میں پکڑ لائے ہیں۔ غیرت اور شرمندگی سے اس کی حالت غیر ہو رہی تھی لیکن اس میں اشتعال کا انداز موجود تھا۔ اسے یقین تھا کہ جب ان لوگوں کی غلط فہمی دور ہوگی تو وہ اس سے ضرور معافی مانگ لیں گے۔

تامر ڈاکو کے گرفتار ہوجانے کی خبر اس سے پہلے امیر نعمان بن زید تک پہنچ گئی تھی اور سب جان گئے تھے کہ کچھ ہی دیر کے بعد وہ امیر کے روبرو پیش کیا جانے والا ہے لہٰذا لوگ تماشا دیکھنے کے لیے جمع ہو رہے تھے۔ پچھلے کئی برس سے اس لٹیرے نے پورے علاقے کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ کبھی مہمان بن کر کہیں جاتا اور سب کچھ صاف کردیتا' کبھی مسلح ساتھیوں کے ساتھ ڈاکا ڈالتا' کسی شادی میں باراتیوں کے ساتھ شامل ہوکر جاتا تو صفِ ماتم بچھ جاتی۔ اس کی شکل چند ایک لوگ ہی دیکھ پائے تھے لیکن نام سے بچہ بچہ لرزتا تھا۔ اس وقت وہ سب رئیس جن کا مال چوری ہوا تھا' موجود تھے۔ نجران کا مدبر امیر ان سب کی موجودگی محسوس کرتے ہوئے اپنے آدمیوں کا انتظار کررہا تھا جنہوں نے اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال کر اس سفاک لٹیرے کو اسیر کیا تھا۔ ابھی سب انتظار کررہے تھے کہ شور بلند ہوا۔ ''تامر ڈاکو آ گیا' تامر ڈاکو آ گیا۔''

بادشاہ نے یہ آوازیں سنیں تو غصے سے کھول کر رہ گیا۔ گرفتار کرنے والے اس مجبور انسان کو دھکیلتے ہوئے اس عمارت میں داخل ہوگئے جہاں امیر مقدمے سنا کرتا تھا اور ان کے فیصلے کیے جاتے تھے۔ یہ ایک کشادہ صحن تھا۔ امیر نعمان کی اپنی شان بھی بادشاہوں سے کم نہ تھی۔ قیمتی عبا پہنے وہ ایک بیش قیمت نشست پر براجمان تھا جس کی پشت اونچی تھی۔ اس کے دائیں بائیں اور پیچھے دست بستہ غلام کھڑے ہوئے تھے۔ بڑے بڑے سردار حسبِ مراتب اپنی نشستوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور یہ طویل و عریض صحن معززین سے بھرا ہوا تھا۔ سب نے حیرت سے دیکھا کہ تامر ڈاکو' امیر نعمان سے زیادہ شاہانہ لباس میں تھا۔ اس کی کمر سے بندھی ہوئی سونے کی پیٹی میں قیمتی نگ چمک رہے تھے۔ پیروں میں کسے ہوئے جوتے بھی معمولی نہ تھے۔ بادشاہ نے تعجب سے اس امیر کو دیکھا جس نے دو دن قبل ہی اسے تحائف اور دوستی کا پیغام بھیجا تھا لیکن شاہی نخوت کے باعث اس نے ان

تحائف کو دیکھا تک نہیں تھا' بس قبول کر لیے تھے۔ اس سے قبل کہ کوئی کچھ کہتا' اس نے خود ہی بات شروع کی۔

''دیکھیے جناب' آپ کے یہ آدمی مجھے غلط فہمی کے سبب پکڑ کر لے آئے ہیں.....''

''ہم داد دیتے ہیں ان کی جرأت کی کہ کسی بھی طریقے سے سہی' تمہیں پکڑ کر تو لے آئے' بلاشبہ یہ سب انعام کے مستحق ہیں۔'' امیر نے بڑی شان کے ساتھ اس کی بات قطع کی۔

بادشاہ کو بہت غصہ آیا۔ اس کی بات قطع کرنے کی مجال کسی کو نہ تھی۔ شاید یہ پہلا موقع تھا لہٰذا وہ اسے اپنی توہین تصور کر رہا تھا لیکن جس حالت میں تھا' وہاں صبر و برداشت کے سوا چارہ بھی نہ تھا۔ اس نے خود کو سنبھالا اور بولا۔

''یہ کہاں کا اخلاق ہے کہ آپ لوگ ایک آدمی سے اس کی بات نہیں سنتے؟ یہ نہیں جانتے کہ وہ کون ہے اور کیا کہنا چاہتا ہے؟''

''اور یہ کہاں کا اخلاق ہے کہ تم نے پورے علاقے کا سکون غارت کر دیا؟ آج ہمارے علاقے میں کوئی گھر خود کو محفوظ تصور نہیں کرتا۔ تم نے ایک شہر میں دس ڈاکے مارے' لباس بدل بدل کر محفلوں میں آتے ہو' شفاخانوں میں بیمار بن کر جاتے ہو' کبھی گھروں کو لوٹتے ہو' کبھی قافلوں کو۔ آج تمہارا کون سا روپ ہے؟'' امیر نے سوال کیا۔

بادشاہ نے قدرے انداز بدل کر کہا۔ ''آپ یقین مانیے' میں ڈاکو نہیں بلکہ یمن کا بادشاہ عک بن عتاب ہوں۔ میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شکار کے لیے نکلا تھا مگر جنگل میں راستہ بھٹک گیا۔''

اس بات پر حاضرین نے قہقہہ لگایا۔ کسی نے آواز لگائی۔ ''معزز امیر.....! یہ اس کا نیا روپ ہے۔ اس بار یہ بادشاہ بن کر آیا ہے۔''

امیر خود بھی ہنس دیا۔ اس نے دلچسپی سے اپنے سامنے بندھے ہوئے اس شخص کو دیکھا جو واقعی قیمتی لباس میں تھا پھر کہا۔ ''تم ڈاکو ہو مگر با حوصلہ اور باذوق۔ بھلا یمن کا بادشاہ عک بن عتاب اس جنگل میں راستہ کیسے بھٹک سکتا ہے؟ زمانہ شہزادگی میں شکار کھیلنا ہی تو اس کا شوق تھا۔ وہ زمین' وہ جنگل سب اس نے ایک بار نہیں' سینکڑوں بار گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر عبور کیے ہیں پھر بھلا وہ راستہ کیسے بھٹک سکتا ہے؟''

اس سوال نے بادشاہ کو بدحواس کر دیا۔ یہ وہ بات تھی جو اس نے آج صبح ہی نصیر سے کی تھی اور اسے دوڑنے کی سزا دی تھی۔ وہ سوچتے ہوئے اپنے دماغ میں زلزلے کی سی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ امیر نے کہا۔ ''ہاں' یہ تمہاری خوش نصیبی ہے کہ تمہاری شکل شاید یمن کے اس جلیل القدر بادشاہ سے ملتی ہو' اسی کا سہارا لے کر تم نے یہ نیا روپ دھارا ہے۔''

یہ کہتے کہتے امیر کو غصہ آ گیا۔ اس نے محفل میں موجود تمام معززین پر نظر ڈالی اور نفرت سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تامر لٹیرے..... تو نے نہ جانے کتنے گھر لوٹے ہیں' کتنے لوگ تیرے ہاتھوں مفلسی سے دوچار ہو گئے' تو نے کتنے قافلے بے دردی سے تباہ کر دیئے' تیری سزا تو یہ تھی کہ تیرے ہاتھ پیر کٹوا کر تجھے اذیتیں دے دے کر موت کے گھاٹ اتارا جاتا لیکن ہم پھر بھی مہربانی کرتے ہیں' تجھے معذور نہیں کرتے بلکہ صرف قید کا حکم سناتے ہیں۔'' پھر وہ سپاہیوں سے مخاطب ہوا۔ ''لے جاؤ اس بے درد کو اور زنداں میں ڈال دو۔''

بادشاہ نے پھر چلا کر اسے یقین دلانا چاہا لیکن سپاہی اسے کھینچتے ہوئے زنداں کی طرف لے گئے اور چند گھنٹوں کے اندر اندر ایک عزت دار بادشاہ سے اس کی بادشاہی اور عزت چھین لی گئی۔

شاہِ یمن نے ایک دو نہیں' ہزاروں عزت دار سرداروں کو سزا دی تھی اور جیل خانے بھی بھیجا تھا لیکن اس نے کبھی بھی اس زندگی کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ قید و بند کی' بے عزتی اور بے آرامی کی زندگی' آرام دہ بستر کی بجائے کھردری زمین' خاص نشست کی بجائے دیوار کی ٹیک' مرغن اور لذیذ کھانوں کی جگہ جیل کا روکھا پھیکا کھانا' پانی کا وہ پیالہ جو صبح ایک قیدی کے لبوں سے لگا تھا' اسی سے بادشاہ بھی پانی پیے۔ احترام آمیز جملوں کی جگہ ذلت آمیز باتوں نے

لے لی تھی۔ وہ اس ہولناک انقلاب کے بارے میں غور کرتا تو اس کا دل پھٹنے لگتا۔ شاہی لباس کی جگہ قیدیوں کا لباس دیکھ کر اسے خود اپنی ذات سے وحشت ہونے لگتی۔ آخر یہ سب کیوں ہوا' کیسے ہوا؟ جن راہوں سے بھٹک کر وہ یہاں تک آ گیا تھا' ان راہوں کا ہر موڑ اسے اب بھی یاد تھا۔ وہ اگر زبانی بھی کسی مسافر کو راستہ بتا دیتا تو وہ منزل تک پہنچ جاتا پھر وہ خود کیسے بھول گیا؟

گزرتا وقت اس کی بے بسی اور سوچوں میں اضافہ کرتا رہا۔ وہ تنہا بیٹھا رہتا۔ کوئی بات کرتا تو جواب دیتا اور کبھی جواب سے بھی گریز کرتا تھا۔ کبھی دل بہت گھبراتا تو جیل میں موجود اور لوگوں کی آواز پر دھیان دیتا۔ کبھی وہ لوگ اپنی باتیں کرتے' کبھی کسی اور کی لیکن چھوٹی باتیں بادشاہ کو پسند نہ آتیں۔ وہ پھر آنکھیں موند لیتا اور گزرے ہوئے زمانے کا مقابلہ اپنی موجودہ حالت سے کرنے لگتا۔ اس طرح سوچ کی ابتدا جہاں سے ہوتی' وہیں واپس آ جاتی۔

صبح و شام ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوتے رہے۔ ہفتے' مہینوں میں ڈھلتے رہے اور خاصا وقت گزر گیا لیکن نہ بادشاہ اس زندگی کا عادی ہو سکا نہ اپنے ماضی کو فراموش کر سکا اور نہ ہی قید خانے کے ساتھیوں کی صف میں شامل ہو سکا۔ وہ خود کو ان لوگوں کا ساتھی نہ سمجھتا لیکن وہ سب اسے اپنا رفیق سمجھتے تھے' ایک دوسرے کے کام آتے' کوئی بیمار ہو جاتا تو اس کی خدمت کرتے۔ انہی دنوں جیل میں ایک بوڑھا چند دن بیمار رہ کر مر گیا۔ ساتھیوں کو بڑا دکھ ہوا۔ برسوں کا ساتھ تھا' ان سب نے لاوارث بوڑھے کے لیے ایصالِ ثواب کا فیصلہ کیا اور داروغۂ زنداں سے قرآن خوانی کی اجازت طلب کر کے تیس پارے طلب کیے۔ ان کی یہ درخواست منظور ہوئی اور جیل خانے کے اس حصے میں قرآن مجید کی تلاوت کا اہتمام ہوا۔ بادشاہ کو مرنے والے سے غرض تھی نہ ان باقی لوگوں سے لیکن وہ سب تو اسے اپنا ساتھی تصور کرتے ہی تھے لہٰذا پارے تقسیم کرنے والے جوان قیدی نے ایک پارہ بادشاہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اٹھارہ نمبر ساتھی.....! تم تیسرا پارہ پڑھ لو۔''

بادشاہ نے گہری سانس لی اور سیپارہ تھام لیا پھر دوسروں کی طرح اپنے سر پر رومال باندھا اور ان سب سے علیحدہ بیٹھ کر پڑھنا شروع کر دیا۔ یہ وہی کلام تھا جسے وہ کلام الٰہی مانتے ہوئے بھی محض عادت یا رسم کے طور پر پڑھا کرتا تھا۔ اس نے کبھی غور نہیں کیا تھا کہ یہ کیا ہے' کس مقصد کے لیے ہے؟ اس وقت بھی نصف سیپارے تک اس کی یہی کیفیت رہی لیکن نصف کے بعد ورق الٹنے پر بادشاہ کو یوں محسوس ہوا جیسے زلزلہ آ گیا ہے۔ جیل خانے کی چھت اس پر گر گئی ہے۔ اس کی آواز بیٹھ گئی اور آنکھیں پھٹ گئیں۔ سب نے حیرت سے دیکھا کہ ان کا ساتھی بری طرح رو رہا تھا۔

''اٹھارہ نمبر.....! تمہیں کیا ہو گیا؟'' کوئی بولا۔

''ارے' پانی کا پیالہ دینا۔'' کسی نے کہا۔

''ارے' یہ بے چارہ تو کچھ کہتا ہی نہیں۔ اسے آج کیا ہو گیا کہ یوں رو رہا ہے؟''

سبھی متردد تھے اور بادشاہ سیپارہ ہاتھ میں لیے بری طرح سے اشک بار تھا۔ کوئی سمجھ نہ سکا کہ کیا ہوا لیکن بادشاہ نے اس آیت کو دوبارہ پڑھا پھر پڑھا اور جتنی بار پڑھا' رو دیا' روتا رہا اور پڑھتا رہا۔

''اے خدا!! اے بادشاہی کے مالک! تو جسے چاہے' بادشاہی عطا کرے' جس سے چاہے' چھین لے۔ جسے چاہے' عزت بخشے' جسے چاہے' ذلیل کر دے۔ ہر طرح کی بھلائی تیرے ہی ہاتھ میں ہے اور بے شک تو ہی ہے جو ہر شے پر پوری طرح سے محیط و قادر ہے۔''

بادشاہ روتے ہوئے اس آیت کی تلاوت کرتا رہا۔ اس مرتبہ اس طاقت والی ہستی سے اپنی قوت و اختیارات کا مقابلہ کرنے کے لیے نہیں بلکہ اظہارِ عبدیت کے لیے اور عجیب سی بات تھی کہ بندگی کے احساس کے ساتھ ہی غرور و تکبر' غم و غصہ اور بے بسی کے بھی انداز رخصت ہو گئے تھے۔ وہ کیوں رویا تھا' کوئی یہ بات نہ جان سکا لیکن جب اس کا دل قدرے ہلکا ہوا تو اس نے سیپارہ مکمل کیا۔ ہاتھ اٹھا کر

دُعا مانگی پھر کسی سے کچھ نہ کہا' ہاں' جب داروغۂ جیل آیا تو اس سے ایک بات کی۔

''جناب.....! ہمیں قرآنِ حکیم لا دیجیے اور پسند ہو تو یہی سیپارے دے دیجیے۔''

داروغۂ جیل نے خاموشی کے ساتھ سیپارے لیے اور جیل کے اس قیدی کو ایک نسخہ قرآنِ مجید لا دیا جو کبھی کچھ طلب بھی نہ کرتا تھا۔ آج مانگی بھی کیا چیز کہ جس سے انکار ممکن نہیں تھا۔

قرآن ملا تو اپنی ہولناک خطا کے اعتراف کے لیے۔ سکونِ قلب کے لیے یا خود اپنے ہی اضطراب سے بچنے کے لیے تلاوت شروع کر دی۔ جوں جوں پڑھتا گیا' سمجھتا گیا اور سمجھ بڑھتی گئی تو محسوس کرتا گیا۔ یہ کیسا کلام تھا جسے جس مقصد کے لیے پڑھا جاتا' اسی ضرورت پر پورا اترتا۔ سکون کی طلب ہو تو وہ مل جائے۔ ایک وقت میں کروڑوں انسان اپنے اپنے مقاصد اور ضروریات کے لیے اس سے رجوع کریں تو مایوس نہ ہوں۔ جوں جوں انکشافات ہوتے گئے' بادشاہ کا تحیر بڑھتا گیا۔ جتنی بار پڑھتا' نئے معنی سامنے آتے۔ احکامِ خداوندی میں سے ہر حکم اپنی جگہ اتنا مکمل اور جامع ہوتا کہ وہ سمجھتا' انسان کی پوری ہدایت کے لیے یہی حکم کافی ہے' اسی پر عمل کرنا گویا انسانیت کے لیے اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ بادشاہ کو نئے نئے تجربات ہوتے رہے۔ وہ تلاوت نہ کرتا تو بھی اسی کلام کے بارے میں غور کرتا رہتا۔ تلاوت نے اسے بن مانگے ہی بہت کچھ بخش دیا تھا۔ سب سے پہلے جو چیز اسے ملی' وہ سکونِ قلب تھا۔ اضطراب کے بادل قلب سے چھٹ گئے۔ اب ماضی کی یاد کے ساتھ نعمتوں کے چھن جانے کا غم نہ ہوتا بلکہ عبرت حاصل ہوتی۔ وہ سوچتا' زندگی کا یہ ہولناک انقلاب اس کی اپنی خطا کے سبب ہے اور خطا یاد آتی تو وہ خدائے بزرگ و برتر کے حضور توبہ و استغفار کرتا۔ ایسے میں آدم کی خطا اور معافی کی آیات اسے بڑا سکون عطا کرتیں۔ خدا کے رحیم و کریم ہونے پر زیادہ سے زیادہ یقین آتا۔ ایمان پختہ ہو جاتا۔ تب وہ سوچتا۔

'انسان کی اس کائنات میں حیثیت کیا ہے؟'

'بندے اور خالق کا تعلق کیا ہے؟'

'اور انسانی خلافت و حکومت کی حقیقت کیا ہے؟'

ان سب سوالوں کا جواب ایک ہی ہوتا۔

''بس ایک خاص وقت تک اس زمین پر ٹھہرنا پھر اس مالکِ حقیقی کے حکم پر اس کے سامنے پہنچ جانا ہے۔ زندگی اور زندگی کے ہر عمل کا حساب دینا ہے۔ جو مالک کے حکم پر پورا اترے' وہی کامیاب ہے ورنہ نامراد۔ جب ایک جلیل القدر ہستی کے منشا و مرضی پر آنا' اس کے احکامات کے مطابق زندگی گزار کر اسی کی مرضی سے لوٹ جانا ہے تو پھر بندے کی حکومت اور بادشاہی کیسی؟''

یہ سوچتے ہوئے بادشاہ کو دنیا کی حکومت و بادشاہت سبھی ہیچ و بے بنیاد نظر آتی۔ جسے وہ اپنے خیال میں اقتدار تصور کرتا تھا' قرآن نے تو اسے ایک بہت بڑی ذمے داری بنا کر پیش کیا تھا۔ وہ سوچتا' کیا وہ یہ ذمے داری ادا کرتا تھا؟ اس کا جواب نفی کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس طرح جوں جوں حقیقت اس پر واضح ہوتی جاتی' وہ خدا کی اطاعت کی طرف ہوتا جاتا۔ وہ زیادہ سے زیادہ استغفار کرتا۔ ایسے میں ایک نماز کے بعد تلاوت کرنے کے لیے بیٹھتا تو دوسری نماز کا وقت ہو جاتا اور اسے پتا ہی نہ چلتا۔ اس انہماک کو لوگ تعجب سے دیکھتے اور عقیدت سے گزر جاتے۔

اس عظیم کلام کی تلاوت نے اسے دوسری جو چیز بخشی' وہ عزت تھی۔ عزت جس کی اب اسے طلب نہ رہی تھی لیکن اب جیل کے ساتھی اور داروغہ کے انداز بدلتے جا رہے تھے۔ وہی منہ زور داروغہ جو اسے ''ادئے.....!'' کہہ کر پکارتا تھا' اب اس کے ہاتھ میں قرآن پاک دیکھ کر' اس کی پرسوز آواز سن کر ادھر آتا تو خود بخود اس کی چال میں احترام آ جاتا۔ وہ کھانے کی تھالی اس کے نزدیک رکھتے ہوئے اَدب کے ساتھ کہتا۔ ''حافظ صاحب! آپ کا کھانا۔''

جیل کے ساتھی جو اسے ''اٹھارہ نمبر.....!'' کہہ کر مخاطب کرتے تھے' اس کی رُوح میں اتر جانے والی تلاوت سن کر ''قاری صاحب!'' کہتے۔ بادشاہ جب

ان کی جانب دیکھتا تو متعجب ہوئے بغیر نہ رہتا۔ اس لے اردگرد رہنے والے لوگوں کے چہروں پر عجیب سی عقیدت' آنکھوں میں احترام اور سلوک میں والہانہ پن تھا۔ یہ انداز تو اسے کبھی خوشامدی مصاحبین اور درباریوں سے بھی نصیب نہ ہوا تھا۔ تب وہ اُس عزت اور اِس عزت کے فرق کو محسوس کرتا تو ماضی کی اس شان و شوکت اور درباریوں کی عزت سے اس کا دم گھٹنے لگتا اور وہ اسی کلام میں غرق ہو جانا چاہتا تھا۔

طمانیتِ قلب اور عزت کے بعد اس کلام کی تلاوت نے تیسری شئے جو اُسے عطا کی' وہ فہم و فراست تھی۔ اس کتاب کے ذریعے سے ناپسندیدہ اور پسندیدہ انسانوں کی خصوصیات اس کے سامنے آتیں اور اسے غور کرنے پر مجبور کرنے لگتیں۔

''وہ لوگ جن پر قدرت کی جانب سے انعامات نازل ہوئے تھے' کون تھے؟''

''اور وہ لوگ کہ جن پر قدرت کی جانب سے غضب نازل کیا گیا' کون تھے؟''

اس تحقیق کے جواب نے اسے حقوق اللہ اور حقوق العباد کے معنی سمجھا دیئے۔ بے شک وہ اس سے قبل بھی صاحبِ علم تھا۔ زمانہ شہزادگی سے اس نے فنونِ جنگ اور متعدد زبانیں سیکھی تھیں۔ آدابِ شاہی بھی جانتا تھا لیکن ان سب کے باوجود اس نے ایمان' عقائد' اخلاق' فرائض' معاشرت' معیشت' سیاست' قانون' نظم و نسق اور صلح و جنگ کے بارے میں کبھی غور نہ کیا تھا اور اس کی ضرورت بھی نہ سمجھی تھی۔ شہزادوں اور بادشاہوں کو اس کی ضرورت بھی تو نہیں ہوتی' بس مصاحبین سے اردگرد کی خبریں سن کر احکام صادر کر دینا ہی آئینِ حکومت تھے لیکن اب وہ سوچتا کہ علم کا اصل تعلق تو انہی شعبوں سے ہے۔ زندگی کے یہی مسائل ہیں جن پر بادشاہ کو توجہ دینا چاہیے اور ان سے صرف قرآنِ پاک نے آگاہ کیا ہے۔

اب جوں جوں علم بڑھتا جاتا' تلاش سوا ہوتی جاتی اور جوں جوں تلاش بڑھتی' علم میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ مسلسل سیکھنے اور حاصل کرنے کے بعد اسے یوں ہوتا کہ علم کے اِس بحرِ بے کراں سے چند قطرے ہی تو حاصل کیے ہیں۔ ابھی تو سمندر باقی ہے۔ وہ سوچتا' یہ کیسا علم ہے؟ دنیا کا وہ واحد علم جو نظریات' تصورات اور خیالات کا علم نہیں اور یہ کتاب وہ نہیں جسے درس گاہوں اور مکتبوں میں بیٹھ کر پڑھا جائے۔ اس کے کنائے سمجھ اور رموز حل کر لیے جائیں اور بس فرض ادا ہو جائے۔ یہ تو ایک تحریک' ایک دعوت ہے جو خود انسان کے اپنے اندر ہی نہیں بلکہ باہر بھی ایک انقلاب پیدا کر دیتی ہے اور واقعی بادشاہ کے اندر انقلاب آ چکا تھا پھر وہ جوں جوں اس میں کھوتا گیا' حقیقتیں پاتا گیا۔ غالباً فہم و ادراک کے حصول کے بعد ہی وہ مقام آتا ہے جب انسان کو ہدایت نصیب ہوتی ہے۔ اسے بھی ہدایت مل گئی تھی۔ ہدایت' جس کے بعد اللہ تعالیٰ تاریکی سے روشنی کی طرف لاتا اور راہِ راست دکھاتا ہے۔ الغرض بادشاہ زنداں میں رہتے ہوئے ہر دم تلاوت کرتا رہتا۔ اپنی خطاؤں سے توبہ کرتا۔ خدا کی قوت و جلال کے تصور پر رو دیتا اور جب بھی اپنے سابقہ غرور و تکبر اور خود پسندی کا خیال آتا تو سجدے میں گر جاتا۔ تیسرے سیپارے کی وہ آیت جس نے کبھی اسے ایک بار ہنسایا تھا' اَب ہمیشہ رلا دیتی۔ وہ بے قرار ہو کر سوچتا کہ شاید اس کا یہ گناہ کبھی معاف نہ کیا جائے جس کی پاداش میں وہ تختِ شاہی سے زنداں تک آ گیا تھا۔ اب قرآن کے ذریعے خدا کے منصب و قوت کو پہچان لینے کے بعد اسے لگتا کہ جو سزا اسے ملی ہے' وہ اس کے گناہ کے مقابلے میں بہت ہی کم ہے۔ خدا جو قادرِ مطلق ہے' خالقِ کائنات ہے' اسے اس سے بھی زیادہ ذلیل کر دینے کی قوت رکھتا ہے۔ اس نے تو اپنے تحمل کے سبب اسے سزا دینے میں بہت دیر کی ورنہ وہ بہت کم وقت میں عزت چھین لینے اور ذلیل کر دینے کی طاقت رکھتا ہے۔

•.....•.....•.....•

امیر نعمان کا انتقال ہو گیا تو اس کی قوم نے اتفاقِ رائے سے نیا حاکم حاطب بن اسعد کو منتخب کیا۔ یہ سابقہ امیر کا مشیر بھی تھا اور علم بھی رکھتا تھا۔ اس نے اپنی امارت کے پہلے ہی دن دربارِ عام کیا۔ بہت سے

پرانے اصولوں میں ترمیم کی گئی اور کچھ نئے احکامات جاری کیے گئے۔ ان میں ایک حکم یہ بھی تھا کہ درس گاہوں اور گھروں میں قرآن و احادیث کی تعلیم کو زیادہ سے زیادہ رواج دیا جائے۔ نوجوانوں کو حفظِ قرآن پر انعامات دیئے جائیں اور اس کارِ خیر کی ابتدا اس نے اپنے ہی گھر سے کی کیونکہ امیرزادی کلثوم بنتِ حاطب تکمیلِ قرآن کے بعد اسے دہرانے اور حفظ کرنے کا ارادہ رکھتی تھی جس کے لیے ایک ایسے معلّم کی ضرورت تھی جو سن بھی سکتا، تصحیح بھی کرا سکتا اور لب و لہجے کی دُرستی کے ساتھ حفظ کرانے کا بھی اہل ہوتا۔ امیرزادی اور امیر کو جیسے معلّم کی آرزو تھی، اس پر کوئی پورا نہ اترتا تھا۔ یہ دیکھتے ہی اس نے باقاعدہ اعلان کرایا تو کئی ایک نے رَسائی حاصل کرنا چاہی لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اسی زمانے میں زنداں کے داروغہ نے حاضرِ خدمت ہو کر نئے امیر کو سلام کیا اور اس کے بعد عرض کیا۔ ''عالی جاہ! آپ نے قرآن کے بہترین عالم کے بارے میں اعلان فرمایا تھا۔ ارشاد ہو تو پتا بتاؤں؟''

''ہاں، ہمیں ایسے عالم کی ضرورت ہے جو ہمیں بھی مطمئن کر سکے اور امیرزادی کو بھی۔'' امیر حاطب نے کہا۔

''جناب! زنداں میں ایک شخص برسوں سے رات دن کلامِ پاک کی تلاوت کرتا ہے۔ غلام نے اس سے بہتر انداز کسی عالم کا نہیں دیکھا۔ جب وہ تلاوت کرتا ہے تو ارد گرد چلنے پھرنے والے لوگ اس کی آواز سن کر ٹھہر جاتے ہیں۔ اس کی آواز رُوح کے اندر اترتی محسوس ہوتی ہے۔ حضور! ایک بار سُن لیجیے۔ پسند ہو تو امیرزادی کے لیے مقرر فرما دیجیے۔''

امیر حاطب کو داروغہ کی بات پسند آئی۔ اس نے کہا۔ ''تم آج ہی اسے لے آؤ۔ ہم دیکھ لیں گے۔''

داروغہ تعمیلِ حکم کے لیے لوٹ گیا۔ جب وہ زنداں پہنچا تو بادشاہ عصر کی نماز اَدا کر رہا تھا۔ داروغہ نے مختصراً بتانے کے بعد کہا۔ ''آپ کو امیر حاطب نے طلب کیا ہے۔''

بادشاہ نے کوئی سوال کیا نہ خوشی یا تعجب کا اظہار بلکہ داروغہ کے ساتھ چلنے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ اس وقت باہر کا ماحول اسے عجیب سا محسوس ہوا لیکن جب وہ امیر حاطب کے دربار تک پہنچا، خود پر قابو پا چکا تھا۔ امیر نے اسے دیکھا اور پوچھا۔ ''معزز عالم! داروغۂ زنداں نے تمہیں یہاں لانے کا مقصد بتایا ہوگا؟''

''جی ہاں، میں جان گیا ہوں کہ کیوں لایا گیا ہوں۔''

''تو سب سے پہلے میں آپ سے چند آیاتِ قرآنی سننا چاہوں گا تاکہ اندازہ کر سکوں کہ مجھے اپنی دُختر کے لیے جیسے استاد کی ضرورت ہے، آپ میں اُس کی خصوصیات ہیں یا نہیں؟''

بات معقول تھی اور صاف بھی جس سے صفائیِ قلب کا اندازہ ہوتا تھا۔ بادشاہ کو یہ بات پسند آئی۔ اس نے بلا تامل آیاتِ تلاوت کرنا شروع کر دیں۔

''یہ قرآن رحمٰن کی جانب سے ہے جس نے انسان کو پیدا کیا اور اسے گویائی سکھائی۔ اسی کے حکم سے سورج اور چاند سب ایک مقررہ حساب کے تحت چل رہے ہیں۔ درخت و انجم سب سجدہ کر رہے ہیں۔ اس نے آسمان کو بلند کیا اور میزان قائم کی تاکہ انسان حد سے تجاوز نہ کرے اور انصاف کے ساتھ تولے اور اے انسان! تول میں کمی نہ کرو۔ وہ اللہ رحمٰن ہی ہے جس نے خلقت کے لیے فرشِ زمین کا اہتمام کیا جس میں میوے اور درخت ہیں کھجور کے جن کے خوشوں پر غلاف ہیں اور اَناج عطا کیا جس کے ساتھ بھس ہوتا ہے اور اسی نے تمہاری فرحت کے لیے خوشبودار پھول پیدا کیے۔ تو اے جن و انس! تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں سے انکار کرو گے؟''

اس وقت حاضرین پر سکوت طاری تھا۔ بادشاہ کی خوش الحانی نے انہیں بھی متوجہ کر لیا تھا جو متوجہ نہ تھے، جو اِن آیات کے معنی سے آشنا تھے، وہ تو تھے ہی مسحور۔ دربار کا ایک فرد بھی حرکت کرنے کی کیفیت میں نہ تھا اور خود امیر حاطب کے چہرے پر عقیدت انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ اس نے نظر اٹھا کر اپنے سامنے بیٹھے اس انسان کو دیکھا تو اس کی صاف و کشادہ جبیں سے

روشنی نکل رہی تھی۔ قیدی بادشاہ کا چہرہ چمک رہا تھا اور وہ آنکھیں بند کیے خود اس کلام کی لذت لیتے ہوئے تلاوت میں مصروف تھا۔ جونہی تلاوت تمام ہوئی امیر حاطب نے بے ساختہ کہا۔ ''سبحان اللہ! سبحان اللہ!''

درباری بھی عقیدت سے تعریفیں کرنے لگے پھر اس نے کہا۔ ''معزز عالم! ہمیں آپ سے بڑی تفصیلی گفتگو کرنا تھی لیکن اب ہم سوچتے ہیں کہ کسی اور سوال کی گنجائش نہیں۔ جیسا ہم چاہتے تھے' آپ ویسے ہی ثابت ہوئے۔''

یہ کہتے کہتے اس نے غلاموں کو حکم دیا۔ ''امیرزادی کو مطلع کردو کہ اس کے لیے معلّم کا انتظام ہو گیا ہے۔ وہ اپنے درس کی ابتدا آج سے ہی کردیں۔ عالم صاحب کے قیام کے لیے محل کے اندر ہی انتظام کیا جائے۔''

اس ہدایت کے بعد امیر حاطب نے داروغۂ زنداں کو انعام و اکرام سے نواز کر رخصت کیا اور بادشاہ کو اس کی نئی قیام گاہ کی طرف بھیج دیا۔ یہ محل سے متصل ایک الگ تھلگ حصہ تھا جہاں عیش و آرام کا ہر سامان موجود تھا۔ بادشاہ دربار سے رخصت ہو کر جب وہاں پہنچا تو مغرب کی نماز کا وقت ہونے والا تھا۔ اس نے فریضۂ نماز ادا کیا اور امیرزادی کے طلب کرنے کو تیار ہو کر محل کے اندرونی حصے میں چلا گیا۔

یہ پہلا دن تھا جب بادشاہ' امیرزادی کی نشست کے ایک حصے میں بیٹھا ہوا تھا اور امیرزادی دوسرے حصے میں۔ اُن دونوں کے درمیان فاصلہ نہیں تھا البتہ ایک باریک پردہ حائل تھا' ریشم کا پردہ جس میں اِس قدر مہین تھا کہ باریک ہونے کے باوجود پردے کا فرض بخوبی ادا ہوتا تھا۔ امیرزادی نے اس جانب پہنچ کر سلام کیا اور بولی۔ ''استادِ عظیم! ہم نے سنا ہے کہ آپ تلاوت میں اپنا ثانی نہیں رکھتے اور آپ کی آواز میں ہم لوگوں کو اپنے قلب و رُوح میں اترتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔''

''کلام ربّانی کی تاثیر ہے۔ میری آواز کی نہیں۔'' بادشاہ نے جواب دیا۔ ''جب میں گفتگو کرتا ہوں تو کسی کو میری آواز قلب میں اترتی محسوس نہیں ہوتی مگر جب تلاوت کرتا ہوں تو لوگ عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔ اس کے یہی معنی ہوئے نا کہ تاثیر کلام میں ہے' آواز میں نہیں۔''

شہزادی کو یہ بات بہت پسند آئی۔ اس نے کہا۔ ''کیا آپ مجھے یہ انداز سکھائیں گے؟''

''میں جو کچھ جانتا ہوں' آپ کو سکھانے کی کوشش کروں گا۔''

''فی الحال ہم آپ سے ایک سوال کرنا چاہتے ہیں۔'' امیرزادی نے اطمینان سے کہا۔ ''ہمیں یہ بتایئے کہ انسان کی فطرت کس چیز پر بنائی گئی ہے؟''

''نیکی پر۔'' بادشاہ نے بے ساختہ جواب دیا۔ ''کیا آپ نے غور نہیں کیا کہ انسان نیکی کر کے مطمئن

غزل

محبت کا چلا پھر سلسلہ ہے
کسی سے بعد مدت دل ملا ہے
اے دنیا بیچ میں نہ آ ہمارے
یہ میرا اور اس کا معاملہ ہے
نہ کاٹو یہ شجر کہ اس شجر پر
پرندوں نے بنایا گھونسلہ ہے
مری تقدیر میں تھی بے وفائی
بھلا اس شخص سے پھر کیا گلا ہے
نظر کے سامنے رہتے ہیں مری
دلوں میں پھر بھی کتنا فاصلہ ہے
اسے گر جیتنے کا بس جنوں ہے
تو مجھ میں ہارنے کا حوصلہ ہے

شاعر: ریحان آفاق

ہوتا ہے؟''

''تو پھر وہ برائی کیوں کرتا ہے؟'' امیر زادی نے دریافت کیا۔

''اس لیے کہ مطمئن نہیں ہو پاتا۔ جب اس سے ایک غلطی ہو جاتی ہے تو کبھی خود کو مطمئن کرنے کو' کبھی اسے چھپانے کے لیے دوسری غلطی کرتا ہے۔ ایک برائی دوسری کو جنم دیتی رہتی ہے' یوں سلسلہ شروع ہو جاتا ہے پھر نیکی کی آواز جو اسے خود اندر سے روکتی ہے' دبتی چلی جاتی ہے اور انسان برائی کرتا رہتا ہے۔ اگر وہ فطرت یا نیکی یا ضمیر کی اس آواز پر توجہ دے کر پہلی بار ہی اپنی غلطی کا اعتراف کر کے اس کے ازالے کی طرف توجہ دینے لگے تو دوسری برائی سرزد نہ ہو۔ یہ ہماری فطرت ہی کی آواز ہوتی ہے جو شروع میں ہمیں گناہوں پر ملامت کرتی ہے اور نیکی کے تمام کاموں پر مطمئن کرتی ہے لہٰذا یقین کر لیجیے کہ قدرت نے انسان کی فطرت کو نیکی پر بنایا ہے۔''

امیر زادی اس طرح خاموش ہو گئی جیسے قائل ہو گئی ہو۔ بادشاہ نے اندازہ کیا کہ امیر زادی ایک منفرد سوچ رکھنے والی لڑکی ہے۔ اسے تلاش و جستجو کا یہ انداز پسند آیا۔ اس دن امیر زادی نے قرآن کا ایک جزو تلاوت کیا۔ بادشاہ نے اس کے لب و لہجے میں کچھ ترمیم و اصلاح کی اور واپس آ گیا۔ جو غلام اس نشست گاہ کے باہر متعین تھا' اس نے بادشاہ کو ساتھ لیا اور اس کی قیام گاہ پر چھوڑ گیا جہاں نمازِ عشاء ادا کرنے کے بعد بادشاہ نے اس گھر کے ہر حصے کو دیکھا۔ اس کی آرام دہ خواب گاہ اور نشست گاہ کے علاوہ ایک کمرا اور بھی تھا جہاں لکھنے پڑھنے کا کچھ سامان اور قیمتی کتابیں رکھی تھیں۔ ان چند گھنٹوں کے اندر اندر اس کے لیے بہترین ملبوسات کا انتظام بھی ہو گیا تھا اور ایک خدمت گار بھی موجود تھا۔ اس رات مدتوں بعد لذیذ کھانا کھانے کے بعد بادشاہ آرام دہ بستر پر لیٹا تو اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے۔ وہ دیر تک سوچوں میں غرق بے آواز اشک بہاتا رہا یہاں تک کہ سو گیا۔

اپنی زندگی کا یہ دوسرا انقلاب بھی اس کے لیے عجیب تھا۔ امیر زادی کے معلّم ہونے کی حیثیت سے بھی اسے عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور خود امیر زادی ایسے ایسے سوالات کرتی جن کا جواب بادشاہ کے سوا کوئی نہ دے سکتا تھا اس لیے نہیں کہ وہ صاحبِ علم تھا بلکہ اس لیے کہ وقت اور حالات نے' خدا کی لامحدود قدرت کے بارے میں مسلسل غور و فکر کرنے نے اسے دانش عطا کی تھی۔ وہ بندے اور خالق کی طاقت کے فرق کو جان گیا تھا۔ ایک طاقت اَزل سے اَبد تک تھی' اس کی اپنی تھی اور دوسری ایک مخصوص وقت کے لیے کسی کی عطا کردہ تھی جو کبھی بھی چھن سکتی تھی۔ بہرکیف اس احساس کے ساتھ بادشاہ اپنا وقت گزار رہا تھا۔ مدتوں جیل میں وقت گزارنے کے بعد اَب جو وقت بھی قدرے آرام سے گزرتا' غنیمت تھا۔ امیر زادی کو دَرس دینے کے لیے وہ ہر شام جاتا۔ امیر زادی نے ایک جزو حفظ کیا پھر دوسرا' اس عمل نے خاصا وقت لیا۔ پردے کے اُس جانب بیٹھ کر وہ پڑھتی اور بادشاہ دوسری جانب سے اُسے ایک ایک لفظ پڑھاتا اور کچھ ہدایات دے کر واپس آ جاتا۔ اُس کا خیال تھا کہ امیر زادی نہ صرف حد درجہ ذہین بلکہ خوش آواز بھی ہے۔ امیر زادی بھی یہ جان چکی تھی کہ اُس کا معلّم ایک سنجیدہ' صاحبِ علم' ذہین اور قابلِ اعتبار انسان ہے۔

امیر زادی کو پڑھاتے ہوئے کئی ماہ ہو چکے تھے۔ اُس شام جب وہ سر جھکائے امیر زادی کو تلاوت کرتے ہوئے سن رہا تھا' کمرا امیر زادی کی دلکش آواز سے گونج رہا تھا۔ حسبِ عادت بادشاہ نے اِس پاکیزہ کلام کو قلب و رُوح میں اترتا محسوس کیا تو آنکھیں موند لیں۔ امیر زادی نے تیسرے سیپارے کی اِسی آیت کی تلاوت کی۔

''اے خدا! اے تمام بادشاہی کے مالک! تو جسے چاہے' بادشاہی عطا فرمائے۔ جس سے چاہے' چھین لے۔ جسے چاہے' عزت بخشے۔ جسے چاہے' ذلیل کر دے۔ ہر طرح کی بھلائی تیرے ہاتھ میں ہے اور بے شک تو ہی ہے جو ہر شئے پر محیط و قادر ہے۔'' (سورۃ آلِ عمران۔ آیت نمبر ۲۶)

بادشاہ لرز گیا۔ نہ جانے غم اور گناہ کا احساس ہی تھا یا پھر اس وقت جلالِ خداوندی کی مظہر اِن آیات نے قلب کو ہمیشہ سے زیادہ شدت سے جکڑ لیا تھا کہ بادشاہ رونے لگا اور نشست کی ہتھی پر رکھے اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ پردے کے دوسری جانب بیٹھی امیرزادی نے ہاتھوں کی لرزش محسوس کر لی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے پردے کو اِس طرح برابر کیا کہ اُس جانب کا منظر دیکھ سکے' تب اپنے سے کچھ فاصلے پر بیٹھے ہوئے استاد کو وہ دیکھتی ہی رہ گئی جو سب کچھ فراموش کیے جھکے ہوئے سر کے ساتھ عاجزانہ انداز سے بیٹھا رو رہا تھا۔ امیرزادی کو لگا کہ یہ اشک یونہی نہیں چھلک آئے' یہ عقیدت کے جذبات سے آنکھوں میں آ جانے والی نمی نہیں ہے بلکہ یہ قلب کے ٹکڑے ہیں جو آنکھوں کے راستے بہہ نکلے ہیں اور قلب کے ٹکڑے ہو جانے کا کوئی سبب ضرور ہوتا ہے۔ چند لمحے اِسی کیفیت کی نذر ہو گئے۔ وہ محتاط انداز سے باریک پردے کی اوٹ سے بادشاہ کو دیکھتی رہی پھر بولی۔ ''استادِ عظیم! آپ اِس قدر دل گرفتہ کیوں ہیں؟''

بادشاہ ایک دَم چونک گیا۔ اسے یاد آیا کہ وہ تنہا نہیں ہے بلکہ امیرزادی کی تیز نظریں اسے دیکھ رہی ہیں۔ اس نے خود کو سنبھالنا چاہا لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ ٹالنا چاہا مگر امیرزادی ٹلنے والی نہ تھی۔ موضوع بدل دینا چاہا لیکن وہ اس موضوع سے ہٹنے کے لیے تیار نہ تھی۔ وہ مستحکم آواز میں بولی۔

''اگر کوئی خاص بات ہے تو وضاحت فرما دیجیے ورنہ بابا جان خود ہی دریافت کر لیں گے کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ یہاں بیٹھ کر آپ کا اِس طرح سے گریہ کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟''

بادشاہ اس جملے پر سٹپٹا گیا۔ وہ اپنے مقام سے بھی آگاہ تھا اور امیرزادی کی حیثیت سے بھی اور اس طرح رو دینے کے معنی سے بھی۔ ایسے میں وہ اس مقام کو بھی گنوانا نہیں چاہتا تھا جو امیرزادی اور امیر حاطب کی نظروں میں مشکوک ہو جانے کے بعد ہونا ناممکن تھا لہٰذا پوری طرح سے خود کو سنبھالتے ہوئے بولا۔ ''امیرزادی.....! آپ اِس قدر اصرار کر رہی ہیں تو میں انکار نہیں کر سکتا لیکن آپ اِس بات کو راز رکھنے کا وعدہ کریں تو عرض کروں کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ کوئی میرے اِس حال سے آگاہ ہو۔ دراصل میں مالکِ حقیقی کی نظروں سے گرا ہوا ایک معتوب انسان ہوں جس نے تختِ شاہی سے زنداں تک طویل سفر کو چند گھنٹوں میں طے کیا۔ گویا خالقِ کائنات کے جلال و عظمت کو آزمائے بغیر ایمان نہ لایا اور ایک بلند ترین منصب سے گرنے کے بعد پستیوں اور ذلتوں کی کیفیات سے گزر کر آپ کے سامنے ہے' آپ کے معلّم کے منصب پر فائز ہے اور اِسی کو بہت بڑی عزت تصور کر رہا ہے۔''

یہ کہنے کے بعد بادشاہ نے اِس آیتِ مبارک پر ہنسنے سے لے کر اِس وقت اُس پر رونے تک کا واقعہ بیان کیا اور آخیر میں بولا۔ ''آپ اِس بات کو راز رکھیں گی نا؟''

امیرزادی نے ساری رُوداد کے ساتھ یہ سوال بھی سنا۔ وہ سناٹے کے عالم میں بیٹھی ہوئی تھی۔ یہ داستان سن کر اُس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے لیکن اُس نے پوری طرح خود کو سنبھالا اور بولی۔ ''معاف فرمایئے' میں نے آپ سے رازداری کا وعدہ نہیں کیا اور پھر خیال ہے کہ یہ بات عام ہو جانا چاہیے' عبرت کے لیے بھی اور انصاف کے لیے بھی اور یاد رکھیے کہ آپ معتوب یا مغضوب نہیں ہیں' نہ مالکِ حقیقی کی نظروں سے گرے ہوئے معمولی انسان ہیں بلکہ قُدرت جن لوگوں کو اُن کی خطاؤں پر فوراً پکڑ لیتی ہے' دراصل اُسے اُن کی اصلاح منظور ہوتی ہے اور جنہیں گناہ راس آ جاتے ہیں' اُن کے لیے اصلاح کا اہتمام نہیں بلکہ دوسری دنیا میں سزا کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ آپ تو بہت خوش نصیب ہیں کہ دائمی سزا اور پکڑ سے بچ گئے۔''

پھر بادشاہ رو کتارہ گیا لیکن امیرزادی اٹھ کر محل کے اندرونی حصے میں چلی گئی اور وہ دروازے پر متعین غلام کے ساتھ اپنی قیام گاہ پر آ گیا۔

قُدرت جب کسی کام کو کرنے کا فیصلہ کرتی ہے تو

ذرا بھی دیر نہیں لگتی بلکہ جس چیز کا ارادہ کیا' ''کُن'' کہا اور وہ ہوگئی۔ شاید وہ لمحہ بادشاہ کے لیے بھی آ چکا تھا۔ سزا کی مدت تمام ہوئی اور بارگاہِ خداوندی سے ''کُن'' کہا گیا۔ امیر زادی نے امیر حاطب کو بادشاہ کی حقیقت سے آگاہ کرتے ہوئے یہ عجیب و غریب واقعہ سنایا۔ اُدھر اِس صداقت کی گواہی دینے کے لیے تامرڈا کو جو مدتوں سے اپنے پکڑے جانے سے بے خوف ہو چکا تھا' کسی قافلے کو لوٹتے ہوئے عین موقع پر پکڑا گیا۔ امیر حاطب نے یہ دونوں باتیں حیرت سے سنیں اور ایک لمحہ ضائع کیے بغیر بادشاہ کی قیام گاہ کی طرف روانہ ہوگیا۔ بادشاہ نمازِ عشاء اَدا کرنے کے بعد حسبِ دستور تسبیح و تہلیل میں مصروف تھا کہ اس نے متعدد قدموں کی آواز سنی پھر اس نے دیکھا کہ امیر حاطب چند خاص لوگوں کے ساتھ اس کے سامنے موجود ہے۔ قریب تھا کہ بادشاہ اس کے استقبال کو کھڑا ہوتا کہ اس نے خود ہی آگے بڑھ کر دونوں ہاتھ تھام لیے اور بولا۔

''شاہِ یمن.....! آپ ہمیں عزت دے کر شرمندہ نہ کیجیے۔ ہماری سلطنت میں آپ کے ساتھ جو زیادتی اور ظلم ہوا' اس کا ازالہ ناممکن ہے۔ ہم تو آپ سے معافی بھی نہیں مانگ سکتے۔''

لمحہ بھر کے لیے بادشاہ کو چکر سا آ گیا۔ خدا لمحوں میں تقدیر پلٹ دیتا ہے۔ بے شک جسے چاہے' عزت دے' جسے چاہے' ذلیل کردے۔ وہی ہر شئے پر محیط و قادر ہے۔ اِس تصور سے اُس کا گلا رندھ گیا پھر اُس نے کہا۔ ''امیر حاطب! اَب آپ میری حقیقت کو جان ہی گئے ہیں تو واضح کردوں کہ سب سے عارضی عزت بادشاہ کی ہوتی ہے جس پر وہ سب سے زیادہ فخر کرتا ہے۔''

''بے شک اصل عزت کے قابل اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے۔'' امیر حاطب نے متاثر سے انداز میں کہا۔ ''اور آج اُسی لائقِ عبادت ہستی نے مجھے یہ عزت بخشی ہے کہ میں یمن کی سلطنت کی طرف اُس کے قابلِ فخر بادشاہ کو لوٹا دوں جس کا انتظام مکمل ہو چکا ہے' تب تک آپ بہ حیثیت بادشاہ کے' میرے مہمان ہیں۔''

بادشاہ کو پوری شان اور اعزاز کے ساتھ محل میں لایا گیا جہاں معزز سرداروں' غلاموں اور خدام نے اُسے سلامی دی۔

پھر اُن چند دنوں کے اندر اندر کئی واقعات رونما ہوئے۔ امیر حاطب نے اپنے چند آدمی یمن بھیجے جنہوں نے واپس آ کر خبر دی کہ یمن کا بادشاہ شکار کی غرض سے گیا تھا اور پراسرار طور پر لاپتا ہوگیا۔ اس کے وفادار مشیر اور وزیر ابھی تک تلاش میں سرگرداں ہیں اور اس دوران میں معمر مشیر معتصم نے انتظام سنبھالا ہے۔ امیر حاطب نے وہاں باقاعدہ بادشاہ کے بہ قیدِ حیات ہونے کی اطلاع بھجوائی اور بادشاہ کے پہنچنے کے دن اور تاریخ کا تعین کر کے اہلِ یمن کو مطلع کیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک عجیب فیصلے نے سب کو چونکا دیا' یہ فیصلہ تھا امیر زادی کلثوم بنتِ حاطب کا۔

''ہم اِس عظیم انسان کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتے ہیں جس پر خداوندِ عالم نے اپنی عظمت کو خاص انداز سے آشکار کیا۔''

یہ فیصلہ سن کر بادشاہ اور امیر حاطب دونوں ہی حیران رہ گئے۔ امیر حاطب نے کہا۔ ''شاہِ یمن! میں اپنی بیٹی کے اِس فیصلے کی داد دیتا ہوں۔ اِس طرح نہ صرف اِسے ایک اچھا ساتھی مل جائے گا بلکہ اس زیادتی کا ازالہ بھی ہو جائے گا جو ایک غلط فہمی کے سبب آپ کے ساتھ ہوئی۔''

پھر جیسے شاہِ یمن کی خاموشی نے اِس بات کی اجازت دے دی اور کچھ دن کے بعد اہلِ یمن نے دیکھا کہ اُن کا بادشاہ واپس آیا مگر عجیب شان کے ساتھ' وہ شان جس میں بندگی کے انداز نمایاں تھے اور اِسی اعترافِ بندگی کے باعث بادشاہ کی شان اور عزت میں اضافہ ہوگیا تھا۔

اَب اہلِ یمن اُس سے خوف زدہ اور مرعوب ہو کر نہیں بلکہ اُس کی چاہت اور محبت دل میں لیے وفاداریوں کا اظہار کر رہے تھے۔

☆☆.....☆☆

سیالکوٹ سے آئی مختلف اور منفرد کتھا

مائی ناجو اور بلیاں

منیر نیازی کا شعر

ملائمت ہے اندھیرے میں اُس کی سانسوں سے
دمک رہی ہیں وہ آنکھیں ہرے نگیں کی طرح

شفق شیکی

اُس خستہ حال مکان کے صحن میں آج پھر چند ں پانی کے نل کے قریب بیٹھی ہوئی تھیں۔ اِس ٹپکتے نل کے قریب اِن بلیوں کا بسیرا بہت پرانا تھا۔ ویسے سویرے میں یہ چند ہی بلیاں نظر آتی تھیں مگر رات

کے اندھیرے میں اِن کی تعداد بہت بڑھ جاتی تھی۔ مائی ناجو کو اِن بلیوں سے بڑی سخت اور بہت پرانی نفرت تھی۔ مائی ناجو اب کافی بوڑھی اور لاغر ہوچکی تھی۔

اُس پر اکثر پاگل پن کے دورے پڑتے تھے سبھی لوگ اِس سے ڈرتے اور خوف کھاتے تھے اور ایسے میں کبھی کوئی جو اِس سے ہمدردی کرتا' آس پڑوس سے حال پوچھنے آتا تو مائی ناجو ہر آئے گئے کو اِن بلیوں کے قصے سنانے لگ جاتی۔ نل کے قریب لے جا کر کہتی۔

''دیکھو..... یہ منحوس بلیاں آج پھر میرے نل پر قابض ہوکر بیٹھی ہیں۔ میرا سارا دن یہاں کھڑے کھڑے دم نکل جاتا ہے باقی جگہ بھی پانی ہے۔ مگر اِن منحوس بلیوں کو یہاں سے ہی پانی چاہیے ہے۔ ارے یہ بلیاں جانے ہیں نا..... یہ بڑھیا بھی اِسی نل سے پانی لینے کو آئے گی۔ اسی لیے میرا سارا پانی یہ بلیاں پی جاتی ہیں۔''

''ارے مائی ناجو! یہاں تو کوئی بلی نظر نہیں آ رہی' دیکھو خالی نل ٹپک رہا ہے۔'' پڑوس سے آئی عورت بولی تھی۔

''اچھا..... تجھے شاید معلوم نہ ہے..... یہ بلیاں بڑی مکار ہیں..... جب کوئی میرے گھر قدم رکھتا ہے تو یہ چھپ جاتی ہیں۔'' مائی ناجو نے نفرت سے کہا تھا۔

''وہ دیکھ رہی ہے نا..... وہ دیکھ' وہ سفید بالوں والی موٹی بلی اُس دیوار کے بڑے سوراخ میں چھپ رہی ہے۔'' مائی ناجو نے اپنا لکڑی کا ڈنڈا زمین پر مارتے ہوئے غصے سے پوچھا۔

''بول نظر آ رہی ہے تجھے..... جلدی بتا مجھے.....'' اپنی لنگ زدہ ٹانگ کو گھسیٹ کر چلتے ہوئے پوچھا تھا۔

''وہ..... ہاں..... ہاں شاید..... وہاں بلی ہے' مجھے نظر آ گئی..... بھئی آ گئی ہے میں بعد میں آؤں گی' یہ روٹی سالن لائی تھی تمہارے لیے' کھالینا میرا چھوٹا بچہ رو رہا ہوگا میں اب چلتی ہوں۔'' پڑوس والی عورت جو مائی ناجو کے غصے سے بہت ڈرتی تھی۔ فٹافٹ وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی کہ کہیں مائی ناجو لکڑی ڈنڈا اُس کے سر میں نہ دے مارے۔

مائی ناجو جو پیچھے سے آوازیں دے د نجانے کیا کیا بک رہی تھی۔ پھر خود سے بولی۔

''ارے! میرا شیرو بھی رو رہا ہے۔ آج نے اُسے برفی بھی لاکر نہیں دی ہے۔ شیر شیرو..... کہاں چھپا ہوا ہے تُو؟ آ جا..... چل نکل۔'' وہ اندر کمرے میں آئی۔ کونے میں بدرنگ رضائی اٹھائی۔

''یہاں ہے تو؟ شیرو..... چل نکل باہر..... ناجو نے رضائی جھٹک جھٹک کر الٹ پلٹ پرے پھینک دی۔ مگر وہاں کیا دھرا تھا؟ خالی ا کسی انسانی وجود کا کوئی نام ونشان نہ تھا۔

مائی ناجو چیخ رہی تھی نجانے کیا کیا بک رہی اُس پر پاگل پن سوار تھا۔ اُس نے اپنا لکڑی فرش سے اٹھایا تھا اور اپنے آپ کو مارنے لگی اپنے لاغر بدن پر ایک دو تین' ضرب پر ضرب رہی اور پھر وہ نڈھال ہوکر کمرے کے اندھیر فرش پر ڈھے گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

اگلے روز مائی ناجو کی وہی چیخ و پکار پھر تھی۔ آس پاس کے لوگ تو جیسے مائی ناجو کی اِس پکار کے عادی ہوچکے تھے۔

چند ہی ایسے لوگ تھے جو ترس کھا کر اکثر ا اسے کھانے پینے کو کچھ دے جاتے تھے۔ یا پھ بہت بیٹھ کر حال احوال پوچھ لیا کرتے تھے۔

اُس روز بھی مائی ناجو کی چیخ و پکار پر پڑو رہنے والی ماں بیٹی اُس کے گھر کے کھلے درو سے اندر آ گئی تھیں اور اُس کے پاس جا کر' ما نے آہستگی سے کچھ پوچھا تھا۔

مائی ناجو سخت غصے میں بکنے جھکنے لگی تھی۔ ما چپ کر کے پاس ہی کھڑی رہی تھیں۔

''ارے رانو! دیکھ ذرا اِن مکار بلیوں کو' می بھر کے چالیس پچاس چکر لگاؤں اِس نل کے' مگ عیار بلیاں نہ ٹلیں ہیں یہاں سے' ارے میں میٹ

نے کو اپنا برتن لیے اندر سے چکر پر چکر لگاؤں کہ
یا تب یہ موٹی عیار بلیاں یہاں سے کہیں اور جا
یں تو میں اپنا برتن اِس نل کے نیچے بھرنے کو رکھ
ں مگر نہ.....

یہ تو اِس نل اور اِس کے پانی پر قبضہ مارے بیٹھی
ں۔'' اب مائی ناجو کی غصے سے سانس پھول رہی
تھی۔ وہ زور زور سے سانس بھرنے لگی تھی چپ کھڑی
ماں بیٹی کو مائی ناجو کے پاگل پن کا بہت اچھے سے
علوم تھا۔

لڑکی بولی۔

''مائی! تجھے کتنی بار بولا ہے کہ ہمیں دیوار سے
آواز دے کر پانی منگوالیا کر..... مگر.....'' ابھی لڑکی
آگے کچھ کہنا ہی چاہتی تھی تبھی مائی ناجو ہاتھ فضا میں نچا
کر بولی تھی۔

''ارے میں کیا تجھے لنگڑی نظر آؤں' یا ٹانگ کٹی
نظر آؤں ہوں؟''

مائی غصے میں پھنکاری تو لڑکی کچھ سہم کر پیچھے کو ہٹی
اور اب کے لڑکی کی ماں بولی۔

''دیکھ مائی ناجو! جو بھی ہے بلیاں نل پر بیٹھے ہیں
یا نہ بیٹھے ہیں۔ تیرے گھر میں اور بھی تو نل ہیں' تو اِس
کے آگے برتن رکھ کر پانی بھر لیا کر' تجھے بھی اِسی نل کا
پانی چاہیے۔''

''ارے! تیرے کو میں پاگل نظر آؤں ہوں کیا؟
میں کیوں دوسرے نل سے اپنا برتن بھروں ارے یہ
میرا مکان ہے میں جس جگہ سے چاہے پانی اپنے برتن
میں بھروں' یہ موٹی مکار بلیاں جا کر دوسری جگہ سے
پانی نالے لیں' اِن کے پیر میں مہندی لگی ہے یا پیر میں
زخم لگے ہیں جو یہ ہل نہ سکے ہیں۔'' مائی غصے میں
پنگاڑھی تھی۔

''اچھا مائی! ہمیں تو معافی دے ہم تیرے بھلے کو
ہی بول رہے تھے۔ مگر تو شاید ہمیں دشمن ہی مانتی
ہے۔''

''چل ہمیں دیر ہو رہی ہے..... ہم چلتے ہیں۔''
ماں نے اپنی بیٹی کو ٹہوکا دے کر چلنے کا اشارہ کیا تھا
دونوں جلدی سے دروازے سے باہر نکل گئی تھیں۔

مائی ناجو پیچھے سے چیختی رہ گئی تھی اور پھر وہ بکتے
جھکتے اندر کمرے میں آئی تھی۔ اِدھر اُدھر دیکھا تھا۔
پھر کمرے کے کونے تک آئی تھی۔ ایسا معلوم پڑتا تھا
جیسے وہ کسی کو تلاش کر رہی ہے اور پھر جنونی کیفیت میں
فرش پر پڑی اپنی ڈنڈا نما لاٹھی اٹھائی تھی اور اپنے بدن
پر ضرب پر ضرب لگاتی چلی گئی تھی۔ ذرا دیر بعد نڈھال
ہو کر کمرے کے فرش پر گویا گر سی گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

رات کسی پہر مائی کی آنکھ کھلی تھی کمرے کے خستہ
حال دروازے سے ٹھنڈی ہوائیں اندر آ رہی تھیں۔
مائی بڑی مشکل سے اپنے لنگ زدہ وجود کو گھسیٹ کر
کمرے سے باہر آئی تھی اور اپنی لاٹھی کی مدد سے قدم
جماتی ننگے پیر ٹھنڈے فرش پر چلتی ہوئی صحن کے کونے
تک آئی تھی جہاں نل کے پاس اُسے بلیوں کا بہت بڑا
ہجوم نظر آیا تھا۔

اُس نے سوئی ہوئی بلیوں اور اُن کے بچوں پر
اپنی لاٹھی بڑے زور سے دے ماری تھی' گویا پھر نیا
طوفان برپا ہو گیا تھا' بلیوں کے بچے چیخنے لگے تھے
بلیاں غراتی ہوئی مائی ناجو کی جانب بڑھنے لگی تھیں' مائی
اُن کے خوف سے بھاگی تو فرش پر اوندھے منہ گر گئی
تھی۔ پھر گرتے پڑتے اپنے کمرے تک آئی' اندر آئی
اور جلدی سے کمرے کے دروازے کی کنڈی لگانے
لگی تھی باہر بلیوں کا شور اور غرانے کی آوازیں تیز
ہوتی جا رہی تھیں۔

اِن آوازوں میں کسی انسانی بچے کے رونے کی
آوازیں بھی بہت شدت سے آنا شروع ہو گئی تھیں۔
مائی گویا پاگل ہو گئی تھی وہ کبھی اپنے بال نوچتی اور کبھی
اپنا سر دیوار سے پٹختی وہ بہت زور زور سے چیخ رہی
تھی۔

''شیرو..... شیرو..... میرے بچے..... آ.....
جا..... تو کہاں..... چھپا ہوا ہے؟ شیرو.....شیرو۔''
کچھ دیر بعد باہر اور اندر کا شور دونوں گویا جیسے تھم گئے
تھے۔

یہ کالے اور سیاہ اندھیرے مائی ناجو نے خود اپنے
لیے پالے تھے اپنے ہاتھوں سے تاریکی کی دیواروں کو

چیخوں کے طوفان سے بھر دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

یہ بات کافی پرانی ہے جب موٹی اور خرانٹ مائی ناجو اپنے چار بیٹوں کے ہمراہ رہتی تھی۔ اُس کے چاروں بیٹے شادی شدہ تھے۔

مائی ناجو ہر وقت بہو بیٹوں اور اُن کے بچوں سے لڑتی جھگڑتی رہتی اور تاک میں رہتی کہ کوئی بہانا سوجھے تو وہ انہیں نکال باہر کرے' اور پھر اُس نے رفتہ رفتہ سب کو نکال باہر کیا تھا' اور خود اکیلی مزے سے رہنے لگی تھی۔

مائی ناجو عجیب وغریب فطرت کی مالک تھی وہ کس پل کیا کر ڈالے گی کچھ کہا نہ جاسکتا تھا اسے کسی انسان سے بھی محبت نہ تھی' بس اگر اُسے کسی کی قدر تھی یا کسی سے تھوڑا بہت لگاؤ یا پیار تھا تو بس اپنے سب سے چھوٹے پوتے شیرو سے..... شیرو بھی اپنی دادی سے محبت بہت کرتا تھا۔

مائی ناجو اپنے چھوٹے بیٹے فراز کے ہاں گئی تھی جو کہ کرائے کے مکان میں رہ رہا تھا اور لڑ جھگڑ کر اُس کے چاروں بچوں کو اپنے ساتھ لے آئی تھی۔ بڑے تین بچے تو مائی ناجو سے کئی بار پٹ چکے تھے اسی لیے بہت ڈرتے تھے۔ بس ایک شیرو تھا جس کو مائی نے کبھی نہ مارا تھا۔ بلکہ اپنے ہاتھ سے نوالے بنا کر اُسے کھلاتی تھی۔

مائی ناجو بچوں کو لے تو آئی تھی۔ مگر وہ بہت خوف زدہ تھے۔ اور پھر ایک روز شیرو کے علاوہ تینوں بڑے بچے آنکھ بچا کر بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔

مائی کو یہ حرکت ایک آنکھ نہ بھائی تھی مگر اُس نے کوئی پرواہ بھی نہ کی تھی۔

''میری بلا سے دفع ہوگئے اب اگر آئے تو لاٹھی سے مار مار کر ایسا مرغا بناؤں گی کہ ساری عمر مائی کا نام نہ بھولیں گے۔'' مائی نے غصے سے لال ہوتے ہوئے کہا تھا۔

مائی شیرو کے ساتھ بڑا اچھا سلوک کرتی تھی اسی لیے وہ ابھی تک نہ بھاگا تھا ویسے وہ مائی کی عزت بھی بہت کرتا تھا۔ جو مائی کہتی مانتا تھا وہ باہر سے کچھ سودا منگواتی لے آتا' پانی کا ڈرم بھرنے کو کہتی تو شیرو بھر دیتا' مائی برف منگواتی شیرو بھاگ کر قریبی بازار کی نکڑ والی گلی والے خان بھائی سے لے آتا۔

شیرو بہت اچھا بچہ تھا' وہ اپنے مدرسے کا سبق بھی دل لگا کر یاد کرتا تھا۔ مگر کبھی اگر وہ مدرسے کا سبق بھول جاتا تو اُس کے مدرسے کے استاد مولوی اکرم صاحب بہت زور سے موٹا ڈنڈا اُس کی پیٹھ پر مارتے تھے اور شیرو کونے میں بیٹھ کر بہت روتا تھا۔

اُس نے کئی بار سوچا تھا مائی کا اچھا موڈ دیکھ کر مولوی صاحب کی شکایت لگائے گا پھر مائی انہیں مزہ چکھائے گی۔

☆.....☆.....☆

موسم گرما اپنے عروج پر تھا۔ سورج کی تپش نے انسانوں اور حیوانوں کو بدحال کر رکھا تھا۔ آسمان سے گرم لُو کے بگولے گویا ہر طرف اڑتے پھرتے تھے اُس روز بھی بلا کی گرمی تھی۔ زمین پر پاؤں رکھو تو مانو جل اٹھتے تھے۔ گرمی اور تپش کا زور ایسا تھا جیسے سب کچھ جل بھن جائے گا۔

کچھ دنوں سے صحن کے کونے میں لگے میٹھے پانی کے نل کے قریب بلیاں آ بیٹھتی تھیں۔ شیرو بھی کچھ دنوں سے اِن مختلف رنگوں والی بلیوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ کچھ فاصلے پر کھڑے کھڑے کتنی کتنی دیر تک اُن کو دیکھتا رہتا تھا۔

شیرو کو یہ موٹی موٹی بلیاں بہت اچھی لگنے لگی تھیں۔ سفید رنگ والی کالے رنگ والی چتکبری اور نارنجی رنگ اور آخری ہلکے زرد رنگ والی بلی' یہ چاروں موٹی موٹی بلیاں اُسے بہت بھلی لگنے لگی تھیں۔ وہ انہیں دیر تک دیکھا کرتا مگر جیسے ہی اندر سے مائی کی خرانٹ آواز آتی تو شیرو ڈر کر جلدی سے اِدھر اُدھر ہو جاتا یا پھر اندر بھاگ جاتا۔

اُسے کسی حد تک یہ معلوم ہوگیا تھا کہ مائی کو یہ بلیاں بالکل پسند نہیں ہیں' کیونکہ مائی انہیں دیکھتے ہی نفرت سے منہ پھیر لیتی تھی' اور اُس نے شیرو کو بھی کہہ دیا تھا۔

''اگر تو نے اِن موٹی بلیوں کو کچھ کھانے کو ڈالا

ان موٹی بلیوں کی کھال اتار کر' اور پھر وہ کھال ابال کر مجھے روز کھلاؤں گی بہتر ہے کہ تو ان بلیوں سے دور رہا کر۔'' اور یہ سنتے ہی شیرو کوزور سے قے آ گئی تھی۔

اب شیرو بلیوں کے معاملے میں کافی چوکنا رہنے لگا تھا۔ ذرا آہٹ ہوتی تو وہ ڈر کے مارے فوراً وہاں سے بھاگ کھڑا ہوتا تھا۔ جب روزانہ مائی میٹھے پانی کے اس نل سے جہاں بلیاں بیٹھتی تھیں' ڈرم یا بالٹی بھرنے کو کہتی تو گویا شیرو خوشی سے نہال ہو جاتا تھا۔ چونکہ صرف پانی بھرنے کے اوقات میں مائی اُس کو بالکل کچھ نہ کہتی تھی۔

حیرت کی ایک بات یہ بھی تھی کہ جب شیرو پانی بھرنے کے لیے نل کے قریب جا کر کھڑا ہوتا تو بلیاں آپ ہی کچھ فاصلے پر ہو جاتی تھیں اور پھر شیرو پانی بھرنے میں کافی دیر لگاتا اور قریب سے اُن موٹی نرم و ملائم بلیوں کو دیکھتا رہتا۔

☆.....☆.....☆

''شیرو..... چل دسترخوان کا کپڑا بچھا' آج اس قدر گرمی ہے' ہائے جیسے بندے کو تپش مار کر کھا جاوے گی۔ چل آج ہم جلدی روٹی کھا کر تھوڑا سو جاویں گے۔ رات میں بھی ٹھیک سے آنکھ ہی نہ لگے ہے۔'' شیرو نے فوراً ہی دسترخوان بچھا دیا تھا۔

''دیکھ میں نے کسی میں برف کے ٹکڑے ڈالے تھے دیکھ ابھی جیسے وہ موئے بھی غائب ہو بیٹھے ہیں' یہ بیسن کی روٹی تجھے مزے کی لگے ہے نا؟ میں نے تیرے لیے دو پکائی ہیں چل..... چل..... شروع کر۔''

مائی ناجو نے شیرو کے آگے بیسن کی دو روٹیاں اور لسی کا بھرا ہوا کٹورہ رکھا' شیرو نے مزے سے کھانا کھایا اور روٹی کا کچھ حصہ مائی کی نظروں سے چھپا لیا تھا۔

جب کھانے کے بعد مائی لیٹ گئی اور جب شیرو کو کچھ دیر بعد یہ یقین ہو گیا کہ مائی سو چکی ہے تو وہ خاموشی سے بہت گرم دوپہر میں چپکے سے صحن کے کونے والے نل کی طرف آیا تھا اُس نے چھپائی ہوئی روٹی کے ٹکڑے کر کے ایک بدرنگ پرانے سے برتن میں ڈال کر نل کے نیچے بیٹھی بلیوں کے قریب رکھ دیا تھا۔ بلیوں نے شیرو کی طرف دیکھا تھا اور پھر چاروں بلیوں نے ایک ایک ٹکڑا اپنے منہ میں ڈال کر کھا لیا تھا۔ اور پھر دوبارہ سے ٹپکتے ہوئے نل کے نیچے جم کر بیٹھ گئی تھیں۔

شیرو اکثر سوچتا تھا کہ یہ بلیاں ہر وقت تو اس نل کے نیچے بیٹھی رہتی ہیں تو بھلا کچھ کھانے اور شکار کو کب جاتی ہوں گی؟ روٹی کے ان چھوٹے ٹکڑوں سے ان بلیوں کا پیٹ تو نہیں بھرتا ہوگا' مائی ناجو تو کہتی ہے کہ اِن موٹی بلیوں کا پیٹ ایک بڑے مٹکے کے برابر ہے۔ تو کیا یہ بلیاں بھوکی رہتی ہیں؟ یا پھر ان بلیوں کا پیٹ کٹورے برابر ہے' مگر بھوک تو چڑیا کو بھی لگتی ہے وہ بھی ہر وقت دانہ چگتی ہے' میں اب مائی سے چھپ چھپا کر روز اِن بلیوں کو ضرور کھانا ڈالا کروں گا۔ شیرو نے گویا دل میں پختہ گرہ باندھ لی تھی۔

☆.....☆.....☆

شیرو نے آخر کار ایک روز مائی کو رو رو کر مولوی اکرم صاحب کی شکایت لگا ہی دی تھی۔ شکایت لگانے کی دیر تھی مائی آگ بگولہ ہو گئی تھی سر پر برقعہ ڈالا تھا اور ہاتھ میں لاٹھی اٹھا کر شیرو سے بولی تھی۔

''اب دیکھ اُس مولوی کی میں نے چٹنی نہ بنا دی تو کہنا واپس آتے ہوئے اُس مولوی کی چٹنی' سیر بھر یا پاؤ بھر تیرے لیے بھی لیتی آؤں گی اور ہاں تو آج سے مدرسے مت جانا میں تیرے کو بتاؤں ہوں کہ آج وہ مولوی تیرے حصے کا سبق میرے کو سنائے گا' چل میں جا رہی ہوں..... دروازہ بند کر لے۔'' مائی غصے میں لال پیلی ہوتی ہوئی دروازے سے نکل گئی تھی۔

اب شیرو تو بہت زیادہ خوش تھا' اور خیال ہی خیال میں مولوی صاحب کو مائی کی لاٹھی سے مار کھاتے دیکھ رہا تھا۔

مائی ناجو نے مولوی اکرم کے خوب لتے لیے تھے' مولوی صاحب کی تو مائی کے سامنے گویا گھگھی ہی بندھ گئی تھی۔ مولوی صاحب شیرو پر تشدد سے انکار کرتے مائی اور زیادہ لتے لیتی خیر پھر وہاں سے نکل کر وہ اپنے بڑے بیٹے کے ہاں گئی اور اُس کی کریانے کی دکان میں گھس کر زبردستی لڑ جھگڑ کر ہفتے بھر کا راشن تھیلے

میں ڈال کر لے آئی۔

مائی جب گھر میں داخل ہوئی تو شیرو بہت بے چینی سے مائی کا انتظار کر رہا تھا۔ مائی نے شیرو کو راشن کا تھیلا پکڑایا اور بولی۔

''جا شیرو..... پہلے بھاگ کے جا اور خان بھائی سے برف کا ٹکڑا لے آ' گرمی سے جان نکلے جاوے ہے میری۔'' مائی نے گرمی سے بے حال ہوتے ہوئے کہا تھا۔

شیرو بھاگ کر خان بھائی سے برف لے آیا۔ مائی نے برف پانی میں ڈال کر خوب ٹھنڈا پانی پیا پھر شیرو سے بولی۔

''شیرو..... آج تو اُس مولوی کی خوب خبر لی ہوں میں' ارے وہ مولوی' وہ جھوٹا آدمی میرے کو اُبلی آنکھیں دکھا رہا تھا۔ ارے میں کہوں ہوں' کب سے میرے شیرو کو مارے تھا؟ وہ جلاد..... میرے کو بولا..... میں شیرو کا نام خارج کر دوں گا اور یہ بھی بولا کہ مدرسے نکال باہر کروں گا..... ورنہ کل آ کے شیرو معافی مانگے۔''

''نہ..... نہیں..... میں نے نہیں جانا مدرسے..... وہ مولوی صاحب میرے کو ڈنڈے اور جوتے سے مارتے ہیں' اب تو وہ اور ماریں گے۔'' شیرو نے خوف سے تھر تھر کانپتے ہوئے کہا تھا۔

''ارے..... میرا بچہ' تو کیوں ڈر رہا ہے؟ ارے کل سے تو اُس مولوی کو نظر ہی نہ آئے گا..... تو دیکھنا وہ کیسا پاگل..... پاگل پھرے گا۔'' مائی نے جوش مارتے ہوئے کہا تھا اور شیرو خوشی کے مارے پھدکنے لگا تھا۔

''شیخ انور صاحب کی مسجد میں تیرا نام لکھوالیں گے' تو پھر وہاں پڑھے گا۔ وہ بہت اچھے پڑھا دیں گے تیرے کو۔'' مائی خوشی سے پھولتے ہوئے بولی تھی۔

''یہ لے برفی کھالے' اور ہاں اپنے کسی دوست کو مت کھلائیو' میں نے تیرے لیے زیادہ برفی خریدی ہے' کہ تو کافی دنوں تک کھالے۔'' مائی نے تھیلے سے برفی کے دو لفافے نکال کر شیرو کو پکڑا دیے تھے۔

شیرو نے کچھ برفی کھالی تھی اور باقی کی برفی ایک خفیہ جگہ چھپا کر رکھ دی تھی اب شیرو کو اندھیرا ہونے کا انتظار تھا اور پھر جیسے ہی اندھیرا چھانے لگا شیرو نے کمرے کے اندر جھانکا مائی کو دیکھا کہ شاید اُس کی آنکھ لگ چکی ہو۔ مائی کی واقعی آنکھ لگ چکی تھی۔ شاید اُس کے لیے کہ آج کافی روز بعد اُس کا باہر کا چکر لگا تھا اور وہ اسی لیے بہت تھک چکی تھی۔

شیرو نے یہ منظر دیکھا تو وہ خوشی سے جھوم اٹھا' اُس نے چھپائی ہوئی برفی نکالی اور ایک برتن میں خوب چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر ڈالے اُس نے ایک نظر برفی کے ٹکڑوں پر ڈالی اور مطمئن ہو گیا کہ آج بلیوں کا پیٹ کافی حد تک بھر جائے گا' وہ دبے پاؤں باہر آیا مگر یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ آج چار کی بجائے بلیوں کی کافی بڑی تعداد وہاں موجود تھی۔ شیرو حیران ہونے کے ساتھ ساتھ بہت خوش بھی ہوا کہ آج تک کسی نے بھی اتنی ڈھیر ساری بلیاں اکٹھی ایک ساتھ نہ دیکھی ہوں گی۔ اور وہ اتنی حسین بلیاں.....

شیرو نے ایک چھوٹا سا برفی کا ٹکڑا اپنے منہ میں رکھا اور تل کے قریب ننگے پیر دبے قدموں سے آیا تاکہ مائی کو کسی بھی آہٹ کا احساس تک نہ ہو' شیرو نہیں چاہتا تھا کہ اُسے بلیوں کی وجہ سے سزا ملے اور بلیوں کو اُس کی وجہ سے' سچی بات تو یہ تھی کہ شیرو ان بلیوں پر مرتا تھا۔ اور دوسری طرف بلیاں بھی شیرو پر فدا تھیں وہ جب بھی تل کے قریب جاتا بلیاں خود اُٹھ کر اُس کے اردگرد جمع ہو کر گھیرا ڈال لیتی تھیں۔

شیرو نے برفی والے برتن سے ساری برفی کے ٹکڑے بلیوں کے لیے رکھے برتن میں ڈال دیے تھے بلیوں کی آج اتنی بڑی تعداد دیکھ کر شیرو کو لگا تھا آج اُن چار بلیوں کی سہیلیاں اور اُن کے بچے بھی آئے ہیں۔ وہ تمام بلیوں کو تل سے کچھ دور کھڑے ہو کر شوق سے دیکھنے لگا تھا۔ ساری بلیاں مل جل کر برفی کے ٹکڑے یوں کھا رہی تھیں جیسے اُن کو یہ کھانا بہت پسند آیا ہو۔ اندھیرے میں بھی بلیوں کے وجود سے جیسے ایک سفید دودھیا روشنی کی لکیریں نکل رہی تھیں۔ جس سے وہاں کا منظر بہت واضح نظر آ رہا تھا۔

شیرو تو جیسے ساکت اور جامد ایک ٹک اِس ہولناک منظر کو دیکھے جا رہا تھا' گویا وہ اُس منظر میں کھو چکا تھا۔

شیرو جہاں کھڑا تھا وہاں سارا دن بڑی تیز دھوپ پڑتی تھی اسی لیے وہاں کا فرش اب بھی بہت گرم تھا۔ حالانکہ اندھیرا خاصا گہرا ہو چکا تھا۔ مگر زمین کی تپش ہنوز برقرار تھی' شیرو چونکہ ننگے پیر تھا سو وہ بار بار کبھی ایک پاؤں اوپر کرتا تو کبھی دوسرے پاؤں کو.....!

پھر اُس نے دیکھا کہ بلیوں کا برتن برفی سے خالی ہو چکا تھا اور اب تمام بلیاں آہستہ آہستہ شیرو کی جانب بڑھ رہی تھیں وہ کچھ سہم سا گیا تھا۔ اُس نے وہاں سے ہلنے کی کوشش کی تھی مگر اُس کا وجود گویا وہیں پر جم گیا تھا وہ اپنی جگہ جامد کھڑا تھا اور پھر جیسے ہی تمام بلیاں اُس کے قریب آئی تھیں تو اُسے ایسا لگا تھا کہ جیسے نرم نرم روئی کا ڈھیر اُس کے آس پاس ہے' اور اچانک ہی اپنے جلتے ہوئے پیروں کے نیچے اُسے ٹھنڈک کا احساس ہوا تھا' جیسے اُس کے جلتے پاؤں کے نیچے کسی نے ٹھنڈی ٹھار برف بچھا دی ہو۔ یکدم ہی شیرو کے وجود میں ایک سکون کی لہر دوڑ گئی تھی۔ وہ بلیوں کے جھرمٹ میں بیٹھ گیا تھا۔ اُس کو بڑا مزہ آنے لگا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں نیند تیرنے لگی تھی اور پھر وہ نرم نرم روئی کے ڈھیر پر سر رکھ کر سو گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ جب شیرو کی آنکھ کھلی تھی وہ حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا تھا' اُس کو کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا کہ وہ کہاں ہے؟ اُس کا سر کسی نرم سی چیز پر ٹکا ہوا تھا وہ اچانک ڈر سا گیا اور جلدی سے اٹھ بیٹھا اور پھر اُسے جیسے سب یاد آ گیا تھا برفی اور بلیوں کا وہ جھرمٹ اور پھر وہ سو گیا تھا' اب وہ چار بلیاں اُس کے قریب ہی بیٹھی ہوئی تھیں بلکہ شاید سو چکی تھیں مگر شیرو جاگا تھا تو وہ آنکھیں پٹ سے کھول کر بیٹھ گئی تھیں' باقی تمام بلیاں غائب تھیں شاید وہ بلیاں اپنے اپنے ٹھکانوں پر جا چکی تھیں۔

شیرو نے آہستہ سے ہاتھ بڑھا کر ڈرتے ڈرتے چتکبری اور سفید والی بلی کی پشت پر آہستہ سے پیار کیا تھا تبھی اُسے ایسا لگا جیسے اُس کی پشت پر کوئی موجود ہے اُسے کوئی گھور رہا ہے شیرو نے ڈر کر پیچھے دیکھا تھا تو اس کی سانس جیسے سینے میں اٹک گئی تھی۔ مائی نے سخت غصے میں ابلتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ کہا تھا۔

''اٹھ جا..... چل کھڑا ہو' دفع ہو جا یہاں سے۔''

اور پھر وہ شیرو کو گھسیٹ کر دھکے دینے لگی تھی۔

''نہ..... نہیں' وہ میں..... وہ.....'' شیرو کے منہ سے بے ربط الفاظ اٹک اٹک کر نکل رہے تھے۔ وہ مائی کے غصے اور خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔

مائی نے شیرو کی کوئی بھی بات نہیں سنی تھی اور اسے داخلی دروازے سے گلی میں نکال باہر کیا تھا۔

اگلے روز شیرو نے سارا دن مائی سے معافی مانگی تھی۔ ترلے ڈالے تھے منت سماجت کی تھی اور مائی سے کہا تھا۔

''جو وہ آئندہ کہے گی وہی کرے گا اُس کی ہر بات مانے گا۔''

آخر کار مائی نے شیرو کو معاف تو کر دیا تھا' مگر صرف اِس شرط پر کہ..... ''اگر دوبارہ..... اُسے بلیوں کے پاس بیٹھا دیکھ لیا تو پھر وہ اُسے ایسی سخت سزا دے گی جو اُس نے سوچی بھی نہ ہوگی۔''

اُس روز کے بعد سے مائی اب ہر پل ہر لمحہ شیرو پر نظر رکھنے لگی تھی۔ جب وہ مسجد سے آتا' صحن میں بیٹھ کر اپنا سبق یاد کرتا تو مائی کی نظریں اُس پر جمی رہتی تھیں۔ جبکہ شیرو تو مگن اپنا سبق یاد کرتا رہتا تھا۔

پانی کا ڈرم بھرتا..... تو مائی کمر پر ہاتھ رکھے اُسے گھور کر دیکھتی رہتی کہ ابھی شیرو اُن موٹی اور مکار بلیوں کے پاس جا کر بیٹھ جائے گا' تو وہ اُس کو چپل سے مارے گی' مگر شیرو کا دھیان اِدھر اُدھر ہوتا ہی نہ تھا۔ وہ اپنا کام کرتا اور اندر آ جاتا' مائی پہلے تو شیرو کے اس رویے پر بہت حیران ہوئی تھی مگر پھر اُسے لگا تھا کہ شیرو کو اُس کی بات سمجھ میں آ ہی گئی ہے۔

مائی دل ہی دل میں اکثر سوچتی کہ ہوں یہ موٹی مکار عیار بلیاں میرے گھر پر قبضہ جمانے چاہے ہیں' میں اِن بلیوں کا ایسا حال کروں گی کہ پھر کبھی میرے

ٹھکانے پر قدم نہ رکھ پاؤیں گی۔ ان منحوس بلیوں کی وجہ سے لگے ہے میرے مکان پر' جیسے کوئی کالا سایہ آوے ہے' میرے اناج پر بھی' اِن موٹی بلیوں کی کالی نظر لگے ہے۔''

☆.....☆.....☆

پھر بہت سے دن گزر گئے تھے اور کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی اب جاڑے کے دن شروع ہو چکے تھے۔ مائی گرم گرم پکوڑے تل رہی تھی اور شیرو قریب ہی کھڑا مائی کی چھوٹی موٹی مدد کر رہا تھا۔

''جا شیرو ذرا تنور سے تین چار روٹیاں پکڑ لا۔''

مائی نے شیرو کو پیسے پکڑائے تھے۔

شیرو بھاگ کے تنور سے روٹیاں لے آیا تھا۔ جب وہ روٹیاں لے کر اندر آیا تھا تو اُس نے ایک روٹی جو اپنے پیسوں سے اضافی خریدی تھی۔ جلدی سے دیوار والے ایک سوراخ میں چھپا دی تھی۔ پھر ایک نظر موٹی موٹی نرم و ملائم بلیوں پر ڈالی تھی۔ جو تل کے قریب سو رہی تھیں اور پھر جلدی سے اندر بھاگ آیا تھا کہ کہیں مائی نہ دیکھ لے اور پھر کوئی آفت نہیں آ پڑے۔

مائی نے شیرو کو گرم گرم پکوڑے اور روٹی دی تھی سردی چونکہ بہت تھی اسی لیے ساتھ میں گرم گرم چائے بھی بنائی تھی۔ شیرو نے مزے سے کھانا کھایا تھا اور کچھ پکوڑے بعد کے لیے بھی بچا کر رکھ لیے تھے۔

اگلے روز دھوپ خوب چمک کر نکلی تھی تو مائی نے گدے اور رضائی وغیرہ کو دھوپ لگوائی تھی۔ دو چھوٹے صندوق بھی دھوپ میں رکھے تھے اور ایک کافی بڑا صندوق جو کافی گہرا بھی تھا۔ اِس کو مائی اور شیرو نے گھسیٹ کر صحن کے وسط میں لا کر دھوپ میں رکھا تھا۔

ایک میلی سی پرانی رضائی جو اُس گہرے صندوق میں پڑی تھی۔ مائی نے شیرو کو کہا کہ اندر گھس کر یہ رضائی نکال دے اور دھوپ میں ڈال دے۔ وہ سارا دن انہی کاموں میں نکل گیا تھا۔ اس روز مائی اور شیرو سرِ شام ہی سو گئے تھے۔

اگلے روز صبح سے خوب زور کی بارش ہو رہی تھی۔

غزل

محبت حادثاتی طور پر ہے
مری یہ رائے ذاتی طور پر ہے
دلوں سے انخلا کی کارروائی
سنا ہے' انضباطی طور پر ہے
ترا پہچان کر انجان بننا
یقیناً احتیاطی طور پر ہے
کبھی ثابت' کبھی سیّار ہونا
یہ دنیا بے ثباتی طور پر ہے
بچھڑتے جا رہے ہیں لوگ خود سے
یہ سب کچھ انحطاطی طور پر ہے
بہت کچھ اتفاقاً ہو رہا تھا
بہت کچھ واقعاتی طور پر ہے
یہاں پر اجتماعی کچھ نہیں ہے
یہاں جو کچھ ہے' ذاتی طور پر ہے

نجم الحسن نجمی

جو بھی تیز اور کبھی آہستہ مسلسل برس رہی تھی۔ کمرے سے باہر رکھا کچھ سامان تو مائی گزشتہ روز ہی اندر کر چکی تھی بس ایک دو چیزیں ہی باہر رہ گئی تھیں' ان میں وہ بڑا اور گہرا صندوق بھی تھا جس پر بارش کا پانی پڑ رہا تھا سو مائی اور شیرو نے اُسے دھکا دے کر چھجے کے نیچے کر دیا تھا۔

سردی پہلے سے بہت ہی زیادہ بڑھ گئی تھی۔ سرد ہوائیں بدن کو چیر کر گزر رہی تھیں۔ اُس روز دوپہر میں مائی اور شیرو نے گرما گرم چائے کے ساتھ پراٹھا کھایا تھا اور پھر مائی سونے کے لیے لیٹ گئی تھی۔

''تو بھی کچھ دیر کو سو جا۔'' مائی نے شیرو سے کہا تھا۔

شیرو نے لیٹنے سے پہلے جلدی جلدی کچھ کھانے پینے کی چیزیں اُس دیوار والے مخصوص سوراخ میں چھپا دی تھیں۔

پورا آسمان کالے بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ بارش مسلسل تیزی سے برس رہی تھی۔

شیرو نے بلیوں کی طرف دیکھا تھا۔ چاروں بلیاں نل کے پاس والی دیوار کے قریب ہو کر برستی بارش سے بچنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ شیرو کو یکدم بے چینی سی شروع ہو گئی تھی۔

بہت شدت سے بلیوں کے بھیگنے پر فکر ہو رہی تھی۔ اُس نے ایک نظر اپنے پیچھے سوئی ہوئی مائی پر ڈالی تھی اور مطمئن ہو کر اپنے اوپر موٹی چادر ڈالتے ہوئے کمرے سے باہر آیا تھا اور بلیوں کو بڑی مشکل سے چھجے کے نیچے تک لے کر گیا تھا۔ سرد ہوائیں شیرو کے بدن کے اندر گویا گھسی جا رہی تھیں۔ اس نے دیوار والے سوراخ سے چھپایا ہوا کھانا نکالا تھا کچھ بلیوں کو ڈالا تھا اور کچھ بلیوں کے قریب ہی بیٹھ کر خود بھی کھایا تھا۔

شیرو کو مائی کا خوف تو تھا مگر اُس نے سوچا تھا اگر مائی اٹھ بھی گئی تو وہ کوئی بہانہ کر دے گا یا پھر کہیں چھپ جائے گا اور پھر اچانک ہی وہ بھاگ کر اندر گیا تھا اُسے ایسا لگا تھا جیسے مائی آ رہی ہے۔

جب اُس نے اندر کمرے میں جھانکا تھا تو مائی اپنے بستر پر سے اٹھ رہی تھی۔

مائی نے اٹھ کر قہوہ بنایا تھا پیالی میں انڈیلا تھا کہ اُس کی نظر شیرو پر پڑی تھی۔ جو کچھ گھبرایا ہوا اور کافی بھیگا ہوا تھا۔

''ارے تو کیسے بھیگ گیا؟'' مائی نے قدرے حیرت سے پوچھا تھا۔

''چل اندر فوراً کپڑے بدل..... اب باہر مت جانا..... چل اندر مر..... بیمار پڑے گا۔'' مائی کی آواز میں اب غصہ بھی شامل ہو گیا تھا۔

شیرو نے جب تک کپڑے بدلے تھے مائی نے قہوہ پی لیا تھا۔ وہ شیرو سے بولی تھی۔

''چل جا کے رضائی میں بیٹھ۔'' شیرو مائی کے کہنے پر رضائی میں دبک تو گیا تھا پر اُس کا سارا دھیان بلیوں کی طرف ہی لگا ہوا تھا۔

مائی قہوہ کی پیالی وغیرہ رکھنے کو کمرے سے باہر گئی تھی کہ کچھ دیر بعد ہی شیرو کے کانوں میں بلیوں کے بری طرح سے غرانے کی آواز آئی تھی۔

شیرو رضائی سے جھٹ سے نکل کر باہر کی طرف لپکا تھا۔ اُس نے دیکھا تھا کہ مائی چھجے کے نیچے موجود چاروں بلیوں کو اپنی لاٹھی سے مار اور دھتکار رہی تھی۔

''ارے..... یہ منحوس..... بلیاں پہلے نل پر قبضہ مارے بیٹھی تھیں اب چھجے والی جگہ پر قبضہ کر رہی ہیں کل میرے کمرے کی چوکھٹ پر اور پھر کمرے میں آ جائیں گی کمبخت ماری۔'' مائی نے شیرو کی طرف دیکھ کر قدرے غصے سے کہا تھا۔

شیرو کا دل بری طرح سے دھک دھک کر رہا تھا چتکبری' سفید' زرد اور نارنجی چاروں بلیاں جاڑے کی سرد بارش میں بھیگ چکی تھیں اور سرد ہوا کے جھکڑ شائیں شائیں کر رہے تھے۔

وہ چاروں بلیاں پناہ کے لیے جگہ تلاش کر رہی تھیں مگر مائی نے سخت غصے اور نفرت سے اُن بلیوں کو اپنی لاٹھی سے مار مار کر بھگا دیا تھا مگر بلیاں بھیگتی ہوئی سرد ہواؤں میں دوبارہ چھجے کے نیچے برستی بارش سے بچنے کے لیے آنے کی کوشش میں لگی ہوئی تھیں۔ بارش اِس قدر تیز برس رہی تھی کہ ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔

مائی نے تھک ہار کے واپس آتے ہوئے غصے میں کمرے کا دروازہ زور سے لاٹھی مار کر بند کر دیا تھا اور شیرو کی طرف دیکھ کر بولی تھی۔

''چل تو رضائی میں لیٹ.....اور ہاں کان کھول کر سن لے میری بات' اس کمرے سے قدم باہر مت نکالنا' ورنہ میرے سے برا حشر ہو جاوے گا تیرا۔'' مائی نے جیسے غصے سے پھنکارتے ہوئے کہا تھا۔

☆.....☆.....☆

نجانے وہ رات کا کون سا پہر تھا جب شیرو چپکے سے اپنے بستر سے اٹھا تھا اور اپنی رضائی اپنے جسم سے پرے کی تھی اور کمرے کا جائزہ لیا تھا مائی اپنے بستر پر رضائی میں منہ لپیٹے پڑی سو رہی تھی اور کمرے میں اُس کے خراٹے گونج رہے تھے۔

شیرو ننگے قدموں سے کوئی آہٹ کیے بغیر دوبارہ اپنے بستر کی طرف آیا تھا اور اپنی رضائی کو اٹھا کر اپنے کندھے پر ڈالنے کی کوشش کی تھی لیکن رضائی کا کافی حصہ نیچے لٹک رہا تھا بہرحال وہ دبے قدموں کمرے سے باہر آیا تھا اور بلیوں کو تلاش کرتے ہوئے برستی تیز بارش اور گہرے اندھیرے میں وہ بڑی مشکل سے پانی میں شڑاپ شڑاپ راستہ بناتا چھجے تک آیا تھا۔

یخ بستہ پانی میں اُس کی ٹانگیں یکدم جیسے سن سی ہو گئی تھیں اُس نے بڑی مشکل سے دیکھا تھا کہ بلیاں یخ ٹھنڈے پانی سے بھرے فرش پر بے دم سی پڑی ہیں' شیرو کو یکدم سے ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ وہ سمجھا تھا شاید بلیاں سردی سے اکڑ کر مر چکی ہیں' لیکن جب اُس نے بلیوں کو ہاتھ لگایا تھا تو وہ سانس تو لے رہی تھیں مگر اُن کی حالت نہایت خستہ ہو رہی تھی۔

شیرو کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟

اچانک اُس کی نظر کچھ فاصلے پر چھجے کے نیچے پڑے اُس بڑے سے گہرے صندوق پر پڑی تھی' پھر تو گویا اچانک ہی اُس کے اندر بجلی کی سی پھرتی بھر گئی تھی۔ اُس نے پہلے تو صندوق کا بڑا سا ڈھکنا کھول کر اپنے ساتھ کمرے سے لائی ہوئی رضائی صندوق کے اندر پھینکی تھی پھر ایک ایک کر کے چاروں بلیوں کو بڑے آرام سے لا کر اُس بڑے اور گہرے صندوق میں رکھا تھا اور پھر خود بھی اُس صندوق کے اندر اترنے کی کوشش کی تھی۔ اِس کوشش میں وہ پہلی بار تو نیچے پانی میں گر گیا تھا کیونکہ سخت سردی اور یخ بستہ بارش نے اُس کے وجود کو سن کر دیا تھا حالانکہ اُس کے کپڑے اونی اور موٹے تھے' مگر اِس برفیلے موسم میں گویا سب کچھ جم رہا تھا۔ بہرحال دوسری کوشش میں شیرو صندوق کے اندر تھا اُس نے جلدی سے صندوق کے اندر پھینکی ہوئی رضائی کو پہلے بلیوں کے گرد لپیٹا تھا اور خود بھی بلیوں کے قدرے پاس ہو کر رضائی اپنے بھی اردگرد لپیٹ لی تھی۔

شیرو کے خیال میں بلیوں کی حالت کافی خراب تھی۔ وہ مرنے کے قریب تھیں اور وہ اُن بلیوں کے لیے زندگی کی نئی راہ بنا رہا تھا۔ وہ ہمیشہ یہ سوچتا تھا کہ ان بلیوں کے پاس کوئی جادو ہے یا وہ بلیاں خود جادو نگری سے آئی ہیں۔ مگر اب وہ اِس بات پر بھی بہت حیرت زدہ تھا کہ آج یہ بلیاں خود اپنی مدد کیوں نہیں کر سکی تھیں؟ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اُس کو کچھ شور اور کھٹکے جیسی کچھ آوازیں سنائی دی تھیں۔

شیرو نے اپنے سن اور سُل ہوتے پیروں کے وزن پر بڑی مشکل سے کھڑا ہونے کی کوشش کی تھی اور کچھ اونچا ہو کر صندوق کے کنارے سے باہر کی طرف جھانکا تھا کہ اُس کے وجود پر گویا ہزاروں حشرات اور کیڑے مکوڑے رینگ گئے تھے۔ اُس کا وجود گویا برف کی سِل بن گیا تھا شیرو نے مائی کو دیکھا تھا۔

مائی سر پر موٹا کھیس رکھے صحن میں اپنی لاٹھی کے ذریعے آگے کی طرف بڑھتے ہوئے شیرو کو آوازیں دے کر تلاش رہی تھی۔ اُس نے دروازے کو کھول کر باہر گلی میں بھی جھانکا تھا مگر وہاں تو بس اندھیرا اور ویرانی اور ڈھیروں ڈھیر پانی کا جل تھل تھا۔

مائی صحن میں اِدھر سے اُدھر چکراتی پھر رہی تھی کہ اچانک ہی اُس کی نظر اُس بڑے اور گہرے کھلے ہوئے صندوق پر پڑی تھی اب وہ بڑی مشکل سے لاٹھی کی مدد سے صحن میں کھڑے پانی میں سے گزر کر چھجے تک آ رہی تھی۔

شیرو نے مائی کو آتے دیکھ لیا تھا۔ اُس کی سانس

گویا اُس کے وجود میں کہیں رُک سی گئی تھی۔ اُسے اپنے اور چاروں بلیوں کے وجود کے پرخچے اِس برستی بارش میں اڑتے اور بکھرتے ہوئے نظر آرہے تھے۔

مائی نے جیسے ہی صندوق کے قریب آکر اندر جھانکا تھا مائی کا دماغ بھک سے اڑ گیا تھا۔

''ارے.....واہ.....واہ میں زمانے بھر میں تجھے تلاشو ہوں میرے گلے میں سوراخ پڑ رہے تھے اور تو سانپ کی اولاد' سانپ کی طرح یہاں چھپے ہے تو مجھے کیا اندھی بڑھیا سمجھے ہے' یا فاقے سے مرا کتا سمجھے ہے کہ میں اپنے پیروں سے چل نہ سکوں ہوں۔ ارے تو ایسے نہ سدھرے گا' تجھے اب ایسی سزا دوں ہوں کہ ساری عمر مائی کو پاگل نہ بنا سکے گا۔ چل نکل باہر.....''

مائی نے شیرو کو زور سے صندوق سے باہر کو کھینچنے کی کوشش کی تھی مگر شیرو کا وجود تو گویا جم کر رہ گیا تھا۔

''نہ..... نہیں..... معاف کر..... کرو.....دے..... ما.....مائی ..... میں.....'' شیرو نیلے پڑتے ہونٹوں سے التجا کے لیے ٹوٹے پھوٹے الفاظ نکل رہے تھے۔

''نہ.....نہ.....تو ایسے نہ سمجھے گا۔ ارے تجھے کھلا کھلا کر سانپ بنایا میں نے.....نہ.....نہ.....ایسے نہ چھوڑوں گی تجھے۔'' مائی نے اپنی لاٹھی اٹھائی تھی اور شیرو کو مارنے کے لیے ہوا میں لہرائی تھی کہ چاروں بلیاں جیسے یک بیک شعلہ بار ہوگئی تھیں۔ بلیوں نے مائی پر غرانا شروع کر دیا تھا۔ مائی نے گھبرا کر لاٹھی زمین پر پھینک دی تھی اور بہت تیزی سے صندوق کا ڈھکن گرا دیا تھا۔

صندوق کا ڈھکن جیسے ہی گرا تھا اندر سے شیرو کے چلانے اور مائی کو پکارنے کی آوازیں آنے لگی تھیں مگر مائی ڈھیٹ بنی کھڑی رہی تھی۔

''اب بھگت اپنے کیے کی سزا میں بولی تھی نا کہ ان منحوس بلیوں کے پاس نہ بیٹھا کر یہ آسیب ہیں' جادو ٹونا کر دیوے ہیں۔ اب رہیں اِس صندوق کے اندر تو بھی اور تیری بلیاں بھی۔''

کچھ دیر ہی گزری تھی کہ صندوق کے اندر سے شیرو کی آوازیں آنا بند ہوگئی تھیں۔ ایک بالکل جامد اور ساکت خاموشی چھا گئی تھی۔ اِس خاموشی سے مائی یکدم ہی گھبرا گئی تھی۔ وہ جھٹ سے صندوق کے قریب آئی تھی۔ کانپتے ہاتھوں سے بڑی مشکل سے صندوق کا ڈھکن اٹھا کے اندر جھانکا تھا۔

اندر جھانکتے ہی مائی کے منہ سے بے ربط چیخوں کا طوفان ابلنے لگا تھا۔ جیسے وہ پاگل سی ہوگئی ہو۔ صندوق کے اندر شیرو کا وجود مردہ ہو چکا تھا۔ اور چاروں بلیاں صندوق کے اندر سے غائب ہو چکی تھیں وہاں اب صرف اور صرف شیرو کا مردہ جسم موجود تھا۔

مائی یکدم دھڑام سے بارش کے پانی میں گر کر ہوش وحواس سے بے گانہ ہوگئی تھی۔ فضا میں بارش اور تاریکی کے علاوہ نجانے کہاں سے آتی بے شمار بلیوں کے رونے یا پھر ماتم کی آواز بھی شامل ہوگئی تھی۔

☆.....☆.....☆

پہلے پہل علاقے کے اکثر لوگ اُس مائی ناجو سے ڈرتے تھے جبکہ کچھ ہمدردی بھی کرتے تھے اُن کا خیال تھا کہ بے چاری اپنے پوتے کی جدائی اور موت کے صدمے کی وجہ سے اِس حال تک پہنچی ہے۔ پر شیرو کے ماں باپ کا خیال کچھ اور تھا اُن کو شیرو کی موت والے دن سے ہی یقین تھا کہ شیرو کی موت کی وجہ مائی ہی ہے۔ اور مائی 'قاتل' ہے مگر اُس کے پاگل پن کی وجہ سے انہوں نے مائی ناجو کو پولیس کے حوالے نہیں کیا تھا۔

اور پھر جب وہ وقت آیا تھا مائی ناجو صبح شام اور خاص کر رات کو چیخ چیخ کر محلے والوں کو مدد کے لیے یہ کہہ کر بلانے لگی تھی۔

''بچاؤ بچاؤ مجھ پر چار بلیاں حملہ کر رہی ہیں۔'' تو ایک روز محلے والے اُسے پاگل خانے چھوڑ آئے تھے۔

☆.....☆.....☆

مائی ناجو جس مکان میں رہتی تھی۔ جہاں چار بلیاں تل کے نیچے ٹھنڈے فرش پر بیٹھی نظر آتی تھیں آج بھی وہاں لگا پانی کا نل ٹپکتا رہتا ہے مگر اب وہاں کوئی بھی بلی آکر نہیں بیٹھتی۔

☆☆.....☆☆

دنیا میں کس جگہ

سچی کہانیاں کے چرچے نہیں

اِس لیے کہ "سچی کہانیاں" کے مصنّفین پیشہ ور لکھنے والے نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو زندگی کی حقیقتوں اور سچّائیوں کو برتتے، دیکھتے، محسوس کرتے اور ہمیں لکھ بھیجتے ہیں۔ "سچی کہانیاں" کے قارئین وہ ہیں جو سچّائیوں کے متلاشی اور انھیں قبول کرنے والے ہیں

یہی وجہ ہے کہ "سچی کہانیاں" پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا اپنی نوعیت کا واحد ڈائجسٹ ہے "سچی کہانیاں" میں آپ بیتیاں، جگ بیتیاں، اعترافاتِ جرم و سزا کی کہانیاں، ناقابلِ یقین کہانیاں، دلچسپ و سنسنی خیز سلسلوں کے علاوہ مسئلہ یہ ہے اور قارئین و مدیر کے درمیان دلچسپ نوک جھونک احوال۔ سب کچھ جو زندگی میں ہے وہ "سچی کہانیاں" میں ہے۔

پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا — اپنی نوعیت کا واحد جریدہ

ماہنامہ سچی کہانیاں، پرل پبلی کیشنز : 88-C-II فرسٹ فلور۔ خیابان جامی کمرشل۔
ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی
فون نمبر: 021-35893121-35893122
ای میل : pearlpublications@hotmail.com

جنات سے جڑے دلچسپ تجربے اور روداد

جنوں کی بددعا

ساغر صدیقی کا شعر

زندگی تو چل رہی ہے مگر
ساتھ بددعا بھی چلتی ہے

اُمِّ مناہل

اس دنیا میں گزرا ہوا زمانہ جہاں اپنے پیچھے بہت سارے یادگار نقوش چھوڑ گیا' وہاں انسان اور جنات دوستی دشمنی کی بہت سی اَن مٹ داستانیں بھی رقم کر گیا' انسان اور جنات کی دوستی اور دشمنی ازل سے

ہورہی ہے اور ابد تک قائم رہے گی' ابلیس اور آدم کی مثال آپ کے سامنے ہے' انسان اور جنات کی دشمنی کی ابتداء آدم کے سجدے سے ہوتی ہے' ابلیس بھی ایک جن تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے آگ کی لپیٹ سے پیدا کیا تھا لیکن فرشتوں کے ساتھ مل جل کر رہتا تھا' اُس نے غرور و تکبر میں مبتلا ہوکر ایک سجدے کو بنیاد بنایا اور مٹی سے بنے آدم سے دشمنی کرکے آدم کو جنت سے نکلوادیا اور اس طرح بنی آدم کے ساتھ دشمنی کا آغاز کیا یہ کہانی بھی ایسے ہی تعلق پر مبنی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ جب ہمارے سامنے ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں جو ہماری عقل و فہم سے ماورا ہوں تو ہمارے ذہن میں اچانک جن بھوت اور ماورائی قوتیں جنم لینے لگتی ہیں۔

اللہ رب العزت نے اپنی نورانی مخلوق فرشتوں کی تخلیق کے ساتھ ساتھ اور بھی نہ جانے کون کون سی مخلوق پیدا فرمائی' ہماری قریب ترین مخلوق میں فرشتے اور جن ہیں' جن کی جمع جنات اور جنات کی جمع الجان ہے' قرآن مجید میں جنات کا ذکر ایک سو اٹھائیس دفعہ آیا ہے اور جن کا لفظ چودہ سورتوں کی اکتیس آیت مبارکہ میں بتیس مرتبہ آیا ہے۔

سورۃ الجن اس کی واضح مثال ہے اس کے علاوہ رسول اللہ ﷺ کی متعدد احادیث مبارکہ میں جنات کا ذکر موجود ہے' ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرائم سے ارشاد فرمایا'' کہ جب میں نے سورۃ الرحمٰن جنوں کو پڑھ کر سنائی تو وہ تم سے اچھا مجھے جواب دیتے تھے۔'' صحابہ کرام نے ارشاد فرمایا۔

''یارسول اللہ ﷺ وہ کیا جواب دیتے تھے۔''

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

''جب میں انہیں سورۃ الرحمٰن پڑھ کر سناتا تو وہ بہت ادب کے ساتھ سنتے اور جب میں 'فبای الآ ربکما تکذبٰن O ترجمہ:'' تو تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔'' تک پہنچتا تو وہ بڑے ادب کے ساتھ جواب دیتے اے ہمارے رب ہم تیری کسی نعمت کو نہیں جھٹلاتے۔''

سبحان اللہ چونکہ یہ کہانی جنات کے بارے میں ہے اس لیے جنات کی کچھ تفصیل یہاں بیان کرنا لازمی ہے۔

(1) سورۃ الانعام' سورۃ نمبر 6' آیات 100-128-130۔

(2) سورۃ الاعراف' سورۃ نمبر 7' آیات 179' 38۔

(3) سورۃ الحجر' سورۃ نمبر 15' آیات 26'27۔

(4) سورۃ الکھف' سورۃ نمبر 18' آیت 50۔

(5) سورۃ بنی اسرائیل' سورۃ نمبر 17' آیت 88۔

(6) سورۃ الانبیاء' سورۃ نمبر 21' آیت 82۔

(7) سورۃ المومنون' سورۃ نمبر 23' آیت' 23' 25'29۔

(8) سورۃ النمل' سورۃ نمبر 28' آیت 17'39۔

(9) سورۃ سباء' سورۃ نمبر 34' آیت 12'14'4۔

(10) سورۃ السجدہ' سورۃ نمبر 41' آیت 13۔

(11) سورۃ الاحقاف' سورۃ نمبر 46' آیت 18'29

(12) سورۃ زریات' سورۃ نمبر 51' آیت 56۔

(13) سورۃ الرحمٰن' سورۃ نمبر 55' آیت 33'39' 11-511456۔

(14) سورۃ الجن' سورۃ نمبر 72' آیت 1'5'26' 27۔

یہ واقعات جو میں بیان کرنے جارہی ہوں' ہمارے خاندان کے ہیں' ہمارے بزرگ ان واقعات کے چشم دید گواہ اور متاثرین میں سے ہیں اور ان واقعات کا اکثر تذکرہ کرتے ہیں۔ ہمارے پردادا قاضی مقبول حسین عثمانی کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں' جن میں سب سے بڑے قاضی محی الدین احمد عثمانی ہمارے دادا اور منجھلے بیٹے قاضی بختیار حسین عثمانی ہمارے نانا تھے' ہمارے خاندان کا نسب خلیفہ سوئم حضرت عثمان غنیؓ سے ملتا ہے ہماری پردادی کا نام مریم النساء تھا۔

ہماری رشتے کی پردادی سیدہ سعادت بیگم ایک کامل ولیہ تھیں اور اردو وظائف کی بھی عالمہ تھیں' ان کے وظیفے کی تکمیل پر ذاکر شاہ نامی ایک جن اُن کے قبضے میں آئے' لیکن سعادت بیگم نے ان سے اپنے

ذاتی مفاد کا کام لینے کے بجائے انہیں اپنا بھائی بنالیا اور ان سے وعدہ کیا کہ وہ بھی دنیاوی کام کے لیے انہیں مجبور نہیں کریں گی۔ تب ذاکر شاہ نے بھی اُن سے وعدہ کیا کہ میں آپ کی اولاد کی نسل در نسل دیکھ بھال کروں گا' وہ سعادت بیگم کو پیار سے سدھا کہا کرتے تھے' لہٰذا کہانی میں، میں بھی انہیں سدہ دادی ہی لکھوں گی۔ ہاں ایک اور بات ذاکر شاہ کا دوسرا نام عبدالرحمٰن تھا۔

راجہ رائے بھرت سنگھ کے دو بیٹے تھے' رائے برل اور بانس برل ہندوستان کا شہر بریلی شریف ان دونوں بھائیوں کا بسایا ہوا شہر ہے جس کے دو حصے ہیں' بانس بریلی اور رائے بریلی جو کہ ان دونوں بھائیوں کے نام پر ہیں' پھر اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں صاحب فاضل بریلوی کے بعد سے اس شہر کو بریلی شریف کہا جانے لگا۔

ہمارے آباؤ اجداد کا تعلق بھی بانس بریلی سے ہے' بانس بریلی کے ایک محلے درزی چوک پر ہمارے پردادا قاضی مقبول حسین عثمانی کی میلوں پر پھیلی خاندانی حویلی تھی' جس میں پورا خاندان مل جل کر رہتا تھا اس حویلی میں پچاس کمرے اور چالیس دکانیں تھیں۔

آنگن اتنا بڑا تھا کہ اس میں تقریباً سو پلنگ بچھتے تھے' اسی حویلی کے ایک کمرے میں سدہ سعادت بیگم رہتی تھیں اور وہیں ذاکر شاہ اُن سے ملاقات کے لیے آتے تھے' جب اُن کی آمد ہوتی تو ایک خوشگوار مہک محسوس ہوتی' اِن ہی ملاقاتوں کے درمیان سدہ دادی نے جو باتیں ذاکر شاہ سے معلوم کیں۔

وہ میں آپ کے گوش گزار کر رہی ہوں' ذاکر شاہ بتاتے تھے جیسے آپ کے انسانوں میں مختلف مذاہب' فرقے اور ذاتیں ہوتی ہیں اس کے برعکس چونکہ ہماری عمریں زیادہ ہوتی ہیں اور اب بھی ہمارے یہاں ایسے جن موجود ہیں جو نبی کریم ﷺ کی محفل میں شامل رہے ہیں اور ان سے فیض حاصل کیا' اس لیے ہمارے یہاں صرف دو طرح کے جن ہوتے ہیں' ایک مسلمان اور دوسرے کافر' کافر جنوں کو ہم بھورے جن بھی کہتے ہیں' وہ لوگوں کو تکلیف پہنچاتے ہیں لیکن کوئی مسلمان جن لوگوں کو تکلیف نہیں پہنچاتا' اور جیسے آپ کے انسانوں میں بہت سے لوگ لاولد ہوتے ہیں' ایسے ہی ہمارے یہاں بھی لاولد جن ہوتے ہیں' تو بہت سے جن یہ طریقہ اختیار کرتے ہیں کہ جب انسانوں میں کسی حاملہ خاتون کے پورے دن ہوں اور اُس لاولد جن کو اپنے علم کے ذریعے پتہ چل جائے تو وہ لاولد جن خود یا اُس کا کوئی رشتے دار اس عورت کے شکم سے بچہ غائب کر دیتے ہیں' اس لیے حاملہ عورت کو کسی ایسی جگہ مثلاً چھت یا درخت وغیرہ کے نیچے اکیلے نہیں بیٹھنا چاہیے جہاں سے کسی دوسری مخلوق کا گزر ہو۔

مگر ہمارے یہاں اِس فعل کو اچھا نہیں سمجھا جاتا ہے' ہماری برادری میں ایک ایسا ہی بچہ ہے جو اب نو دس سال کا ہو چکا ہے اس کے بڑے ہونے پر کسی ایسی ہی لڑکی کو تلاش کیا جائے گا جو اس طرح لائی گئی ہو ابھی اُس بچے میں اتنی قوت نہیں ہے جو وہ بند دروازے سے نکل سکے' مگر جب ہمارے ساتھ ہوگا تو ہم اسے بند دروازے سے بھی نکال کر لے جائیں گے۔

سدہ دادی نے اُس بچے کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو ذاکر شاہ نے کہا تھا۔

''ٹھیک ہے ہم کسی دن اُسے آپ کو دکھانے لے آئیں گے مگر دور سے ہی دیکھنا۔'' پھر ایک دن فجر کی نماز کے بعد وہ اُس بچے کو لے کر آئے اور گھر کی چھت پر کھڑا کر دیا گھر والوں نے دیکھا بروکیڈ کی شیروانی' ٹوپی اور سفید چوڑی دار پاجامہ پہنے ہاتھ میں چھڑی لیے ہوئے ایک بہت خوبصورت بچہ گھر کی چھت پر کھڑا تھا۔

☆.....☆.....☆

سدہ دادی کے ایک بھائی ہندوستان آرمی میں تھے' ان دنوں اُن کی پوسٹنگ لاہور میں تھی' اور وہ چھٹیوں پر بریلی آئے ہوئے تھے لیکن کسی مجبوری کے تحت بروقت ڈیوٹی پر نہیں پہنچ پائے تھے' انہوں نے سدہ دادی سے کہا۔

''تم اپنے بھائی سے کہو مجھے لاہور پہنچا دیں کل مجھے ہر حال میں وہاں ڈیوٹی دینی ہے۔'' سدہ دادی نے ذاکر شاہ کو بلا کر اُن سے اس بات کا ذکر کیا تھا۔ ذاکر شاہ نے کہا۔

''ٹھیک ہے مگر بریلی سے لاہور تک کا کرایہ دینا ہوگا۔'' وہ راضی ہوگئے۔ اُس زمانے میں بریلی سے لاہور تک کا کرایہ چھ یا ساڑھے چھ روپے ہوتا تھا۔

بریلی میں ایک قلعے والی ندی ہے' جو لوگ بریلی جا چکے ہیں یا بریلی کے رہنے والے ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ بریلی میں قلعے والی ندی کتنی مشہور ہے ذاکر شاہ نے سدہ دادی سے کہا ان سے کہنا کل صبح قلعے والی ندی پر آجائیں۔

دوسرے دن صبح وہ اپنی پوری تیاری کے ساتھ قلعے والی ندی پر پہنچ گئے' اس کے بعد ذاکر شاہ نے سدہ دادی کو ایک خط لا کر دیا اور کہا۔

''آپ کے بھائی خیریت سے لاہور پہنچ گئے ہیں اور پھر جب سدہ دادی کے بھائی دوبارہ چھٹیوں پر آئے تو انہوں نے بتایا تھا۔

''جب میں قلعے والی ندی پر پہنچا تو ذاکر شاہ ملے' انہوں نے کہا۔

''میرے ایک پاؤں پر اپنے دونوں پاؤں رکھو' اور اپنے ایک ہاتھ سے میرا ہاتھ پکڑ کر آنکھیں بند کرنے کو کہا۔ چند لمحوں میں انہوں نے آنکھیں کھولنے کے لیے کہا تھا اور جب میں نے اپنی آنکھیں کھولیں تو دیکھا میں لاہور اپنے اسٹیشن کے پریڈ میدان میں ہوں اور پریڈ کے لیے بگل بجایا جا رہا ہے بعد میں ذاکر شاہ نے مجھ سے کہا' اپنی بہن کے نام خط لکھ دو کہ میں خیریت سے لاہور پہنچ گیا ہوں' میں نے خط لکھ دیا جو کہ ذاکر شاہ نے آپ کو دے دیا ہوگا۔''

☆.....☆.....☆

کبھی کبھی بڑے مزیدار واقعات بھی ہوتے تھے۔ بریلی ریلوے جنکشن کا علاقہ تھا ایک دفعہ بسنت کے زمانے میں ہمارے دادا قاضی محی الدین احمد عثمانی (جو اس وقت چھوٹے سے تھے) ریلوے لائن پر پتنگ کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔

'ذاکر شاہ کی اُدھر سے آمد ہوئی انہوں نے اپنی بڑی بڑی سرخ آنکھیں دکھا کر دادا کو وہاں سے بھگا دیا' دادا روتے چیختے ہوئے گھر آئے اور سدہ دادی سے خوب لڑے کہ تمہارے بھیا نے اپنی لال لال آنکھیں دکھا کر مجھے ڈرا دیا' انہیں منع کردو آئندہ مجھے نہ ڈرائیں۔ عین اُسی وقت ذاکر شاہ گھر میں داخل ہوئے اور بولے۔

''یہ پتنگوں کے پیچھے بھاگ رہا تھا' وہاں سے ریل گاڑیاں گزرتی ہیں کوئی حادثہ نہ ہوجائے اس بات کے پیش نظر میں نے ڈرا کر اُسے وہاں سے بھگا دیا تھا۔''

ذاکر شاہ سدہ دادی کے پاس ہمیشہ انسانوں والی شکل میں آتے تھے کبھی اپنی اصل شکل میں نہیں آئے' ایک دفعہ سدہ دادی نے اُن کی صورت دیکھنے کی خواہش ظاہر کی' مگر ذاکر شاہ نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ

''آپ ہماری اصل صورت کو برداشت نہیں کرسکیں گی۔''

☆.....☆.....☆

کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ گھر سے کوئی چیز غائب ہوجاتی' دوسرے دن ذاکر شاہ سدہ دادی کو آکر بتا دیتے کہ ہمیں اِن چیزوں کی اچانک ضرورت ہوگئی تھی اس لیے ہم بغیر اجازت لے گئے۔

مقبول دادا اچار کے بہت شوقین تھے اور مختلف قسم کے اچار ڈالتے رہتے تھے ایک دفعہ ذاکر شاہ سدہ دادی کے بھائی احمد حسین کے گھر سے گھی کا مٹکا اور مقبول دادا کا اچار لے گئے' دوسری صبح آکر سدہ دادی سے بولے۔

''بھئی ہمارے گھر اچانک مہمان آگئے تھے' اس لیے ہم تمہارے بھائی کا گھی لے گئے اور آدھا گھی ہم نے استعمال کرلیا' احمد حسین سے کہنا ناراض نہ ہوں۔'' مقبول دادا ہنستے ہوئے بولے۔

''احمد حسن کے گھی کا بتا دیا' مقبول کے اچار کا نہیں بتایا۔'' ذاکر شاہ نے کہا۔

''بھئی ہم جلدی میں تھے آئندہ بتا کر لے

جائیں گے۔''

مقبول دادا کا گندم کا ایک کھیت تھا' اس کی فصل ملنا بند ہوگئی تھی' فصل پک کر تیار ہوجاتی جب کاٹنے کا ارادہ کرکے جاتے تو پتہ چلتا بالیاں سب کھڑی ہوئی ہیں' مگر اُن میں سے دانے سب غائب ہیں' سدہ دادی نے ذاکر شاہ سے کہا۔

''یہ بات اچھی نہیں ہے کہ پکی پکائی فصل غائب ہوجائے۔'' ذاکر شاہ نے کہا۔

''ہاں ہمارے یہاں بھی کچھ لوگ ایسی شرارتیں کرتے ہیں آپ بے فکر ہوجائیں آئندہ ایسا نہیں ہوگا' پھر ہر فصل پر خوب گندم ملنے لگی تھی۔

☆.....☆.....☆

اب جو واقعہ میں بیان کرنے جارہی ہوں وہ سدہ دادی کی آخیر زندگی اور تقریباً 1920-21ء کا ہے' اور اس ساری کہانی کا حاصل ہے' اس واقعے میں ذاکر شاہ کی لڑائی بھورے (مخالف) جنوں سے ہوئی تھی۔

اِس واقعے کی وجہ سے ہمارا خاندان دربدری کا شکار ہوگیا اور ایسا ہوا کہ آج تک ہم لوگ خانہ جنگی کی زندگی گزار رہے ہیں۔

درزی چوک والی حویلی میں ہی سدہ دادی کی تمام اولادوں کی مثلاً بھتیجا' بھتیجی وغیرہ سب کی شادیاں ہوگئیں تھیں کہ گھر میں کچھ انہونی باتیں ہونے لگیں' جو کہ تکلیف دہ ہوتیں' مثلاً اگر کوئی برآمدے میں پلنگ پر سو رہا ہوتا تو ایسا محسوس ہوتا کہ پلنگ کو کوئی جھولا جھلا رہا ہے پھر اچانک خود بخود جھولا بند ہوجاتا' جب آنکھ کھلتی تو دیکھتے پلنگ اپنی جگہ سے ہٹ کر دور بچھا ہوا ہے۔ ایک دفعہ ایک بہو اپنے چھوٹے بچے کو آدھی رات کے وقت آنگن میں بنی نالی میں پیشاب کرانے لگیں کہ اچانک وہ چیخنے اور چلانے لگیں' ان کی چیخیں سن کر گھر کے دیگر افراد بھی اٹھ گئے اور جب اُن سے چیخنے کی وجہ پوچھی تو انہوں نے بتایا جیسے ہی بچے کو پیشاب کرایا نالی میں سے بہت سارے سانپ نکل کر آگئے' اور پھر وہ دیکھتے ہی دیکھتے غائب بھی ہوگئے۔

اسی طرح ایک دن ایک بہو حاجت کے لیے واش روم گئی کہ اچانک چیختی ہوئی واپس آئیں' اُن کی حالت ایسی تھی کہ وحشت سے آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں' جب اُن کی حالت سنبھلی تو انہوں نے بتایا جیسے ہی میں حاجت سے فارغ ہوکر اٹھی تو ایک طرف سے بہت ساری بڑی بڑی مکڑیاں نکل آئیں' اور پھر وہ اچانک غائب بھی ہوگئیں۔

اس طرح کے اور بھی مختلف واقعات ہونے لگے' جب سدہ دادی نے ذاکر شاہ سے اِن باتوں کا ذکر کیا تو ذاکر شاہ نے بتایا' آپ کے گھر پر کچھ مخالف جنوں کا قبضہ ہوگیا ہے کیونکہ گھر میں پاکیزگی نہیں رہتی' دلہنیں بچوں کے بول بزار کا خیال نہیں رکھتیں' اس لیے یہ سب کچھ ہورہا ہے' اُن سے کہو گھر میں پاکیزگی رکھیں اور احتیاط کریں۔

تب وہ تمہیں نقصان نہیں پہنچائیں گے' ہمیشہ اس بات کا خیال رکھیں کہ برآمدے میں سوتے وقت راستہ چھوڑ کر سوئیں کیونکہ انہیں بھی نکلنے میں پریشانی ہوتی ہے' اور رفع حاجت کے لیے جاتے وقت دروازے پر تین دفعہ دستک دے کر اور سر ڈھانپ کے جائیں کیونکہ انسانوں کے علاوہ اور بھی مخلوق ان جگہوں پر ہوتی ہے' بے خیالی میں گندگی اُن پر بھی جاسکتی ہے۔

ان تمام تر احتیاط کے باوجود واقعات میں کمی نہیں ہوئی تو سدہ دادی نے ذاکر شاہ سے کہا۔

''بھئی اب میں کہاں تک دلہنوں کو منع کروں، تم ہی کوئی اقدام کرو۔''

ذاکر شاہ نے سدہ دادی سے کہا۔

''آپ کچھ دن کے لیے گھر خالی کردیں' تاکہ ہم اُن کا قبضہ ختم کرادیں۔'' تب سدہ دادی نے گھر کی تمام بہوؤں کو اُن کے میکے بھیج دیا اور باقی افراد کرائے پر گھر لے کر اس میں شفٹ ہوگئے تھے۔

جنوں کی یہ لڑائی تقریباً تین ماہ چلتی رہی' تین ماہ بعد حویلی آنے کی اجازت ملی' جب حویلی واپس آئے تو ہر طرف آسمانی اور سیندوری رنگ کی ٹوٹی ہوئی چوڑیاں بکھری ہوئی تھیں (سیندور جو ہندو سہاگن

عورتیں اپنی مانگ میں لگاتی ہیں) اور پوری حویلی کی دیواروں پر تقریباً تین تین فٹ اونچائی پر خون لگا ہوا تھا' ذاکر شاہ نے سدہ دادی سے کہا۔

''یہ دیواروں پر خون ان جنوں کا ہے جو اِس لڑائی میں مارے گئے ہیں' یہ بہت قیمتی خون ہے' آپ یہ خون جمع کر کے رکھ لیں' جسم کے کسی بھی حصے میں درد یا زخم وغیرہ ہو تو یہ خون تھوڑے سے پانی میں پتلا کر کے ہتھیلی پر لگا کے مریض کے درد والی جگہ پر لگا دیں' درد یا زخم فوراً ختم ہو جائے گا' اور یہ چوڑیاں بیوہ ہو جانے والی جنیوں کی ہیں' آپ اپنے خاندان میں وصیت کر دیں کہ نسل در نسل آپ کے خاندان کی عورتیں اِن دو کلر کی چوڑیاں نہ پہنیں' اور اب آپ گھر کی صفائی کر کے رہنا شروع کر دیں ہم نے اُن کا قبضہ ختم کرا دیا ہے۔''

اس وقت سے ہی ہمارے خاندان میں ان دونوں رنگ کی چوڑیاں نہیں پہنی جاتی ہیں' جب تمام عورتوں نے حویلی کی صفائی کی تو خون بہت مشکل سے صاف ہوا کیونکہ اتنے عرصے میں وہ سوکھ کر خشک ہو چکا تھا' جسے چھریوں سے کھرچ کھرچ کر بوتلوں میں بھرا اور اِس لڑائی میں اتنی جنیاں بیوہ ہوئی تھیں کہ جب ٹوٹی ہوئی چوڑیاں جمع کی گئیں' تو سات ٹوکرے بھر کے نکلے (ٹوکرے وہ جو پہلے زمانے میں مٹھائیوں کے لیے استعمال ہوتے تھے)

☆.....☆.....☆

جب سدہ دادی نے ذاکر شاہ سے لڑائی کی بابت پوچھا کہ آپ لوگوں کی لڑائی کیسے ہوئی اور کیا نقصان ہوا تو ذاکر شاہ نے بتایا۔

''یہ لڑائی مختلف جانوروں کے بھیس میں ہوئی یعنی کبھی ہاتھی کبھی اونٹ اور کبھی گھوڑے ایسے ہی جانور تھے اور نقصان اُن کا زیادہ ہوا۔''

اِس واقعے کی سب سے زیادہ درد ناک اور تکلیف دہ بات یہ تھی کہ جب بھورے جنوں نے حویلی خالی کی تو ذاکر شاہ کے ساتھ سدہ دادی بھی وہاں موجود تھیں۔

انہوں نے اُس وقت یہ منظر دیکھا کہ سدہ دادی کے کمرے سے سینکڑوں کی تعداد میں انسانی شکل کے لوگ نکلنا شروع ہوئے جو حویلی کے داخلی دروازے تک جاتے ہوئے نظر آتے اس کے بعد غائب ہو جاتے' سب سے آخر میں ایک بزرگ سر پر سفید امامہ باندھے ہاتھ میں چھڑی لیے اور دوسرے ہاتھ میں تسبیح' اُن کی داڑھی سینے تک تھی' وہ یہ کہتے ہوئے حویلی سے نکل گئے۔

''جس طرح تم نے ہمیں بے گھر کیا ہے تمہاری آئندہ آنے والی سات نسلیں بھی در بدر پھرتی رہیں گی' اور کبھی ایک ساتھ مل کر سکون سے نہیں رہ سکو گے۔''

جنوں کی یہ بد دعا ہمارے خاندان کو ایسی لگی کہ پورا خاندان برباد ہو گیا اور کبھی مل کر سکون سے نہ بیٹھ سکے۔

☆.....☆.....☆

اِس واقعے کے کچھ عرصے بعد سدہ دادی کا انتقال ہو گیا سدہ دادی کے انتقال میں ایسی خواتین بھی شریک تھیں جنہیں پہلے کبھی کسی نے نہیں دیکھا تھا' وہ بہت خوبصورت حسین اور بہت قد آور تھیں' جب سدہ دادی کا جنازہ گھر سے باہر نکل گیا تو وہ سب بھی ایک دم غائب ہو گئیں' حالانکہ اُن کے ہوتے ہوئے گھر میں پیر رکھنے کی جگہ نہیں تھی' سدہ دادی تو دنیا سے رخصت ہو گئیں مگر ذاکر شاہ نے سدہ دادی سے کیا ہوا وعدہ اُن کے انتقال کے بعد بھی نبھایا۔

یہ تقریباً 1930-3ء کا زمانہ تھا' مقبول دادا کی بڑی بیٹی نگار فاطمہ چھلہ نہانے کے بعد اپنے بیٹے فرید احمد کو لے کر میکے آئی ہوئی تھیں' صبح کا وقت تھا۔ مریم النساء (بچے کی نانی) فرید احمد کو گود میں لیے گھر کی چھت پر بیٹھی ہوئی تھیں' حویلی کے صحن میں پیپل کا بہت بڑا درخت تھا' جس کی شاخیں چھت پر بھی پھیلی ہوئی تھیں کہ اچانک وہاں بندر آ گئے' مریم دادی ایک دم چیخیں۔

''بندر آ گئے بندر آ گئے۔'' (ہندوستان میں آج بھی بہت سے علاقوں میں بندر آزادانہ چھتوں پر گھومتے رہتے ہیں اور لوگوں کی چیزوں کے ساتھ

ساتھ چھوٹے بچوں کو بھی اٹھا کر لے جاتے ہیں)
مریم دادی گھبراہٹ میں جیسے ہی فرید احمد کو لے کر پلنگ سے اُٹھیں تو اپنے ہی غرارے میں اُلجھ کر گر گئیں' اور گھٹنے پر سے اُن کے پیر کی ہڈی ٹوٹ گئی' سب لوگ جلدی سے مریم دادی کو نیچے لے کر آئے اور فوراً ہی اس حادثے کی اطلاع مقبول دادا کو آفس میں دی' مقبول دادا اُن دنوں ریلوے بریلی میں سپرنٹنڈنٹ تھے۔

وہ ڈاکٹر کو ساتھ لیتے ہوئے آئے ڈاکٹر نے مریم دادی کے پیر کی کچی بینڈیج کر دی تھی' اسی افراتفری میں شام ہوگئی' مگر کسی کا دھیان بچے کی طرف نہیں گیا' ابھی مریم دادی کی پکی بینڈیج کی باتیں ہو رہی تھیں کہ مریم دادی کا پیر پلنگ سے ایک فٹ آگے کی طرف نکلا اور کھٹ کی آواز کے ساتھ واپس آگیا' مریم دادی کی چیخ نکل گئی' دو تین دفعہ ایسا ہی ہوا' مقبول دادا نے آیتیں وغیرہ پڑھ کر پوچھا۔

''آپ کون ہیں' اور یہ سب کیا ہو رہا ہے؟'' تو مریم دادی مردانہ آواز میں بولیں۔

''ہم تو سدہ سے کیے ہوئے وعدے کی وجہ سے خیریت معلوم کرنے آئے تھے' مگر ہمارے اوپر ہنسا گیا اور ہمیں بندر بندر کہا گیا' اور بچے کی بھی کچھ خبر ہے' وہ صبح سے چھت کے ایک کونے میں رکھا ہوا ہے' بٹی اپنے میکے آئی ہوئی ہے وہ پرایا بچہ ہے اگر اسے کچھ ہو جاتا تو کیا جواب دیتے جاؤ اسے لے کر آؤ۔''

مقبول دادا جلدی سے اوپر گئے تو دیکھا جہاں گھر کا سامان رکھا ہوا تھا وہاں بچہ آرام سے لیٹا اپنا انگوٹھا چوس رہا ہے' پھر دادا نے اُن سے معافی مانگی کہ یہ سب نادانستہ ہوا ہے اس کے بعد مریم دادی بھی ٹھیک ہوگئیں مگر خاندانی حالات درست نہیں ہوئے وہ بد سے بدتر ہوتے گئے۔

☆.....☆.....☆

اکتوبر 1940ء رمضان المبارک کے الوداع جمعہ کے دن مقبول دادا رضائے الٰہی سے رحلت فرما گئے' اُن کے انتقال کے بعد پوری حویلی بٹوارہ ہو کر بک گئی اور جس کا جدھر منہ اٹھا چل نکلا' جو خاندان ضرب کی طرح مل جل کر رہتا تھا موت کی صورت میں تفریق ہوتا گیا اور ایسا تقسیم ہوا پھر نہ جمع ہو سکا' رہی سہی کسر تقسیم ہند نے پوری کر دی' پہلے 1947ء کے آخری ایام میں خاندان والوں نے مشرقی پاکستان ہجرت کی۔

ہمارے نانا بختیار عثمانی کی اسلامیہ کالج بریلی میں گورنمنٹ نوکری تھی جس کی وجہ سے وہ نہیں جا سکے۔ انہوں نے کہا۔

''پہلے تم لوگ جا کر سیٹ ہو جاؤ پھر میں نوکری چھوڑ کر آجاؤں گا۔'' وہاں سیٹ کیا ہوتے مزید برباد ہوگئے وہاں کی بربادی کی ایک الگ داستان ہے' مختصر یہ کہ مشرقی پاکستان میں دنیاج پور سے آگے گاگرا گاچی نام کا جنگل نما کوئی گاؤں تھا' کیونکہ گھر ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر بنے ہوئے تھے اور آبادی نہ ہونے کے برابر تھی' وہاں تین مہینے تک خیمے لگا کر قیام کیا' چھوٹے بچوں کا ساتھ تھا' چاروں طرف جنگلی جھاڑیاں اور آدم خور جانوروں کا خوف' غذائی قلت اور ماحولیاتی آلودگی کی وجہ سے پریشانیاں اور لاتعداد مصائب تھے' جس کی وجہ سے سارے خاندان والے مختلف بیماریوں میں مبتلا رہے۔

انہی حالات کے پیش نظر مریم دادی بیمار ہو کر انتقال کر گئیں' مریم دادی کے انتقال کے وقت ان کے دونوں بیٹے اور تمام اولادیں وہاں موجود تھیں' بس بختیار نانا اپنی نوکری کی وجہ سے بریلی میں تھے' مریم دادی کا انتقال شام کے وقت ہوا تھا دوسرے دن ظہر میں تدفین تھی۔

نانی بتاتی تھیں کہ مریم دادی کی میت تدفین کے لیے خیمے کے دروازے سے باہر نہیں نکل رہی تھی' ڈولا اٹھاتے دروازے سے نکالتے مگر دروازہ چھوٹا ہو جاتا' حالانکہ اسی دروازے سے خالی ڈولا با آسانی اندر آ گیا تھا' مگر میت جاتے وقت دروازے سے نہیں نکل رہا تھا۔ ایک طرف سے خیمے بانس ہٹاتے تو دوسری طرف سے بانس آگے کی طرف کھسک جاتا اور دروازہ چھوٹا ہو جاتا' پھر دوسری طرف سے بانس آگے کی طرف کھسکا کر دروازہ چوڑا کرتے تو چھت کا

بانس نیچے کی طرف کھسک جاتا اور دروازہ بند ہو جاتا' اِسی کشمکش میں رات ہوگئی اور میت نہ اٹھ پائی' اور پھر جب دوسرے دن بھی کافی جدوجہد کے بعد بھی میت خیمے سے نہ نکلی تو سب نے یہ تجویز دی کہ خیمے کو اکھاڑ کر میت باہر نکالی جائے' ابھی سب اس تجویز پر عمل کر ہی رہے تھے کہ اچانک بریلی سے ہمارے نانا بختیار وہاں پہنچ گئے تب انہیں پتہ چلا کہ ان کی ماں اب اس دنیا میں نہیں رہیں' جب نانا اپنی ماں کے ڈولے کو کندھا دے کر چلے تو ڈولا بغیر کسی مشکل کے خیمے سے نکل گیا۔

تب سب نے کہا کہ ماں کی میت بیٹے کے انتظار میں باہر نہیں نکل رہی تھی' بعد میں نانا نے بتایا کہ اچانک مجھے گھبراہٹ ہوئی تھی اور میرا دل کسی چیز میں نہیں لگ رہا تھا میں نے سوچا تم لوگوں کی خیریت لے کر آؤں اور جب یہاں آیا تو یہ حادثہ ہو چکا تھا۔

مریم دادی کو مشرقی پاکستان میں دفن کر کے نانا سب لوگوں کو لے کر واپس بریلی آ گئے۔

پریشانی اور سفر کی صعوبتوں کے پیش نظر خاندان والوں نے بس کچھ بہت ضروری سامان ساتھ لیا اور باقی سامان وہاں پر کسی حکیم صاحب کے گھر رکھوا دیا تھا اس سامان میں خاندان کے شاہی فرمان' جنوں کے قیمتی خون کی شیشیاں' خاندانی علم کی کتابیں' اور بہت سی قیمتی چیزیں بھی شامل تھیں' اس کے بعد ہمارے دادا ہجرت کر کے مغربی پاکستان آ گئے' پاکستان آ کر دادا کو سرکاری نوکری مل گئی۔

ان حکیم صاحب کے خطوط 1965ء تک ہمارے دادا کے پاس سامان کے سلسلے میں آتے رہے کہ ''اب میرے بچے بڑے ہو رہے ہیں مجھے کمروں کی ضرورت ہے یا تو آپ سامان لے جائیں یا پھر مجھے استعمال کرنے کی اجازت دے دیں۔'' دادا نے آخری خط میں لکھ دیا۔

''میں اپنی نوکری کی وجہ سے آنے سے قاصر ہوں آپ کو اجازت ہے کہ آپ وہ سامان استعمال کر لیں۔'' اس طرح مشرقی پاکستان میں تین ماہ کے مختصر سے عرصے میں مال و زر کے ساتھ ساتھ ایک

غزل

وقت مہلت عطا کرے کب تک
اپنی قسمت سے بھاگیے کب تک

گرتے پیروں کی زد میں ہیں ہم لوگ
کیا خبر راستہ کھلے کب تک

میں نہ ہوتا تو کیا خبر ہوتی
رات جلتے رہے دیے کب تک

سارا منظر نظر کے سامنے ہے
نظر آتا ہے دیکھیے کب تک

عاشقی شعبدہ گری ہی سہی
کوئی اس تار پر چلے کب تک

عرصۂ زندگی شمار نہ کر
صرف یہ دیکھ ہم جیے کب تک

تم تو باز آ گئے ستم سے مگر
زخم کا کیا پتا بھرے کب تک

اظہر فراغ

انسانی جان بھی گنوا آئے پھر چند سال بعد نانا بریلی سے مشرقی پاکستان مریم وادی کی قبر پر فاتحہ پڑھنے گئے' وہ علاقہ اس وقت تک ویران پڑا تھا جب نانا اس جگہ پہنچے تو نانا نے دیکھا کہ مریم وادی کی قبر کے پاس ایک سیر بیٹھا ہوا ہے تب نانا دور سے ہی فاتحہ پڑھ کر آ گئے' حکیم صاحب سے بھی ملنے کا موقع نہیں ملا اس کے بعد نانا نانی بھی 1970ء میں پاکستان آ گئے اور پھر کبھی مشرقی پاکستان جانے کا موقع نہیں ملا۔

☆.....☆.....☆

دادا بتاتے تھے سب سے زیادہ دکھ اُن کتابوں کا تھا جو انمول تھیں اور سامان میں ضائع ہو گئیں' کتابیں کیا ضائع ہوئیں خاندان سے دینی علم ہی جاتا رہا ورنہ جو خاندان اپنے علم کی وجہ سے باعزت سمجھا جاتا تھا آج دینی علم سے بے بہرہ ہے۔

انقلاب اِسی کو کہتے ہیں ورنہ اسی خاندان عثمانی نے ہندوستان میں علم کی بنیاد رکھی' بڑے بڑے عالم فاضل اسی خاندان میں پیدا ہوئے جس کا تذکرہ سید نجم الحسن مونگیری نے اپنی کتاب 'اشرفِ عرب' میں کیا ہے۔

آج سے تقریباً (300) تین سو سال قبل جودھپور کے قصبے ڈیڈوانہ میں شیوخ عثمانی کی آمد ہوئی' وہاں سے قضا (قاضی انعقان) کے سلسلے میں جے پور اور دہلی بریلی میں پھیل گئے جس کے کچھ بچے کھچے شاہی فرمان آج بھی خاندان میں موجود ہیں۔

☆.....☆.....☆

آج بھی ہمارے خاندان کی یہ حالت ہے کہ جب ان بھورے جنوں کی بددعاؤں کا زور چلتا ہے تو خاندان طرح طرح کی پریشانیوں میں گھر جاتا ہے اور جب ذاکر شاہ کی طاقت کا زور چلتا ہے تو کچھ عرصے کے لیے خاندان میں خوشحالی آ جاتی ہے' لیکن خوشحالی کا پریڈم ہی ہوتا ہے اور کیونکہ ذاکر شاہ نے سدہ دادی سے وعدہ کیا تھا۔

''آپ کی نسل جہاں تک جائے گی ہم اُن کی دیکھ بھال کریں گے اگر وہ بھی ہمیں یاد رکھیں گے تو۔''

آج بھی ہمارے یہاں اُن کے نام کی نیاز دلائی جاتی ہے' اور والدین اُن کے نام کا چراغ جلاتے ہیں۔

قارئین اکرام ہمارے خاندان کے یہ حالات صرف جنوں کی بددعا کی وجہ سے ہوئے' اس سے پہلے تو سب سکھ اور چین کی زندگی بسر کر رہے تھے اگر ہمارے خاندان کی بزرگ خواتین کچھ وقت کی پریشانی اٹھا کر پاکیزگی کا خیال رکھ لیتیں' اور بے وجہ انہیں تنگ نہ کیا جاتا کیوں کہ وہ کسی کو نقصان تو نہیں پہنچا رہے تھے تو شاید زندگی بھر کے لیے ہمارا خاندان اِن پریشانیوں سے بچ جاتا۔

جس طرح بھورے جن تین ماہ میں دربدر ہوئے اسی طرح مشرقی پاکستان جا کر تین ماہ میں ہمارا خاندان برباد ہو گیا مگر قسمت کا لکھا آج تک کون ٹال سکا ہے' ویسے بھی اپنی غلطیوں کو قسمت کے زمرے میں ڈال دینا بنی آدم کے لیے نہایت آسان ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت اسی لیے دی ہے کہ وہ اپنی عقل کا استعمال کر کے نقصان سے بچ سکے' اور کاش کا لفظ ہماری زندگی میں اُس وقت آتا ہے جب ہم غلطی کر چکے ہوتے ہیں بھورے جنوں کا تو صرف اُسی وقت نقصان زیادہ ہوا تھا مگر ہمارے خاندان کے لیے تو زندگی بھر کا نقصان بن گیا اب تک ہمارے خاندان کی پانچ پشتیں اُن بدعاؤں کی نظر ہو چکی ہیں' باقی دو کے حالات کا کچھ علم نہیں ہے۔

☆.....☆.....☆

اس کہانی کی ایک پُراسرار بات یا معمہ یہ ہے کہ ذاکر شاہ نے انہیں بھورے جن بتایا تھا اور بھورے جن کافر ہوتے ہیں جب کہ حویلی خالی کرتے وقت جو آخری بزرگ نکلے تھے اُن کے سر پر سفید امامہ اور ہاتھ میں تسبیح انہیں مسلمان ظاہر کرتی ہے لیکن حویلی سے ملنے والی سیندوری رنگ کی چوڑیاں ان جنوں کے کافر ہونے کا پتہ دیتی ہیں' کیونکہ سیندوری رنگ گہرا اورنج رنگ ہوتا ہے جو ہندوؤں کا مقدس رنگ ہے' اور وہ رنگ ہندوستان میں مسلمان عورتیں بھی استعمال کرتی ہیں اب وہ جن مسلمان تھے یا کافر واللہ علم.....!

☆☆.....☆☆

نادیدہ مہربان

انجم اعظمی کا شعر

باتیں جو اَن کہی تھیں بین السطور لکھ دیں
قصے بیاں ہوئے سب بے نام چاہتوں کے

سیمیں غزالہ نہاں

میرے شوہر کو والدین کے انتقال کے بعد وراثت میں کچھ زرعی زمینیں ملی تھیں..... اس لیے ڈاکٹر ہونے کے باوجود انہوں نے اس گاؤں میں رہائش اختیار کی جہاں پر زمینیں تھیں، وہیں وہ کلینک

بھی کرنے لگے..... اس طرح زمینوں کی دیکھ بھال کے ساتھ علاج معالجہ بھی چلنے لگا۔ زمینوں سے کیونکہ ٹھیک ٹھاک آمدنی ہو رہی تھی' اس لیے وہ غریبوں کا علاج مفت کرتے تھے۔ وہ صرف وڈیروں اور زمینداروں سے پیسے لیتے تھے۔ سو اللہ نے اُن پر اپنا خصوصی کرم کیا اور تھوڑے ہی دنوں میں اُن کے علاج کی دھوم مچ گئی۔ اُن کے ہاتھ میں اللہ نے شفا رکھی تھی' اس لیے ان کو دست شفا کا خطاب بھی ملا ہوا تھا۔

میرے شوہر کی رہائش اندرون سندھ کے ایک پسماندہ سے گاؤں میں تھی۔ والدین داغ مفارقت دے چکے تھے' سب بہن بھائیوں کی شادی ہو چکی تھی۔ یہ سب سے چھوٹے تھے اور گھر میں اکیلے رہتے تھے' بہن بھائی سب شہروں میں آباد تھے۔

سن 1960ء کی دہائی تھی جب میری اُن سے شادی ہوئی' میں کراچی سے شادی ہو کے اُس چھوٹے سے گاؤں میں گئی تھی جہاں بجلی کی سہولت بھی نہیں تھی۔ شروع میں تو بہت پریشانی ہوئی' مگر پھر عادی ہو گئی۔ ویسے میں یہاں زمیندارانہ ٹھاٹ سے رہ رہی تھی۔

جب ہمارے بچے ہوئے اور اُن کی پڑھائی کا وقت آیا تو ہم قریبی شہر میں منتقل ہو گئے۔ شہر میں میرے شوہر کو ایک بہت پرانا مکان سستے داموں مل گیا تھا' جس کی مرمت اور رنگ و روغن کروا کے اپنی ضرورت کے مطابق رہنے کے قابل کر لیا گیا۔ یہ گھر گاؤں کی حویلی کی طرح بڑا تو نہیں تھا مگر پھر بھی بہت کشادہ اور دو منزلہ بنا ہوا تھا۔

گاؤں سے کھانا پکانے اور بچوں کو سنبھالنے کے لیے ماسی صغراں اور باہر کے کام کاج کے لیے ایک چھوٹا لڑکا علی گوہر ہمارے ساتھ آیا تھا۔ ہم نے نوکروں کو رہائش اوپر کے کمروں میں دی تھی۔ میری اصل کہانی اس گھر سے شروع ہوتی ہے۔

ایک دن ماسی صغراں کی اوپر والی منزل سے زور زور سے چیخنے کی آواز آئی تھی۔

''بی بی دروازہ کھولو..... علی گوہر نے باہر سے دروازہ بند کر دیا ہے۔''

علی گوہر سے ماسی کی نہیں بنتی تھی' وہ اُسے اکثر اپنی شرارتوں کا نشانہ بنائے رکھتا تھا۔ اس وقت وہ باہر سودا لینے گیا ہوا تھا۔ اس لیے ماسی کے پکارنے پر میں ہی جلدی سے اوپر گئی۔ مگر دروازے پر تو باہر سے کوئی کنڈی نہیں لگی تھی۔ میں سمجھی دروازہ تیز ہوا کے باعث بند ہونے سے جام ہو گیا ہوگا۔

میں نے بہت زور لگایا مگر دروازہ کھل کے ہی نہیں دے رہا تھا۔ اتنے میں علی گوہر بھی آ گیا۔ اُس نے سمجھا کہ ماسی نے اندر سے کنڈی لگا لی ہے۔ مگر وہ کھلی تھی۔

''دروازہ باہر سے بند ہے اندر سے نہیں۔'' مجھے کچھ خطرے کا احساس ہوا تو میں نے فوراً آیۃ الکرسی کا ورد شروع کر دیا اس کے بعد جیسے ہی علی گوہر نے دروازے کو ہاتھ لگایا۔ وہ آسانی سے کھل گیا۔ میں نے ماسی کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا کہ وہ ڈر نہ جائے' وہ اُسے علی گوہر کی شرارت ہی سمجھ رہی تھی۔

جب میں اُس گھر میں شفٹ ہوئی تھی تو مجھے گھر کی فضا عجیب بھاری سی محسوس ہوئی تھی' لیکن میں کچھ سمجھ نہیں سکی تھی' چونکہ میں صوم صلوٰۃ کی بچپن سے ہی پابند تھی اور روزانہ چاروں قل' آیۃ الکرسی اور منزل پڑھ کر گھر پر دم کرتی رہی تھی۔ اس لیے مجھے ڈر تو محسوس نہیں ہوتا تھا' مگر کچھ انجانا سا احساس ہوتا جیسے کوئی اور بھی یہاں پر موجود ہے۔

دوسری بار جو واقعہ پیش آیا اس سے مجھے یقین ہو گیا کہ یقیناً کوئی اور مخلوق بھی یہاں رہائش پذیر ہے۔ اُس دن ماسی صغراں کچھ سامان نکالنے اسٹور میں گئی تھی۔ جیسے ہی اس نے کوٹھری کا دروازہ کھولا چیختی چلاتی بھاگتی ہوئی آ گئی۔

''بی بی! اسٹور میں ایک بہت بڑی بلا بیٹھی ہے۔'' وہ ڈر کے مارے کانپتی ہوئی بول رہی تھی۔

''کیا ہے ماسی..... چلو میرے ساتھ۔'' میں دیکھنے کے لیے اٹھی۔

''نہیں بی بی آپ نہیں جائیں..... وہ بہت بڑا ہے۔'' ماسی مجھے بھی روک رہی تھی۔

''ارے ڈرو نہیں.....'' میں یہ کہہ کر آگے بڑھی اور جیسے ہی میں نے اسٹور کا دروازہ کھولا تو دہشت

سے بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔ میں تو عورت تھی اگر کوئی مرد بھی ہوتا تو حواس کھو بیٹھتا۔

ایک بہت بڑا سیاہ رنگ کا سانپ کنڈلی مارے بیٹھا تھا' وہ اتنا بڑا تھا کہ پوری کوٹھری کو گھیرے میں لیے ہوئے تھا۔

میں نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا اور آیۃ الکرسی پڑھنے لگی' پھر میں نے بزرگوں سے سنی ہوئی بات کو آزمانا چاہا اور زیر لب یوں گویا ہوئی۔

''آپ جو کوئی بھی ہیں..... آپ کو حضرت سلیمان علیہ السلام کا واسطہ یہاں سے چلے جائیں' ورنہ آپ کے نقصان کی میں ذمہ دار نہیں ہوں گی۔''

یہ کہہ کر میں نے کوٹھری کا دروازہ کھول کر جھانکا' جبکہ ماسی حواس باختہ ہو کر مجھے روک رہی تھی۔ مگر اب تو وہاں پر کچھ بھی نہیں تھا۔

میں نے دروازہ پورا کھول دیا اور ماسی سے کہا۔

''دیکھو یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔'' پھر میں نے اُس کا ڈر ختم کرنے کے لیے کہا۔

''شاید روشن دان سے کسی چیز کا سایہ آ رہا ہوگا۔ یہ دیکھو روشن دان میں رسی لٹک رہی ہے۔''

ماسی نے ڈرتے ڈرتے اندر جھانکا اور بولی۔

''سایہ اتنا بڑا تھوڑی ہوتا ہے وہ تو سچ مچ کا ناگ تھا پھن اٹھائے ہوئے..... میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس کی لال لال زبان بھی نکل رہی تھی' وہ اندر کہیں چھپا ہوگا۔''

دیکھا تو میں نے بھی یہ تھا..... ماسی سچ کہہ رہی تھی مگر اس کو یہ کیسے بتاتی کہ وہ جو کوئی بھی تھا حضرت سلیمان علیہ السلام کا واسطہ دینے سے ہٹ گیا ہے۔ اور اس کی رہائش یہیں کہیں پر ہے..... وہ بھی میری بات کا یقین نہیں کرتی۔

میں نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔

''اچھا شام کو جب ڈاکٹر صاحب آئیں گے تو وہ کسی کو بلا کر اچھی طرح چیک کر لیں گے کہ کوئی بل یا سوراخ تو کوٹھری میں نہیں ہے۔''

دوسرے دن ڈاکٹر صاحب نے کوٹھری خالی کروا کے اچھی طرح دیکھ لیا مگر وہاں پر کوئی سوراخ تھا نہ کوئی بل..... پھر بھی انہوں نے دیواروں اور فرش کو دوبارہ کھرچ کر پلاستر کروا دیا تھا۔

ماسی اب بھی اس کوٹھری یعنی اسٹور میں جانے کو تیار نہیں تھی' اس لیے ہم نے کچن کے ساتھ جو خالی جگہ تھی' وہاں پر اسٹور بنوا دیا تو اسے اطمینان ہوا۔

اب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اس گھر میں کوئی اُوپری چیز ضرور ہے۔ جو اپنی موجودگی کا یقین دلا کر ہمیں گھر چھوڑ کر جانے پر مجبور کر رہی ہے۔ میں نے ایک دن ڈاکٹر صاحب سے اِس موضوع پر بات کی اور بتایا کہ کچھ غیر معمولی واقعات ہو رہے ہیں۔ اِس کا مطلب ہے یہاں پر کچھ ہے' کہیں ہم لوگوں کو کوئی نقصان نہ پہنچے بہتر ہے کہ آپ دوسرا گھر دیکھ لیں۔''

انہوں نے مجھے جو جواب دیا تھا اُس کے بعد میں نے اپنی زبان بند کر لی تھی' مجھے معلوم تھا وہ میری بات پر کبھی یقین نہیں کریں گے۔

''تم پڑھی لکھی ہو کر جاہلوں والی بات کر رہی ہو' اس سے پہلے بھی تو اس گھر میں لوگ رہتے تھے۔ وہ بھی میرے دوست تھے انہوں نے کبھی ایسی شکایت نہیں کی۔ یہ انسان کی نظر کا دھوکہ ہوتا ہے جو معمولی چیز بھی انوکھی اور غیر مرئی نظر آنے لگتی ہے۔ ڈر اور خوف کی حالت میں انسان جو سوچتا ہے وہی نظر آنے لگتا ہے۔ میں ڈاکٹر ہوں اور میں نے نفسیات بھی پڑھی ہے۔ میڈیکل کی تعلیم میں انسانی نفسیات بھی پڑھائی جاتی ہے۔''

اتنا طویل لیکچر سن کے مجھے خاموش ہونا ہی پڑا' لیکن چند دنوں بعد میرا پھر ایک ایسے ہی واقعہ سے واسطہ پڑا تھا۔

اُن دنوں تفریح کا کوئی اور ذریعہ تو تھا نہیں' سوائے اس کے وڈیرے اور زمیندار یا تو شکار کھیلنے جاتے تھے یا سنیما ہال جا کر فلم دیکھتے' ڈاکٹر صاحب یعنی میرے شوہر بھی فلموں کے شوقین تھے۔ اور ہر نئی فلم دوستوں کے ساتھ جا کر ضرور دیکھتے تھے۔

اُن دنوں ماسی چھٹی لے کر اپنی بیٹی کے گھر گئی ہوئی تھی۔ علی گوہر کی بھی طبیعت خراب ہوگئی تو وہ بھی گاؤں چلا گیا۔ میں بچوں کے ساتھ گھر میں اکیلی تھی۔

اُس روز میرے شوہر کا فلم دیکھنے کا پروگرام بن گیا۔ ان کی کلینک ابھی تک گاؤں میں تھی۔ وہ صبح جاتے تو شام کو واپسی ہوتی' اس لیے آخری شو یعنی نو سے بارہ والی ٹکٹیں خریدیں۔ اُن کا پروگرام آخری شو دیکھ کر آرام سے سونے کا ارادہ تھا' کیونکہ دوسرے دن اتوار تھا۔ اُن دنوں راتوں کو دیر تک جاگنے کا رواج نہیں تھا۔ لوگ جلدی سوتے اور جلدی اٹھتے تھے' اس لیے سرِشام ہی ہو کا عالم ہو جاتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کا یہ پروگرام تھا کہ وہ گیٹ کو باہر سے تالا لگا کر چلے جائیں گے' تاکہ مجھے اٹھ کر دروازہ کھولنا نہ پڑے اور میری نیند خراب ہو' مجھے بھی اُن کی تجویز پسند آئی اور بچوں کو کھانا وغیرہ کھلانے کے بعد اُن کو سلا کر خود بھی سو گئی تھی۔

معلوم نہیں اُس وقت کیا ٹائم ہوا تھا کہ ایک انجانے سے شور کی وجہ سے گہری نیند سے میری آنکھ کھل گئی تھی' میں نے غور کیا تو بیٹھک والے کمرے سے بھنبھناہٹ جیسی آواز آ رہی تھی' جیسے کوئی سرگوشیوں میں باتیں کر رہا ہو' اُس کے ساتھ چائے کی پیالی رکھنے اور اٹھانے کی آواز بھی آ رہی تھی' چھت کا پنکھا بھی چلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اِس کا مطلب تھا میرے شوہر فلم دیکھ کر واپس آ گئے تھے اور خود ہی چائے بنا کر دوستوں کو پلا رہے تھے' مجھے اس لیے نہیں اٹھایا ہوگا کہ میری نیند نہ خراب ہو میں مطمئن ہو گئی' مگر کچھ دیر بعد مجھے سخت پیاس محسوس ہوئی تو مجھے پانی پینے کے لیے اٹھنا پڑا' میں نے یونہی بیٹھک کی کھڑکیوں سے جھانکا تو مجھے حیرت کا زبردست جھٹکا لگا' کیونکہ کمرے میں اندھیرا ہو رہا تھا' اور وہاں کوئی بھی نہیں تھا' جبکہ وہ سب آوازیں میں نے صاف طور پر سنی تھیں۔ میں حیرت زدہ کھڑی تھی کہ گھر کا مرکزی دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور میرے شوہر آتے ہوئے نظر آئے۔

''تم ابھی تک سوئیں نہیں.....'' مجھے وہاں کھڑا دیکھ کر انہوں نے پوچھا۔

''میں سو ہی رہی تھی..... پانی پینے کے لیے ابھی اٹھی ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

میں سمجھی شاید وہ اپنے دوستوں کو دروازے سے باہر تک چھوڑنے گئے ہوں گے' اس لیے میں نے پوچھا۔

''آپ کب آئے؟ کیا تھوڑی دیر پہلے بھی آئے تھے؟''

''نہیں تو..... مگر تم کیوں پوچھ رہی ہو.....'' ڈاکٹر صاحب نے کچھ حیرت سے پوچھا تھا۔

''اس لیے کہ مجھے بیٹھک سے باتوں کی آواز آ رہی تھی۔ اور ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے آپ اپنے دوستوں کے ساتھ چائے پی رہے ہوں۔''

''ارے نہیں بھئی..... چائے تو میں باہر سے ہی پی کر آیا ہوں۔ تم نے خواب دیکھا ہوگا۔''

مجھے معلوم تھا میں کچھ بھی کر لوں' میرے شوہر کبھی نہیں مانیں گے کہ میں نے بقائم ہوش وحواس..... خود اپنے کانوں سے وہ آوازیں سنی تھیں اس لیے میں خاموش ہو گئی تھی اور ساتھ ہی میں نے یہ بھی سوچ لیا تھا کہ اِس صورت حال کا مجھے اکیلے ہی مقابلہ کرنا ہے۔

☆.....☆.....☆

اُس دن میں اوپر کے پورشن میں کسی کام سے گئی تھی۔ ماسی صغراں بھی اوپر ہی تھی وہ مجھ سے باتیں کرنے لگی' عصر کا وقت ہوا چاہتا تھا۔ اُس نے کہا۔

''بی بی! آپ نماز پڑھ لیں تو میں چائے بناتی ہوں۔'' وہ یہ کہہ کر نیچے چلی گئی تھی میں ابھی اٹھنے کا ارادہ ہی کر رہی تھی کہ وہ پلنگ جس پر میں بیٹھی ہوئی تھی' اچانک تیزی سے اوپر اٹھنا شروع ہو گیا تھوڑی دیر تک تو میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا' پھر یکدم مجھے خطرے کا احساس ہوا' کیونکہ پلنگ اب برابر والے کمرے کی چھت کے قریب اوپر تک چلا گیا تھا۔ میرے یہاں اُن دنوں چوتھے بچے کی آمد آمد تھی۔ مجھے یہ خوف محسوس ہوا کہ اگر پلنگ تیزی سے نیچے گرتا ہے تو مجھے اور میرے ہونے والے بچے کو یقیناً نقصان پہنچے گا۔ تو میں نے جلدی جلدی قرآنی آیتوں کا ورد شروع کر دیا تھا' سورۃ فلق اور سورۃ ناس پڑھتے ہی پلنگ بہت آہستہ اور آرام سے فرش پر آ لگا تھا۔ اور اُس کے نیچے

سے بلاشبہ شیر کی جسامت کا کالا بلا نکل کر میری آنکھوں کے سامنے دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہوگیا تھا۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ اب مقابلہ واقعی شروع ہوگیا ہے' اس گھر میں کوئی ایسی پُراسرار مخلوق بھی ہے' جو مختلف بھیس میں میرے سامنے آکر مجھے ڈرا رہی ہے' اُن کا مقصد شاید مجھے یہاں سے نکالنا تھا' لیکن ابھی تک کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔

میں نہ کوئی عالم فاضل تھی نہ عامل کامل' مگر میں اللہ کی ایک ادنیٰ بندی' اتنا ضرور جانتی تھی کہ ان چیزوں سے جو ڈرتے ہیں انہی کو وہ ڈراتے ہیں میں نڈر واقع ہوئی تھی۔ پھر مجھے اللہ اور اُس کے کلام پر پورا یقین تھا' اس لیے مجھے غیبی مدد مل رہی تھی اور مجھے اور گھر کے دوسرے افراد کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا اور دوسری بات جو میری سمجھ میں آرہی تھی وہ یہ کہ وہ مخلوق جو کوئی بھی تھی' مجھے نقصان پہنچانا نہیں چاہتی تھی' شاید وہ نیک روحیں تھیں یا نیک جنات' بہرحال اچھے اور برے تو سب میں ہوتے ہیں۔

☆.....☆.....☆

اِس دفعہ بھی میرے یہاں بیٹا ہوا تھا' اور میں تین بیٹوں اور ایک بیٹی کی ماں بن گئی تھی۔ اُس روز میں منے کو گود میں سلا رہی تھی کہ میرے بڑے بیٹے کامل نے سامنے والے میدان میں کرکٹ کھیلنے کی اجازت مانگی تھی۔ اُس کے دوست اُسے بلانے آئے تھے۔ میں نے اُس کو اِس شرط پر اجازت دی تھی کہ مغرب سے پہلے آجانا..... اور وہ خوشی خوشی اپنا بیٹ اٹھا کر چلا گیا تھا۔ اُس بات کو ابھی پانچ دس منٹ ہی ہوئے تھے کہ منا سو گیا تھا' میں اُس کو جھولے میں لٹا کر اٹھی تھی کہ ماسی کے پاس جاکر رات کے کھانے کی تیاری کروں' اتنے میں مجھے سامنے سے میرا بیٹا کامل آتا ہوا نظر آیا۔

''ارے تم اتنی جلدی آگئے..... میچ ختم ہوگیا کیا؟'' مگر اُس نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا تھا اور اندر کمرے کی طرف تیزی سے قدم بڑھا دیے تھے۔

تو میں نے اُسے پھر آواز دی۔

''کامل.....!'' میری آواز پر ماسی بھی اٹھ کر آگئی اور بولی۔

''بی بی..... کامل تو میچ کھیلنے گیا ہوا ہے۔''

''مگر ابھی ابھی تو وہ آکر اندر گیا ہے؟''

''نہیں بی بی..... دروازہ تو میں نے ہی بند کیا تھا' وہ ابھی واپس نہیں آیا ہے۔''

''اچھا.....'' کہہ کر میں خاموش ہوگئی تھی۔ مگر میں نے خود اپنی آنکھوں سے کامل کو دیکھا تھا۔ میری آنکھیں دھوکہ نہیں کھا سکتیں' میں اپنی تسلی کے لیے اندر کمرے میں گئی تھی وہاں کوئی نہیں تھا۔

اب میرا شک یقین میں بدل گیا تھا کہ کوئی اور بھی اس گھر میں رہائش پذیر ہے' اُس نے مجھے اپنی موجودگی کا یقین دلا دیا تھا۔ اب مجھے تو غیر معمولی واقعات اور پُراسرار مخلوق سے کوئی خوف تو محسوس نہیں ہو رہا تھا' بس ڈر تھا تو صرف یہ کہ اِن حالات سے خوفزدہ ہوکر کہیں کام والی نہ چلی جائے۔ چھوٹے بچے کے ساتھ گھر کے کاموں میں مجھے بڑی مشکل ہوجاتی' مگر شاید وہ مخلوق بھی مجھے سمجھ گئی تھی کہ میں بھی اُس کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کروں گی' اس لیے ماسی کے ساتھ شروع میں دو واقعات' جب اس کے کمرے کا دروازہ بند ہوگیا تھا اور اسٹور روم میں سانپ نظر آیا تھا اس کے بعد پھر کچھ نہیں ہوا تھا۔

اگر میں اُن واقعات اور حالات سے ڈر کر اپنے شوہر کو مجبور کرتی کہ وہ کسی عامل یا بزرگ کو بلا کر گھر کو دکھائیں' اور وہ ان کو بھگانے کی کوشش کرتے تو شاید مجھ سے اُن کی دشمنی پیدا ہوجاتی' مجھے ایک اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ قوم اجنہ میں سے تھے اور اچھے تھے' اور پھر ایک دن یہ بات کھل کر میرے سامنے بھی آگئی تھی۔ ماسی اور علی گوہر چھٹی لے کر گاؤں گئے ہوئے تھے۔

اُس دن میں اکیلی تھی' بچے اسکول گئے ہوئے تھے' جمعہ کا دن تھا۔ جمعہ کے دن میرے شوہر بھی نماز سے پہلے کلینک سے آجاتے تھے۔ بچوں کی بھی جلدی چھٹی ہوتی تھی۔ میں نے جلدی جلدی دوپہر کے کھانے کی تیاری کرلی تھی' اس لیے سوچا کہ پہلے منے کے کپڑے دھولوں پھر ٹائم نہیں ملے گا کیونکہ جمعہ کی نماز کی تیاری کے لیے بچوں اور شوہر کو غسل کرنا ہوگا'

اس وقت اٹیچ باتھ نہیں ہوتے تھے۔ سب کے لیے گھر میں ایک ہی مشترکہ غسل خانہ ہوتا تھا' بڑا گھر ہوتا تو دو بھی ہوتے تھے ہمارا گھر بڑا تو تھا مگر غسل خانہ ایک ہی تھا' ہاں اوپر کے پورشن میں الگ بنا ہوا تھا' جو کام والی کے استعمال میں تھا۔

میں جلدی جلدی کپڑے دھو رہی تھی کہ اچانک پتہ نہیں کدھر سے ایک لمبے قد کی خوبصورت عورت میرے سامنے آ کر کھڑی ہوگئی تھی۔ میں حیران ہوگئی تھی کہ یہ عورت کون ہے۔ ابھی میں نے اس سے پوچھنا چاہا ہی تھا کہ وہ کون ہے اس نے سلام کر کے کہنا شروع کیا تھا۔

''آج جمعہ کا دن ہے اور تم اتنی دیر سے غسل خانے میں کپڑے دھو رہی ہو' مجھے بھی کپڑے دھونے ہیں' میرے بچوں کو بھی نماز پڑھنے جانا ہے' اُن کو بھی نہلانا ہے' تم غسل خانہ خالی کرو تو میں بھی اپنا کام کروں..... میرا بھی اِس گھر پر اتنا ہی حق ہے جتنا تمہارا' ہم برسوں سے یہاں رہ رہے ہیں۔''

اُس کی بات سن کر میں بغیر خوفزدہ ہوئے بولی تھی۔

''آجاؤ بہن تم اپنا کام کرلو میں بعد میں کرلوں گی۔'' یہ کہہ کر میں کپڑے اٹھا کر کھڑی ہوگئی تھی۔

مجھے حیرت ہوئی کہ اُس کے پیچھے میرے بچوں کی عمر کے برابر چار بچے کھڑے تھے تین لڑکے اور ایک لڑکی اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ان بچوں کی شکلیں حیرت انگیز طور پر میرے بچوں سے مل رہی تھیں۔

میرے اٹھتے ہی وہ غسل خانہ کے اندر مسکراتی ہوئی یہ کہہ کر چلی گئی۔

''تم نے مجھے بہن کہا ہے تو انشاء اللہ میں بھی یہ رشتہ نبھاؤں گی۔'' پھر کچھ دیر تک مجھے غسل خانے کے اندر سے کپڑے دھونے اور پانی گرنے کی آواز آتی رہی مگر نظر کچھ نہیں آرہا تھا۔

مجھے بہت خوشی ہوئی تھی کہ وہ مسلمان اجنبہ میں سے تھی اور شر انگیز نہیں' بلکہ نیک پُرخلوص اور مہربان نظر آئی تھی' وہ میرے گھر میں شراکت دار تھی اور میں نے بھی اس کو قبول کرلیا تھا۔

جب ڈاکٹر صاحب اور بچے جمعہ کی نماز کے لیے مسجد چلے گئے تو میں نے دیکھا کہ میرے بیٹوں جیسے دو بچے سفید کپڑے اور سر پر ٹوپی پہنے ہوئے ایک آدمی کے ساتھ آنگن کے دروازے سے باہر جارہے ہیں۔ یقیناً وہ بھی نماز کے لیے جارہے تھے اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اُس آدمی کی شکل اور قد میرے شوہر سے بہت مل رہا تھا۔ وہ میری آنکھوں کے سامنے بند دروازے سے ہی باہر نکل گئے تھے۔

میں نے اب تک اپنی زندگی میں جتنے بھی آسیب' جنات اور اثرات کے قصے سنے تھے' وہ بہت خوفناک اور نقصان پہنچانے والے تھے' لیکن میرا وسطہ نہایت نیک اور بے ضرر جنات فیملی سے پڑا تھا۔ اس لیے میں بے فکر ہوگئی تھی' اُن کی رہائش پہلی منزل پر بنے ہوئے کونے کے کمرے میں تھی۔ کیونکہ میں نے اُسی طرف سے اُن کو آتے جاتے دیکھا تھا۔ یہاں سب سے اہم بات یہ تھی کہ وہ سوائے میرے' گھر کے کسی اور فرد کو نظر نہیں آتے تھے۔ اُسی طرف سے اکثر مجھے کھانا پکانے کی خوشبو اور برتن وغیرہ دھونے کی آوازیں بھی محسوس ہوتی تھی' کبھی کبھی ماسی بھی کہتی۔

''بی بی' برابر والوں کے یہاں پتہ نہیں کیا پک رہا ہے خوشبو بڑی اچھی آرہی ہے۔''

میرے بڑے بیٹے کامل نے بورڈ کے امتحان میں اول پوزیشن حاصل کی تو' میں نے اپنے محلے پڑوسی اور دوستوں میں مٹھائی بانٹی' پھر مجھے خیال آیا کہ اپنی نادیدہ دوست جس کو میں نے بہن کہا تھا' اُس کو بھی اپنی خوشی میں شامل کروں' اُن کو بھی مٹھائی کھلاؤں۔

میں نے اپنے بڑوں سے سنا تھا کہ جنات اخروٹ کی مٹھائی کھاتے ہیں تو میں نے اپنے شہر کی سب سے بڑی اور بہترین مٹھائی کی دکان سے اخروٹ کی مٹھائی منگوائی اور ڈبہ لے جا کر اس کمرے کے دروازے کے سامنے رکھ دیا' وہ میری نظروں کے سامنے ہی غائب ہوگیا اور میرے کانوں میں پُرخلوص آواز آئی۔

''بہت مبارک ہو۔''

اُسی روز شام کو میرے بیٹے کی میز پر ایک بہت

خوبصورت اور قیمتی پین کا ڈبہ رکھا ہوا ملا' وہ بہت خوش ہوا اور پین کا ڈبہ لے کر میرے پاس آیا اور بولا۔

''امی یہ پین آپ لائی ہیں؟ میں یہ ہی پین لینا چاہتا تھا۔'' میں سمجھ گئی کہ یہ تحفہ میری اُس نادیدہ دوست نے دیا ہوگا۔

''رکھ لو بیٹے' یہ میری دوست نے دیا ہے۔'' میں نے مسکرا کر کہا تھا۔

''امی جس نے بھی دیا ہے بہت خوبصورت ہے' مجھے بہت پسند آیا ہے۔ بہت بہت شکریہ۔'' اُس نے خوش ہوتے ہوئے شکریہ ادا کیا تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ سن ستر کا زمانہ تھا جب سندھ میں لسانی فسادات پھوٹ پڑے تھے اِدھر اُدھر سے خبریں اچھی نہیں آرہی تھیں۔ ہم نے بڑے بچوں کو کراچی نخیال بھیج دیا تھا۔ ماسی بھی بہانہ بنا کے اپنے گاؤں واپس چلی گئی تھی اور علی گوہر نے بھی کام چھوڑ دیا تھا۔ میں چھوٹے بیٹے کے ساتھ گھر میں اکیلی رہ گئی تھی۔ میرے شوہر صبح کلینک چلے جاتے تو میں سارا دن گھر میں اکیلی ہوتی' صبح جاتے وقت وہ اپنے سامنے گھر کے گیٹ میں اندر سے تالا لگواتے اور جب تک میں گیٹ میں تالا ڈال کر کمرے کا دروازہ بھی بند نہیں کر لیتی وہ کھڑے رہتے۔

مجھے گزشتہ دو تین روز سے گھر کے سامنے موجود کھیل کے میدان کی باؤنڈری وال پر ایک مشکوک سا لڑکا بیٹھا ہوا نظر آرہا تھا' وہ پتہ نہیں کب سے آ کے دیوار پر بیٹھ جاتا اور جب میرے شوہر گاڑی اسٹارٹ کر لیتے تو واپس چلا جاتا ایسا کئی دنوں سے ہو رہا تھا۔ مجھے ایک دن یہ خیال آیا کہ شاید یہ میرے شوہر کے آنے جانے کے اوقات کو نوٹ کر رہا ہے اور پھر میرا یہ اندیشہ صحیح ثابت ہوا تھا۔

اُس دن میرے شوہر نے جیسے ہی گاڑی اسٹارٹ کی تو میں اُن کو خدا حافظ کہہ کر اندر آ کر گیٹ بند کرنے لگی۔ اُس دن اُن کو جانے کی کچھ جلدی تھی شاید اس لیے گیٹ بند کروانے سے پہلے ہی چلے گئے ورنہ جب تک میں گیٹ میں تالا نہیں ڈالتی' وہ کھڑے رہتے تھے' جیسے ہی انہوں نے گاڑی آگے بڑھائی' وہ لڑکا پھرتی سے دیوار کود کر میرے گیٹ کے پاس آ گیا' اور تیزی سے گیٹ کے درمیان اپنا ہاتھ ڈال دیا' اب میں اندر سے گیٹ بند کرنا چاہ رہی تھی اور وہ باہر سے دھکا لگا کر کھولنا چاہ رہا تھا۔

اُس کا ہاتھ گیٹ کے درمیان پھنسا ہوا تھا اس لیے میں بند نہیں کر پا رہی تھی۔ میں ابھی خوف اور پریشانی سے چیخنا ہی چاہتی تھی کہ اچانک میری دوست مخلوق کا شوہر آ گیا تھا اور میری طرف دیکھے بغیر ہاتھ کے اشارے سے مجھے اندر جانے کا کہا تھا۔ تو میں کمرے میں چلی گئی تھی۔ اُس آدمی کو دیکھ کر وہ لڑکا سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ گیا تھا۔ اس نے دروازہ کھول کے اِدھر اُدھر دیکھا اور کسی کو نہ پا کر گیٹ بند کر کے تالا ڈال دیا' چابی اُس میں چھوڑ دی اور وہیں پر غائب ہو گیا' میں یہ سب کھڑکی سے دیکھ رہی تھی۔

شام کو میں نے ڈاکٹر صاحب کو بتایا کہ کس طرح وہ لڑکا اندر گھسنے کی کوشش کر رہا تھا اور میں کیسے بال بال بچی یہ قصہ گول کر گئی کیونکہ میں اپنی دوست مخلوق کا راز کھولنا نہیں چاہتی تھی مجھے ڈر تھا کہ میرے شوہر کچھ الٹا سیدھا نہ بول دیں جس سے وہ مخلوق ناراض ہو جائے' کیونکہ عموماً لوگ ایسی باتوں پر یقین ہی نہیں کرتے ہیں اور خاص طور سے مرد تو جنات اور جادو وغیرہ کو مانتے ہی نہیں حالانکہ یہ دونوں چیزیں قرآن سے ثابت ہیں۔ مگر پڑھے لکھے ہونے کے باوجود لوگوں کا کہنا ہے کہ اس زمانے میں ایسا نہیں ہوتا' میں تو اُن کو مانتی تھی اور میرا ذاتی تجربہ بھی ہو رہا تھا۔

اس واقعے کے بعد میرے شوہر نے مجھے بھی کراچی میرے والدین کے پاس بھیجنے کا فیصلہ کیا' کیونکہ یہاں میرے اکیلے رہنے میں خطرہ تھا اُس دن میں نے جلدی میں اپنا مختصر ضروری اور قیمتی سامان باندھا کیونکہ میرے شوہر نے کسی کو بتائے بغیر مجھے کراچی بھیجنے کا فیصلہ کر لیا تھا' وہ مجھے اسٹیشن پر ویٹنگ روم میں بٹھا کر ٹکٹ خریدنے چلے گئے تھے' میں اکیلی بچے کے ساتھ بیٹھی تھی کہ پتہ نہیں کہاں سے ایک مشکوک سا آدمی بھی ویٹنگ روم میں آ کر بیٹھ گیا تھا

...ہری طرف غور سے دیکھنے لگا تھا حالانکہ یہ لیڈیز ...انگ روم تھا۔

میں ڈر کے مارے خاموش تھی میں سوچ رہی تھی ...یر انسانی وجود سے میں کبھی نہیں ڈری' اور اس ...ان جو اشرف المخلوقات کہلاتا ہے سے مجھے کیوں ...لگ رہا ہے' میں قرآنی دعاؤں کا زیر لب ورد کرنے ...گی' اسی وقت ایک اور فیملی جو ایک مرد عورت اور ایک ...ے بچے پر مشتمل تھی ویٹنگ روم میں آ کر میرے ...ابر بیٹھ گئی' وہ عورت سیاہ رنگ کا توپی والا برقعہ پہنے ...ئے تھی اور کافی لمبی تڑنگی تھی' مرد نے بھی سفید کرتا ...لوار اور سر پر سیاہ عمامہ پہنا ہوا تھا' اس کا قد بھی کچھ ...یر معمولی لمبا تھا وہ اس عورت کو بٹھا کر باہر چلا گیا تو وہ ...ادی بھی جو تھوڑی دیر پہلے آ گیا تھا باہر نکل گیا تو میں ...نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔

اتنے میں میرے شوہر بھی ٹکٹ لے کر آ گئے تھے ...رین بھی آ چکی تھی' انہوں نے مجھے ٹرین میں بٹھایا اور ...چھ ہدایتیں دے کر کہا کہ بہت جلد وہ یہاں سے ...ب کچھ بیچ کر کراچی منتقل ہو جائیں گے' اتنے میں وہ ...برقعہ پوش عورت اور اس کے ساتھ جو مرد تھا وہ بھی ...پلیٹ فارم پر آ کر کھڑے ہو گئے تھے' شاید وہ اپنا ...مطلوبہ بوگی دیکھ رہے تھے اسی اثنا میں انجن نے وسل ...دی اور ٹرین چل پڑی' میرے شوہر خدا حافظ کہہ کر ...جانے کے لیے پلٹ گئے تب بھی وہ فیملی وہیں پلیٹ ...فارم پر کھڑی تھی بس اچانک ہی مجھے خیال آیا تھا کہ وہ ...مسافر میرے گھر کے نادیدہ رہائشی تھے جو مجھے ...چھوڑنے آئے تھے عین اسی وقت میرے کانوں میں ...بہت قریب سے آواز آئی تھی۔

''خدا حافظ فی امان اللہ.....'' یقیناً یہ وہی تھی ...میرے نادیدہ دوست ہمدرد اور بہن.....تب ہی مجھے ...یاد آیا تھا کہ اس نے کہا تھا۔

''تم نے بہن کہا ہے تو میں بھی یہ رشتہ نبھاؤں گی۔ سو وہ نبھا رہی تھی اُس نے مجھے اکیلا نہیں چھوڑا تھا۔ شہر میں فسادات کی وجہ سے خطرات منڈلا رہے تھے۔ لسانی جھگڑے کی آڑ میں بہت سی دشمنیاں پیدا ...ہو رہی تھیں اور کچھ لوگ اس کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے

غزل

شامل جو محبت میں اذیت نہیں ہوتی
اے دل کبھی تکمیل محبت نہیں ہوتی
جو ہوش نہ ہو سر کا وہ ہوتی ہے عبادت
سر سجدے میں رکھنے سے عبادت نہیں ہوتی
کچھ اپنے ہیں اپنوں کا گلا کس سے کریں ہم
ہیں غیر تو غیروں کی شکایت نہیں ہوتی
جاں دینے کا گر شوق ہے تو سن لو یہ مجھ سے
مقتل میں تڑپنے کی اجازت نہیں ہوتی

ملک ضیاء الرحمٰن اعوان۔ کراچی

تھے' ایسے میں اس نے میرا بہت ساتھ دیا تھا۔

اس پُراسرار قصے میں کہیں بھی ڈر اور خوف والی بات نہیں ہے۔ گویا میں خوش قسمت ہوں کہ غیر انسانی مخلوق جنات نے میرے ساتھ محبت کا سلوک رکھا۔

اس واقعے کو بہت ایک لمبا عرصہ گزر گیا ہے' میری زندگی میں پیش آنے والا یہ انوکھا اور یادگار واقعہ ہے۔ اب ہمیں سندھ کا علاقہ چھوڑے ہوئے اور کراچی میں رہتے ہوئے برسوں بیت گئے ہیں' میں نانی اور دادی کے عہدے پر فائز ہو چکی ہوں۔ میرے شوہر کا بھی انتقال ہو چکا ہے۔ لیکن اس تمام عرصے میں میرے ساتھ ساتھ اور میرے بچوں کے ساتھ پھر کوئی پُراسرار واقعہ پیش نہیں آیا' اس لیے میرے بچے بھی غیر مرئی وجود پر یقین نہیں رکھتے' لیکن چونکہ میرا یہ ذاتی تجربہ ہے اس لیے آج بھی میں اس مخلوق کے لیے دعا کرتی ہوں جس نے میرے ساتھ دوستی نبھائی.....وہ مہربان ہستی مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔

☆☆.....☆☆

کوئلہ بنا سونا

اثر نعمانی کا شعر

واقعہ تو ہوا تھا سامنے میرے
یقین کیسے دلاؤں ' یقین مجھ کو نہیں

اے حمید

اندرون لاہور کے جنات تنگ و تاریک گلی کوچوں کے نیچے انسانوں کو کچھ نہ کہتے اور اچھے ہمسائیوں کی طرح رہتے۔ یہ جن بھوت عام طور پرانے مکان کی کسی پچھلی اندھیری کوٹھڑی میں رہا

ہوتے۔ مکان کی یہ کوٹھڑی اکثر بند رکھی جاتی۔ سال چھ مہینے میں اگر ایک بار اس کی صفائی وغیرہ ہوائی جاتی تو سب سے پہلے گھر کا کوئی بوڑھا بزرگ وضو ہو کر کلمہ شریف کا ورد کرتا ہوا کوٹھڑی میں داخل ہوتا۔

شہر لاہور کے پرانے مکانوں کی پچھلی کوٹھڑیوں میں ایسے آلے اور طاق آج بھی پائے جاتے ہیں جہاں عورتیں رات کو چراغ روشن کرتی ہیں۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہاں کوئی نیک دل بزرگ والی روح رہتی ہے۔ پھر اس بزرگ کے بارے میں یہ بھی سنا جاتا ہے کہ کل فلاں شخص یا فلاح عورت نے سفید لباس والے ایک بزرگ کو کوٹھڑی میں سے نکلتے دیکھا جو دو قدم چل کر غائب ہو گئے۔ جن بھوتوں کے بارے میں عجیب و غریب محیر العقول باتیں مشہور ہو جاتی یا کر دی جاتی ہیں۔

ہماری رشتے کی ایک پھوپی جان اندرون لاہور کی باری میں رہتی ہیں۔ اُن کا تین منزلہ حویلی نما مکان ڈھائی سو سال پرانا ہے۔ ان کے مکان کا زینہ نیچے سے شروع ہو کر مکان کی چھت کے دروازے تک جاتا۔ زینے میں ہر وقت اندھیرا چھایا رہتا۔ مکان کی دوسری منزل کے دروازے کے پہلو میں ایک چھوٹی سی کوٹھڑی ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہاں جنات کی ایک فیملی رہتی ہے۔ کوٹھڑی میں ان کے ہاں بیاہ شادیاں ہوتی ہیں۔ ان کے رشتے دار آتے جاتے ہیں۔

میری پھوپی کی بڑی بیٹی کا کہنا ہے' ایک دن وہ سیڑھیاں چڑھ رہی تھی کہ دیکھا اس کوٹھڑی کا دروازہ کھلا تھا۔ کوٹھڑی کے اندر بڑے پلنگ پر ایک جن دولہا اور اس کی دلہن بیٹھے مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہے ہیں۔ گھر والے کہتے ہیں کہ انہوں نے اکثر راتوں کو ایسی آوازیں سنی ہیں کہ جیسے کوئی تیز قدم اٹھاتا سیڑھیاں چڑھ رہا ہے۔ کبھی کبھی اس کوٹھڑی میں سے گھنگھروؤں کی آواز بھی آ جاتی۔ گھر والوں نے اس کوٹھڑی کا نام پیش محل رکھا ہوا تھا۔ کوٹھڑی میں ایک بلب ساری رات اور سارا دن جلتا رہتا۔ جمعرات کو کوٹھڑی میں

غزل

میں ستاروں کی ضیا ہوں مجھے جانتے نہیں ہو
میں زمین کی صدا ہوں مجھے جانتے نہیں ہو
مجھے آزمانے والو! اتنا خیال رکھنا
میں رسول کا گدا ہوں مجھے جانتے نہیں ہو
بھری انجمن میں اس نے مجھے بے وفا کہا ہے
ارے کیا میں بے وفا ہوں! مجھے جانتے نہیں ہو
میں چراغ منفرد ہوں مجھے تیرگی سے ڈر کیا
میں ہواؤں میں جلا ہوں مجھے جانتے نہیں ہو
میں سدا بہار گل ہوں کوئی دشت ہو یا صحرا
میں ہر اک جگہ کھلا ہوں مجھے جانتے نہیں ہو

جاوید ثانی۔ جنڈ انوالہ (بھکر)

چراغ روشن کیے جاتے اور اگر بتیاں سلگائی جاتی کیونکہ کہا جاتا ہے کہ یہ جنات مسلمان ہیں۔

میری سب سے بڑی ہمشیرہ کا مکان مستی گیٹ میں تھا۔ ان کے مکان کے پاس ہی ایک کٹڑی تھی جہاں بی بی دائی رہا کرتی۔ بی بی دائی بڑی عبادت گزار پرہیز گار خاتون تھیں۔ بچے کی پیدائش کے وقت لوگ بی بی دائی ہی کو بلواتے۔ کہتے ہیں ایک بار بی بی دائی کے ساتھ عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ سردیوں کی رات تھی۔ سخت سردی پڑ رہی تھی۔ شہر کی گلیاں سنسان پڑی تھیں کہ کسی نے بی بی کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ بی بی دائی کا بڑا بیٹا نیچے آیا۔ دیکھا کہ دو بزرگ کھڑے ہیں۔ ایک بزرگ نے کہا۔

''ہماری بہو کے بچہ ہونے والا ہے ہم بہن بی بی دائی کو لینے آئے ہیں۔''

بی بی دائی کو پتا چلا تو اس نے پوچھا۔

''کہاں جانا ہوگا؟'' بزرگ نے کہا۔

''قریب ہی جانا ہے بہن جی! ہم تانگہ ساتھ لائے ہیں۔ ہم آپ کو واپس بھی چھوڑ جائیں گے۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ ہم آپ کو منہ مانگی فیس دیں گے۔'' بی بی دائی راضی ہوگئی۔ کٹڑی کے باہر تانگہ کھڑا تھا۔ بی بی دائی کا بیان ہے کہ تانگے کا کوچوان اگلی سیٹ پر خاموش بیٹھا تھا۔ دونوں بزرگ بھی تانگے کی اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے اور تانگہ مستی دروازے سے نکل کر دریائے راوی کی طرف ہوگیا۔

بی بی دائی نے سردی سے بچنے کے لیے گرم اونی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ دونوں بزرگ خاموش تھے۔ بی بی دائی کوئی بات کرتی تو وہ بھی جواب دے دیتے۔ تانگہ جب سڑک سے اتر کر دریا کے پرانے ذخیرے کی طرف مڑا تو بی بی دائی نے پوچھا۔

''بھائی جان آپ کا مکان ابھی کتنی دور ہے؟''

ایک بزرگ نے جواب دیا۔

''بس قریب ہی ہے بہن جی۔'' بی بی دائی کا کہنا ہے کہ جب تانگہ ذخیرے کے درختوں سے نکل کر دریا کے کنارے کنارے چل پڑا تو میں گھبرا گئی۔ آدھی رات کا وقت' اجاڑ سنسان جگہ' اجنبی لوگ' بی بی دائی کو خوف محسوس ہونے لگا مگر ہمت کر کے اس نے ایک بار پھر پوچھ لیا۔

''آپ کا مکان کس جگہ پر ہے؟'' بزرگ نے کہا۔

''گھبرائیں نہیں بہن جی! مکان قریب ہی ہے۔''

آخر دریا کے کنارے درختوں کے نیچے ایک جھونپڑی کے پاس تانگہ رک گیا۔ جھونپڑی کے اندر لالٹین روشن تھی۔ ایک بزرگ خاتون جھونپڑی کے باہر کھڑی انتظار کر رہی تھی۔ بی بی دائی نے خاتون کو دیکھا تو اسے کچھ حوصلہ ہوا۔ دونوں بزرگ جھونپڑی کے باہر ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے۔ بزرگ خاتون بی بی دائی کو جھونپڑی میں لے گئی۔ بی بی دائی کا کہنا ہے کہ اندر ایک خوبصورت جوان لڑکی پلنگ پر لیٹی تھی۔ بچے کی پیدائش قریب تھی۔ بچہ پیدا ہوگیا۔ بی بی دائی کہتی ہیں کہ وہ لوگ مجھے عجیب و غریب لگ رہے تھے۔ زچہ اور اس کی والدہ بزرگ خاتون کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی کہ جس کو دیکھ کر میرے بدن میں خوف کی ایک لہر دوڑ جاتی۔ زچہ کے ہاں بیٹا ہوا تھا۔ پیدا ہونے والے بچے کی آنکھوں میں بھی جا اس نے وہی مافوق الفطرت چمک دیکھی تو وہ جلد سے جھونپڑی سے باہر آ گئی۔ باہر اسے وا چھوڑنے کے لیے تانگہ کھڑا تھا۔ بی بی دائی جلدی تانگے میں بیٹھ گئی۔ بزرگ آدمی نے کہا۔

''بہن جی! آپ کی فیس دینے کے لیے ہمار پاس اس وقت کچھ نہیں۔ اس پوٹلی میں جو کچھ ہے اسے قبول کر لیں۔'' بزرگ نے پوٹلی سیٹ پر رکھ دی تانگہ چل پڑا۔ بی بی دائی اپنے مکان پر پہنچی تو خدا شکر ادا کیا۔ کوچوان اسے چھوڑ کر چلا گیا۔

بیٹے نے ناراض ہو کر کہا۔

''اماں' اتنی سردی اور رات کے وقت تمہیں نہ جانا چاہیے تھا' یہ کون لوگ تھے؟'' بی بی دائی نے کہا

''کوئی غریب غربا خانہ بدوش تھے۔ میری فیس دینے کے لیے بھی ان کے پاس پیسے نہیں تھے۔ یہ پوٹلی دے دی ہے کہ اسے قبول کرو۔'' کمرے میں آ بیٹے نے پوٹلی کھول کر لالٹین کی روشن میں دیکھا کہ میں بجھے ہوئے کوئلے تھے۔ بیٹے نے غصے میں کو فرش پر پھینک دیئے اور ماں کو سختی سے منع کیا کہ آئ کبھی رات کے وقت کسی کے ساتھ نہ جایا کرو۔ بی دائی کو بھی بجھے ہوئے کوئلے دیکھ کر بڑا غصہ آیا مگر وہ کچھ نہیں کر سکتی تھیں۔

دن چڑھا اور ماں بیٹے نے کمرے کے فرش طرف دیکھا تو دیکھتے ہی رہ گئے۔ فرش پر جہاں نے رات کو بجھے ہوئے کوئلے پھینکے تھے وہاں سونے کی ڈلیاں بکھری ہوئی تھیں۔ دونوں دنگ گئے۔ اب معلوم ہوا کہ وہ لوگ جو رات کو بی بی دا لے گئے تھے جنات تھے۔ بیٹے نے سونے کی سا ڈلیاں جلدی جلدی سمیٹ کر صندوق میں کپڑوں نیچے رکھ دیں۔ دونوں ماں بیٹا تانگہ کرا کر کنارے اس جگہ گئے جہاں رات کو جھونپڑی کے ا ایک عورت کے ہاں بچے کی ولادت ہوئی تھی۔ ا وہاں کسی جھونپڑی کا نام و نشان تک نہ تھا۔

☆☆.....☆☆

روم میٹ

محمود شام کا شعر

اِک شام دل بھی ڈوبا تھا، سورج کے ساتھ ساتھ
اُس شام ہی پھوٹیں یہ کالی کہانیاں

حنا بشریٰ

میں نے خوابوں کو زندگی میں بھی اہمیت نہیں دی، بارے میں یہی رائے تھی کہ خواب بس ایسا عمل ہے
ہت سے لوگوں کی طرح میری بھی خوابوں کے جس سے دورانِ نیند ہر انسان کو گزرنا پڑتا ہے۔ اس کا

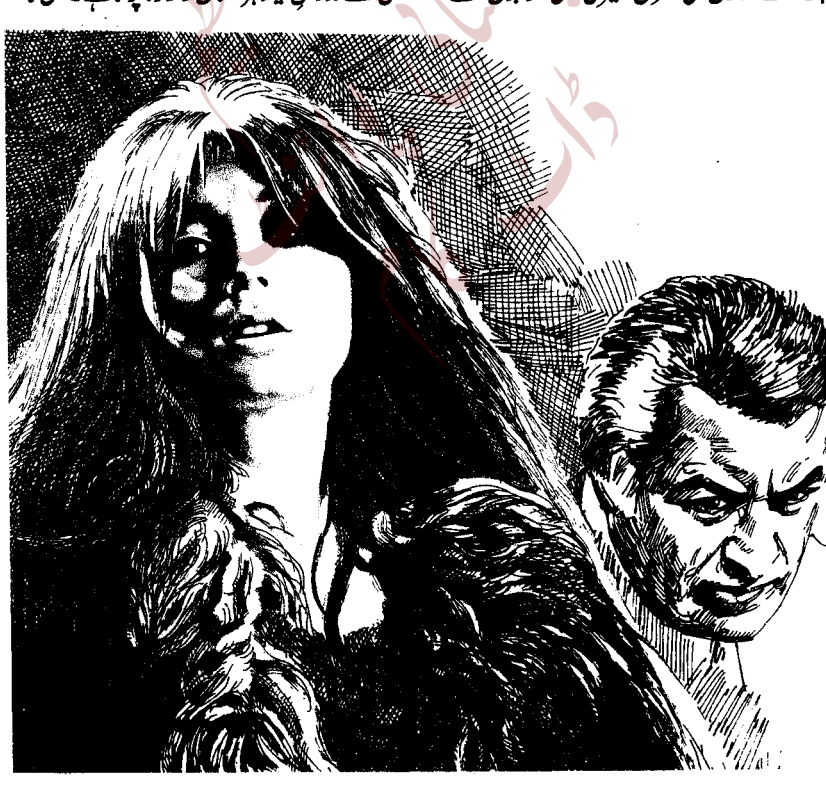

حقیقت سے دور دور تک کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ مگر میری زندگی میں ہونے والے ایک عجیب و غریب واقعے نے میری سوچ کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ اس عجیب واقعے کا ایک ایک حصہ میرے خوابوں سے جڑا ہوا تھا جو مجھے اکثر دکھائی دیتے تھے۔ بلند و بالا شاندار عمارت' سفید لبادے میں ملبوس ایک کم عمر لڑکی جو بہت پریشان دکھائی دیتی' بڑے سے شاندار لان میں پڑا ہوا جنازہ جس میں لوگوں کی کثیر تعداد موجود ہوتی۔ صفِ اول میں خود میں بھی موجود ہوتا۔ شروع شروع میں تو ان خوابوں کو نظر انداز کرتا رہا' مگر رفتہ رفتہ میرا دل ان خوابوں پر غور و فکر کرنے پر مجبور کرنے لگا۔

پڑھنے پڑھانے کے شوق نے مجھے قلم تھمایا تو میں ادیب بن گیا اور روپے پیسے کی فراوانی نے مجھے سیاح بنا دیا۔ میں قدرتی حسین نظاروں سے لطف اندوز ہونے کے لیے کسی نہ کسی صحت افزاء مقام کی طرف چل پڑتا تو ساتھ میں کاغذ قلم لے کر جانا نہ بھولتا' بہت سے مقامات پر شاہکار تحریریں بھی لکھ ڈالیں مگر کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اس بار قدرت مجھ سے ایسی تحریر لکھوائے گی جس کا ایک کردار میں خود ہوں گا۔

اس بار میں نے سیر و تفریح کے لیے سوات کا انتخاب کیا تھا' وہاں مجھے ایک شاندار ہوٹل میں قیام کا موقع ملا' ایسا پُرسکون ماحول کہ راحت و خوشی دل کی اتھاہ گہرائیوں تک محسوس ہوئی۔ ہوٹل منیجر سے چابی پکڑی اور اپنے روم میں آ گیا۔ شیشے کی طرح چمکتا دمکتا کمرہ' فرش پر بچھے مخملیں قالین' دیواروں پر آویزاں قدیم ثقافت کو اجاگر کرتی دیدہ زیب مصوری کے فن پارے' چھتوں پر لگے نفیس و بیش قیمت فانوس جہاں میں کمرے کی خوبصورتی پر مبہوت رہ گیا' وہیں حیرت کا شدید جھٹکا لگا کہ یہ تو وہی عمارت ہے جسے میں اکثر خوابوں میں دیکھ چکا ہوں۔ بہرحال میں اس خلوت میں ناقابلِ بیان سکون محسوس کر رہا تھا۔

میں ابھی اسی عالمِ محویت میں تھا کہ اچانک ہی ناگوار سی بو چونکا گئی۔ سڑے ہوئے گوشت کی بدبو سے دماغ پھٹنے لگا تھا میں نے روم میں پڑا ایئر فریشنر کھلے ہاتھ سے یوں استعمال کیا کہ آج ہی ساری بوتل ختم کرنے کا حکم ہو۔ ناگوار بدبو کی وجہ سے میں ناک پر رومال رکھ لیا تھا۔ روم کا تعفن زدہ ماحول نا کرنے کی خاطر کھڑکی کی جانب قدم بڑھائے کمرے کی واحد الماری جو فرش سے چھت تک ہوئی تھی اُس کے پاس تین موٹے موٹے چو سائز میں عام چوہوں سے قدرے بڑے تھے۔ میری موجودگی سے بے خبر کبھی الماری پر نیچے مار کبھی کچھ سونگھتے تو کبھی الماری پر چڑھنے کی کوش کرتے۔

عجیب سی بے چینی و اضطراب تھا اُن کی حرکا میں اس قدر خوبصورت ماحول میں پہلے وہ ناگوار مہ اور پھر چوہوں کی موجودگی مجھے بدمزہ کر گئی۔ مجھے د کروہ چوہے بھاگ اٹھے تھے۔

یہ ایک حقیقت تھی کہ الماری کے قریب وہ ناگو بو بہت شدید آ رہی تھی کہ میرا دل متلانے لگا' میں آگے بڑھ کر کھڑکی کھول دی۔ آسمان پر سرمئی باد اِدھر اُدھر منڈلا رہے تھے۔ جو موسم کی خرابی کا وا عندیہ تھا۔ دھند کی گیلی گیلی باس کو سانسوں میں سموتے ہوئے دل چاہ رہا تھا کہ اس دھند کا حصہ ہو جاؤں۔ نظر آسمان سے اتری تو سنگِ مرمر کی شاند مسجد کے بلند و بالا مینار پر جا ٹھہری۔ اردگرد زمین گڑی بلند و بالا لائنیں جنہیں پہاڑ کہا جاتا ہے جو زمی کو توازن میں رکھنے کے لیے خدائے بزرگ و برتر نصب کر رکھی ہیں دکھائی دیں۔ کہیں کہیں سبزہ جو دھند کے باعث ڈھکا ہوا تھا اور کچھ فاصلے پر ٹھنڈے پانی کی شفاف جھرنا' میں اُس منظر کو دیکھ کر چند لمحوں کے لیے دنیا و مافیا سے بیگانہ سا ہو گیا۔ مسجد کے نور بھرے مینار سے اک لطیف سی صدا بلند ہوئی۔

''تم اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے۔'' دھند لے آسمان سے قطرہ قطرہ گرتی بوندوں نے میری محویت کو توڑا' ٹھنڈی ہلکی بارش کی بو چھاڑ اندر آئی تو میں نے جھرجھری لیتے ہوئے کھڑکی بند کر دی' آتش دان جلایا۔ سردی کافی بڑھ چکی تھی۔ کچھ دیر پہلے کمرے میں آنے والی ناگوار بو اب معدوم ہو چکی تھی۔ اِسی دوران کمرے کے دروازے

ناک ہوئی۔

''سر ڈنر میں کیا لیں گے؟'' ہوٹل کے ملازم نے پانی کا کپ میز پر رکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ اس مبہوت کرنے والے ماحول میں ملازم کی آمد حد درجہ مخل ہوئی تھی۔

☆.....☆.....☆

حاجاتِ ضروریہ سے فراغت کے بعد میں قلم سنبھال کر بیٹھ گیا تھا' موسم کی جولانیاں اپنے عروج پر تھیں' طوفانی بارشیں ہوٹل کی مضبوط کھڑکیوں کے ساتھ دیوانہ وار ٹکرا رہی تھیں' نا جانے کیوں پہلی بار مجھے کہانی لکھنے میں مشکلات ہو رہی تھیں' قلم بار بار رک جاتا' دھیان بھٹک جاتا' میں اسی پریشانی میں الجھا ہوا تھا کہ ایک سرد ہوا کا جھونکا' بلکہ برف کی مانند جھونکا میرا قریب سے گزرا تھا۔ کھڑکیاں دروازے بند تھے' آتش دان نے ماحول کو خوب گرمایا ہوا تھا۔ تو پھر یہ سرد جھونکا کہاں سے آیا؟ میں ایک لمحے کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔ شاید کمرے میں کوئی ایسی جگہ ہو جہاں سے ہوا کا جھونکا اندر آیا تھا۔

مگر کہیں بھی کوئی ایسی جگہ نہیں تھی سو میں نے اپنا وہم جانا اور دوبارہ سے لکھنا شروع کیا' ابھی چند الفاظ صفحہ قرطاس پر اُتارے تھے کہ خالی واش روم سے پانی گرنے کی آواز نے میرے حواس مختل کر دیے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے کوئی واش بیسن کا نل کھول اور بند کر رہا ہو۔ میں تیزی سے اٹھا اور واش روم میں جھانکا۔ واش بیسن کے نل سے واقعی میں پانی بہہ رہا تھا۔ مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا' اِس کمرے کا واحد مکین میں ہوں کوئی میرا روم میٹ بھی نہیں تو پھر نل کس نے کھولا؟

''شاید مجھ سے پہلے جو لوگ اس کمرے میں ٹھہرے ہوں گے وہ نل کھلا چھوڑ گئے تھے' جب پانی آیا تو بہنا شروع ہو گیا۔'' میں نے اپنے وہم کو تھپکی دی اور اپنے دل و دماغ کو پُرسکون کرتے ہوئے ہاتھ نل کی جانب بڑھایا ہی تھا کہ مجھے لگا کہ میرا ہاتھ کسی ان دیکھے وجود سے ٹکرا گیا ہو۔ یوں محسوس ہوا جیسے دو لوگوں نے بیک وقت نل بند کرنے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہو اور دونوں کے ہاتھ ٹکرا گئے ہوں' اس وہم کو تھپکی دینے کا میرے پاس حوصلہ نہیں تھا۔ میرا دل بری طرح سے دھڑکنے لگا۔ بے اختیار میری نظر واش بیسن کے اوپر لگے آئینے پر جا رُکی۔ کوئی غیر واضح سفید عکس آئینے میں دکھائی دیا اور پھر غائب ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی بادل اِس زور سے گرجا کہ کانوں کے پردے پھٹنے لگے۔

بارش کا شور ماحول کو مزید خوفناک بنا رہا تھا۔ میرے اوسان خطا ہونے لگے تو تیزی سے نل بند کر کے باہر نکل آیا اور پھولی سانسوں کو درست کرنے لگا۔

لکھنے میں پہلے ہی یکسوئی نہیں تھی' باقی کسر اس نہ سمجھ آنے والے واقعے نے پوری کر دی۔ میں نے لائٹ آف کی اور سونے کے لیے لحاف میں دبک گیا۔ اور وہی خوابوں کا سلسلہ پھر سے شروع ہو گیا۔ انسانی قد کے برابر سفید سا ہیولہ کمرے میں چلتا پھرتا غیر واضح سا دکھائی دیا۔ وہ ہیولہ کسی مرد کا تھا یا عورت کا صحیح سے جان نہیں پایا تھا۔ اس کی چال میں ایک انجانا سا اضطراب تھا۔ پھر کچھ سرگوشیاں ہونے لگیں۔ مکھیوں کی بھنبھناہٹ جیسی آوازیں کان کے قریب سنائی دیں۔

''مجھے یہاں سے نکالو..... غسل دو..... مجھے مٹی میں اُتارو.....'' یہ الفاظ سنتے ہی میری آنکھ کھل گئی تھی۔

روم میں بلیو نائٹ بلب کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں آنکھیں پھاڑے اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ خواب کے ایک ایک حصے پر باریک بینی سے غور کر رہا تھا۔ وہ مبہم آوازیں میری سماعت میں اب تک ہلچل مچا رہی تھیں۔ مضبوط اعصاب کا ہوتے ہوئے میں یوں گھبرا گیا تھا۔ اپنے اوپر غصہ بھی آنے لگا کہ میں یہاں اکیلا کیوں آیا ہوں۔ کسی دوست کو ساتھ نہ لا کر شدید غلطی کی ہے۔ میں انہی سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ واشن روم سے پانی گرنے کی آواز پر میرا دل بری طرح دھڑکا..... جیسے کوئی وحشی ویرانے میں ڈھول پیٹ رہا ہو۔ دروازے کے سخت قبضوں

سے آواز بلند ہوئی واش روم کا دروازہ بند ہوگیا تھا۔ میں نے ہمت کی اور واش روم جا پہنچا۔ لرزتے ہاتھوں سے دروازہ کھولا۔ اندر مکمل اندھیرے کا راج تھا۔ واش بیسن کے نل سے ایک بار پھر پانی بہہ رہا تھا۔

میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں' میں نے نل خود بند کیا تھا پھر یہ کیسے کھلا..... میں نے نل بند کیا تو میری نظر باتھ روم میں موجود تین موٹے چوہوں پر پڑی وہ میری طرف متوجہ تھے' مگر میرے دیکھنے پر وہ بے خوف انداز میں مجھے دیکھتے رہے اُن کی آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ میں نے خوفزدہ ہوکر دروازہ بند کیا اور آ کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔ آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ میں کافی دیر تک سوچتا رہا تھا کہ اذان سحر کی صدائیں بلند ہوئیں تو میرے خوف میں کمی آئی۔ مگر میں یہ معمہ حل نہ کر پایا تھا۔

☆.....☆.....☆

ساری رات بے آرامی کے باعث میرا سر بوجھل ہوا جا رہا تھا۔ وقفے وقفے سے سڑے ہوئے گوشت کی بدبو نے دل و دماغ چکرا کر رکھ دیے تھے۔ صبح جب ہوٹل کا عمر رسیدہ ملازم ناشتہ لے کر آیا تو میں نے اُس سے پوچھا۔

''آپ جانتے ہیں کہ مجھ سے پہلے اس روم میں کون لوگ ٹھہرے تھے؟'' میرے سوال پر اُس کے ماتھے کی گہری ہوتی شکنیں مجھے حیرت میں ڈال گئیں۔

''سر چند روز پہلے اس ہوٹل میں ایک آفس ٹرپ آیا تھا۔ اُس میں ایک لڑکی بھی تھی جو پُراسرار طور پر لاپتہ ہوگئی تھی۔ بہت تلاش کیا مگر کچھ اَتا پتہ نہ ملا تو وہ لوگ واپس چلے گئے۔'' ملازم نے مختصر سا جواب دیا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ میرے ذہن میں ابھی اور بھی سوالات کلبلا رہے تھے۔

میں اب ایک پل اس ہوٹل میں گزارنا نہیں چاہ رہا تھا' بارش ابھی بھی ہو رہی تھی۔ بادلوں نے دن میں رات کا سماں کر رکھا تھا۔ میں نے سامان پکڑا اور واپسی کا ارادہ باندھ لیا۔ طوفانی بارشوں کے باعث آمدورفت کا نظام معطل ہوکر رہ گیا تھا۔

''سر موسم انتہائی خراب ہے..... شدید طوفان اور برفباری کے باعث بہت سے حادثے ہو رہے ہیں۔ اِس وقت آپ کا جانا اپنی جان کو مصیبت میں ڈالنے کے مترادف ہوگا۔'' ہوٹل منیجر نے چابی پکڑاتے ہوئے مخلصانہ مشورہ دیا تھا۔

''تو پھر میرا کمرہ بدل دیں۔''

''سوری سر اِس وقت تمام روم بک ہیں۔'' منیجر کی یہ بات سن کر میں دوبارہ کمرے میں آ گیا تھا جبکہ رات کے تصور سے ہی مجھے شدید وحشت ہو رہی تھی۔

اِس کے بعد دو راتیں پُرسکون گزر گئیں' کوئی ناخوشگوار واقعہ رونما نہ ہوا میں مطمئن ہوگیا' ہاں البتہ خوابوں کا سلسلہ اب بھی جاری رہا اور وہ عجیب و غریب سرگوشیاں' صبح اٹھ کر بھول جایا کرتا میں علی الصبح اپنا کیمرہ پکڑتا اور سیر و تفریح کے لیے نکل جاتا۔ قدرتی مناظر کو کیمرے کی آنکھ سے محفوظ کرتا' ان حسین نظاروں میں کھو کر چند روز پہلے کی پُراسراریت مکمل طور پر فراموش کر گیا تھا۔ شام کو اپنے روم میں واپس آتا اور کہانی لکھنے میں مگن ہو جاتا۔

ایک شام ہوٹل واپس آیا تو روم میں تبدیلی کا احساس ہوا۔ میرا سامان بکھرا پڑا تھا میری تحریر کے صفحات بھی بکھرے ہوئے تھے جیسے تند و تیز ہوا نے سب کچھ اُلٹ پلٹ کر کے رکھ دیا ہو' میں سخت حیران ہوا۔ ہوٹل ملازم سے باز پرس کی تو اُس کے مختصر جواب نے مجھے لاجواب کر دیا۔

''سر آپ روم کی چابی اپنے ہاتھ سے منیجر صاحب کو دے کر گئے تھے تو آپ کی واپسی تک چابی اُن کے پاس آپ کی امانت ہوتی ہے۔''

میں نے اُس سے الماری کی چابی مانگی کہ جتنے دن یہاں ہوں اپنا سامان حفاظت سے اس میں رکھ دیا کروں۔

''اصل میں آپ سے پہلے جو لوگ یہاں ٹھہرے تھے وہ غلطی سے چابی اپنے ساتھ لے گئے ہیں اِس لیے فی الحال یہ الماری نہیں کھولی جا سکتی۔'' ملازم کی بات نے مجھے اُلجھا دیا۔

''تو پھر لاک ماسٹر کو بلواؤ تاکہ نئی چابی لگوائی جائے۔'' میں نے فوراً کہا۔

''سر ابھی موسمی صورتحال کے پیش نظر یہ مشکل ہے چند روز مزید انتظار کریں تو لاک ماسٹر بھی آجائے گا۔'' وہ یہ کہہ کر چلا گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ پُراسرار واقعات جو کافی دنوں سے بند تھے اُن کا سلسلہ اب پھر سے چل پڑا تھا۔ میری کہانی کا روز کوئی نہ کوئی صفحہ گم ہونے لگا..... بیگ میں رکھ کر جاتا مگر نتیجہ صفر کا صفر رہتا۔ ایسے لگتا کہ جیسے کوئی نہیں چاہتا کہ میں کہانی مکمل کروں۔ میری کہانی پہلے ہی مشکلات کا شکار تھی اِن واقعات نے تو میرا دھیان بھی بھٹکا دیا تھا۔ پڑے ہوئے گوشت کی بدبو پہلے سے زیادہ آنے لگی تھی ملازم سے پوچھتا تو وہ لاعلمی کا اظہار کرتا..... آئینے میں غیر واضح عکس دکھائی دیتا اور پھر اوجھل ہو جاتا۔ واش روم سے پانی گرنے کی آواز آتی اور پھر خود بخود نل بند ہو جاتا..... سرگوشیاں اب باتھ روم میں بھی سنائی دینے لگیں۔ آخر یہ سب میرے ساتھ ہی کیوں ہو رہا تھا؟ ایک معمہ تھا جو حل ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

ایک شام موسم بہت حسین ہو رہا تھا' میں نے کیمرہ پکڑا اور روم سے نکلنے ہی لگا تھا کہ ہوا کا سرد اور فیلا جھونکا میرے قریب سے گزرا یوں لگا کوئی میرے قریب موجود ہے۔ میرا کیمرہ واضح اور غیر واضح ہر طرح کے منظر کو اپنی آنکھ میں قید رکھنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ نا جانے کس قوت کے زیر اثر میں نے Polorioid کیمرے کی مدد سے اپنے اردگرد کی چند تصاویر لے ڈالیں' اور پھر فوری پرنٹ دیکھتے ہی خوف سے میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ لگے اپنی رگوں میں خون جمتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ انسانی قد کے برابر ایک سفید سا ہیولہ جس کی پشت میری جانب تھی۔ سیاہ بکھرے بال دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ ہیولہ کسی لڑکی کا تھا' خوف و دہشت کے مارے میں بے ہوش ہوتے ہوتے بچا تھا کہ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اتنے دنوں سے میرے اردگرد کوئی روح موجود تھی جس کی موجودگی سے میں بالکل بے خبر تھا مگر وہ مجھے ہر پل دیکھ رہی تھی۔ میرے ہاتھوں کی کپکپاہٹ کے باعث کیمرہ زمین پر گرتے گرتے بچا تھا۔

میرا ذہن بے حد منتشر تھا' کیا کوئی نادیدہ ہستی میری 'روم میٹ' ہے۔ کوئی روح' بدروح یا پھر کوئی آسیب..... اس خیال کے آتے ہی میرا جسم بے جان ہونے لگا۔ میں ابھی اس خوفناک صورتحال سے نکلنے کی کوشش میں تھا کہ کمرے کی لائٹ آف ہو گئی۔ بادل زوردار آواز سے گرجا' ساتھ ہی بجلی کی کڑک دار آواز نے ماحول کو مزید بھیانک بنا دیا۔ تند و تیز ہواؤں نے ہوٹل کی مضبوط کھڑکیوں اور دروازوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میں جو اندھیرے میں ٹارچ ڈھونڈ رہا تھا ایکدم دہل کر رہ گیا کمرے کی کھڑکی ایک زوردار دھماکے کے ساتھ کھل گئی۔ ماحول میں عجیب سا اضطراب تھا جو محسوس ہو رہا تھا۔

ڈریسنگ ٹیبل پر ٹارچ کی تلاش میں ہاتھ مارتے ہوئے کتنی ہی چیزیں گر پڑیں۔ میرا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ گوشۂ چشم سے میں اپنے پیچھے دیکھنے کی کوشش کرتا یوں لگتا جیسے کوئی نادیدہ مخلوق مجھے اپنی گرفت میں لے لے گی۔

ٹارچ جیسے ہی آن ہوئی کھڑکی کے پاس سفید لبادے میں ایک لڑکی کھڑی تھی۔ سیاہ بال کھلے ہوئے تھے رنگت بالکل سفید جیسے جسم میں خون کا ایک قطرہ نہ ہو..... ہونٹ سیاہی مائل ہو رہے تھے آنکھوں میں اس قدر ویرانی تھی کہ یوں لگتا تھا اندھیری رات میں کسی سنسان قبرستان کو دیکھ رہا ہوں اُس کے چہرے پر بے بسی اور کرب نمایاں تھا مجھے دیکھ کر وہ کچھ بولتی تھی مگر میں کچھ نہ تو سمجھ پا رہا تھا نہ سن پا رہا تھا۔ اُس کی پُراسرار سرگوشیاں میرے پردۂ سماعت تک پہنچنے سے پہلے ہی دم توڑ جاتی تھیں۔

''کک..... کون؟'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا مگر جواب میں سنگین خاموشی چھائی رہی۔

''کون ہو تم آخر کیا بگاڑا ہے میں نے تمہارا؟'' میں پھٹی پھٹی آواز میں چلایا۔ وہ لڑکی کچھ کہنے کی کوشش کرتی مگر میں کچھ نہ سن پاتا۔ بجلی کی چمک میں

اُس کا چہرہ دیکھ کر مجھے موت شدت سے یاد آنے لگی۔ میں خوفزدہ ہوکر دروازے کی جانب دوڑا اور لاک تیزی سے گھمانے لگا مگر دروازہ تو سختی سے بند تھا۔ میں نے مڑکر اُس کی جانب دیکھا وہ میری طرف بڑھ رہی تھی۔ میرے ہاتھ سے ٹارچ گر پڑی۔ جو فرش پر پڑی دائیں بائیں جھول رہی تھی۔

وہ لڑکی ٹارچ کی روشنی میں مزید بھیانک لگ رہی تھی مگر اُس کے انداز میں ایک کرب تھا بے بسی تھی۔ مگر میں اس وحشت کے عالم میں اپنے آپ کو بہت بے بس محسوس کررہا تھا۔ دروازہ کھولنے کی کوشش کرتے ہوئے میں چلایا۔

''کوئی ہے جو میری مدد کرے۔'' میں پھٹی پھٹی آواز میں چیخا اور رو پڑا۔ موت میرے بہت قریب پہنچ چکی تھی۔

''یا اللہ میری مدد فرما۔'' دل نے بے اختیار دعا مانگی کہ اچانک لائٹ آگئی اور وہ دروازہ جو کافی دیر سے کھل نہیں رہا تھا ایکدم کھل گیا۔ میں نے باہر کی جانب دوڑ لگائی جیسے کوئی پرندہ پنجرہ کھل جانے پر آسمان کی جانب پرواز کرتا ہے اور پیچھے مڑکر نہیں دیکھتا' میں گرتا پڑتا ہوٹل منیجر کے پاس پہنچا اور بدحواسی کے عالم میں ایک ایک بات بتانے لگا۔ وہ میری حالت اور میری بات پر حیران رہ گیا۔

تصدیق کے لیے ہوٹل کا عملہ میرے ساتھ میرے روم میں پہنچا مگر وہ کفن پوش وجود کہیں دکھائی نہ دیا اور کمرہ بھی بالکل درست حالت میں تھا۔ اور حیرت انگیز بات جو ہوٹل منیجر نے بتائی کہ ہمارے ہوٹل میں لمحہ بھر کے لیے بھی لائٹ نہیں گئی تھی۔ میں انہیں بھرپور یقین دلانے کی کوشش کرتا رہا مگر ہر آنکھ میں بے یقینی اور تمسخر تھا۔

''رائٹر بابو آپ کی ہی تحریر کا کوئی پراسرار کردار یا کوئی حسینہ نکل کر باہر تو نہیں آگئی تھی۔'' بوڑھے ملازم کی بات پر جہاں سارا عملہ کھلکھلا کے ہنس پڑا..... وہاں میں اپنی بے بسی پر تلملا کے رہ گیا۔

''پلیز منیجر صاحب میں صبح ہوتے ہی یہاں سے چلا جاؤں گا۔ مگر آج رات کے لیے مجھے کوئی اور روم

غزل

تجھ سے ملنے کو دل کیا اک دن
میں نے تھوڑا سا رو لیا اک دن

ساتھ دینا تھا عمر بھر جس نے
میری خاطر نہ رک سکا اک دن

بات کہہ دی نئی محبت کی
دھیرے دھیرے وہ جب کھلا اک دن

مجھ سا کوئی نہ مل سکا اُس کو
پھر وہ میرا ہی ہوگیا اک دن

دل سے مانگی ہوئی ہو کوئی بھی
کام آتی ہے ہر دُعا اک دن

اب نہ جانے میں کب چلا جاؤں
یاد آؤں گا یوں گیا اک دن

ڈاکٹر فخر عباس

ا ے دیں یا چند گھنٹوں کے لیے مجھے کسی کا روم میٹ
ل بلنا پڑے میں تیار ہوں۔'' میں قطعی انداز میں
بولا۔

''دیکھیے سلمان صاحب اس وقت تمام روم بک
ہیں۔ آپ کو ضرور کوئی وہم ہوا ہے۔ یا تو آپ کوئی
اسرار کتاب پڑھ رہے تھے اور دوران خواب آپ
ڈر گئے ہیں۔ ہوجاتا ہے ایسا بھی..... مگر آپ وہم کو
ذہن سے نکال دیں کیونکہ وہم کا علاج تو حکیم لقمان
کے پاس بھی نہیں تھا۔'' ہوٹل منیجر نے میرے کندھے
پر ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی آمیز الفاظ کہے تھے۔

☆.....☆.....☆

میں نے ہونقوں کی طرح روم کی لائٹ آن کی
اور لحاف میں دبک گیا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر
اُدھر دیکھتا رہا..... دل کو یقین تھا کہ وہ بھیانک وجود
کہیں آس پاس ہی تھا۔ جو میری نظروں سے اوجھل
تھا۔ دل و دماغ کے اندازوں پر تصدیق کی مہر ثبت
کررہا تھا۔ دماغ تھکنے لگا تھا اور آنکھیں نیند سے
بوجھل ہورہی تھیں۔ غنودگی سی طاری ہونے لگی تھی۔
اور پھر خواب میں سفید لبادے میں وہی لڑکی کمرے
میں موجود تھی۔ اُس کے چہرے پر کرب والم واضح
تھا۔

''میری قبر کہاں ہے۔ میرا کفن لادو..... مجھے مٹی
میں اُتار دو۔'' وہ بے قراری سے کہتی ہوئی کمرے کی
الماری کے قریب بیٹھ کر رونے لگی۔ بھیانک سسکیوں
سے میرا دل ہولنے لگا۔ ہڑبڑا کر میری آنکھ کھل گئی
تھی۔

میرا دل چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ میں ضرور کسی
آسیبی چکر میں پھنس گیا ہوں اور اب شاید مر کے ہی
نکل پاؤں..... اسی اثناء میں موبائل کی بیل بجی.....
امی کا نمبر دیکھ کر میرا دل چاہا کہ دھاڑیں مار مار کر
رونے لگوں کہ امی آپ کا بیٹا ایسے کمرے میں قید ہوکر
رہ گیا ہے جہاں سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں بن
رہی۔

''سلمان..... بیٹا کب تک واپسی ہے؟'' مجھے
تمہاری بہت فکر ہورہی ہے کافی دنوں سے تمہارے
بارے میں پریشان کن خواب دیکھ رہی ہوں..... بس
بہت سیر و تفریح ہوگئی اب جلد لوٹو.....'' امی میرے
لیے فکرمند تھیں۔

میرا دل چاہ رہا تھا کہ پر لگا کر اڑ جاؤں اور امی
کے پاس پہنچ جاؤں اور اُن کی آغوش میں گہری نیند
سو جاؤں اور ہر خوف سے آزاد ہوجاؤں۔

''امی طوفانی بارشوں کے باعث آمد و رفت کا
نظام معطل ہوکر رہ گیا ہے جیسے ہی کوئی صورت بنتی ہے
میں واپس آجاؤں گا۔''

میں نے انہیں تسلی دی۔ اصل بات بتا کر انہیں
پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ورنہ دل چاہ رہا تھا کہ کہہ
دوں امی پتہ نہیں اب میں زندہ واپس آپ کے پاس آ
بھی سکوں گا یا نہیں.....

''دیکھو بیٹا ذرا برابر بھی مشکل آئے تو اُس رحمٰن
کو مدد کے لیے پکارنا' وہ اپنے بندوں کے لیے ایسے
اسباب بناتا ہے کہ انسان کے وہم و گمان میں بھی نہیں
ہوتا.....'' اذانِ سحر کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ میں
سجدے میں سر رکھ کر دیر تک اُس پاک پروردگار سے
مدد مانگتا رہا اور گریہ زاری کرتا رہا۔

☆.....☆.....☆

طوفانی بارشوں کا سلسلہ ابھی تک جاری تھا' یوں
محسوس ہورہا تھا کہ جیسے قدرت کو ابھی منظور ہی نہ ہو کہ
میں یہاں سے جاؤں..... جس جگہ موت لکھ دی گئی
ہے اُس مقام سے انسان چاہ کے بھی فرار نہیں ہوسکتا۔
اس سوچ نے مجھے قدرے مطمئن کردیا تھا۔ دوسری صبح
ہوٹل منیجر نے میرے ساتھ یہ مہربانی کی کہ میرے
کمرے کی خاص طور پر صفائی ستھرائی کروائی۔ ناگوار
بو کے خاتمے کے لیے عمدہ اسپرے کروایا گیا۔ اور
لاک ماسٹر کا فوری انتظام کروایا گیا تاکہ الماری کو کھولا
جائے..... پچھلے ایک گھنٹے سے لاک ماسٹر لگا ہوا تھا مگر
الماری کھلنے پر نہیں آرہی تھی۔

آخر اللہ اللہ کر کے الماری کھلی تو پھر پورا کمرہ
چیخوں سے گونج اٹھا۔ سارے عملے میں کھلبلی سی مچ
گئی۔ سفید چادر میں لپٹی لاش جو ایک بہت بڑے
موی لفافے میں بند تھی وہ دھم کر کے لاک ماسٹر کے

اوپر گری۔ لاک ماسٹر بے چارہ خوف کے مارے بے ہوش ہوگیا۔ سارے کمرے میں تعفن سا پھیل گیا' بدبو کے مارے ابکائی آنے لگی۔ میں یہ سارا منظر حیران پریشان دیکھتا رہ گیا۔ ہوٹل مالکان نے بدنامی کے ڈر سے مجھ سے کسی قسم کا کوئی رینٹ نہ لیا' بلکہ وعدہ لیا گیا کہ آپ یہ خبر اخبار میں نہیں دیں گے ورنہ ہمارا ہوٹل برباد ہوجائے گا۔

پولیس کو اطلاع دیے بغیر اُس نامعلوم لڑکی کی لاش کی تجہیز و تدفین کردی گئی وہ بھی انتہائی خفیہ انداز میں..... اُس کا جنازہ پڑھایا گیا اور میں صفِ اول میں کھڑا تھا خواب کا وہ سلسلہ ختم ہو چکا تھا کیونکہ ہر خواب لفظ بہ لفظ پورا ہوا تھا..... میرے یہاں آنے کا وہ مقصد پورا ہوگیا تھا جس سے میں بالکل لاعلم تھا۔

☆.....☆.....☆

میں نے اپنا سامان سمیٹا اور مطمئن انداز میں رختِ سفر باندھ لیا۔ کاتبِ تقدیر کی مجھے یہاں مسلسل ٹھہرائے رکھنے کی جو مصلحت تھی وہ سمجھ آچکی تھی میں کمرے سے نکلنے لگا تھا کہ میری نظر ایک سیاہ ڈائری پر پڑی۔ میں نے وہ کھولی تو اُس میں 'حوریہ ذوالقرنین' بہت نفاست سے لکھا ہوا تھا' میں نے وہ ڈائری اپنے سامان میں رکھ لی اور گھر آ گیا۔ ڈائری میں اُس نامعلوم لڑکی کی تصاویر' جعلی نکاح نامہ اور کچھ ادھوری عبارتیں تھیں' جن سے میں یہ سمجھ پایا تھا کہ ایک حرماں نصیب بنت حوا کو اپنے پاس سے محبت ہوگئی تھی۔ محبت کے دعوے اور قسمیں اُس ابنِ آدم نے ویسے ہی کھائے جیسے ہر مرد کرتا ہے۔

اُس شخص نے جعلی نکاح کیا وہ بدنصیب اپنا سب کچھ برباد کر چکی تو اُس شخص کی اصلیت کھلی جو ایک عیاش مرد تھا' اُس مرد نے جان چھڑانے کی کوشش کی جس کا اظہار حوریہ نے ڈائری میں بھی کیا۔ جگہ جگہ ڈائری پر آنسو بھی گرے تھے ایک اور بنت حوا دھوکہ کھا گئی تھی۔ ڈائری کے آخر میں لکھے الفاظ پڑھ کر مجھے اپنے مرد ہونے پر شرم آنے لگی کہ ہم مرد ہر حد پار کر جاتے ہیں۔

''مرد کو اگر مرد نہ کہتے تو شاید 'مردود' کہتے.....

اللہ پاک اگر شیطان کے بعد کسی کو اپنی مخلوق میں مردود قرار دیتا تو یقیناً مرد ہی ہوتے۔'' میں کتنی دیر رنجیدہ رہا۔ اُس کی بے بس موت بلکہ قتل پر آنسو بہاتا رہا۔ جب وہ اصلیت جان گئی تو اُس شخص نے اُس لڑکی کا قتل کردیا۔ اپنی ہوس پوری کر کے اُسے مار کر الماری میں لاش چھپا دی۔ مگر وہ بے چاری بھٹکتی رہی..... مدد مانگتی رہی۔

☆.....☆.....☆

اس واقعے کو 7 سال گزر چکے ہیں۔ میں نے خوابوں کو کبھی اہمیت نہیں دی تھی۔ اس واقعے نے اظہر من الشمس کی طرح مجھ پر واضح کردیا ہے کہ 'خواب واقعی آدھی زندگی ہوتے ہیں۔'' بہت سے معاملات و واقعات انسانی آنکھ سے اوجھل ہوتے ہیں۔ وہ ہمیں خواب میں دکھائے جاتے ہیں۔ خوابوں کو جھٹلانا' خود سے تعبیریں اخذ کرنا' یہ کہنا کہ ہر خواب کی تعبیر اُس کے برعکس ہوتی ہے یعنی اُلٹی ہوتی ہے یہ سب باتیں سراسر غلط اور بے بنیاد ہیں۔

پورے سات دن میں نے اُس کمرے میں گزارے جہاں ایک لڑکی کی روح میری 'روم میٹ' رہی تھی۔ وہ مجھ سے مدد مانگ رہی تھی..... طلبِ غسل میت اُس بے چاری کو بار بار پانی کی طرف لے جاتی..... واش روم میں پانی گرنے کے پیچھے یہ راز پنہاں تھا..... اللہ کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے۔ اللہ نے مجھے اِس کام کے لیے چُنا..... پہلے خوابوں کے ذریعے مجھے مطلع کیا گیا..... اور جب تک اُسے قبر میں اُتار نہیں دیا اُس نے مجھے ایک کمرے میں قید کردیا اور باہر نکلنے کی ہر سبیل بند کردی..... طوفانی بارشیں ہوتی رہیں مگر جب سارا کام پایہ تکمیل تک پہنچ گیا تو بارش بھی بند ہوگئی اور راستے بھی کھلے گئے..... میں آج بھی اُس واقعے کو سوچتا ہوں تو دل میں انتہائی سکون محسوس کرتا ہوں کہ میں ایک مظلوم کے کام آیا..... اور شکر ہے میں اُن مردوں میں سے نہیں تھا جنہیں حوریہ ذوالقرنین نے اپنی ڈائری میں 'مردود' کہا تھا۔

☆☆.....☆☆

مجھے محبت ہوگئی ہے

مبشر سعید کا شعر

پاس بیٹھے ہوئے آنکھوں نے اُسے دیکھا تھا
مجھ پہ اب تک اُسی حیرت کی فضا طاری ہے

عقیلہ حق

گھر کے چاروں طرف جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں، بوسیدہ لکڑی کے دروازے پر لگا زنگ آلود تالا چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ برسوں سے یا شاید صدیوں سے کبھی اُس کو کھولا نہیں گیا ہے، دیواروں کا پلستر اُکھڑ

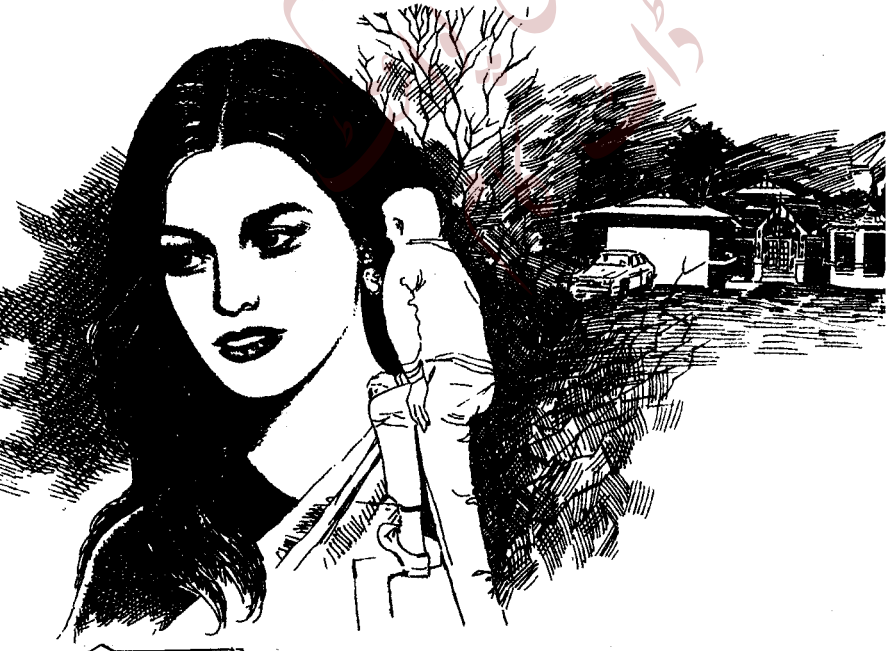

چکا تھا' برآمدے کے ایک ستون پر لگا گارا اور ملبہ جھڑ جھڑ کر گر رہا تھا جھری سے نظر آتی گھانس پر گرگٹ ایسے گھوم رہے تھے جیسے بے خطر ہوں..... بے ترتیب کہیں اُجڑی اور کہیں سے اکھڑی اور سوکھی گھانس..... برسوں سے پانی کو ترستی خشک بنجر روتی سسکتی گھاس اور چرمر سے زمین پر بکھرے پتے' میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا' میں کبھی اُس ہزار گز پر بنے کھنڈر کو دیکھ رہی تھی اور کبھی پیچھے روڈ پر شور مچاتی ہارن بجاتی تیز رفتاری سے گزرتی گاڑیوں کو.....

یہ وہی گھر ہے میرا دماغ ماننے کو تیار نہیں تھا' یہ وہی گھر ہے میرا دل کہہ رہا تھا میں نے ایک دفعہ پھر دل و دماغ کی تکرار سے گھبرا کر برآمدے کی طرف دیکھا اور پھر میری نظر کرسی پر جھولتی اُس لڑکی پر پڑی اور میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

☆.....☆.....☆

میری اور ندا کی دوستی بہت پرانی نہیں تو نئی بھی نہیں تھی۔ میری اور اُس کی دوستی فیس بک سے شروع ہوئی تھی سفید لباس میں لمبے سیاہ بال کھولے' بے حد خوبصورت مسکراہٹ والی اُس لڑکی کو جب میں نے دیکھا تو بے ساختہ فرینڈز ریکویسٹ بھیج دی اور اُس نے بھی فوراً قبول کر لی۔ دوستی تکلفات سے آگے بڑھی تو ایک بڑا حیران کن انکشاف ہوا کہ ندا میرے ہی کالج میں پڑھتی ہے۔ بس دوستی گہری ہونے میں ایک ہی کالج سنگ میل ثابت ہوا۔ اُس نے بتایا کہ اُس کا ایک چھوٹا بھائی بھی ہے اور اس کی امی بہت خوبصورت ہیں' لیکن میں جب بھی اس کے ابا کے بارے میں کوئی سوال کرتی تو وہ ٹال جاتی۔ دراصل کریدنے والی فطرت میری بھی نہیں ہے۔ جب میں نے محسوس کیا کہ اپنے ابا کے بارے میں بتاتے ہوئے وہ کتراتی ہے تو میں نے پوچھنا چھوڑ دیا۔ میں سوچتی شاید اُس کے ابو نے اُس کی امی کو طلاق دے رکھی ہو یا شاید وہ مر چکے ہوں۔ خیر مجھے اِن باتوں میں ایسی کوئی خاص دلچسپی بھی نہیں تھی' مجھے ندا اچھی لگتی تھی اور اچھی لگتی کیا وہ تھی ہی بہت اچھی' بہت پیاری' مخلص اور نرم مزاج.....!

ہم دونوں گھنٹوں لان میں بیٹھ کر گپ شپ لگاتے' ہم فلموں کے بارے میں باتیں کرتے تو اُس کو پرانی فلمیں پسند ہوتیں اور میں نئی فلموں کے قصے سناتی۔

''یار میری سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ تم پاکستان بننے سے پہلے کی فلموں کو کیسے دیکھ لیتی ہو۔ آج کل دیکھو کیسی شاندار موویز بن رہی ہیں۔ تم تو مجھے کوئی آثارِ قدیمہ کی بوڑھی روح لگتی ہو۔'' ایک دن میں نے کہا تو وہ بے ساختہ ہنس دی۔ پھر اُس نے چہرے پر حد درجہ سنجیدگی لا کر عجیب ویران سی آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔

''اچھا..... تو تم نے مجھے پہچان لیا۔'' اور پھر ہنستی چلی گئی۔ اور میں جو اُس کے بدلتے لہجے اور سرد آنکھوں سے ایک لمحے کے لیے ڈر سی گئی تھی ہنس پڑی۔

''توبہ ہے تم نے تو میری جان ہی نکال دی۔'' میں نے رُکی ہوئی سانس لیتے ہوئے اُس سے کہا۔

''نہیں ایکچوئلی میری ممی کو پرانی بلیک اینڈ وائٹ زمانے کی فلمیں پسند تھیں تو میں بچپن میں اُن کے ساتھ بیٹھ کر دیکھتی تھی' اب تو برسوں ہو گئے ہم لوگ ٹی وی ہی نہیں دیکھتے۔'' اُس نے افسردگی سے کہا تھا۔

''یار اِس الیکٹرانک دور میں تم ٹی وی نہیں دیکھتیں۔ موبائل USE نہیں کرتیں۔ حیرت ہے نا..... اس طرح تم زمانے کے ساتھ کیسے چلو گی۔'' میں نے ہمدردی سے اُس کے سرد ہاتھوں کو محبت سے تھامتے ہوئے کہا۔

''میں کیا کروں گی میری جان زمانے کے ساتھ چل کر' میں جہاں ہوں' جس حال میں ہوں ٹھیک ہوں۔'' اُس لمحے خوبصورت آنکھوں میں نمی چھپاتی ندا مجھے بہت دکھی اور افسردہ لگی تھی۔

''چلو دفع کرو کینٹین چلو' گرم گرم پکوڑے کھائیں گے اور ساتھ میں کافی بھی پئیں گے۔'' میں نے کھڑے ہو کر اُس کو ہاتھ پکڑ کر کھڑا کیا اور یوں میری توقع کے مطابق موضوع بدل گیا جو کہ میں چاہتی تھی۔ چاہتی تو میں بہت کچھ تھی۔

☆.....☆.....☆

امی میری دوست ندا کتنی پیاری ہے' کتنی دفعہ آپ اُس سے مل بھی چکی ہیں۔ آپ بھائی کے لیے سارے جہاں میں کیوں لڑکیاں ڈھونڈتی پھر رہی ہیں۔ بس بھیا کی شادی ندا سے کرلیں۔'' اس روز جب ایک رشتے والی نے امی کو ساجد بھائی کے لیے لڑکی دکھانے کو کہا تو میں نے ضد کی۔

''ہاں بیٹا! لڑکی تو بہت سلجھی ہوئی اور پیاری ہے' لیکن بیٹا شادی بیاہ کے معاملات میں صرف لڑکی نہیں دیکھی جاتی۔ بہت کچھ دیکھا اور سوچا جاتا ہے۔ تم خود بتاتی ہو کہ وہ اپنے ابا کے بارے میں کوئی بات نہیں کرتی۔ امی اُس کی کسی سے نہیں ملتیں' تم دس دفعہ گئی ہو تو دو دفعہ اُن سے تمہاری دعا سلام ہوئی ہے' خاندان کیا ہے؟ کون لوگ ہیں؟ کچھ بھی تو نہیں پتا۔'' امی نے سونے کے کنگن کلائیوں میں سجاتے ہوئے مجھے رسان سے سمجھایا۔

''خیر امی مجھے امید ہے اُس کے ابا یقیناً اچھے آدمی نہیں ہوں گے اور رہی بات اُس کی امی کی وہ بہت مصروف رہتی ہیں۔ گھر کے ایک ایک کام خود ہی کرتی ہیں اور ہوسکتا ہے ندا کا خاندان یہاں نہیں رہتا ہو۔ ایک بار میں نے اُس سے پوچھا تھا تو اُس نے کہا تھا کہ اُس کا پورا خاندان ننھیال اور ددھیال یہاں نہیں ہوتے۔'' میں نے ندا کا مکمل دفاع کیا۔

''خیر! ابھی تو میں جارہی ہوں نصیب میں ہوا تو چلے چلیں گے' لڑکی بہت اچھی ہے اس میں کوئی شک نہیں۔'' امی نے کمرے سے باہر نکلتے نکلتے میرے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے محبت سے کہا تھا۔

☆.....☆.....☆

''یار تمہاری گاڑی ہے یا راکٹ۔'' میں نے ندا کے گھر پہنچتے ہی اُس سے کہا۔

''تم نے فون کیا کہ میں گاڑی بھیج رہی ہوں' میں نے فون بند کیا اور تمہاری گاڑی دروازے پر موجود' یقین کرو اتنی بھاگم بھاگ گاڑی میں بیٹھی کے ہیئر بینڈ ہاتھ میں تھا' اور سچ طرح ہیئر بینڈ لگا بھی نہیں پائی کہ تمہارا گھر آ گیا۔'' میں نے پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ بہت حیران لہجے میں کہا۔

''تو دور ہی کتنا ہے تمہارا گھر ایک قدم یہاں تو دوسرا تمہارے گھر پر۔'' ندا نے لاپرواہی سے شیلف میں سے کتابیں ڈھونڈتے ہوئے کہا۔

''خدا کا خوف کرو یار۔ تمہارا گھر گرومند پر ہے اور میرا ناظم آباد میں' اب اتنا بھی قریب نہیں کہ تم ایک قدم یہاں رکھو اور دوسرا میرے گھر میں' سچ بتاؤ تم انسان ہو یا جن۔'' میں نے اُس کی بات کا برا مانتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''میں جن نہیں ہوں میری بہن' لیکن میں انسان بھی نہیں ہوں۔'' مجھے اُس کا لہجہ پُراسرار لگا۔

''کیا مطلب؟'' ایک لمحے کے لیے مجھے اُس سے خوف سا محسوس ہوا۔

''توبہ ہے تم کتنی احمق اور ڈرپوک ہو' یار میں لڑکی ہوں' میں نے اِس Sence میں کہا تھا۔'' میری خوفزدہ شکل دیکھ کر وہ بے ساختہ ہنس دی اور پھر ہنستی ہی چلی گئی۔

ندا کی ہنسی کتنی خوبصورت ہے میں نے ہمیشہ کی طرح اپنے دل میں کہا تھا۔

اُس روز ہمارا کیمسٹری کا پیپر تھا کچھ سوالوں پر ندا مطمئن نہیں تھی اور کچھ جگہوں پر میں پریشان تھی۔ سو ندا نے کہا کہ وہ گاڑی بھیج رہی ہے اور پھر ہم دونوں کمبائن اسٹڈی کرلیں گے یوں اِس وقت میں ندا کے کمرے میں بیٹھی سوالات حل کررہی تھی۔

''کیا کررہی ہو ندا' کیمسٹری کے پیپرز کی تیاری کیوں کررہی ہو' تم پاگل تو نہیں ہو' ہر سال اِس طرح ایگزامز کی تیاری کرتی ہو جیسے تم کو پیپر دینا ہو۔'' ندا کا چھوٹا بھائی شکیل کرکٹ کا بیٹ لیے اندر داخل ہوا اور ہمیں پڑھتے دیکھ کر بولا۔

''چلو جاؤ..... تم کو میں نے منع کیا ہے نا کہ جب میں پڑھ رہی ہوں تو مجھے ڈسٹرب نہیں کیا کرو۔ جب تم اکیلے کھڑے چھکے اور چوکے لگا رہے ہوتے ہو تو میں کچھ کہتی ہوں۔'' ندا نے جھنجلا کر اُس کو ہاتھ کے اشارے سے کمرے سے باہر جانے کا اشارہ کیا۔

''ہاں تو پھر.....''

''یار یہ کیا کہہ رہا تھا تم ہر سال تیاری کرتی ہو۔''
میں ندا اور اُس کے بھائی کی باتوں میں اُلجھی گئی تھی۔ سو میں نے اُس کی بات بیچ میں سے کاٹی۔
''تم نہیں جانتیں یہ بھائی کیسی اوٹ پٹانگ باتیں کرتے ہیں یار' تمہارا بھی تو بھائی ہے تم کو تو عادی ہونا چاہیے اِس قسم کی فضولیات کا' چلو یار پڑھو وقت کم ہے اور مقابلہ سخت۔'' اُس نے کتاب کھولتے ہوئے کہا۔ میں نے سر جھٹکا اور پڑھنے میں مصروف ہوگئی لیکن نہ جانے کیوں ایک اُلجھن تھی میں کچھ سمجھنے سے قاصر تھی۔

☆.....☆.....☆

میری اور ندا کی دوستی دن بدن گہری ہوتی جارہی تھی۔ اگر وہ کسی دن کالج نہیں آتی تو میں گھر نہ آتی بلکہ سیدھی اُس کے گھر پہنچ جاتی۔ مجھے ویسے بھی ندا کا گھرانہ بہت پسند تھا' خوبصورت گول برآمدوں والا بڑا سا بنگلہ جس کی کھڑکیوں پر سفید جالی کے پردے لہراتے رہتے۔
پورے گھر میں گلاب کی خوشبو مہکتی رہتی' ندا کی امی کو گلاب بہت پسند تھے تو وہ ایئر فریشنر گلاب کا استعمال کرتیں اُن کے گھر میں ملازمین نہیں تھے۔ اُس کے باوجود 1000 گز کے وسیع رقبہ پر پھیلا اُن کا گھر ہر وقت صاف ستھرا رہتا۔ اتنا صاف کہ آنکھ میں میل ہو لیکن اُن کے گھر میں میل نہ ہو..... ہمیشہ کھانا وقت پر تیار ہوتا میں وقت بے وقت بہت دفعہ گئی۔ ہمیشہ اُن کی میز لذیذ کھانوں سے سجتی۔ اُس کی امی مدھم لہجے میں ہم سے بہت کم گفتگو کرتیں' لیکن ندا اور شکیل (ندا کا چھوٹا بھائی) کے معاملے میں ہمیشہ بہت حساس رہتیں' ایک لمحے کے لیے دونوں ذرا سا بھی آنکھوں سے اوجھل ہوجاتے تو اُس کی امی گھبرا کر آوازیں دینے لگتیں' میں اکثر سوچتی یا اللہ ایسی بھی کیا بے صبری یا محبت' میں اکثر ندا سے کہتی۔
''یار تمہاری امی تم لوگوں کے بارے میں اتنی حساس ہیں' تم کو کالج کیسے بھیج دیتی ہیں؟'' تو ندا ہنس کر کہتی۔
''کیونکہ میں بیک وقت کالج میں بھی ہوتی ہوں اور گھر میں بھی۔''
''کیا مطلب؟'' میں چونکتی۔ تو ندا ایک زوردار تھپڑ میری کمر پر مار کر کہتی احمق ایسا ہوسکتا ہے جو مطلب پوچھتی ہو..... میں کالج میں ہوتی ہوں تو گھر پر میری تصویر ہوتی ہے۔ اور پھر میں خود ہی اپنے سوال اور اپنی حیرت پر شرمندہ ہوجاتی۔ ویسے یہ حقیقت ہے کہ ندا کی امی دوسری ماؤں سے مجھے ہمیشہ مختلف لگتیں۔

☆.....☆.....☆

''یار یہ سب کیا ہے؟'' ایک روز میں نے خوف اور حیرت کے ملے جلے انداز میں کھڑکی سے جھانکتی ندا سے پوچھا تھا۔
''یہ.....!'' ندا کی آنکھوں نے سوال کیا۔
''ہاں..... یہ صاحب کون ہیں اور اُن کے ساتھ؟''
''یہ میرے ابو ہیں۔'' ندا میرا سوال مکمل ہونے سے پہلے ہی رو پڑی تھی۔
''تمہارے ابو.....!'' میری آواز جیسے حلق میں پھنس سی گئی تھی۔
اُس روز جب ندا کالج نہیں آئی تھی تو میں کالج سے سیدھی اُس کے گھر چلی آئی۔ ندا کی امی جن کو میں نے کبھی لان میں نہیں دیکھا تھا' جن کی آواز کی نرمی اور دھیما لہجہ ہمیشہ مجھے متاثر کرتا تھا۔ وہی ندا کی امی ہاتھ میں کلہاڑی اٹھائے چیخ رہی تھیں' اور وہ بہت سوبر سی پرسنالٹی والے صاحب اُن کے ساتھ ایک مڈل ایج خاتون اور ایک کافی گریس فل خاتون تھیں' وہ ہاتھ جوڑ جوڑ کر منتیں کررہے تھے کہ اُن کو اندر آنے دیا جائے۔ وہ ہاتھ جوڑ رہے تھے..... وہ رو..... رہے تھے..... وہ کہہ رہے تھے۔
''ہم سب مل کر رہیں گے..... تم کو ہم سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔'' لیکن ندا کی امی ایک لفظ سننے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ وہ انہیں گیٹ کے اندر قدم رکھنے نہیں دے رہی تھیں' مجھے ایسا لگا جیسے اگر میں آگے بڑھی تو شاید کلہاڑی کے وار سے وہ میرے سر کے بھی دو ٹکڑے کردیں گی' لیکن جیسے ہی میں اُن لوگوں کے

[illegible] پہنچی' وہاں خاموش ہوگئی' ندا کی امی نے بڑی اپنائیت سے ہمیشہ کی طرح میرے لیے گیٹ کھولا۔ میں ایک ہپناٹائزی کیفیت میں گھر میں داخل ہوگئی اور [illegible] لکڑی کا وہ منقش جالی دار گیٹ ایک زوردار آواز کے ساتھ بند ہوگیا۔

میرے قدم ایک سحر زدہ سی کیفیت میں آگے بڑھ رہے تھے لیکن میں بار بار پیچھے مڑ مڑ کر دیکھ رہی تھی۔ یہ سب کیا تھا۔ ندا کی امی کا یہ کون سا روپ تھا؟ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھی' اور ندا کہہ رہی دروازہ پر کھڑا اتہاتھ جوڑتا شخص اُس کا باپ ہے۔

''ایکچوئلی ابو نے دوسری شادی کرلی ہے' اُن کے ساتھ اُن کی ساس اور اُن کی نئی بیوی تھیں۔ یہ گھر ابو مہر میں امی کے نام کرچکے ہیں۔ اب ابو اپنی ہی بیوی کے ساتھ واپس آنا چاہتے ہیں اور امی یہ ہونے نہیں دیں گی۔ بس یہی جھگڑا تھا۔'' کئی دنوں سے میرے دماغ میں اٹھتے سوالوں کا ندا نے کالج کینٹین میں بھاپ اڑاتی چائے کے کپ پر نظریں جمائے دیا تھا' اُس لمحے بھاپ سے دھندلاتے ماحول میں سردی کی وجہ سے پھیلی دھند میں نہ جانے کیوں ندا مجھے بہت عجیب سی لگی تھی۔

بے چاری ندا باپ کی موجودگی میں یتیموں کی طرح رہ رہی ہے' اب جو ہونا تھا ہوچکا' ندا کی امی کو اب سمجھوتہ کرلینا چاہیے۔ لیکن پتہ نہیں اُن کے کیا پرسنل میٹرز ہیں' وہ اس قدر ہائپر تھیں کہ ایک بات سننے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ اللہ پاک سب کی پریشانیوں اور تکلیفوں کو اپنی رحمت خاص سے دور کرے..... سر جھکائے اُداس بیٹھی ندا پر نظریں جمائے جمائے میں نے اپنے دل میں کہا تھا۔

☆.....☆.....☆

میرے دل میں ندا کے لیے محبت اور ہمدردی دن رات بڑھ رہی تھی' مجھے زندگی میں پہلی بار احساس ہوا بڑے بڑے گھر اور شاندار گاڑیاں خوشیوں کی ضامن نہیں ہوتیں۔ ندا کی امی کتنی خوبصورت ہیں' کتنی محنت اور محبت سے اپنے بچوں کی تربیت کررہی ہیں' گھر کے سارے کام سنبھالے ہوئے ہیں' کوئی نوکر چاکر نہیں ہے سارا کام خود کرتی ہیں' اگر وہ اُس کے ابو پر اس قدر ہائپر ہورہی تھیں تو یقیناً کوئی بہت بڑی بات ہوگی ورنہ میں نے تو کبھی اُن کو اونچی آواز تو بڑی بات بات کرتے ہوئے ہی کم دیکھا تھا۔

☆.....☆.....☆

''امی ایک بار آپ چلیں تو سہی.....'' میں امی سے بضد تھی کہ وہ ساجد بھائی کے لیے ایک دفعہ ندا کو دیکھ لیں' یوں تو امی کئی بار ندا سے مل چکی تھیں لیکن اِس نظر سے کبھی اُس کو نہیں دیکھا تھا۔

''یہ تم کیا ہر وقت ندا..... ندا گاتی رہتی ہو' مجھے نہیں کرنی اُس سے شادی۔'' ساجد بھائی جو بہت توجہ سے مجھے ایک ٹاک شو دیکھ رہے تھے مڑ کر بولے۔

''کیا مطلب؟'' ندا کے بارے میں اِس طرح بولنا مجھے بے حد برا لگا۔

''کیا کمی ہے ساجد بھائی اُس میں' بے حد شائستہ' مہذب' پنج وقتہ نمازی' خوبصورت اور کیا چاہیے آپ کو.....'' میں نے جل کر ساجد بھائی پر سوالوں کی بوچھاڑ ہی کردی۔

''آپ نے دیکھا ہے ندا کو کتنی پیاری ہے؟'' میں ساجد بھائی کے سر پر کھڑی سوال کررہی تھی۔

''مجھے دیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی میں نے دیکھا ہے۔ بس جس کو دیکھنا ہے اُس کو میں دیکھ چکا۔'' ساجد بھائی نے آخر بلی تھیلے سے نکال ہی دی تھی۔

''کیا مطلب؟'' میرے ساتھ امی بھی چونکیں۔

''امی..... ایک لڑکی ہے میں نہیں جانتا اُس کا نام کیا ہے؟ وہ کون ہے؟ چھ ماہ سے اتفاقاً ہر جگہ وہ مجھ سے ٹکرا جاتی ہے۔ کبھی راستے میں' کبھی شاپنگ مال میں' کبھی بینک میں' اور بس نہ جانے کیسے مجھے اُس سے بہت محبت ہوگئی ہے' میں نے کبھی اُس سے بات نہیں کی' میں اُس کا نام تک نہیں جانتا' لیکن ہاں اُس کو Follow کرکے میں نے اُس کا گھر دیکھ لیا ہے۔ امی میں اُس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

امی خاموش تھیں..... اور میں ساجد بھائی کی عجیب وغریب محبت کی کہانی سانس روکے سن رہی

تھی۔

''نہ اتہ پتہ' نہ جان پہچان' نہ جانے کون ہے؟ کیسی ہے؟ ہم کیسے اُس سے تمہاری شادی کر دیں؟'' آخر کار امی نے خاموش کو توڑا تھا۔

امی میں نے ایک دفعہ اُس کی خاموشی سے موبائل کیمرہ سے تصویر لی تھی' میں آپ کو دکھاتا ہوں..... ساجد بھائی موبائل فون میں اُس کی تصویر تلاش کرنے لگے۔

''یا اللہ یہ ساجد بھائی کتنے گہرے نکلے' خود ہی خود راہ چلتے لڑکی پسند کر لی' میرے کون سے دس بارہ بھائی ہیں کہ چلو یہ نہ سہی کوئی اور سہی' ایک ہی تو میرے بھائی ہیں' کتنی خواہش تھی میری..... ندا کو بھابی بنانے کی۔''

اُس اَن دیکھی لڑکی پر مجھے بے اختیار غصہ آنے لگا تھا۔

''لو ندا تصویر دیکھو۔'' امی نے بھیا کا موبائل میری طرف بڑھایا تھا۔

''میں نہیں دیکھ رہی۔'' میں نے بیزاری سے کیا تھا لیکن جب میری نظر تصویر پر پڑی تو.....

☆.....☆.....☆

''تمہارا دماغ خراب ہے کیا؟'' ندا میری بات سن کر اچھل ہی تو پڑی تھی۔

''اس میں دماغ خراب ہونے کی کیا بات ہے تم مجھ کو میری امی کو سب سے زیادہ میرے بھائی کو بہت پسند ہو اور میں تم کو اپنی بھابی بنانا چاہتی ہوں۔ اس لیے میں اپنی امی کے ساتھ تمہارے گھر آنا چاہتی ہوں۔'' میں نے آرام سے چیونگم چباتے ہوئے اُس کے غصے کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے کہا تھا۔

''یہ ناممکن ہے شازیہ..... تم نہیں جانتیں' میں شادی نہیں کر سکتی' ممی تو میرا گھر سے باہر نکلنا بالکل پسند نہیں کرتیں برسوں میں نے اُن کی منت وسماجت کی تو مجھے اپنوں نے باہر نکلنے اور تم سے دوستی کی اجازت دی' تم خود جانتی ہو انہوں نے مجھے کبھی تمہارے گھر تک نہیں آنے دیا۔ اگر اُن کو تمہارے ارادے کا علم ہو گیا تو یقین کرو وہ میری تمہاری دوستی

غزل

کہاں کوئی بدن کا بوجھ اُتارے
سمندر کیا ہوئے تیرے کنارے

یہ پانی اب مُقدر ہو چکا ہے
مگر جو ساحلوں پر دِن گزارے

یہاں تو دُوسرا کوئی نہیں ہے
کوئی اپنے سوا کس کو پُکارے

رواں ہیں آخرِ شب کے مُسافر
مگر اب ڈوبتے جاتے ہیں تارے

ظفر یہ بادباں ہی جانتا ہے
ہواؤں نے کئے ہیں کیا اشارے

صابر ظفر

ندا سیکنڈ میں ختم کروادیں گی۔''

''ارے یار تمہاری شادی کہیں نہ کہیں تو ہوگی نا تو پھر میرے بھائی سے کیوں نہ ہو؟'' میں بضد تھی۔

''شازیہ میری شادی نہیں ہوسکتی۔'' ندا رو دینے والی ہوگئی تھی۔

''کیوں؟ کیوں نہیں ہوسکتی؟ ارے میری بہن تم اس دنیا میں رہتی ہو تو شادی تو ہوگی نا۔'' میں ہنسی تھی۔

ندا چند لمحوں تک ساکت نگاہوں سے مجھے دیکھتی رہی تھی اور پھر خاموشی سے اٹھ کر چل دی۔ اور میں حیران سی اُس کے قدموں کی لڑکھڑاہٹ دیکھتی رہ گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

میں کبھی گھر کے مقفل بوسیدہ دروازے کو دیکھتی اور کبھی حیران کھڑی امی اور ساجد بھائی کو.....!''

''یہی گھر ہے۔'' میں نے امی کو یقین دلانا چاہا۔

''ہاں گھر تو یہی تھا۔'' ساجد بھائی بھی جیسے اپنے آپ سے بولے تھے۔

''بے ربط' اونچی اونچی جھاڑیاں ستونوں کا اُکھڑا پلستر اندر دروازے کے آگے گرا تناور درخت جو یہ ثابت کررہا تھا کہ یہ دروازہ برسوں سے نہیں کھلا تیز ہواؤں کے سبب عجیب پُراسراریت پیدا کرتے لہراتے اونچے اونچے درخت' اندھیرا گھپ زنگ آلود لوہے کا کٹہرا..... میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا یہ رات ہی رات میں کیسے ہوگیا کل تو اِس دروازے سے میں اندر گئی تھی۔

نرم صوفوں پر بیٹھ کر آتشدان کے قریب دبیز قالین پر پیر جما کر میں نے بیٹھ کر کافی پی تھی' دیر تک گپ شپ لگائی تھی ندا کی امی نے گرم گرم سوپ بنایا تھا' جو میں نے فرمائش کرکے دوبارہ پیا تھا اور جب میں نے واپسی کا ارادہ کیا تھا تو ندا نے بہت محبت سے ایک قیمتی گرم شال میرے کندھے پر پھیلاتے ہوئے کہا تھا باہر سردی ہوگی یہ اوڑھ لو..... اور وہ شال اب بھی میرے شانوں پر پھیلی ہوئی تھی۔ میں ندا کے لاکھ منع کرنے کے باوجود آج امی اور ساجد بھائی کے ساتھ اُس کی امی سے ملنے آئی تھی۔ حیرت اور اتفاق کی بات یہ تھی کہ جس لڑکی کو ساجد بھائی دل میں بسائے پھر رہے تھے وہ ندا ہی تھی..... لیکن یہ کیا؟ ہم تینوں کے سوالیہ چہرے ایک دوسرے سے سوال کررہے تھے۔

''خیریت! آپ لوگ یہاں کیسے کھڑے ہیں؟'' ایک صاحب نے جو شاید اُسی اسٹریٹ پر رہتے تھے ہمارے پاس آکر پوچھا تھا۔

''یہاں میری دوست رہتی ہے۔ میں کل شام کو ہی یہاں ہوکر گئی ہوں۔'' مجھے اپنی آواز خود خلاؤں سے آتی محسوس ہوئی تھی۔

''بی بی یہ گھر برسوں سے ویران پڑا ہے' ہم اپنے باپ دادا سے سنتے آئے ہیں کہ یہ گھر آسیب زدہ ہے' راتوں کو یہاں ہنسنے کی' کھیلنے کی اور کبھی کبھی میاں بیوی کے جھگڑے کی آوازیں آتی ہیں سارا محلہ سنتا ہے۔ مغرب کے بعد تو کوئی اِس گھر کے سامنے سے بھی نہیں گزرتا..... اور آپ یہ کہہ رہی ہیں کل شام آپ اِس گھر کے اندر تھیں۔'' وہ صاحب خوفزدہ ہونے کے ساتھ ساتھ میری دماغی حالت پر مشکوک بھی تھے۔

وہ صاحب کب کے جاچکے تھے امی اور ساجد بھائی عجیب گومگو سی حالت میں گاڑی میں بیٹھ چکے تھے۔ میں نے گاڑی میں بیٹھتے بیٹھتے ایک ہیبناٹائز سی کیفیت میں دوبارہ اُس کھنڈر کی طرف دیکھا تھا جو کل تک ایک جگمگاتا ہوا گھر تھا اور پھر میری نظر ٹیرس میں کرسی پر بیٹھی ندا پر پڑی تھی۔

''ندا.....!'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا اور میں نے گواہی کے طور پر امی اور ساجد بھائی کی طرف دیکھا تھا' اِس سے پہلے وہ دونوں مجھے پاگل سمجھنے لگتے میرے موبائل کی گھنٹی بجی تھی اور اسکرین پر ندا کا نمبر جگمگا رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

''زمانہ ہوگیا ہم کو مرے ہوئے۔ میں اور میرا بھائی شکیل امی اور ابو کے ساتھ اِس گھر میں رہتے تھے۔ ہمارا گھرانہ ایک مثالی محبت بھرا گھرانہ تھا۔ میرے ابو..... میری امی کو بے حد چاہتے تھے..... پھر ہمارے گھر کو نظر لگ گئی..... میرے ابو کا ایک لڑکی سے

افیئر چل گیا اور انہوں نے دوسری شادی کر لی' یہ گھر میری امی کا تھا۔ میری امی کو سخت صدمہ ہوا اور انہوں نے ابو کی بے وفائی کا جواب اس طرح دیا کہ اُن سے ہر قسم کا تعلق ختم کر لیا۔ اور ابو نے بھی ہم کو چھوڑ دیا..... میں اپنی امی کا وہ دکھ ایک بیٹی کی حیثیت سے اچھی طرح سمجھ سکتی تھی' امی ہماری ماں بھی بن گئیں اور باپ بھی..... کچھ عرصے کے بعد ابو کو احساس ہوا' اُن کو امی کی قدر اور ہماری محبت کی پہچان ہوئی' لیکن امی کسی قسم کا سمجھوتہ کرنے کے لیے تیار نہیں تھیں' ابو کی دوسری بیوی ماں نہیں بن سکتی تھی' ابو..... ہمارے لیے تڑپنے لگے۔ ابو نے ہماری کسٹڈی کے سلسلے میں کورٹ کا رخ کیا اور کورٹ نے ابو کے حق میں فیصلہ سنا دیا۔ امی تو جیسے پاگل سی ہو گئیں۔

نہ وہ ہمارے بغیر اور نہ ہی ہم اُن کے بغیر رہ سکتے تھے۔ وہ رات قیامت کی رات تھی' جس کے ختم ہونے پر طلوع ہونے والی صبح کو ابو ہم کو لے جاتے اور پھر امی نے دودھ میں زہر ملا کر ہم کو پلا دیا اور خود بھی پی لیا..... ہم باپ کے گھر جانے کے بجائے اپنی ماں کے ساتھ اُن کی آغوش میں موت کی وادی میں جا سوئے۔''

''قسمت دیکھو ابو جو صبح بہت خوش خوش اپنی دوسری بیوی اور ساس کے ساتھ ہم کو ہماری امی سے چھیننے آ رہے تھے اُن کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا اور وہ سب مر گئے۔''

ہمارے جسم بظاہر اس گھر سے باہر نکل کر منوں مٹی تلے جا سوئے ہیں' لیکن زمانہ گزرا آج بھی ہم اس گھر میں رہتے ہیں سردیوں کی شاموں میں امی چکن سوپ بناتی ہیں اور گرمی کی دوپہروں میں ہم تینوں ٹھنڈا مینگو فیک پیتے ہیں'' ہم ہنستے ہیں' ہم کھیلتے ہیں' ہم روتے ہیں' ہم ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے..... جیسا کہ تم نے دیکھا تھا کہ میرے ابو گھر کے اندر آنے کے لیے گڑگڑا رہے تھے..... وہ چاہتے ہیں اُن کی دوسری بیوی' وہ اور اُن کی ساس' وہ سب بھی یہ پھاٹک کراس کر کے گھر کے اندر آ جائیں اور پھر ہم سب مل کر ساتھ رہیں لیکن امی نے کبھی اُن کو گھر میں داخل نہیں ہونے دیا' اُن کی روحیں بھٹکتی ہیں' لیکن امی اُن کو معاف کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں..... ایک زمانہ گزر گیا تھا میں کبھی گھر سے باہر نہیں نکلی تھی میری بہت ضد سے مجبور ہو کر امی نے مجھے باہر جانے کی اجازت دی اور پھر مجھے تم مل گئیں' تم بہت اچھی ہو' تمہاری امی بہت اچھی ہیں اور پتہ ہے سب سے زیادہ حیران کن بات یہ ہے کہ مرنے کے برسوں بعد مجھے ساجد سے محبت ہو گئی ہے۔''

میں ساکت کان موبائل سے لگائے اُس کی باتیں سن رہی تھی۔ امی آیۃ الکرسی پڑھ رہی تھیں اور مجھ پر پھونکیں مار رہی تھیں کہ میں ایک بھٹکتی روح کے ساتھ تعلق جوڑے پھر رہی تھی ساجد بھائی سر جھکائے خاموشی سے گاڑی ڈرائیو کر رہے تھے۔ ہم اُس آسیب زدہ گھر سے بہت دور نکل آئے تھے' لیکن ندا' ہاں ندا گاڑی کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی اس کے کان سے فون لگا ہوا تھا وہ مجھ سے باتیں کر رہی تھی۔

میں نم آنکھوں سے اُس کو ہوا میں چلتا ہوا دیکھ رہی تھی مجھے اُس سے کوئی خوف' کوئی ڈر محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

''تم بہت اچھی ہو میری دوست! ساجد کی شادی کسی بہت اچھی سی لڑکی سے کرنا' میں واپس جا رہی ہوں اب شاید کبھی بھی میں اُس گھر سے باہر نہ نکل سکوں۔ لیکن ہاں..... ایک زمانے کے بعد بھی مجھے احساس ہوا..... محبت زندہ ہے۔ محبت باقی ہے۔''

وہ پلٹ گئی..... میرا دل چاہا اُس سے لپٹ کر بہت روؤں' میں اُس کو روک لوں' لیکن نہیں' میں اُس کو روک نہیں سکتی تھی' میں اُس سے لپٹ نہیں سکتی تھی۔

وہ ہوا میں تحلیل ہو گئی تھی اُس کے وجود کو ہوا میں تحلیل ہوتا دیکھ کر میں پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ مجھے روتا دیکھ کر میری سیدھی سادی ماں گھبرا گئیں' وہ سمجھیں شاید مجھ پر آسیب ہو گیا ہے وہ با آواز بلند آیۃ الکرسی پڑھنے لگیں..... لیکن میں اُن کو کیا بتاتی..... مجھے کچھ نہیں ہوا..... مجھے تو اُس سے محبت ہو گئی تھی..... جو صدیوں بعد اپنے گھر سے محبت ڈھونڈنے نکلی تھی۔

☆☆.....☆☆

روحانی رشتہ

وصی شاہ کا شعر

آنکھوں سے میرے اس لیے لالی نہیں جاتی
یادوں سے کوئی رات جو خالی نہیں جاتی

الماس فاطمہ ارمان

یہ کہانی انڈیا کے مشہور شہر آگرہ سے آئی ہے۔ پہلے اپنی دوست رضیہ کو وصیت کی تھی کہ میری داستان اور جس لڑکی سعدیہ کی یہ کہانی ہے اُس نے مرنے سے کسی طرح الماس باجی تک پہنچا دینا۔ میں نے اُن کی

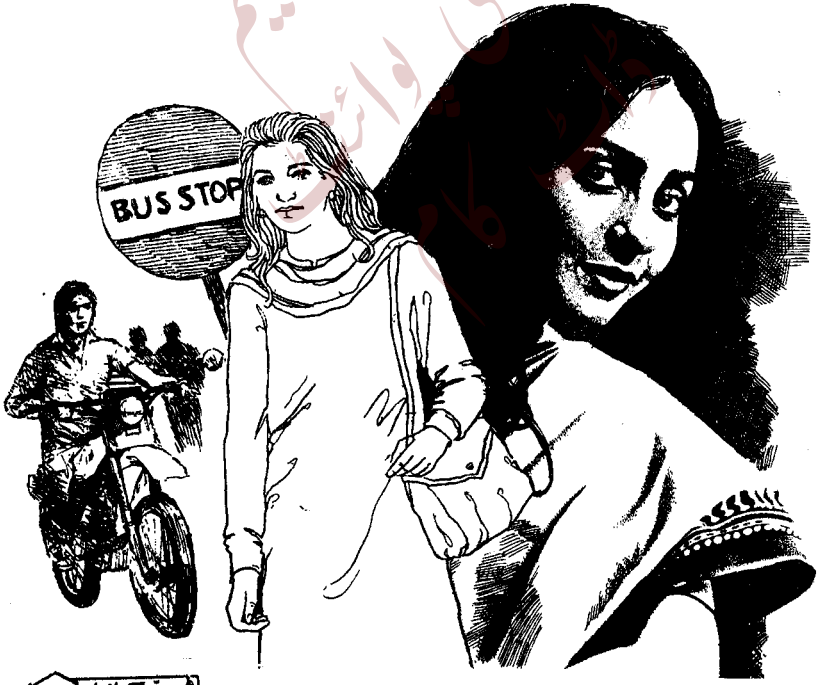

کہانیاں پڑھی ہیں' میں اُن کی فین ہوں' اُن کی ہر کہانی بہت سبق آموز ہوتی ہے۔

سعدیہ کا اب سے تقریباً چھ مہینے پہلے انتقال ہو چکا ہے۔ مرحومہ کی دوست رضیہ نے نیٹ کے ذریعے فیز بک پر مجھ سے رابطہ کیا' میری بیٹی نے مجھے اس رابطے کے متعلق بتایا اور رضیہ کا فون نمبر بھی دیا' اس طرح میری رضیہ سے بات ہوئی اور اس نے مجھے سعدیہ مرحومہ کی جو آپ بیتی سنائی وہ میں مرحومہ کے الفاظ میں ہی بیان کر رہی ہوں۔

میرا نام سعدیہ ہے میں مسلم گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں میرے والد صاحب مسجد میں بچوں کو قرآن پڑھاتے اور اذان دیتے تھے۔ وہ نماز روزے کے ساتھ ساتھ پردے کے بھی بہت پابند تھے' جب میں چوتھی کلاس میں تھی تو مجھے برقعہ میں اسکول جانا پڑتا تھا۔ سب لڑکیاں میرا مذاق اڑاتی تھیں۔

میری کلاس میں ہندو مسلم عیسائی سب لڑکیاں پڑھتی تھیں۔ ہم سب آپس میں بہت اتفاق سے رہتے' اُوشا میری بہت گہری دوست تھی وہ کہتی۔

''بھگوان دل میں بستا ہے' اِن پتھروں میں نہیں سب کا بھگوان ایک ہے۔''

میں جو گھر سے لاتی وہ میرے ساتھ مل کر کھاتی بس وہ گوشت نہیں کھاتی تھی۔ اُس کے ممی پاپا بھی اچھے تھے' اُس کا بڑا بھائی اشوک اکثر اُسے اسکوٹر پر اسکول لینے آتا تھا تو اُوشا مجھے بھی اپنے ساتھ بٹھا لیتی تھی۔ میں گھر آنے سے پہلے ہی اتر جاتی تھی کہ کہیں ابا جان نہ دیکھ لیں' اشوک مجھے ہمیشہ بہت پیار بھری نظروں سے دیکھتا تھا یہ بات اُوشا نے بھی محسوس کی تھی۔

وقت پر لگا کر اڑ جاتا ہے' میں نے میٹرک کر لیا تھا' میرے اور اُوشا کے راستے الگ ہو چکے تھے' وہ میٹرک کے بعد اپنی نانی نانا کے پاس کینیڈا پڑھنے کے لیے چلی گئی تھی۔ میں نے کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔ مجھے کالج بس میں جانا پڑتا تھا بس اکثر کافی دیر کے بعد پوائنٹ پر آتی' ایک دن بس کے انتظار میں کھڑی تھی کہ ایک کار میرے آگے رُکی تھی۔

''ہیلو..... سعدیہ کیا حال ہے تم تو مجھے بالکل بھول ہی گئیں مگر میں نہیں بھولا۔'' آنے والا اشوک تھا۔

''آؤ کھڑی کیوں ہو گاڑی میں بیٹھو۔'' میں بیٹھ گئی اور وہاں سے میری اور اشوک کی کہانی شروع ہوئی تھی' اشوک نے مجھے اپنے جال میں کچھ ایسا پھنسایا تھا کہ میں اپنی سُدھ بدھ کھو بیٹھی تھی۔ ایک دن وہ مجھے کہنے لگا۔

''سعدیہ میں نے تمہارے لیے فلیٹ خریدا ہے' چلو میں تمہیں تمہارا فلیٹ دکھاتا ہوں میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں' مجھے معلوم ہے تمہارے مسلمان ہونے کی وجہ سے یہ ناممکن ہے' اس کے لیے مجھے اور تمہیں کورٹ میرج کرنا پڑے گی۔''

''اشوک تمہیں معلوم ہے میں مسلم کلچر سے تعلق رکھتی ہوں۔'' میں اُسے سمجھانا چاہ رہی تھی۔

''سعدیہ مجھے مسلم کلچر بالکل پسند نہیں مگر میں تم سے اور تمہارے اس حسین چہرے سے محبت کرتا ہوں۔ اس لیے مجھے منظور ہے' شادی کے بعد تم اپنے کلچر کو اپنانا مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

جب ہم فلیٹ پر پہنچے تو میں بہت خوش ہوئی فلیٹ بہت ہی خوبصورت تھا اشوک نے اُسے بہت اچھی طرح فرنشڈ کیا تھا اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اشوک کولڈ ڈرنک لے آیا اُس نے مجھے بھی پیش کی' پینے کے ذرا دیر بعد ہی مجھ پر مدہوشی طاری ہو گئی تھی اور بس اشوک نے میری عزت کی دھجیاں بکھیر دی تھیں۔

جب مجھے ہوش آیا تھا تو مغرب بھی ہو چکی تھی' میں یہ سوچ کر پریشان ہو گئی تھی کہ ابا اماں پر قیامت گزر گئی ہوگی کہ سعدیہ کہاں چلی گئی' میں نے دروازہ کھولنا چاہا تو وہ لاک تھا باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں ڈر کے مارے رونے اور اللہ سے فریاد کرنے لگی تھی۔

''اے اللہ تو گناہوں کو معاف کرنے والا ہے' مجھے معاف کر دے' اس دلدل سے نکلنے کا کوئی راستہ دکھا۔''

میں رو رو کر فریاد کر رہی تھی کہ مجھے دوسرے کمرے سے کسی کی آواز سنائی دی تھی۔

''اِدھر آؤ سعدیہ بیٹی!'' میں فوراً اُس کمرے کی

طرف بھاگی تھی' جب میں کمرے میں پہنچی تو دیکھا ایک بزرگ جائے نماز بچھائے نماز پڑھ رہے ہیں۔ سلام پھیرنے کے بعد انہوں نے میری طرف دیکھا خوف کے مارے میری چیخ نکل گئی وہ بزرگ تو تھے مگر اُن کے چہرے کے خدوخال ایک مردہ انسان جیسے تھے۔

''تم مجھ سے ڈرو مت' میں سخاوت علی ہوں یہ فلیٹ میرا ہی تھا' چند مہینے پہلے اِسے اشوک اور اُس کے دوست نے مل کر میری بیوی سے خریدا ہے' میری بیوی اور میرے بھائی نے جائیداد کی وجہ سے مجھے زہر دے کر مارا ہے اور اسی فلیٹ کے اِس کمرے میں میرے ٹکڑے کر کے کمرے کے فرش میں دبا کر انہوں نے اوپر ٹائیل لگا دیئے' ٹائیل لگانے کے کام سے میرا نکما بھائی واقف ہے۔ اِس لیے یہ راز کسی کو پتہ نہیں چلا میری کوئی اولاد نہیں تھی' میں نے بیوی کو ہر طرح سے عیش اور آرام میں رکھا' مگر وہ مجھے یہی کہتی تھی۔

''تم اولاد نہیں دے سکتے۔'' میں ایک بڑا بزنس مین تھا' میں چاہتا تو دوسری شادی کر سکتا تھا میرے پاس دولت کی کمی نہیں تھی' مگر میں اپنے اللہ سے ڈرتا تھا میں نماز کا روزے کا پابند تھا' میں کسی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا تھا' میری اِسی نیکی نے مجھے اس حال پر پہنچایا' وہ دونوں دولت سمیٹ کر کہیں چلے گئے ہیں اور میری روح یہاں بھٹک رہی ہے' میں نے کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچایا اگر میں برا ہوتا تو بہت کچھ کر سکتا تھا' بیٹی! اشوک بہت عیاش آدمی ہے' وہ یہاں روز ایک لڑکی لاتا ہے اور عیاشی کرتا ہے اور فلیٹ سے چلا جاتا ہے' میں کبھی اُس کمرے کی طرف نہیں گیا وہ ناپاک جگہ ہے تمہارے اللہ سے رو رو کر فریاد کرنے سے میرا کلیجہ ہل گیا' مجھے پتہ ہے تم نیک ماں باپ کی اولاد ہو' مگر تم اشوک کی وجہ سے بہک گئیں اب تم بہت حوصلے سے کام لو اگر تم نے جرأت سے کام نہیں لیا تو وہ تمہیں کسی کے ہاتھ بیچ دے گا' اُس کا کام یہی ہے' میں جیسا کہتا ہوں ویسا کرو' اشوک ابھی رات کو پھر آئے گا اور شاید اپنے ساتھ دوستوں کو بھی لائے تم وقتی طور پر اُس کے رنگ میں رنگ جانا' ابھی تم ایسا کرو جیسا کہ وہ اب بھی تمہارے لیے قابل اعتبار ہے۔ تم کچن میں جاؤ وہاں فریج میں پھل وغیرہ رکھے ہیں تم کھا کر تازہ دم ہو جاؤ تھوڑا آرام بھی کر لو' جب اشوک اور اُس کے دوست آئیں تو خوش دلی سے انہیں فریج میں رکھی ہوئی شراب پیش کرو انہیں اتنی پلاؤ کہ وہ مدہوش ہو جائیں وہاں بیڈ کے پیچھے ایک موٹا سا ڈنڈا رکھا ہے' بس تم اُن کی مدہوشی سے فائدہ اٹھا کر اُن پر اس طرح وار کرنا کہ وہ زخمی ہو جائیں تم اشوک سے چابی حاصل کر کے اُن کو کمرے میں بند کر دینا' اور یہاں سے بھاگ جانا اور ہاں کچن کے برابر میں ایک کمرہ ہے اس میں ایک الماری ہے اشوک اُس الماری کی چابی کمرے میں رکھے گلدان کے اندر رکھتا ہے اس الماری میں اشوک اپنے لیے وہ رقم جمع کرتا ہے جس سے وہ عیاشی کرتا ہے تم کچھ رقم وہاں سے نکال لو تاکہ جاتے ہوئے اپنے ساتھ لے جا سکو' یہاں سے کچھ دور ہی بس اور ریلوے اسٹیشن ہے تم سیدھی بمبئی چلی جانا وہاں میرا چھوٹا سا فلیٹ ہے۔ میری بیوی کو اس فلیٹ کے بارے میں نہیں معلوم تھا۔'' یہ کہہ کر انہوں نے جائے نماز کے نیچے سے چابی نکال کر مجھے دی تھی۔

''تم دیر مت کرو کمرے میں جا کر پیسے اور کچھ لیڈیز کپڑے بھی ہیں نکال کر کسی مناسب جگہ پر چھپا دو اور آنے والے وقت کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

میں نے بہت تیزی سے کمرے کا رخ کیا تھا گلدان میں سے چابی لی تھی۔ اور الماری سے کچھ کپڑے' ایک بیگ اور رقم نکالی تھی جو کہ بیس ہزار کے لگ بھگ تھی۔ وہ بیگ میں نے دروازے پر پڑے پردے کے پیچھے چھپا دیا تھا۔

رات تقریباً گیارہ بجے دروازہ کھلنے کی آواز آئی تھی میں نے اشوک کا مسکراتے ہوئے استقبال کیا تھا۔

''اشوک میری جان تم مجھے چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے دیکھو میں نے تمہاری خاطر اپنا گھر ماں باپ سب چھوڑ دیے تم پھر مجھے اکیلے فلیٹ میں بند کر کے کیوں چلے گئے' مجھے ڈر لگ رہا تھا۔''

اشوک نے مجھے بہت حیرانی سے دیکھتے ہوئے کہا

تھا۔

''ارے نہیں سعدیہ! گھر سے میرا فون آ گیا تھا' تم سو رہی تھیں میں اس لیے گھر کو لاک کر کے چلا گیا تھا میرے ساتھ میرا دوست راجن بھی آیا ہے' وہ تم سے مل کر بہت خوش ہوگا۔ وہ کورٹ میں ہمارا گواہ بھی بنے گا۔'' اسی وقت راجن کمرے میں داخل ہوا تھا وہ پہلے ہی نشے میں تھا اور مجھے بری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''یار سعدیہ! فریج میں سے ہماری ڈرنک تو لے آ ذرا اس خوشی میں جشن ہو جائے' یار تم بھی میرے ساتھ ہی پینا۔''

میں ڈرنک لے آئی اور اُن کو پیگ بنا کر دیتی رہی۔ وہ دونوں نشے میں دھت ہو گئے تھے کہ میرے کانوں میں بابا سخاوت شاہ کی آواز آئی تھی۔

''بس بیٹا اب جلدی سے اپنا کام پورا کرو۔''

میں نے فوراً ہی بیڈ کے پیچھے سے لکڑی کا موٹا ڈنڈا نکال کر اُن دونوں پر وار کر دیا تھا۔ دونوں کے سر پر گہری چوٹ لگی تھی' وہ فوری بے ہوش ہو گئے تھے' میں نے فوراً ہی اشوک کی جیب سے چابی نکالی تھی اور انہیں کمرے میں بند کر کے بیگ اٹھائے بابا کے کمرے میں پہنچی تھی۔

''بابا میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔''

''جاؤ بیٹا جاؤ' کہیں انہیں ہوش نہ آ جائے۔'' بابا کی ہدایت پر میں فوراً فلیٹ سے نکل کر روڈ پر آ گئی تھی۔ آٹو میں بیٹھ کر سیدھی ریلوے اسٹیشن پہنچی تھی اور بمبئی کا ٹکٹ لیا تھا۔ اور پھر ریل میں بیٹھی میں کافی دیر تک یہ سوچ کر روتی رہی تھی کہ میں نے اِس اندھی محبت میں ماں باپ کو کھویا' اپنا شہر خاندان سب چھوڑا میں بھلا کس منہ سے گھر جاتی' میں تو کسی کو منہ نہیں دکھا سکتی تھی۔

☆.....☆.....☆

بمبئی پہنچ کر میں بابا سخاوت کے فلیٹ میں رہنے لگی تھی اور کچھ روز بعد مجھے ایک پاپڑ کی فیکٹری میں نوکری مل گئی تھی۔ بابا سخاوت کی روح ہر جمعرات کو وہاں بھی میرے پاس آتی اور پوری پوری رات مجھ سے باتیں کرتی رہتی تھی۔ اور پھر بابا سخاوت نے مجھے

غزل

بدن تو جل گئے سائے بچا لیے ہم نے
جہاں بھی دھوپ ملی گھر بنا لیے ہم نے

اس امتحان میں سنگین کس طرح اُٹھتی
دعا کے واسطے جب ہاتھ اٹھا لیے ہم نے

کٹھن تھی شرطِ رہِ مستقیم کیا کرتے
ہر ایک موڑ پہ کتبے سجا لیے ہم نے

ہمارے بس میں کہاں تھا کہ ہم لہو دیتے
یہی بہت ہے کہ آنسو بہا لیے ہم نے

سمندروں کی مسافت پہ جن کو جانا تھا
وہ بادباں سرِ ساحل جلا لیے ہم نے

بڑے تپاک سے کچھ لوگ ملنے آئے تھے
بڑے خلوص سے دشمن بنا لیے ہم نے

محسن بھوپالی

ایک جمعرات بتایا تھا۔

''اشوک شراب کے نشے میں گاڑی چلا رہا تھا کہ اُس کی گاڑی ٹرک سے ٹکرا گئی اُس نے موقع پر ہی دم توڑ دیا تھا۔ اُس کا دوست راجن کبھی کبھی آتا ہے وہ فلیٹ بیچ رہا ہے۔ اور پھر جاتے ہوئے انہوں نے مجھ سے کہا تھا۔

''بیٹا نماز پابندی سے پڑھا کرو اور کبھی کبھی میری روح کو بھی قرآن نماز بخش دیا کرو کہ شاید میری روح جو اُس کمرے میں بھٹک رہی ہے جلدی اپنے خدا کے گھر آباد ہو جائے اور میری روح کو ہمیشہ کے لیے سکون مل جائے۔

زندگی کی گاڑی چل رہی تھی اور بابا سخاوت کی روح کی میرے پاس ہر جمعرات کو آمد کا سلسلہ جاری تھا۔ پھر ایک جمعرات انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ اس ہفتے فلیٹ فروخت ہو جائے گا۔ وہ پارٹی توڑ پھوڑ کر کے نئے سرے سے اُسے بنائے گی اِس وجہ سے شاید میری روح جو وہاں ایک کمرے کی زمین میں قید ہے آزاد ہو جائے پھر میں تم سے کبھی مل نہیں سکوں گا۔ اور پھر یہی ہوا تھا اُن کی روح کبھی میرے پاس نہیں آئی۔ البتہ ایک رات وہ میرے خواب میں آئے تھے اور مجھے بتایا تھا۔

''بیٹی سعدیہ فلیٹ کی توڑ پھوڑ کے باعث میری روح وہاں سے نکل گئی ہے یوں کہہ لو کہ مجھ پر میرے مالک میرے اللہ نے کرم کیا' میرے جسم کی باقیات ملنے پر اُن لوگوں نے پولیس کو اطلاع کی جس نے راجن کو پکڑا تو اُس نے پولیس کو بتایا کہ ہمیں اِس فلیٹ کو خریدے ابھی ایک ڈیڑھ سال ہوا ہے' آپ فلیٹ کے کاغذات دیکھ سکتے ہیں' جبکہ یہ تو بہت پرانی لاش ہے یہ فلیٹ بکنے سے پہلے تین سال بند پڑا رہا ہے جن لوگوں سے میں نے اور اشوک نے خریدا تھا وہ پتہ نہیں کہاں چلے گئے ہیں مگر میرے پاس کاغذات میں اُن کے شناختی کارڈ کی فوٹو اسٹیٹ لگی ہے آپ اُس کی مدد سے مجرموں کو تلاش کر سکتے ہیں۔ یوں راجن کی پولیس سے جان چھوٹی..... اور جن صاحب نے راجن سے میرا فلیٹ لیا انہوں نے مسلم ہونے کی وجہ سے میری باقیات کو پامال نہیں ہونے دیا' انہوں نے باقیات کو کفن میں لپیٹ کر نماز جنازہ کے بعد قبرستان میں دفن کر دیا' میں خوش ہوں کہ پولیس میری بیوی اور بھائی کو تلاش کر رہی ہے۔ سعدیہ بیٹا تم ایک دفعہ میرے نام کی قرآن خوانی ضرور کرانا۔''

میں یہ خواب دیکھنے کے بعد نیند سے جاگی تھی تو بہت روئی تھی میں نے بابا کے لیے قرآن خوانی کے علاوہ غریبوں میں لنگر کا انتظام بھی کیا تھا اُس روز میں ہر ایک کے گلے لگ کر اس طرح رو رہی تھی جیسے میرا اپنا سگا باپ مر گیا ہو۔

وقت گزرتا گیا میں بابا کے لیے نماز پڑھتی' قرآن پاک پڑھتی فاتحہ کر کے کسی غریب کو اُن کے نام کا کھانا دیتی اُس کے بعد بابا کئی بار میرے خواب میں آئے وہ بہت خوش نظر آتے تھے وہ کچھ بولتے نہیں تھے بس مسکرا کر مجھے دیکھتے تھے۔

کچھ اور وقت گزرا اِس واقعے کو پانچ سال گزر گئے میں جس فیکٹری میں کام کرتی تھی وہاں کے منیجر نے مجھے شادی کی آفر کی میں نے اُن سے شادی کر لی' منیجر کی عمر کافی تھی مگر میں نے عمر کو نہیں دیکھا بلکہ اُن کی شرافت کو دیکھا تھا' منیجر کو سب فیکٹری والے شاہ صاحب کہتے تھے۔ شادی کے دو سال کے اندر میں دو جڑواں بچوں کی ماں بن گئی' ایک بیٹا ایک بیٹی اِس دوران میں کبھی بابا کو نہ بھول پائی' میں اُن کے لیے دعا نیاز نذر سب کچھ اُسی طرح کرتی تھی۔

زندگی اِسی طرح گزر رہی تھی کہ شاہ صاحب بیمار ہو گئے انہیں اچانک دمے کی بیماری نے پکڑ لیا اور ایک دن وہ بھی مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ میں نے پھر سے فیکٹری میں کام کرنا شروع کر دیا تھا اور پھر میں بھی نجانے کیسے دمے کی مریضہ بن گئی تھی۔۔

☆.....☆.....☆

آج سعدیہ کے بچے جوان ہیں اور وہ زندگی کے سفر سے تھک کر دنیا سے ہی چلی گئی ہے' مگر یہ کہانی اُس نے رضیہ تک اور رضیہ نے مجھ تک اور میں نے آپ قارئین تک پہنچا دی ہے۔

☆☆.....☆☆

عبرت کی نشانیاں

بشیر مہتاب کا شعر

دو چار دن کی بات تھی یہ زندگی مگر
انسان اُلجھ گیا ہے یاں ماہ و سال میں

زیڈ اے راجپوت

میرا نام ندیم ہے۔ میں دبئی میں تقریباً چھ سال سے ٹیکسی چلا رہا ہوں۔ ان چھ سالوں میں میرا طرح

طرح کے مسافروں سے واسطہ رہا۔ اسی دران مجھے ایک بھیانک تجربے سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ وہ تجربہ آج تک میرے اعصاب پر حاوی ہے اور اکثر رات ہوتے ہی اُس کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

وہ دسمبر کی ایک سرد رات تھی' جب میں سواریوں کو ان کے مطلوبہ مقام اخوانچ پر چھوڑ کر واپس آ رہا تھا۔

مجھے اُس رات کچھ زیادہ ہی دیر ہوگئی تھی اور اب میں جلد سے جلد گھر پہنچنا چاہتا تھا۔ اُن دنوں اخوانچ کا خاصہ حصہ اتنا آباد نہیں تھا۔ مگر اب تو وہاں خاصی ترقی ہو چکی ہے اور آبادی میں بھی اضافہ ہو چکا ہے۔ میرا گزر اس وقت اخوانچ کے اُس خاصے ویران علاقے سے ہو رہا تھا' روڈ پر اِکا دُکا گاڑیاں ہی آ جا رہی تھیں۔

اُس جگہ کے بارے میں مشہور تھا کہ وہاں کچھ ویمپائرز کے گھر ہیں جن میں اُن کی رہائش ہے۔ اکثر لوگوں کا یہ کہنا بھی تھا کہ وہاں کئی مرتبہ شیطان کا عکس بھی دیکھا گیا ہے۔ ان تمام باتوں کی وجہ کے باعث اُس جگہ سے گزرنے والا خوف محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا' سو میں بھی کچھ ایسی ہی کیفیت میں گاڑی چلا رہا تھا کہ مجھے سڑک کے کنارے ایک عورت نظر آئی تھی جو کہ سیاہ برقعہ میں ملبوس تھی۔

اس نے مجھے رُکنے کا اشارہ کیا تھا۔ حالانکہ میں اُس وقت گھر پہنچنے کی جلدی میں تھا پر پتا نہیں کیوں میں نے اُس کے اشارے پر گاڑی روک دی تھی۔ وہ عورت بہت تیزی کے ساتھ میری ٹیکسی میں سوار ہوگئی تھی اور اُس نے مجھے ایک ایسی جگہ کا پتہ بتایا تھا جو کہ اخوانچ والے اُسی راستے میں آتی تھی' میں نے ٹیکسی آگے بڑھا دی تھی۔

ویسے یوں اکیلی رات میں ایک تنہا عورت کا سڑک پر موجود ہونا مجھے کچھ عجیب سا ضرور محسوس ہوا تھا دل میں تو آیا تھا اُس عورت سے کوئی سوال کروں پر میں نے اپنے تجسس پر قابو پا لیا تھا۔

میری ٹیکسی نے ابھی تھوڑا ہی سفر طے کیا تھا کہ مجھے سڑک پر ایک اور عورت نظر آئی تھی جو کہ بالکل میری ٹیکسی میں موجود عورت کی طرح برقعہ میں ملبوس تھی' اُس نے بھی مجھے رُکنے کا اشارہ کیا تھا۔

میں نے ٹیکسی اُس عورت کے برابر میں روک لی تھی۔ وہ فوراً میری گاڑی میں سوار ہوگئی تھی اور پھر میری حیرت کی انتہا نہ رہی تھی جب اُس دوسری عورت نے بھی پہلی والی عورت والا پتا بتایا تھا۔ اب مجھے کچھ نامعلوم سا خوف محسوس ہو رہا تھا۔

سفر کے دوران اُن دونوں عورتوں نے آپس میں بھی کسی طرح کی گفتگو نہیں کی تھی' بس خاموش بیٹھی تھیں یکا یک مجھے اپنے جسم میں برف جیسی ٹھنڈک محسوس ہونے لگی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میری پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی عورتیں انسان نہیں برف کی دو سلیں ہوں۔

''لاحول ولاقوۃ یہ میں کیا سوچنے لگا ہوں۔'' میں نے اپنے دل سے خوف اور وسوسوں کو جھٹکنے کی کوشش کی' لیکن ناکام رہا۔

میری چھٹی حس مجھے کسی انجانے خطرے کا احساس دلا رہی تھی کہ پھر کچھ یوں ہوا تھا کہ مجھے سڑک کے کنارے ہاتھ سے رُکنے کا اشارہ دیتی ایک اور عورت کھڑی دکھائی دی تھی جو کہ میری ٹیکسی میں موجود دو عورتوں کی طرح سیاہ برقعہ میں ملبوس تھی۔

میں نے کسی معمول کی طرح ٹیکسی روک دی تھی۔ اُس عورت نے ٹیکسی میں بیٹھے ہوئے وہی منزل بتائی تھی۔ جو کہ میں پہلے بھی دو مرتبہ سن چکا تھا۔ اب میری حالت ایسی ہوگئی تھی کہ کاٹو تو لہو نہیں' میرے دل میں آیا تھا کہ ٹیکسی کو چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوتا ہوں۔ سردی میں بھی میرے پسینے چھوٹ رہے تھے' اور اب جبکہ میں نے ایک بات پر غور کیا تھا تو میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے تھے کہ ان تین عورتوں نے جس جگہ جانا تھا وہ تو قبرستان کے قریب تھی' نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن کے مصداق میں نے وہاں جانے کا فیصلہ کر لیا یہ بات الگ ہے کہ میرے دماغ میں خوف کے جھکڑ چل رہے تھے۔

میں نے فرنٹ مرر میں کن انکھیوں سے پیچھے دیکھا تو وہ تینوں عورتیں بدستور بہت ہی سکون سے

بیٹھی تھیں۔ ان کی پُراسرار خاموشی مجھے کھٹک رہی تھی کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔

جب میں اُن کے مطلوبہ مقام پر پہنچ گیا تو انہوں نے ذرا آگے جانے کے لیے کہا' میں ذرا آگے گیا تو شہرِ خموشاں کے گیٹ پر آ موجود تھا۔ اُن تینوں نے ٹیکسی سے اترنے کے بعد ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے مجھ سے سوال کیا تھا۔

''تمہیں پتا ہے ہم کون لوگ ہیں اور یہاں کیوں آئی ہیں؟''

''نہیں۔'' میں نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا تھا۔

میرا جواب سن کر اچانک انہوں نے اپنی نقابیں اُلٹ دی تھیں۔ الامان میں وہ نہایت ہی خوفناک منظر دیکھ کر سہم گیا تھا۔

اُن کے چہرے حد درجہ بگڑے ہوئے تھے جن پر طرح طرح کے حشرات الارض رینگ رہے تھے۔ اور پھر اُن میں سے ایک بولی تھی۔

''میں بات بات پر جھوٹ بولتی تھی اللہ اور قرآن کی چھوٹی قسم کھاتی تھی اس لیے میرے ساتھ یہ حشر ہوا ہے۔''

دوسری نے بتایا۔

''میں بات بے بات دوسروں کی غیبت کرنے سے نہیں چوکتی تھی اور ہمیشہ اپنی زبان سے لوگوں کو تکلیف پہنچاتی تھی۔ انہیں آپس میں لڑواتی تھی۔''

تیسری عورت نے بتایا۔

''میں بدکردار تھی' اور شراب نوشی کرتی تھی اور شراب پینے کے بعد مجھے کسی بات کا کوئی ہوش و علم نہیں رہتا تھا۔''

''اس لیے ہم تینوں کو اپنے برے اعمال کی سزا ملی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ تینوں قبرستان میں غائب ہوگئی تھیں' اور مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ وہ تینوں مردہ عورتوں کی روحیں تھیں جو کہ شاید مجھے اور دنیا کو ایک عبرت کا پیغام دینے کے لیے عبرت کی نشانیوں کی صورت ملی تھیں تاکہ لوگ عبرت پکڑیں اور راہ نجات حاصل کریں۔

☆☆.....☆☆

غزل

ہر تماشائی فقط ساحل سے منظر دیکھتا
کون دریا کو اُلٹتا کون گوہر دیکھتا

وہ تو دنیا کو مری دیوانگی خوش آ گئی
تیرے ہاتھوں میں وگرنہ پہلا پتھر دیکھتا

آنکھ میں آنسو جڑے تھے پر صدا تجھ کو نہ دی
اس توقع پر کہ شاید تُو پلٹ کر دیکھتا

میری قسمت کی لکیریں میرے ہاتھوں میں نہ تھیں
تیرے ماتھے پر کوئی میرا مقدر دیکھتا

زندگی پھیلی ہوئی تھی شامِ ہجراں کی طرح
کس کو اتنا حوصلہ تھا کون جی کر دیکھتا

ڈوبنے والا تھا اور ساحل پہ چہروں کا ہجوم
پل کی مہلت تھی میں کس کو آنکھ بھر کر دیکھتا

تُو بھی دل کو اِک لہو کی بُوند سمجھا ہے فراز
آنکھ اگر ہوتی تو قطرے میں سمندر دیکھتا

احمد فراز

ایسی کہانیاں جن میں تجسس اور اسرار کے نت نئے رنگ چھپے ہیں

دو کاسنی پھول

ابرار حسین اکبر کا شعر

دھوپ کے شہر میں پھولوں کی قباؤں والے
یاد آتے ہیں وہ معصوم اداؤں والے

منزہ سہام

آج تیسرا دن تھا فاخرا کو لاپتہ ہوئے۔ امی کا رو رو کر برا حال تھا' ان پر غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ آغا جان نے پولیس میں رپورٹ درج کروادی تھی۔ آس پاس کے سارے علاقے کو بھی چھانا جاچکا تھا

مگر میری چھوٹی بہن کا کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا۔ میں چھوٹے بہن بھائیوں کو بھی سنبھال رہی تھی اور امی اور آغا جان کے لیے بھی بہت فکرمند تھی وہ دونوں محض 3 دن میں ہی بہت بوڑھے اور شکستہ نظر آ رہے تھے۔ سارا خاندان جمع ہو چکا تھا ہر شخص اپنے طور پر فاخرا کو تلاش کرنے کی سعی کر رہا تھا مگر سب بے سود ثابت ہو رہا تھا۔

میرا نام شمیم ہے ہم 3 بھائی اور دو بہنیں ہیں جس میں، میں سب سے بڑی پھر تینوں بھائی اور سب سے چھوٹی فاخرا تھی۔ ہم لوگ افغانستان سے ہجرت کر کے پہلے کوئٹہ پھر اسلام آباد شفٹ ہو گئے تھے۔ والد کا خشک میوہ جات اور کپڑے کا کاروبار تھا جو روز بروز ترقی کی جانب گامزن تھا۔ یوں گھر میں آسودگی ہی آسودگی تھی۔ میری والدہ بہت عبادت گزار خاتون تھیں اور انہوں نے ہماری تربیت بھی ایسی کی تھی کہ ہم لوگ بچپن سے ہی نماز روزے کے پابند تھے۔ والد سخت گیر تھے مگر اپنی اولاد سے بہت محبت رکھتے تھے ہمیں زبان سے کچھ بھی مانگنا ہی نہیں پڑا۔ ہماری ہر ضرورت بنا مانگے ہی پوری کر دی جاتی تھی۔ گھر میں پیسے کی ریل پیل تھی۔ لوگ ہماری زندگی کو رشک کی نظر سے دیکھتے تھے ایسے میں میری 3 سالہ بہن فاخرا اچانک لاپتہ ہو گئی۔ حیرت اور دکھ نے ہم سب کو گنگ کر دیا تھا۔ حیرت اس لیے کہ وہ اتنی چھوٹی تھی کہ گھر سے باہر خود جا ہی نہیں سکتی تھی پھر گیٹ پر چوکیدار بھی 24 گھنٹے موجود رہتا تھا دکھ اس بات کا کہ کسی کو ہم سے کیا دشمنی کہ ہماری جان سے پیاری گڑیا کو ہم سے جدا کر دیا۔ میں اور دونوں بھائی اپنے آغا جان سے زیادہ ملتے تھے۔ رنگ تو ہم سب کے سرخ و سفید تھے مگر فاخرا اور اس سے بڑے بھائی کی آنکھیں اور بال امی جیسے تھے نیلی آنکھوں اور سنہرے بالوں کی وجہ سے وہ دونوں بالکل انگریز لگتے تھے۔ جو ایک دفعہ دیکھتا پیار کیے بنا نہ رہتا۔ لوگوں کا تانتا بندھا ہوا تھا' سب حیران اور پریشان تھے کہ آخر بچی کہاں غائب ہو گئی۔ پولیس نے ہر ممکن کوشش کر ڈالی مگر سب بے سود..... مجھے اب فاخرا سے زیادہ امی کی فکر تھی' جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا اُن کی حالت بگڑتی جا رہی تھی' پہروں روتی رہتیں۔ دنوں بھوکی رہتیں میں اور آغا جان زبردستی کچھ کھلا دیتے تو ٹھیک ورنہ سارا سارا دن اور ساری ساری رات برآمدے میں کھڑی مین دروازے کی طرف تکتی رہتیں۔ مجبوراً ڈاکٹرز کے مشورے پر انہیں نیند کے انجکشن دیے جانے لگے تاکہ ان کے اعصاب پُرسکون رہیں۔ میں خود 12 سال کی بچی تھی کہاں تک اس تکلیف دہ صورتحال کا مقابلہ کرتی' فاخرا کو لاپتہ ہوئے ڈیڑھ ماہ بیت چکا تھا کہ ایک دن مجھے تیز بخار چڑھ گیا۔ ہاتھ پاؤں مڑ گئے منہ سے جھاگ بہنے لگے تو آغا جان مجھے اسپتال لے کر بھاگے..... میں 4 دن میں اسپتال میں رہی بقول ڈاکٹرز کے یہ کوئی معجزہ ہے جو میری زندگی بچ گئی۔

میں گھر واپس آنے سے خوفزدہ تھی۔ کیونکہ میں گھر کی ابتر حالت سے تھک چکی تھی۔ وہ ماں جو ہر وقت ہم لوگوں کے لیے پریشان رہتی تھیں اب مجھے بالکل بے پرواہ محسوس ہوتیں۔ بہرحال ساری زندگی اسپتال میں تو نہیں رہا جا سکتا تھا' آغا جان مجھے گھر لے آئے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی خوشگوار حیرت کا سامنا کرنا پڑا امی ہمیشہ کی طرح کچن سے نکل کر آ رہی تھیں مجھے دیکھتے ہی خود سے لپٹا لیا۔

''کیسی ہے میری جان.....'' انہوں نے مسکرا کر میرے گالوں پر بوسہ دیتے ہوئے پوچھا۔ جواب دینے کے بجائے میں امی سے لپٹ کر دھاڑیں مار مار کر روتی رہی۔

''کیا ہوا ہے شمیم کیوں رو رہی ہو..... جلدی

تمہاری طبیعت بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔'' وہ مجھے دلاسہ دے رہی تھیں پھر مجھے میرے کمرے میں لے گئیں بستر پر لٹا کر خود کھڑی ہو گئیں۔

''تم آرام کرو میں نے تمہارے لیے سوپ بنایا ہے وہ لاتی ہوں۔'' بس اس دن کے بعد سب نارمل ہو گیا۔ ہم لوگ خوفزدہ تھے کہ اگر فاخرا کا نام لیں گے تو امی پھر پہلے جیسی نہ ہو جائیں اسی لیے آغا جان نے سب کو سختی سے منع کر دیا تھا کہ کوئی پرانی باتیں نہ نکالے..... ہم سب اب مکمل طور پر مایوس بھی ہو چکے تھے کہ اب ہماری بہن کبھی ہمیں ملے گی۔ زندگی پرانی ڈگر پر لوٹ آئی مگر ایک کسک تھی جو اکثر و بیشتر پریشان رکھتی تھی۔ انسان مر جائے تو صبر آ جاتا ہے مگر کوئی کھو جائے تو دل ہر لمحہ تڑپتا رہتا ہے۔

امی سارا دن گھر کے کاموں میں مصروف رہتیں مگر عشاء کی نماز کے بعد لان کے کونے میں چھوٹے سے پودے کے پاس بیٹھی رہتیں شاید کوئی وظیفہ کرتی تھیں۔ وہ پودا کب وہاں نکل آیا مالی بابا بھی نہیں جانتے تھے اُس پودے کو نکالنے کی کوشش کی' کیونکہ اس کے دونوں جانب گلاب اور موگرے کے پودے تھے۔ وہ درمیان میں عجیب سا لگتا تھا مگر امی نے اتنا غصہ کیا کہ پھر کسی کی ہمت ہی نہ ہوئی۔ امی اس کا خیال بالکل اپنے بچوں کی طرح رکھتی تھیں اُس کو روز پانی خود ڈالتیں۔ خشک پتے توڑ کر الگ کرتیں اس پر پیار سے ہاتھ پھیرتیں۔ گھر سے باہر نکلنا انہوں نے بالکل بند کر دیا تھا اور اگر مہمان آ جاتے تو اُن کا بہت خیال رکھتیں لیکن عشاء کی نماز ادا کرنے کے بعد سیدھی لان کے اس حصے میں پہنچ جاتیں جہاں وہ پودا لگا ہوا تھا۔ میں نے امی کو اس پودے سے جو اُنس کے ساتھ کافی بڑا ہو گیا تھا باتیں کرتے بھی دیکھا اور مجھے محسوس ہوتا تھا جیسے وہ بھی امی کو دیکھ کر جھومنا شروع کر دیتا ہو' ہوا ہو نہ ہو وہ اپنی شاخیں یوں لہلہاتا جیسے امی کو تھام لے گا۔ کم از کم مجھے ایسا لگتا تھا۔ وہ کس چیز کا پودا تھا مالی بھی سمجھ نہ پایا' اس نے اپنے کئی جاننے والوں سے بھی معلوم کرنے کی کوشش کی مگر کسی کو اندازہ نہ ہوا.....

وقت گزرتا رہا میں بچپن سے نکل کر جوانی کی سرحدوں میں داخل ہو گئی۔ بھائی بھی اسکولوں سے نکل کر کالجوں میں پہنچنے لگے' تب آغا جان نے میری بات اپنی بہن کے بیٹے سردار شیر علی سے طے کر دی۔ وہ دن میری زندگی کا حسین ترین دن تھا۔ شیر علی مجھے ہمیشہ سے بہت پسند تھا وہ وکالت کے لیے لندن میں تھا اور پڑھائی مکمل ہونے پر اگلے سال میری شادی ہونا طے پائی..... رات میں کھانے کے بعد جب مہمان چلے گئے تو امی جلدی جلدی چیزیں سمیٹ رہی تھیں میں جانتی تھی کہ وہ کیوں جلدی کر رہی ہیں میں نے ان سے کہا۔

''امی آپ سب چھوڑیں میں مورہا (ملازمہ) کے ساتھ مل کر سب سمیٹ لوں گی آپ نماز پڑھ لیں۔'' انہوں نے محبت سے مجھے دیکھا اور اپنے کمرے کی جانب چل دیں۔ برتن وغیرہ سمیٹ کر میں اپنے کمرے میں آ گئی۔ پتہ نہیں کس خیال کے تحت کھڑکی سے باہر لان میں دیکھا تو امی سنگی بینچ پر بیٹھی تھیں اور وہ پودا کاسنی پھولوں سے بھرا ہوا تھا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ شام تک تو ایک بھی پھول نہیں تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے میں نے خود دیکھا تھا۔ امی کے پیروں کے پاس بھی ڈھیروں پھول پڑے تھے۔ اس حیرت انگیز منظر نے مجھے ہفتوں پریشان رکھا پھر رفتہ رفتہ میں بھول گئی۔ میری شادی ہو گئی۔ دونوں بھائی پڑھائی کے لیے ملک سے باہر چلے گئے۔ اب گھر میں سب سے چھوٹا بھائی رہ گیا تھا۔ امی کا وہی روٹین تھا۔

رمضان کا آخری عشرہ چل رہا تھا جب آغا جان

نے مجھے فون کر کے بتایا کہ امی سیڑھیوں سے سلپ ہوگئی ہیں وہ انہیں اسپتال لے جا رہے تھے اور مجھے بھی فوراً پہنچنے کی تاکید کی میں نے حواس باختہ ہو کر اپنی ساس کو بتایا تو وہ میرے ساتھ اسپتال کے لیے روانہ ہوگئیں۔ ہمارے پہنچنے سے قبل ہی امی کا دوران آپریشن انتقال ہوگیا۔ آغا جان نے بتایا کہ وہ روز مرہ کے کاموں میں مصروف تھیں جب اوپر والے کمرے سے نکلتے ہوئے اُن کا پاؤں نہ جانے کس چیز میں اُلجھا اور سر کے بل فرش پر آ گریں۔

سر پر اتنی شدید چوٹ تھی کہ باوجود کوشش کہ جانبر نہ ہوسکیں۔ میرے لیے یہ بہت بڑا سانحہ تھا۔ آغا جان تو بالکل ٹوٹ گئے' یہ دوسرا بڑا سانحہ تھا جس نے ہم لوگوں کو ایک بار پھر توڑ کر رکھ دیا تھا۔ میری ماں میری اولاد کو دیکھے بغیر ہی دنیا سے چلی گئی تھیں میرا رو رو کر برا حال تھا۔ امی کو کب گھر لے کر آئے بھائیوں کو اطلاع دے دی گئی تھی' ان کے آتے ہی تدفین بھی ہوگئی مگر مجھے کچھ ہوش نہ تھا۔ میری ساس مجھے لے کر بہت پریشان اور افسردہ تھیں وہ میری ہر ممکن دلجوئی کی کوشش کرتیں۔ شیر علی بھی مجھے بہلانے کی کوشش کرتے مگر جیسے میں بکھر گئی تھی۔ امی کے انتقال کے ایک ہفتے بعد میری حالت دیکھتے ہوئے آغا جان نے شیر علی سے کہا کہ مجھے یہاں سے لے جائے ورنہ ماں کو یاد کر کر کے کہیں میں بیمار نہ ہو جاؤں۔

میں اپنے سسرال چلی آئی۔ کوشش کرتی کہ اپنے آپ کو مصروف رکھوں۔ آغا جان اور بھائی مجھ سے ملنے ہر دوسرے دن آتے..... مگر مجھے گھر نہیں آنے دیتے' وہ سمجھتے تھے کہ اس گھر میں امی کی یادیں مجھے انہیں بھولنے نہیں دیں گی۔ اپنے پیاروں کو تو انسان کبھی نہیں بھولتا ہاں بس صبر آ جاتا ہے تو میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ میں نے اس حقیقت کو مان لیا کہ اب امی کے بغیر ہی زندگی گزرے گی اس دوران

غزل

تم نہ مانو مگر حقیقت ہے
عشق انسان کی ضرورت ہے

کچھ تو دل مبتلائے وحشت ہے
کچھ تری یاد بھی قیامت ہے

میرے محبوب مجھ سے جھوٹ نہ بول
جھوٹ صورت مگر صداقت ہے

جی رہا ہوں اس اعتماد کے ساتھ
زندگی کو مری ضرورت ہے

حُسن ہی حُسن جلوے ہی جلوے
صرف احساس کی ضرورت ہے

اُس کے وعدے پہ ناز تھے کیا کیا
اب در و بام سے ندامت ہے

اس کی محفل میں بیٹھ کر دیکھو
زندگی کتنی خوبصورت ہے

راستہ کٹ ہی جائے گا قابل
شوقِ منزل اگر سلامت ہے

قابل اجمیری

میں کئی بار گھر گئی اور ہر بار میری نظر امی کے چہیتے پودے پر ضرور رُکی جو بالکل ساکت کھڑا رہتا۔ میں نے اس پر پھر کبھی پھول نکلتے نہیں دیکھے..... مگر مجھے یہ احساس ہوا کہ مجھے بھی اس درخت سے بہت انسیت ہوگئی تھی۔ ایک دن میں امی کے گھر رُکی ہوئی تھی رات کو کھانے کے بعد پتہ نہیں دماغ میں کیا سمایا کہ لان میں جا کر اس سنگی بنچ پر بیٹھ گئی جہاں امی برسوں بیٹھ کر پتہ نہیں کیا راز و نیاز کرتی تھیں۔ کچھ دیر بیٹھی رہی پھر درخت کے تنے پر محبت سے ہاتھ پھیرا اور اندر چلی آئی۔

امی اور فاخرا دونوں کمرے میں صوفے پر بیٹھی تھیں میں نے حیرت سے فاخرا اور پھر امی کو دیکھا ان کے چہروں پر غیر معمولی چمک تھی۔ اور وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے مجھے دیکھ کر مسکرا رہی تھیں۔ پھر تیزی سے اٹھیں اور کمرے سے باہر چلی گئیں۔

اذانوں کی آواز پر میں ہوش کی دنیا میں واپس آئی۔

''اوہ تو یہ خواب تھا میں نے اپنے آپ سے کہا کتنی دیر چت لیٹی اسی منظر کو آنکھوں میں بسانے کی کوشش کرتی رہی کاش کہ یہ حقیقت ہوتا..... مجھے پتہ بھی نہیں چلا اور آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب رواں ہوگیا۔ میں نے اُٹھ کر وضو کیا نماز پڑھی اپنی بہن اور اپنی ماں کے لیے ڈھیروں دعائیں کیں مجھے وہ اپنے انتقال کے پورے دو ماہ نظر آئی تھیں اور بہت خوش نظر آئی تھیں دل کچھ مطمئن ہوگیا۔ میں نے نماز کا دوپٹہ سر سے اُتار کر صوفے پر تہہ کر کے رکھا اور پھر کھڑکی سے جونہی پردا ہٹایا میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ میرے سامنے ایک ٹنڈ منڈ پودا کھڑا تھا۔ یہ راتوں رات کیا ہوگیا میں بھاگتی ہوئی باہر لان میں آئی وہ پودا جو رات تک ہرا بھرا تھا کیسے سوکھ کر ختم ہوگیا میں سمجھ ہی نہیں پا رہی تھی۔

پودے پر ایک پتہ بھی موجود نہ تھا۔ گھر کے باقی افراد بھی یہ حیرت ناک منظر دیکھ کر گنگ تھے۔ پھر آغا جان کے حکم پر ہی اس پودے کی سوکھی شاخوں اور تنے کو کاٹ دیا گیا وہ سنگی بنچ بھی وہاں سے ہٹا دیا۔ اور سیمنٹ کر کے فرش کو پختہ کر دیا گیا.....

کچھ ماہ بعد میں ایک گول مٹول سے بیٹے کی ماں بن گئی۔ زندگی ایک ڈگر پر چل پڑی۔ آغا جان بھی دنیا سے چلے گئے میں بچوں میں مصروف ہوتی چلی گئی۔ امی کے گھر میں تینوں بھابیاں آ گئیں۔ آج اس بات کو برسوں گزر گئے ہیں میرا بیٹا نوشیروان اب گیارہ برس کا ہے مگر جب بھی وہ نانا نانی کے گھر جاتا ہے کہیں نہ کہیں سے اس کو کاسنی پھول ضرور مل جاتا ہے جو وہ مجھے لا کر دیتا ہے حالانکہ کسی بھی پودے پر کاسنی پھول نہیں آتے، گھر میں اور بھی بچے ہیں سب مل کر کھیل بھی رہے ہوں تب بھی صرف شیروان کو ہی پھول ملتا ہے وہ ہے بھی بہت پیارا بچہ گم گو اور صلح پسند مگر میں جب بھی اُس کو دیکھتی ہوں مجھے فاخرا یاد آ جاتی ہے ویسی ہی بڑی بڑی پلکوں کی جھالروں سے ڈھکی خوبصورت نیلی آنکھیں.....

نوشیروان کے دادا نے اُس کے گلے میں حفاظت کا تعویذ ڈالا ہوا ہے جو وہ کسی صورت اُتارنے نہیں دیتے..... زندگی بہت پُرسکون انداز میں گزر رہی ہے اللہ کا دیا بہت کچھ ہے مگر ایک خلش ایک کسک بے چین رکھتی ہے۔ میں نہیں جانتی کہ وہ کیا ہے۔

بہت سے ایسے سوالات تھے جن کا ہمیں کبھی جواب نہیں ملا۔ جیسے فاخرا کہاں گئی' وہ پودا راتوں رات کیسے نکل آیا اور امی کیوں اس سے اس قدر محبت رکھتی تھیں اور پھر امی کے دنیا سے جانے کے بعد وہ راتوں رات کیسے مرجھا کر ختم ہوگیا۔ میری طرح گھر کے باقی افراد بھی اس اسرار کو کبھی سمجھ نہ پائے۔

☆☆.....☆☆

خوفناک ہانڈی کا رقص

شمشیر حیدر کا شعر

تمہیں	برباد	کرنے	کو	تمہارا
تمہارا	علم	ہی	بہت	ہے

تبسم زہرہ رضوی

قارئین کرام جیسا کہ آپ کے علم میں ہوگا کہ میری اپنی زندگی بھی ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے کہ عقل انسانی جن کو تسلیم کرنے سے انکار کردے ان واقعات کے پیچھے کوئی نہ کوئی حقیقت ضرور ہوا

اس سے قبل کہ میں خوفناک ہانڈی والا واقعہ تحریر
ں' ایک دو چھوٹے چھوٹے واقعات بیان کرتی
ں۔

میرا بچپن حیدرآباد لطیف آباد میں گزرا' رات کو
ہت ہی زیادہ سناٹا ہو جاتا تھا' یہ بات 70'80 والی
ہائی کی ہے' جب رات دس بجے تو اُلو بولتا تھا' خاص
ر سردیوں کی راتوں میں تو بالکل سنسان ہو جاتا تھا
ور ایسے میں کبھی کبھار ایک پُراسرار آواز گونجتی تھی۔

''اباڑے گھوڑا ڑے۔'' جیسے کوئی بہت اذیت
ے پکارا ہو۔ بعد میں ہمیں پتہ چلا تھا کہ محمد بن قاسم
ے زمانے میں راجہ داہر اور ان کی فوج کی لڑائی میں
ہت سے بے گناہ لوگ مارے گئے تھے۔ ان ہی کی
آوازیں ہیں جو رات کے سناٹے میں گونجتی ہیں۔ یہ
ات مجھے میرے والد کے دوست چچا حرمت علی نے
ائی تھی۔

حیدرآباد میں ایک علاقہ تلک چاڑی ہے' سنا ہے
ہت پہلے وہاں ایک تانگا جا رہا تھا (چاڑی کا مطلب
ڑھائی ہے) تانگے میں جتے ہوئے گھوڑے کی
حالت ناگفتہ بہ تھی' وہ بہت کمزور اور لاغر تھا' اور کوچوان
ے چابک پر چابک رسید کر رہا تھا' چڑھائی پر تانگہ گھسٹنے
ے لیے بہت طاقت درکار ہوتی ہے' گھوڑا نحیف ونزار تھا
ور سواریاں بھی بہت سی تھیں' بس ایک جوزور دار چابک
ور گھوڑے کو پڑا تو سب نے سنا گھوڑے نے بہت
پ کرانسانی آواز میں کہا تھا۔

''کیسے چلوں مجھ سے چلانہیں جاتا؟'' کوچوان
یت سب نے یہ سنا اور آنکھوں سے یہ دیکھا کہ
گھوڑا گرا اور گر کر مرگیا۔ لوگ چیخیں مارتے تانگے
ے گرتے پڑتے بھاگے دائیں ہاتھ پر ایک قبرستان
ھا کچھ نے وہاں پناہ لی تھی' اُن کا کہنا تھا بہت سے
فید لباس والے بلند قامت لوگ گھوڑے کی آواز پر
برں سے نکل نکل کر مدد کے لیے پہنچے تھے۔

''پھر کیا ہوا؟'' میں منہ کھولے یہ کہانی سنتی تو بول
ھی۔

''پھر ہم بے ہوش ہوگئے ہمیں کچھ خبر نہ رہی'
ب ہوش آیا تو پولیس آچکی تھی' کوچوان کا ہارٹ فیل
ہوگیا تھا' تانگا ٹوٹ پھوٹ چکا تھا' زخمی لوگ گھروں یا
اسپتال جا چکے تھے' ہم قبرستان میں پڑے تھے ہم سے
بھی پولیس نے کچھ سوال کر کے گھر بھیج دیا تھا۔''

''اب آتے ہیں ہانڈی کی طرف.....''

یوں تو میری سہیلیوں کی بہت بڑی تعداد تھی۔
اُن میں سے بیشتر میری ہم عمر تھیں' لیکن دماغی اعتبار
سے وہ مجھ سے کافی کم تھیں' ہاں اُن کی مائیں میری
دوست بن جاتیں اور وہ مجھے چاہتی بھی بہت تھیں۔
اسی طرح ایک لڑکی تھی مُنی' اُس کی ماں بھی میرا بہت
خیال رکھتی تھی۔ ایک دن پڑوسن خالہ اپنے میکے جا رہی
تھیں میں نے پوچھا۔

''خالہ میکے سے واپس کب آئیں گی؟'' انہوں
نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور کہا۔

''ہمارا میکہ اب کہاں ہے؟'' اُن کا گلا رُندھ گیا
پھر جو کچھ انہوں نے بتایا وہ میرے رونگٹے کھڑے
کر دینے کو کافی تھا۔

''ہماری ماں کا بچپن میں انتقال ہوگیا تھا' ہم دو
بہنیں تھیں ہم کانپور سے متصل گاؤں میں رہتے تھے'
ہمارے ابا پولیس میں ملازم تھے' وہیں گاؤں میں ایک
ہندو دھوبی بھی رہتا تھا' اُس کی لڑکی اچھی بھلی پندرہ
سولہ سال کی تھی' اور اس کی خراب عادت یہ تھی کہ وہ
گاؤں کی پگڈنڈی کو قارورہ اور فضلے سے خراب
کر دیتی تھی۔ ابا جب گشت پر نکلتے تھے تو کئی مرتبہ
نجاست اُن کے پیروں میں لگ جاتی' انہوں نے اس
بات کی دھوبی سے کئی بار شکایت کی۔ مگر وہ ٹال گیا۔
ایک دن ابا نے لڑکی کو ریڈ ہینڈ پکڑ کر دو بید رسید
کر دیے تھے۔ بس اُس دن سے دھوبی رام لال اُن کا
دشمن ہوگیا' اُس نے کھلم کھلا کہا تھا۔

''میاں جی تمہیں یہ بید بہت مہنگے پڑیں گے۔''
یہ دھمکی اُس کی اپنی جگہ تھی مگر انتقام میں وہ اتنا
گر جائے گا ابا نے سوچا نہ تھا۔

دیوالی کا تہوار آیا تھا ہندوؤں کا جشن تھا مسلمان
بھی شریک تھے باقی سب محبت سے مل رہے تھے لیکن
اِس موقع پر دھوبی کا انتقام بہت خوفناک تھا' ہم بہنوں
کی عمر اُس وقت چھ آٹھ سال تھیں' شام کا وقت تھا اور

گرمیوں کے دن تھے۔ ہم لوگ صحن میں چارپائیوں پر بیٹھے تھے۔ ہمارے گھر کا سالن پڑوس میں بنتا تھا' روٹی میں ننھے ننھے ہاتھوں سے پکاتی تھی' ننھی پڑوس سے سالن لے آئی تھی میں نے روٹی چارپائی پر رکھ کر کہا تھا۔

''ابا کھانا کھالیں۔'' اُس وقت صحن میں اندھیرا ہونے لگا تھا۔ میں نے اچانک اوپر جو نگاہ کی تھی۔ میرے خدایا! ایک ہانڈی ہمارے صحن میں چلی آ رہی تھی' اُسے دیکھتے ہی ابا چارپائی سے کود کر کمرے میں چلے گئے تھے اور اندر سے کنڈی لگالی تھی۔ بیٹا تم ہم سے جیسی قسم لے لو' ہماری آنکھوں کے سامنے وہ منحوس ہانڈی بند دروازے میں داخل ہوگئی تھی۔ ہم بہنیں بری طرح گھبرا گئی تھیں اور دروازے کی جھری سے جھانک کر اندر دیکھا تھا تو ہانڈی کمرے میں چکر لگا رہی تھی۔ اور ابا پر حملے کر رہی تھی۔ وہ دونوں ہاتھ سامنے کیے بچاؤ بچاؤ چیخ رہے تھے کہ اچانک وہ خوفناک ہانڈی زمین پر گر پڑی تھی اور اُس میں سے دو کتے نکل پڑے تھے۔''

''ہائے ہائے.....'' اب وہ باقاعدہ رو رہی تھیں۔

''خالہ پھر کیا ہوا؟'' میری آواز میں بھی لرزش تھی۔

''ہائے بے بی! اُن کتوں نے ابا پر حملہ کر دیا تھا۔ ابا ایک کتے سے بچتے تو دوسرا حملہ کر دیتا تھا' انہوں نے ابا کا چہرہ نوچ ڈالا' پیٹ پھاڑ دیا وہ زمین پر گر گئے اور وہیں تڑپ تڑپ کر ٹھنڈے ہوگئے تھے۔''

اب خالہ ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھیں' میں اُن کے دوپٹے سے اُن کے آنسو پونچھ رہی تھی۔

''اس کے بعد سارا محلہ ہمارے گھر جمع ہوگیا تھا۔ پولیس آ گئی' لاش لے گئی پھر ہمیں چچا دوسرے شہر لے آئے' اور جب ہم بارہ تیرہ سال کے ہوئے تو شادی کر دی۔''

ہانڈی کے دوسرے واقعے کے میرے والد چشم دید گواہ تھے اور یہ واقعہ خود انہوں نے یوں سنایا تھا۔

''ہم کھیلنے اپنے دادا کے گھر جو گھر کے قریب ہی تھا گئے ہوئے تھے' یہ وہی دادا تھے جو اُن کے والد کے چچا اور والد یعنی میرے دادا کے ہم عمر تھے' اور اپنے وقت کے بہت بڑے عالم اور عامل تھے۔ جب کسی پر جنات یا آسیب کا سایہ ہوتا' تو انہی کو بلایا جاتا ابو کو جو صدمے والا واقعہ پیش آیا تھا شاید قارئین کو یاد ہو جو کتا تمام چیزیں یعنی روپوں کی گڈی' سیندور' انڈے' کلیجی' کانٹے چبھی ہوئی بکرے کی سری حتیٰ کہ تانبے کی تھالی تک کھا گیا تھا۔ وہ کتا گدھے کے برابر تھا۔

(یہ واقعہ میں نے سچی کہانیاں مارچ 2013ء میں 'چوراہے کا صدقہ' کے نام سے لکھی تھی)۔

تو انہی نے جن کو حاضر کر کے والد پر سے اُس کا قبضہ ختم کروایا تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ جنات کے بچے اُن کے پاس پڑھنے آتے تھے اور جب عام بچوں کی چھٹی ہو جاتی تھی پھر بھی درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہتا تھا ایک عزیز کہتے تھے کہ میں چھٹی کے بعد کسی کام سے بیٹھک کے قریب سے گزرا تو دادا کے پڑھانے کی آواز آ رہی تھی' میں شرارت میں قریب کے درخت پر چڑھ گیا بیٹھک میں روشنی تھی اور سوائے دادا کے کوئی بھی وہاں نہیں تھا کہ اتنے میں.....

''میرا قلمدان کہاں ہے؟'' دادا کی آواز گونجی تھی اور ایک نادیدہ ہاتھ نے انہیں قلمدان دے دیا تھا' وہ گھر حویلی نما تھا گھر میں ایک ہتھنی بھی پالی ہوئی تھی میں خوفزدہ ہو کر جو گرا تو اُسی ہتھنی پر جا گرا۔ وہ بچوں سے بہت محبت کرتی تھی' اُس نے اپنی سونڈ سے مجھے سنبھال لیا تھا۔ غرض کہ دادا کے جنات شناس ہونے کی بہت سی گواہیاں تھیں۔ وہ حویلی نما گھر اب بھی ہے' اُن کی آل اولاد اُسی میں رہتی ہے تو بات ہو رہی تھی ہانڈی کی.....

میرے والد نے بتایا تھا کہ میں کھیلنے کی نیت سے چھوٹے دادا کے گھر چلا گیا تھا۔ شام کا وقت تھا' بڑے سے آنگن میں چائے بن رہی تھی' پکوان پک رہے تھے کہ اچانک اندھیرا چھا گیا' لیکن باقی سب جگہ روشنی تھی' اُن کے صحن میں اندھیرا چھانے کا سبب جب تک میری سمجھ میں آتا' ایک زوردار آندھی آ گئی اور پھر اِس کے زور پر ایک سیاہ ہانڈی آنگن میں چکر لگانے لگی' جیسے اترنے کے لیے مناسب جگہ دیکھ رہی ہو۔ اُس وقت چھوٹے دادا اپنے کمرے میں سو رہے تھے' شور سن کر وہ صحن میں آئے ہانڈی کو دیکھا اور سب گھر والوں کو کہا کہ وہ کمروں میں چلے

ہا میں۔

''یہ میرے لیے آئی ہے۔'' اور خود اپنے کمرے
کلام پاک اٹھالائے' صحن میں بچھی چارپائی پر بیٹھ
رتلاوت شروع کردی۔ اُن کے بیٹے بیٹیاں' بہوئیں
ے پوتیاں کمروں میں گھسے کھڑکی سے جھانک رہے
اور خوف سے کانپ رہے تھے۔

''آپ بھی کانپ رہے تھے؟'' میں نے ابو سے
چھا تھا۔

''نہیں! لیکن خوفزدہ ضرور تھا۔''

''اچھا پھر کیا ہوا'' میں نے تجسس بھرے لہجے
یں پوچھا تھا۔

''پھر' پھر نہ پوچھو..... اُس ہانڈی میں چار سو راخ
ے اور ایسے خوفناک ناگ کہ اللہ کی پناہ! اپنا پھن
نکال کر دادا کا رخ کررہے تھے' ہانڈی چکر کھا کھا کے
ہوا میں معلق ہوچکی تھی' ایک ناگ اپنا پھن لے کر
بالکل دادا کے سر پر آ گیا تھا کہ دادا نے جو سورۃ فلق
کی تلاوت کرکے اُس کی طرف پھونکا تھا ایک خوفناک
دھماکے کے ساتھ وہ فضا میں ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا تھا۔
اس کے ساتھ ہی باقی سانپ جو آدھے لٹک رہے تھے
دوبارہ ہانڈی میں گھس گئے تھے اور ہانڈی سے رونے
پیٹنے کی آوازیں آرہی تھیں' پھر وہ ہانڈی واپس چلی
گئی تھی' ابر بھی صاف ہوگیا تھا دادا نے سب کو
آوازیں دیں تھیں کہ آئیں اور معمول کے کام انجام
دیں اور خود اٹھ کر غسل کیا تھا' مردہ سانپ کے خون
کے چھینٹے جن کپڑوں پر پڑے تھے اُن کپڑوں پر خود
تیل چھڑک کر آگ لگادی تھی..... اور پھر کچھ دیر بعد
ملازم یہ خبر لایا تھا کہ وہ ہانڈی فلاں پنڈت کے گھر
جاکر پھٹ گئی تھی' اُس میں سے تین سانپ نکلے تھے
اور انہوں نے اُسے کاٹ کاٹ کر نیلا کردیا تھا۔ وہ
بری طرح تڑپ رہا تھا پھر اُس کا وجود ٹکڑوں میں بٹ
گیا تھا یہ وہی پنڈت تھا جس کے لیے دادا نے کہا تھا
کہ یہ میرا دشمن ہے اُس سے زمینوں کے سلسلے میں
جھگڑا تھا۔ اُس نے دادا کو مارنا چاہا تھا دادا کلام الٰہی کی
بدولت سو سال کے قریب زندہ رہے تھے۔

☆☆.....☆☆

غزل

مشہور مکیش و رندوں میں یہ فسانے ہیں
کہ اس کی آنکھیں نہیں دو شراب خانے ہیں

ہمارا ظرف تو دیکھو تلاش میں اپنی
چراغ وہ بھی جلائے کہ جو بجھانے ہیں

ابھی تو صرف ہمیں اعتبار لے ڈوبا
ابھی تو اور جہاں سے فریب کھانے ہیں

جگر پہ لگتے ہیں آ کے خطا نہیں ہوتے
یہ دوستوں کے نشانے بھی کیا نشانے ہیں

کریں تو کس کے کریں در پہ اب جبیں سائی
قدم قدم پہ فقیروں کے آستانے ہیں

دکھائی دیتے ہیں جو آسماں کو چھوتے ہوئے
شجر نہیں وہ پرندوں کے آشیانے ہیں

فرح اظہار

صحرا کا سفر

کفیل برنی کا شعر

نہ کوئی منزل نہ نشانِ قدموں کا
گویا سفر میں کررہا تھا ایک صحرا کا

ایم حسن نظامی

وہ موسم بہار کی ایک خوشگوار صبح تھی۔ سردی نے جاتے جاتے بھی ذی روح کے علاوہ درختوں، پیڑوں اور جانوروں پر بھی گہرا اثر چھوڑا تھا۔ سبھی چمکتے سورج کی دھوپ سے محظوظ ہوتے ہوئے خداوند تعالیٰ کا شکر

ا ادا کر رہے تھے۔ ہر چہرے پر مسرتیں رقصاں تھیں۔
ا چانک ہی سہ پہر کے وقت مغرب کی طرف سے کالی
گھٹا اٹھی اور پل بھر میں پورے آسمان پر چھا گئی۔
ہا ل گرجے' بجلی چمکی اور ننھی بوندیں بارش کا روپ
ھار نے لگیں۔ پھر جلد ہی موسلا دھار مینہ برسنے لگا۔
نالے اور گلیاں بارش کے پانی سے ندی نالے بنتے چلے
گئے۔ صبح کی چمکیلی دھوپ پھر سے سردی میں تحلیل
ہو گئی۔ ہر طرف پھر سے موسم سرما کا گمان ہونے لگا۔

''بیٹا..... کھیتوں کی نگرانی اور پانی کے بارے
ں پتہ کرنا تھا۔ گندم کی فصل میں پانی زیادہ نقصان
ے ہوا کرتا ہے۔ بارش اور کیچڑ کی صورت میرا گھر
ے نکلنا دشوار ہے شاید..... تم جوان آدمی ہو..... ذرا
کھیتوں کا چکر لگا آؤ۔'' حاجی علی احمد نے اپنے بیٹے
بر سے جیسے اپنی خواہش ظاہر کی۔

''اچھا بابا جانی.....'' اکبر نے سعادت مندی
ے سر جھکایا اور چادر ذرا اوپر باندھے۔ کسی اٹھائے
یرے دھیرے قدم باہر کی طرف بڑھا دیے۔

آج اکبر باپ کے مقابل تھا۔ اونچا لمبا' نکلتا ہوا
ڈ' چوڑا سینہ' بڑی بڑی مونچھیں' لمبی ناک غرض یہ کہ
یلا گھبرو جوان بن گیا تھا..... حاجی صاحب! کو کل ہی
کی بات محسوس ہو رہی تھی جب بیٹا بہت سی منتوں
راروں دعاؤں سے پیدا ہوا تھا اور پھر انہوں نے
ں کی پیدائش پر منوں کے حساب سے مٹھائی مانٹی
ی۔ حاجی صاحب! سوچوں کی دھند لاہٹ میں
انے کتنے پیچھے چلے گئے اور پھر ذرا پل پل ان کی
اہوں کے سامنے رقصاں ہوتا چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

حاجی علی احمد بستی نور پور کے چند معززین میں شمار
ئے جاتے تھے اکبر اور نجم ان کے دو بچے تھے ان کی
ی حاجراں نجمہ کی پیدائش کے وقت ہی انہیں داغ
ارقت دے گئی۔ انہوں نے دونوں بچوں کو کبھی ماں
ں کی محسوس نہ ہونے دی۔ گاؤں میں میٹرک کے بعد
اکبر اعلیٰ تعلیم کے لیے شہر گیا حاجی صاحب نے دور
ں زمین بیچ کر گاؤں کے قریب ہی چند ایکڑ خرید لی
لہ وقت پر با آسانی پہنچ کر عمدگی سے ان کی کاشت
اور نگہداشت کر سکیں۔

اُن کا گاؤں بہت ہی قدیم تھا۔ مگر کبھی سہولیات
زندگی میسر تھیں۔ بستی کے مشرق میں چھوٹی سی ندی
بہتی تھی جس کا پانی علاقے بھر کو سیراب کرتا تھا۔ نہر کا
پل عبور کرتے ہی سرسبز و شاداب باغ تھا جس میں
سنگترے امرود اور جموں کے پیڑ تھے۔ گاؤں کے شمال
مغرب میں قبرستان تھا اور ذرا پرے ریلوے لائن
گزرتی تھی جو ذرا دور جا کر پل کھاتے ہوئے شہر کی
طرف چلی جاتی تھی۔ حاجی صاحب کی اراضی درگاہ
بابا گھسن شاہ کے پاس سے شروع ہو کر دور تک
ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چلی جاتی تھی۔ حاجی علی
احمد روزانہ سویرے نیچے تلے قدموں سے جلد ہی
کھیتوں میں پہنچ کر اپنے کام میں مصروف ہو جایا
کرتے۔ تبھی سرسبز و شاداب اور لہلہاتی کھیتیاں اُن کی
محنت کا منہ بولتا ثبوت تھیں۔

☆.....☆.....☆

اکبر گھر سے نکل کر پاؤں کا انگوٹھا گیلی زمین میں
کھبو کھبو کر سنبھلتے ہوئے ریلوے لائن پر آیا اور پھر
با آسانی اپنے کھیت پہنچا۔ ہر سو لہلہاتی بالیاں اپنی
سوندھی خوشبو مہک سے سرشار تھیں۔ جھوم جھوم کر عجیب
سا سماں باندھے تھیں۔ گندم کی اُدھ پکی فصل خوشیوں
اور بیکراں مسرتوں کی دلیل تھیں۔ کماد' مکئی اور کئی ایک
دوسری فصلیں بھی جھوم جھوم کر بہار کا سواگت کر رہی
تھیں۔ وہ ایک پگڈنڈی پر چلتا ہوا کھیتوں کے بیچوں
بیچ ڈیرے پر پہنچا جہاں بوڑھے برگد نیچے بیلنا لگا ہوا
تھا جس سے گنے کا رس نکال کر گڑ بنایا جاتا تھا' مگر آج
وہاں بھی بارش کی وجہ سے ویرانی کا سماں تھا۔ سبھی کام
کرنے والے بارش کو دیکھتے ہوئے گھروں کو لوٹ
گئے تھے۔ وہ چند لمحے وہاں رُکا اور کسی تھامے گندم کی
طرف بڑھ گیا۔ مگر اسے یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ گندم
کی فصل میں ذرا بھی پانی نہیں اور دوسرے سبھی کھلیان
لبالب بھرے تھے۔

''ہائیں.....'' اس نے حیرانگی سے اپنے لبوں کو
ہلکی سی جنبش دی۔ پانی کشیدہ فصلوں کو کیسے اور کس نے
چھوڑا۔ ابھی وہ سوچ رہا تھا کہ اس کے عقب سے ٹشلی

سی خوشبو کا جھونکا آیا اور اس کی نس نس میں سمانے لگا' اس نے چونک کر پیچھے دیکھا ایک نشیلی آنکھوں والی خوبرو دوشیزہ اُسے مسکراتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

''ت.....تم کون ہو؟''

''ہاں میں.....محبوبہ.....!'' وہ ہنسی تو جیسے کلیاں سی کھل اٹھیں اور ہر سو خوشبوئیں بکھر گئیں۔

''میں عرصے سے آپ کی متلاشی ہوں' میرا نام محبوبہ ہے اور میں اس برگد کے پاس رہتی ہوں' حاجی صاحب سے بھی میری گہری دوستی ہے۔''

''مگر..... میں تو کسی محبوبہ کو ہرگز نہیں جانتا۔'' اکبر نے اک ادا سے نفی میں سر ہلایا اور وہ کھل کھلا کر ہنسنے لگی۔

''اکبر میں کب سے تمہاری چاہت میں جل رہی ہوں' مگر کبھی اظہار نہ کر سکی' آج ملے ہو تو.....''

''پہلے تم یہ بتاؤ کہ کب سے یہاں ہو؟'' اکبر نے پوچھا۔

''بہت ہی لمبے عرصے سے میرا یہیں بسیرا ہے۔'' وہ ابھی تک ہنس رہی تھی۔

''مجھے پتا تھا حاجی صاحب آج نہیں آ پائیں گے اور گندم کی فصل کھڑے پانی سے خراب ہوگی' تبھی میں نے تمام فصلوں سے پانی نشیبی فصلوں کو چھوڑ دیا۔''

''اچھا.....'' اکبر کے لہجے میں طنز بھرا ہوا تھا۔

''تم حاجی صاحب کو کب سے جانتی ہو' اور انہیں کبھی اپنے بارے میں بتایا ہے؟''

''نہیں.....مگر وہ اپنی زبان سے کئی بار اقرار کر چکے ہیں کہ آج کام دوگنا ہوا ہے۔ جیسے کئی آدمیوں نے کام مل کر کیا ہو۔''

''اچھا تو اب مجھ سے کیا چاہتی ہو؟'' وہ کسی کو زمین پر رکھے دستاویز کرتے ہوئے اُس کی پلیٹ پر ایسے بیٹھ گیا کہ اس کی کمر دستے کے ساتھ لگی تھی اور پاؤں زمین پر.....مگر اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ لوہے پر نہیں بلکہ کسی نرم فوم کے گدے پر براجمان ہو۔

''دوستی اور محبت چاہتی ہوں۔ جب سے تمہیں دیکھا ہے ایک پل بھی تمہارے بنا گزارنا مشکل ہے۔'' وہ ایک ہی سانس میں بولتی چلی گئی۔

''دیکھو جی.....محبت کرنا اس قدر آسان ہے جیسے مٹی پر مٹی سے مٹی لکھنا اور نبھانا اس قدر دشوار ہے جیسے پانی پر پانی سے پانی لکھنا.....''

''نہیں.....نہیں.....میں ہر مشکل کو آسانی میں بدل سکتی ہوں۔'' محبوبہ نے اکبر کی بات درمیان سے کاٹتے ہوئے کہا۔

''میں آپ کو ہوا سے ہوا میں ہوا لکھ کر دکھا دوں گی۔''

'اوہ.....تم تو بہت گہری باتیں کرنے لگیں خیر مجھے تو کھیت دیکھنا تھے اور.....''

''نا.....نا.....نا کر دیا سبھی بندوبست میں نے' سب کچھ ٹھیک ہے پانی کسی فصل کو نقصان نہیں دے گا' آپ بے فکر رہیں۔''

اکبر خاموشی سے اٹھ کر واپس جانے لگا تو وہ بھی اُس کے ساتھ ہو لی۔ کھیتوں کی پگڈنڈیوں سے نکل کر ریلوے لائن پر آئے تو اکبر نے پوچھا۔

''تم کہاں جا رہی ہو؟''

''میں تمہارے ساتھ تمہیں گھر چھوڑنے جا رہی ہوں۔''

''نہیں.....تم جاؤ.....میں چلا جاتا ہوں۔''

''اب اِس وقت میرے ساتھ تمہیں کوئی دیکھے گا تو خواہ مخواہ باتیں ہوں گی اور بستی کے لوگ تو بات کا بتنگڑ بنا دیتے ہیں۔'' اکبر نے اسے گویا سمجھانا چاہا۔

''میں کسی کو نظر آؤں گی تو باتیں بنیں گی نا؟'' وہ معنی خیز انداز میں بولی تھی۔

ابھی وہ باتیں کرتے ہوئے درگاہ کے پاس پہنچے ہی تھے کہ اُن کے سامنے یکدم ہی آگ کا بگولہ سا ابھرا اور آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگا اکبر نے حواس باختہ ہو کر پیچھے دیکھا تو محبوبہ غائب تھی۔ وہ ایکدم ہی گھبرا سا گیا۔ سانسیں تیز ہو گئیں۔ وہ بوجھل وجود اور تھکے قدموں سے بمشکل گھر پہنچا اور جاتے ہی پلنگ پر گر سا گیا۔ اس کا پورا بدن تھر تھر کانپ رہا تھا اور لب خاموش تھے۔ اُس پر غنودگی سی چھا گئی اور پھر اُسے کچھ ہوش نہ رہا تھا۔

جانے کتنی دیر بعد اکبر کے حواس ذرا بحال ہوئے طبیعت سنبھلی تو محبوبہ کی باتیں اُس کے کانوں میں بازگشت کرتی محسوس ہوئیں۔ آگ کا الاؤ اُس کی نگاہوں کے سامنے گردش کرنے لگا۔ اُسے اب بھی ڈر سا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے سر جھٹکا اور اٹھ کر حکیم صاحب کی طرف روانہ ہوگیا۔

☆.....☆.....☆

اکبر کے بی اے کے پیپر تھے تبھی سبھی کلاس فیلوز ہاسٹل کے کمروں میں شب گئے تیاری میں مگن تھے تبھی اچانک اکبر کے کمرے میں جگنو سے چمکتے ہوئے اِدھر اُدھر اڑنے لگے' خوشبو کے خوشگوار احساس پر اُسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اُس پر غنودگی سی چھانے لگی ہے اور کوئی اُس کی آنکھوں کو بند کر رہا ہو۔ اُسے عجیب سی بے چینی ہونے لگی۔ اور پھر اُسے اپنی آنکھوں پر کسی کے ہاتھوں کا لمس محسوس ہوا۔ اس نے اپنی آنکھیں مسلنا چاہیں تو کسی کے نرم و نازک ہاتھ اُس کے ہاتھوں سے مس ہوئے۔

''ک.....کون ہو تم.....'' وہ گڑبڑا سا گیا۔

''میں..... آپ کی محبوبہ.....'' نرم و ملائم اور شیریں آواز کا ترنم سا بکھرا۔

''تو تم میرے پیچھے یہاں بھی۔'' اُس نے جھپاک سے اپنی آنکھیں کھول کر اُسے دیکھا۔

''اکبر..... یہ تو لاہور ہے۔ آپ سات سمندر پار بھی چلے جائیں میں پل بھر میں آپ کے پاس پہنچ سکتی ہوں۔''

''اچھا..... اِس سے ثابت ہوا کہ تمہارا وجود انسانوں جیسا ہرگز نہیں ہے۔'' اکبر کے اِس سوال پر کمرے میں چند لمحے گہری خاموشی چھا گئی۔ وہ خاموشی سے وہاں سے اٹھا اور یونیورسٹی کے خوبصورت لان میں چلا آیا۔

''ہاں تو محترمہ! اب تم اپنے بارے میں وضاحت سے بتاؤ' کون ہو تم..... اور کیا چاہتی ہو مجھ سے؟''

''اکبر میں پری زاد ہوں' پرستان سے یہاں آنا ہوا..... تمہارے گاؤں میں شام ہوگئی مسافر کا روپ دھار کر ایک دروازے پر دستک دی' خوش قسمتی سے دروازہ حاجی صاحب ہی نے کھولا تھا۔''

''حکم کرو بیٹی' کس سے ملنا ہے۔'' انہوں نے بیکراں پیار اور نرمی سے پوچھا تھا۔

''بابا جی..... مسافر ہوں شام گہری ہو رہی ہے اور اب.....''

''بھوک بھی لگی ہوگی تمہیں.....؟''

انہوں نے میری بات مکمل ہونے سے قبل ہی کہہ دیا' اور میری خاموشی اور نیچی نگاہوں کو بھانپتے ہوئے بولے۔

''اندر آجاؤ بیٹی.....'' پھر میں اُن کے عقب میں چلتی ہوئی گھر میں داخل ہوگئی۔

''بیٹھو بیٹی.....'' انہوں نے اشارہ کیا اور خود اندر کی طرف بڑھ گئے۔ چند لمحوں بعد انہوں نے ایک کپڑے سے ڈھکا کھانا لا کر میرے سامنے رکھ دیا۔

''لو بیٹی..... پڑھو بسم اللہ.....'' میں کھانے میں مصروف ہوگئی میں نے کھانے کے برتن سے کپڑا اٹھانا چاہا۔

''نا بیٹی نا..... کھانا ڈھکا رہے تو برکت برقرار رہتی ہے۔''

اور میرا ہاتھ جوں کا توں رُک کر صرف ایک روٹی اٹھا سکا۔ مگر میں نے سیر ہو کر کھانا کھایا۔ یہ بسم اللہ کی برکت تھی کہ نہ تو کھانا ختم ہوا اور نہ ہی میرا جی اور کھانے کو چاہا حالانکہ ہم کھانے پر آئیں تو منوں کے حساب سے کھا جایا کرتے ہیں۔ حاجی صاحب کا اخلاق اور کردار دیکھ کر میں نے کچھ عرصہ انسانوں کے درمیان رہنے کا فیصلہ کیا۔ یہاں کے قبرستان میں میری جیسی بہت سی مخلوق پہلے ہی آباد تھیں۔ تبھی نظر دوڑاتے ہوئے میں نے اپنے قیام کے لیے بوڑھے برگد کا انتخاب کیا۔ خوش قسمتی سے یہ جگہ بھی حاجی صاحب کی ظاہر ہوئی' بچے چھوٹے ہونے پر میرے دل میں حاجی صاحب کی مدد کرنے کا جذبہ پیدا ہوا' میں نے رات دن کا کام رات کے اندھیرے صبح کے اُجالے میں تبدیل ہونے سے پہلے ہی مکمل کروا دیا۔ بس اُسی وقت سے میرا اور تمہارے گھر کا ساتھ ہے۔''

''یہ سب ٹھیک ہے مگر انسانوں اور پریوں کا کیا تعلق؟'' اکبر نے بغور اُس کی نگاہوں میں جھانکا۔ کئی لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے پھر وہ بولی۔

''اکبر..... محبت ایک لافانی جذبہ ہے جو اونچ نیچ انسان حیوان چرند پرند حتی کہ خونی درندوں کو بھی نہیں دیکھا کرتی' میرا پیار تم ہو میری وفا تم سے ہے' میرا سکون تم ہو' میری سوچ کا محور' میرے تصورات کا حاصل اور خوابوں کا مسکن تنہا ہو۔''

''مگر زندگانی کے اِس سفر میں ساتھ چلتے ہوئے کسی بھی لمحہ تم اڑ کر پانیوں کے اُس پار جا کھڑی ہو گی تو میں.....''

''نہیں..... ایسا ہرگز نہیں ہو گا۔ میں پار اتری تو پانی پر چلنے کو تمہارے لیے راستہ دوں گی' میں تمہارے حصے کی سبھی سختیاں اپنے وجود پر سہہ لوں گی' مگر تمہیں سرد گرم ہوا سے ضرور محفوظ رکھوں گی۔''

''مگر آتش اور خاکی مخلوق کی سنگت ناممکن ہے' میرے سامنے صحرا کا سفر ہے اور تمہارے لیے لمحوں کا' دل ذرا بھی مان ہی نہیں رہا اس رشتے کو۔''

''تمہاری ہاں سے فاصلہ بھی تمہارے لیے پل بھر کا بنا دوں گی مجھ میں اتنی قوت ہے اب آج ہی کی رات مشاہدہ کر لینا تمہارا پیپر تمہارے سامنے آئے گا صبح دیکھ لینا وہی سوالات ہوں گے مگر تمہیں جوابات لکھنے کی ذرا فکر نہ ہو گی۔ وہ تمہاری نگاہوں کے سامنے ہوں گے۔''

''ہائیں..... اگر ایسا ہوا تو پھر میں تمہاری محبت ضرور قبول کروں گا۔'' اکبر نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

''وعدہ..... پکا وعدہ.....'' محبوبہ نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا جسے اکبر نے خاموشی سے تھام لیا۔ دونوں طرف مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوا' اُدھر کلاس فیلوز اکبر کو تلاش کرتے ہوئے وہاں آئے تو وہ اٹھ کر دھیرے دھیرے اکبر کی نگاہوں سے اوجھل ہوتی چلی گئی تھی۔

شب کے پچھلے پہر اونگھ آنے پر پیپرز اکبر کے سامنے تھا اس نے بھی سوالات ذہن نشین کر لیے اور صبح اسی پرچے کا عکس جوں کا توں اکبر کے سامنے تھا۔ جسے لکھنے میں اُسے ذرا پریشانی یا گھبراہٹ محسوس نہ ہوئی۔ یوں بھی پیپرز میں عمدہ نمبروں سے کامیابی کے بعد اسے محبوبہ کی محبت کا برملا اعتراف کرنا پڑا۔

بی اے کے بعد اکبر گاؤں چلا آیا اور پھر اس نے بوڑھے باپ کے ساتھ کھیتوں میں ہاتھ بٹانا شروع کر دیا۔ اُدھر محبوبہ سے دوستی و محبت کے در'وا' ہوئے تو روزانہ ملاقاتوں نے جنم لیا۔ وہ اکبر کے بھی کام بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام دینے لگی۔ اب کام اکبر کے ذہن میں ہوتا اُدھر اُس پر مکمل ہونے لگتا۔ دونوں کے دن عید اور رات شب برأت کی مانند گزرنے لگیں اور ہر سو جیسے مسرتیں رقصاں ہو گئیں اور فصلیں بھی لہلہاتی ہوئی دوگنا ہونے لگیں۔

☆.....☆.....☆

گزرتے وقت کے ساتھ پری زاد محبوبہ مکمل طور پر اکبر کے وجود اور دل و دماغ پر حاوی ہو چکی تھی۔ اب وہ اسے اپنی مرضی اور اشارے پر چلا رہی تھی۔ اس کی مرضی ہوتی تو وہ اسے لوگوں سے ملنے اور اچھا بولنے دیتی اگر محبوبہ کی مرضی یا رضا مندی نہ ہوتی تو اکبر لوگوں کو اپنی لال سرخ آنکھوں سے اس قدر گھورتا کہ انہیں دوبارہ اکبر کی طرف دیکھنے کی اور بات کرنے کی ہمت نہ ہوتی۔

اس صورتِ حال کو بھانپتے ہوئے حاجی صاحب اور برادری کے چند معززین نے اکبر کی شادی کا فیصلہ کیا' کچھ لوگوں نے اسے کسی پیر فقیر کے پاس تویذ گنڈے کی تجویز دی۔ مگر اکبر مکمل طور پر محبوبہ کے حصار میں تھا۔ وہ اپنی مرضی اور رضا مندی سے قدم بھی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ ایک روز اُس کی طبیعت ذرا نارمل دیکھ کر باپ نے اُسے اپنے شادی والے فیصلے سے آگاہ کیا۔ جیسے سن کر پہلے وہ تھوڑا سا شرمایا اور پھر مسکرا کر بولا۔

''باباجی..... جیسے آپ کی مرضی.....''

ایک روز اکبر اپنے کھیت کی منڈیر پر اپنے ہی خیالوں میں چلا جا رہا تھا کہ سامنے بیری کی نرم و نازک شاخوں پر کچھ بچے اٹھکیلیاں کرتے نظر آئے۔

''اوئے گر جاؤ گے.....'' اُس کے منہ سے بے

ماملتہ لگلا۔ اگلے ہی لمحے خالی شاخیں ہوا کے دوش پر لہرانے لگیں۔ بچے غائب تھے۔ یہ منظر دیکھ کر اُس لے اوسان خطا ہو گئے وجود لرزنے لگا اور پاؤں بوجھل ے ہو کر لڑکھڑانے لگے۔ وہ منڈیر سے پھسل کر گرنے ں والا تھا کہ عقب میں کسی نے اُسے تھام لیا تھا۔

''اوہ..... تم ڈر گئے.....'' محبوبہ اُسے مکمل طور پر اپنی بانہوں کے حصار میں جکڑے بری طرح کھلکھلا کر ں رہی تھی۔ اکبر کی سانسوں کا طلاطم ڈگمگانے لگا۔ ں نے اپنے پورے زور اور غصے سے اپنا آپ چھڑانا چاہا مگر..... دونوں ہی گندم کے کھیت میں بری طرح جا گرے' اکبر نے جلدی سے اپنے آپ کو اُس سے ور کرنا چاہا مگر..... وہ ایسا نہ کر سکا اُسے یوں محسوس ونے لگا جیسے اس کا دل ایکدم ہی مٹھی میں آ گیا ہو۔

محبوبہ نے مسکراتے ہوئے اُسے آزاد کر دیا وہ دو قدم دور جا کھڑا ہوا۔ محبوبہ ہنستی ہوئی اس کے قریب ہوئی اور اکبر کا ہاتھ تھام کر اسے دلاسہ دینے لگی۔

''تم تو بس ایسے ہی ڈر گئے میں تو مذاق کر رہی تھی' مجھے تم سے بہت ہی زیادہ محبت ہے۔''

''عجیب انداز ہے تمہاری محبت کا' ایک طرف بچے بن کر مجھے ڈرا رہی ہو تو دوسری طرف محبت جتا رہی ہو۔'' اکبر نے روٹھنے کے سے انداز میں اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

محبوبہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑے گھٹنوں کے ل بیٹھی چلی گئی۔

''مجھے معاف کر دو میں نے تو اک ذرا سا مذاق کیا ہے تمہارے ساتھ۔''

''نہیں..... نہیں..... میں ایسی محبت پر قطعاً یقین نہیں رکھتا۔'' اکبر ناراض ہو کر چلنے لگا۔ تو وہ پھر سے اس کے سامنے چلی آئی تھی۔

''مجھے معاف نہیں کرو گے؟'' وہ بیکراں چاہتیں نگاہوں میں سمائے اکبر کو یوں تکنے لگی جیسے پیاسا ساحل پر آ کر پانی کی طرف دیکھتا ہے۔

اکبر نے اُسے فوراً ہی بازوؤں سے پکڑ کر گلے لگا لیا تھا' باتیں کرتے ہوئے وہ برگد کے نیچے چلے آئے تھے جہاں کبھی مضارعے اپنے اپنے کام میں مصروف تھے کبھی کچھ جوں کا توں تھا۔ بیلنے سے گنے کا رس اور گڑ بنایا جا رہا تھا ایک طرف گڑ سے دیسی چینی تیار ہو رہی تھی۔ مگر اکبر کا دل و دماغ تو کسی اور ہی وجہ سے اتھل پتھل ہو رہا تھا۔ آج اس نے جواں سال محبوبہ کی سانسوں اور اُس کے جسم کی سوندھی خوشبو اس قدر قریب سے محسوس کی تھی' جیسے وہ اس کے پورے وجود میں مکمل سما چکی ہو۔

اُسی شب پچھلے پہر جیسے ہی محبوبہ اس کے سامنے وارد ہوئی۔ اس نے اپنی برادری اور بزرگوں کی خواہش یعنی اپنی شادی کی بات کہہ دی۔'' یہ بات سن کر محبوبہ کا چہرہ ایکدم ہی ماند پڑتا چلا گیا۔ اس کے چہرے پر زمانے بھر کے غم چھا گئے۔ لیکن وہ اپنے آپ پر کنٹرول کرتے ہوئے بولی۔

''ٹھیک ہے اکبر..... مگر؟''

''مگر کیا؟'' وہ حیران سا ہو کر اُس کی صورت تکنے لگا۔

''شادی ضرور کرو مگر..... سہاگ رات کو میں تمہاری بیوی کے وجود میں جلوہ گر ہوں گی' تمہیں تو پتہ ہے کہ میں بھی ناممکنات کو ممکن بنا سکتی ہوں' وجود تمہاری بیوی ہی کا ہو گا مگر.....!'' اکبر نے کچھ بولنا چاہا مگر محبوبہ نے بات کاٹی تھی۔

''ہاں وہی تمہاری بیوی ہو گی جس سے تمہارا نکاح ہو گا' میں تو بس.....''

''تو پھر؟'' اکبر بوکھلا سا گیا تھا۔

''اکبر..... میں تم سے جنون کی حد تک پیار کرتی ہوں' کرتی رہوں گی، مگر ہمارا پیار و محبت اُس وقت تک قائم رہے گا جب تک تمہارے دل میں اور کوئی خیال کوئی تصور نہیں ابھرے گا۔ جیسے ہی تمہارے دل میں باپ کی شفقت نے سر ابھارا اور تمہارے دل میں بچے کی خواہش مچلی پھر..... ہماری راہیں جدا ہوں گی اور پھر یہی خواہش امید اور حسرت تمہارے یا میرے بکھرنے اور خوار ہونے کی علامت ہو گی۔'' یہ کہہ کر وہ دور کھڑے کیکر کے اس پیڑ کو تکنے لگی تھی۔ جس پر شاخیں تھیں اور نہ پتے' اُس کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگیں تھیں۔

☆.....☆.....☆

کچھ حقیقتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں ذہن اور دل و دماغ تسلیم نہیں کرتا' کچھ باتیں ایسی ہوا کرتی ہیں جنہیں عیاں نہیں کیا جاتا کیونکہ ہماری نگاہوں سے اوجھل ایسی ایک دنیا بھی آباد ہے جو کبھی کبھی بندے کے لیے کڑا امتحان بن جاتی ہے' مگر اسے اپنے لیے کسی راستے کا انتخاب کرنا ضروری بن جاتا ہے۔

اکبر کی شادی کی سبھی رسومات دھوم دھام سے سر انجام پائیں۔ سبھی چہرے سے شادمان دکھائی دے رہے تھے اور کوئی بھی انہونی نہیں ہو پائی تھی۔ نگہت اکبر کے دور پار کے چچا کی بیٹی اُس کے عقد میں آئی تھی۔ سبھی پوری برادری خوشیوں سے شادمان تھی' اکبر بھی سبھی رسومات میں خوشدلی سے شامل ہونے کی کوشش تو کر رہا تھا۔ مگر اسے ایک انجانا سا خوف اور ڈر محسوس ہو رہا تھا۔ اس کا دل انجانے خوف سے بجھا بجھا سا تھا۔

شب گئے سبھی مہمان سونے کے لیے اپنی اپنی خواب گاہوں کی طرف بڑھ گئے تو وہ دلہن کے کمرے میں چلا آیا' کمرے کو بہت اچھے انداز سے سجایا گیا تھا۔ دلہن حجلہ عروسی میں محو انتظار تھی۔ جیسے ہی اُس نے دلہن کا نقاب پلٹا' دلنشین مسکراہٹ کے ساتھ محبوبہ نے اس کا سواگت کیا۔ وہ لمحہ بھر کو بھونچکا رہ گیا۔ اور بیڈ سے اٹھ کر جانے کی کوشش کی' مگر دلہن نے اس کا بازو تھام لیا۔

''سرتاج! مجھ سے ایسی کون سی غلطی سرزد ہوئی ہے جو آپ میرا چہرہ دیکھتے ہی واپس جا رہے ہیں۔''

آواز نئی نویلی بیوی نگہت ہی کی تھی لیکن چہرہ محبوبہ کا تھا وہ تو حیران پریشان موجودہ صورت حال جاننے کی کوشش میں خاموش تھا۔

ایسی صورت میں بھلا اسے کیا جواب دیتا' بس چپکے سے اُسی بیڈ پر بیٹھتا چلا گیا۔ وہ کچھ دیر تو نگہت سے باتیں کرتا رہا پھر اس پر ایک سحر سا طاری ہوتا چلا گیا' اُسے کچھ پتہ نہ چلا کہ اس نے نگہت سے کیا کہا اور شب کیسے گزاری؟ صبح موذن کی اذان سنائی دی تو جیسے وہ اپنے ہوش میں آیا تھا۔ اسی دوران کمرے کا روشن دان چھناکے سے ٹوٹ کر باہر گلی میں جا گرا۔

اُس وقت اسے شب بھر کی پوری حقیقت کا علم ہو گیا' وہ اپنی بیوی کے پاس ہی موجود تھا۔ وہ شب خوابی کے لباس میں سوئی ہوئی تھی۔ وہ سوچوں کی عمیق گہرائیوں میں اترتا چلا گیا تھا۔

رات نگہت کے جسم پر محبوبہ کے چہرے کا خیال اُس کے دل و دماغ کو منتشر کرتا چلا گیا' وہ سوچ کر رہ گیا کہ آتشی اور خاکی مخلوق کا بھلا کیا جوڑ؟ محبوبہ ہواؤں میں قلابازیاں لگا کر میلوں کا سفر پل بھر میں طے کرنے والی مخلوق اور انسان زمین پر رینگنے والے کیڑوں کی مثال' اُن کی آسمان کی بلندیوں تک چند لمحوں میں رسائی اور ہمارے دنوں کے فاصلے' اُن کی رفتار ہماری نگاہوں سے بھی تیز اور انوکھی اور ہمارا برسوں کا فاصلہ' پھر بھلا یہ سنگم یہ ملن اور ساتھ کب تک اور کیسے برقرار رہے گا؟

''سرتاج! اب تو آپ بھی اٹھ جائیں زیادہ تر مہمان جاگ چکے ہیں۔'' بیوی کی آواز سن کر اکبر کی سوچوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا اور وہ اٹھ کر شاور کے لیے باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔

☆.....☆.....☆

بابا سمن شاہ علاقے بھر کے معروف اور عظیم ہستی اور بزرگ تھے' ان کا فیوض و برکات دور دور تک مشہور تھا۔ اُن کا نام تو بابا دولت شاہ تھا۔ ان کی بیشتر کرامات میں یہ بھی مشہور تھی کہ اُن کے مرید علی شیر کی رات کے اندھیرے میں چوروں نے بھینس چرالی اُس وقت وہ حاضری کے لیے درگاہ پر تھا۔ اُسے اس کی اطلاع دی گئی اس نے خود ہی چوروں کے پیچھے جانے اور کھوج نکالنے کی بجائے درگاہ پر ہی بابا سے فریاد کی۔

''بابا جی! میری بھینس واپس کرا دو میرے بچے دودھ کے لیے ترس جائیں گے۔ اگر میری بھینس نہ ملی تو آئندہ میں درگاہ کی صفائی اور آپ کی حاضری ہرگز نہیں دوں گا۔''

اُسے اسی کیفیت میں کتنی دیر گزر گئی' اونگھ آنے پر اسے آواز سنائی دی۔

''جاؤ شیر تمہاری بھینس مل جائے گی۔ اگر نہ ملی تو چور اسی کھیت کی منڈیروں پر گھومتے رہیں گے انہیں راستہ نہیں ملے گا۔''

اور پھر وہی ہوا دوسرے روز تینوں چور بستی سے ذرا دور اچھے گجر کے کھیت میں گھومتے ہوئے ملے اور بھینس کھیت میں چارہ کھاتی پائی گئی۔ بس تب سے اُس بزرگ کا نام محسن شاہ مشہور ہو گیا۔

ایک روایت کے مطابق قبرستان میں آتشی مخلوق کا بسیرا تھا۔ ہفتہ کے آخر پر جمعرات کی شام قبرستان میں آگ کا الاؤ سا روشن ہوتا اور پھر بڑھتا ہوا آسمان کی وسعتوں تک دکھائی دیتا' بستی کے چند بزرگ ہاتھ باندھے درگاہ پر حاضر ہوئے اور عرض کی۔

''بابا جی! اِس آگ سے پورے گاؤں کے بچے ڈرنے لگے ہیں اور بیشتر بیمار بھی ہو جاتے ہیں مہربانی فرما کر اس آگ کو ختم کروا دو۔''

''آپ سبھی مل جل کر گاؤں کی مسجد اپنی نمازوں سے آباد کریں۔ خداوند کریم بہتر کرے گا۔'' نحیف سی آواز میں فرمان ہوا۔ اُس کے بعد پھر کبھی آگ کا الاؤ نہ دیکھا گیا اور نہ ہی گاؤں پر کسی قسم کی سختی وارد ہوئی۔

آپ کا عرس مبارک ہر سال یکم جون کو منایا جاتا ہے ہزاروں لاکھوں زائرین عرس میں شرکت کرتے ہیں محفل سماع' تلاوت' نعتیں ہوتی ہیں۔ کشتیاں' کبڈی بڑی دھوم دھام سے ہوتی ہے' اُس عرس میں علاقے بھر سے لوگ جماعتوں' ٹولیوں کی صورت ڈھول کی تھاپ پر بھنگڑا ڈالتے ہوئے آتے ہیں اور دلی مرادیں پاتے ہیں۔

☆.....☆.....☆

اُس دن اکبر بے حد خوش تھا جب شادی کے چند ہی ماہ بعد اُسے قریبی شہر میں لیکچرار شپ مل گئی۔ وہ خاندان بھر میں خوشی مناتے ہوئے مٹھائیاں بانٹ رہا تھا۔ ایک برقعہ پوش خاتون بھی لوگوں کے ساتھ موجود مٹھائی کے لیے ہاتھ آگے بڑھا رہی تھی۔

اکبر اس نرم و نازک ہتھیلی پر مٹھائی رکھتے ہوئے بولا۔

''دعا کریں خدا مجھے چاند سا بیٹا عطا فرمائے۔''

غزل

میں دیکھوں تو مجھ پر محبت کُھلتی ہے
وہ دیکھے تو اور حقیقت کُھلتی ہے

وہ دل' جس پر ہجر میں ہجرت کُھلتی ہے
صرف اُسی پر رمزِ شہادت کُھلتی ہے

جیتے جی آزاد سمجھتے ہیں جن کو
وہ نہ رہیں تو قدر و قیمت کُھلتی ہے

عشق ہے کیا؟ وحشت میں پردہ اُٹھتا ہے
وحشت ہے کیا؟ دشت میں وحشت کُھلتی ہے

آئینہ جب مجھ سے آنکھ ملاتا ہے
آئینے پر عکس کی حیرت کُھلتی ہے

چُپ بیٹھوں گا لوگوں سے کٹ جاتا ہوں
بولوں تو اُس شخص سے قربت کُھلتی ہے

شبیر نازش

برقعہ میں موجود محبوبہ کو یوں محسوس ہوا جیسے اُس کے وجود پر گراں بوجھ ڈال دیا گیا ہو اس پر زمانے بھر کا غم اور غصہ چھا گیا' اس نے طیش میں آ کر مٹھائی ہوا میں یوں اچھالی کہ بارش کی صورت ذرہ ذرہ ہو کر گھر کے پورے آنگن میں بکھر گئی' پھر غضب ناک چیخ مار کر بیرونی دروازہ عبور کر گئی۔ اکبر دل تھام کر نیچے بیٹھتا چلا گیا۔ کس قدر کٹھن اور جانگسل تھے وہ لمحے' اکبر اُسی سے اسی کی پابندی میں کہی بات اور چیز مانگ رہا تھا جو اسے قطعی گوارا نہ تھا۔

کبھی کبھی بندہ اُس سے اس چیز کی فرمائش کر رہا ہوتا ہے جس سے وہ خود اسے منع کرتا ہے اور اُسے قطعی منظور نہیں ہوا کرتا' مگر یہ فطرتی عمل ہے انسان کے من میں چھپی حسرتیں خواہش بن کر لبوں سے خود بخود پھسل جایا کرتی ہیں۔ جس سے اسے خود بھی ملال سا ہونے لگتا ہے مگر بات تیر اور پانی گزر جائے تو پھر کبھی واپس نہیں پلٹا کرتے۔

☆.....☆.....☆

وقت ذرا اور آگے بڑھا اور اپنے ساتھ ماہ و سال لے کر گزر گیا' حاجی علی احمد اس فانی دنیا سے رحلت فرما کر ملک عدم سدھار گئے۔ اکبر اپنے فرائض خوش اصلوبی سے ادا کر رہا تھا۔ کھیت کھلیان یونہی آباد تھے۔ فصلوں کی روانی برقرار تھی۔ اور بھی مضارعے اپنی اپنی ڈیوٹیاں احسن طریقے سے نبھا رہے تھے۔ اکبر کا گھر بیکراں خوشیوں کا گہوارہ بن گیا تھا۔ نگہت گھڑا اور ملنسار بیوی ثابت ہوئی اس نے گھر کو چار چاند لگا دیے۔

ہر چیز کو سلیقے سے سجاتی اور کھانا منفرد انداز میں پکاتی' مگر محبوبہ اس کے سنگ سنگ ہی رہی تھی۔ وہ اپنی خواہش میں نگہت کے پاس جاتا نگہت مسکراتے ہوئے اس کا پرتپاک استقبال کرتی مگر پچھلی رات اس کے پہلو میں محبوبہ ہوتی' کبھی کبھی یوں بھی ہوتا کہ اکبر کالج کے کلاس روم میں لیکچر دیتے ہوئے جانے کن خیالوں کے سحر میں پہنچ جاتا اور پھر باتوں کا موضوع ہی بدل جاتا جس سے اُس کی ساکھ متاثر ہونے لگی اور بدنامی کے ڈر سے اس نے ملازمت چھوڑ دی اور اپنی فصلوں کی نگہداشت کرنے لگا۔

رفتہ رفتہ اکبر بیوی اور محبوبہ کی دوہری زندگی سے بیزار ہونے لگا تھا۔ اسے نہ دن کو چین تھا اور نہ رات کو آرام' ہر وقت عجیب و غریب سوچیں اور وسوسے اس کے دل و دماغ پر مسلط رہتے اب اُس کے دل میں باپ بننے کی خواہش شدت سے سر اٹھانے لگی تھی اور اُس نے بابا گھمن شاہ کے دربار جا کر اپنی اس خواہش کا اظہار بھی کیا تھا۔ پھر ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے اُس کی زندگی بدل کر رکھ دی۔

اُس روز وہ کھیتوں سے واپس لوٹ رہا تھا کہ سوندھی اور خوشگوار خوشبو سے محبوبہ کی آمد کا احساس ہوا۔ آج اس کی صورت اجڑی اجڑی اور غصے سے بھرپور محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اس کے مقابل آ کھڑی ہوئی اور گویا ہوئی۔

''میں نے تمہیں کہا تھا نا..... جس روز تمہارے دل میں اولاد کی خواہش جنم لے گی وہ میری یا پھر تمہاری زندگی کا آخری روز ہوگا' ہم آتشی مخلوق اپنے درمیان تیسرے وجود کو قطعی برداشت نہیں کر سکتے اور تمہارے دل میں باپ کی شفقت غالب آ رہی ہے اور اس کے لیے تم گھمن شاہ کے دربار بھی گئے تھے' جو مجھے ہرگز قبول نہیں' میں تمہیں جلا کر خاکستر کر دوں گی یا پھر اپنے آپ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دوں گی۔''

محبوبہ کی شکل و صورت غضب ناک ہو رہی تھی۔ پورا وجود غصے سے سرخ ہوتے ہوئے لرز رہا تھا۔

''محبوبہ..... تم بھول رہی ہو شاید کہ تم سے زیادہ ایک اور بھی بڑی اعلیٰ اور عظیم طاقت ہے جس کی حکومت' حاکمیت مشرق سے مغرب تک قائم اور سدا رہنے کے لیے برقرار ہے۔ اس کے قبضہ قدرت میں میری اور تمہاری جان ہے وہ بڑا عظیم اور غفور الرحیم ہے۔

تکبر غرور اور خدائی کا دعویٰ تو فرعون' نمرود اور شداد جیسے کافروں نے بھی کیا تھا مگر وہ سبھی نیست و نابود ہوئے اور خداوند کریم نے اپنی حاکمیت برقرار رکھتے ہوئے زمانے کے لیے عبرت کا نشان بنا دیا' اور اب تم بھی گھمنڈ غرور اور اپنی طاقت کو آزمالو' میرے

لیے میرا اللہ ہی کافی ہے' جس کے قبضہ قدرت اور اختیار میں سبھی کچھ ہے۔''

محبوبہ کی آنکھیں سرخ انگارہ سی ہوگئیں' اس پر زمانے بھر کی فرعونیت چھا گئی۔

''اچھا..... تو تم میرا کرشمہ دیکھنا چاہتے ہو۔'' اس نے تکبرانہ انداز سے کہا اور اپنے منہ کو فصلوں کی طرف کرتے ہوئے پھونک ماری جس سے ہر طرف آگ ہی آگ بھڑک اٹھی۔

اکبر پریشانی کے عالم میں زمین پر بیٹھتا چلا گیا' ہاتھ بے ساختہ دعا کے لیے اٹھے اور نگاہ آسمان پر مرکوز ہوگئیں پھر اُس کے لب خود ہی خود پھڑ پھڑانے لگے۔

''اے میرے مولا' میرے پروردگار..... میں تیرا ادنیٰ سا بندہ ہوں' گنہگار ہوں مگر تجھ پر یقین' اعتماد اور پکا بھروسہ ہے۔ اس زمین پر جب بھی کوئی فرعون پیدا ہوا۔ تُو نے موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا آج اگر تُو نے میری مدد نہ کی تو کفر غالب ہوگا۔ ظلم بڑھتا رہے گا دندناتا پھرے گا۔'' اُس کی پلکوں سے آنسو نکل کے پانی کی طرح بہنے لگے تھے۔

پھر آن واحد میں آسمان پر کالے سیاہ بادل چھا گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ جس سے محبوبہ کی لگائی آگ فوراً ہی بجھ گئی۔ اس کا رنگ سیاہ کوئلوں کی مانند ہونے لگا۔

غرور' تکبر زائل ہوگئی وہ لڑکھڑاتے قدموں سے بھاگنا چاہتی تھی مگر..... اکبر نے بھاگ کر سلگتی ہوئی لکڑی اٹھائی اور خدا کا نام لے کر اس کی طرف اچھال دی۔ محبوبہ کے وجود سے ٹکراتے ہی آگ لگ گئی اور پھر جلد ہی آگ کے شعلے آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگے۔

اُسے اپنے قدموں پر کھڑا ہونا دشوار سا ہوگیا۔ پھر وہ لڑکھڑا کر گر پڑی اور ہڈیوں کا ڈھانچہ نکل آیا جس پر بہت سارے کوئے اور چیلیں اڑنے لگیں۔

اکبر دعا ہی کی صورت زمین پر سجدہ ریز ہوتا چلا گیا۔ اور پھر اسے اپنی کچھ خبر نہ رہی' اوسان بحال ہوئے تو وہ درگاہ کے ولی بابا گھسن شاہ کے قدموں میں تھا وہ زور زور سے گڑگڑانے لگا' جانے کون کون سی دعائیں اُس کے لبوں سے ادا ہوتی رہیں کئی سے یونہی گزر گئے اور پھر دھیمی سی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

''جاؤ بیٹا..... خدا نے تمہاری سن لی ہے۔ محبوبہ کا انجام تمہارے سامنے ہوا اور اب تمہیں ڈرنے کی ذرا فکر نہیں اگر زندگی میں کبھی ڈر یا خوف محسوس ہو تو میرا نام یاد کرتے ہوئے مجھے آواز دینا..... خدا آپ کے ساتھ ہے۔''

یہ سن کر اس نے اپنی آنکھیں صاف کیں اور دھیرے دھیرے گھر کی راہ لی۔ جہاں نگہت اُس کی منتظر تھی اور سچ تو یہ ہے کہ اس روز اکبر نے نگہت اور اس کی بے پناہ محبت کو پہلی بار اس قدر چاہت اور اپنائیت سے محسوس کیا تھا۔

☆.....☆.....☆

اس واقعہ کو کئی سال گزر چکے ہیں اکبر کے تین بچے ہیں اور وہ بچوں کے ساتھ خوش کن زندگی گزار رہا ہے۔ اس کی زمینیں آباد ہیں۔ وہ روزانہ نگرانی پر قرآن مجید کا ورد اور تلاوت کرتے ہوئے چکر لگاتا ہے۔

محبوبہ کا ہیولا کبھی کبھار اس کے سامنے نمودار ہوتا ہے مگر نادم پریشان اور مایوس سا اس کی نگاہیں جھکی جھکی اور شرمندہ سی ہوتی ہیں جیسے اس نے کوئی بہت بڑا جرم کیا ہو۔

یہ سچ ہے کہ غیر مرئی مخلوق اور انسانوں کی دوستیاں ہوتی ہیں مگر محبت دیرپا ہرگز نہیں ہوا کرتی کیونکہ آتشی اور خاکی کا جوڑ متضاد ہے آتشی مخلوق میں کبھی کبھار غرور' گھمنڈ اور بغاوت آ ہی جاتی ہے۔ جس کا نشانہ وہ اسی خاکی ہی کو بناتے ہیں۔

انسان بھی بھول کر بھی غیر مرئی مخلوق کی محبت نہ اپنائے' کیونکہ اُن کی وفائیں بہت بڑا صحرا ہوا کرتی ہیں جس میں انسان عمر بھر بھی سفر کرتا رہے منزل پر نہیں پہنچ سکتا۔ انسان بکھر جاتا ہے اپنے آپ میں نہیں رہتا۔

☆☆.....☆☆

بس وہ خواب

اسد اعوان کا شعر

اُس دربار پہ رونق رہتی ہے اکثر
اُس دربار پر مست ملنگ آجاتے ہیں

تحسین جونیجو

چھم چھم چھم گھنگروؤں کی تیز آواز کے ساتھ ڈھول اور دھمال کی گونج میرے کانوں کے پردے اچانک ہی چیرنے لگی تھی، میں گھبراہٹ کے مارے اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ میرے پورے وجود میں جلن سی

ہو رہی تھی۔

وہ رات کا آخری پہر تھا' بادلوں نے پورے گاؤں کو لپیٹ میں لے رکھا تھا اور پھر وہ اِس قدر برسے کہ ندی اور نالے اپنا راستا بھول گئے' اب گرمی کی شدت میں بہت حد تک کمی آ گئی تھی۔ لائٹ نہ ہونے کی وجہ سے میں صحن میں سوئی ہوئی تھی' لیکن پھر بارش کی وجہ سے لاؤنج میں چارپائی ڈال کے سونا پڑا تھا۔ لیکن موسلا دھار بارش' گھنگھروؤں اور ڈھول کی آواز نے بیدار کر دیا تھا' اُس وقت میرا دل بھی ڈھول کی طرح بج رہا تھا۔ مجھے گزشتہ چند روز سے ایک خواب نے بہت تنگ کر رکھا تھا۔

صبح اٹھی تو کسی چیز میں دل نہیں لگ رہا تھا بہت عجیب سی حالت ہو گئی تھی۔ خیر دن کسی نہ کسی صورت یوں ہی کاموں میں گزر گیا تھا اور رات پھر وہی خواب میری آنکھوں کا مہمان تھا جس نے میری پریشانی میں مزید اضافہ کر دیا تھا اور اب اس بات کا کسی سے ذکر کرنا بھی ضروری ہو گیا تھا۔

امی سے میں یہ بات کر نہیں سکتی تھی کہ وہ جلدی پریشان ہو جاتی ہیں' پھر اپنی بڑی بہن سے اس خواب کا ذکر کیا' جو کہ مسلسل چند راتوں سے مجھے آ رہا تھا۔ انہوں نے کوئی خاص ردِعمل نہیں دکھایا' بس یہ کہہ کر ٹال دیا۔

''یہ خواب تو بس دماغ کی تخلیق ہوتے ہیں۔ تم زیادہ نہ سوچا کرو۔'' میں نے بہن کی بات کو ہی سچ جانا تھا لیکن پھر ایک رات چھوڑ کر وہی آوازیں میرے کانوں میں گونج رہی تھیں۔

اگلی صبح میں نے بہن سے کہا۔

''آپی معلوم نہیں اِن خوابوں کا اشارہ کس طرف ہے' ہو سکتا ہے کہ میں نے کوئی منت مانی ہو' لیکن پوری ہونے کے بعد میں بھول گئی ہوں شاید' تو چلے چلتے ہیں حضرت لال شہباز قلندر کے مزار پر چادر چڑھاتے ہیں' ہو سکتا ہے کہ اس کے بعد وہ خواب آنا بند ہو جائیں۔'' میں نے یہ بات بہت سنجیدگی سے کہی تھی۔ سو آپی راضی ہو گئی تھیں۔

حضرت لعل شہباز قلندر چھٹی صدی ہجری کے آخر میں تبریز (آذربائیجان' روس) کے قریب گاؤں مروند میں 573ھ 1177ء میں پیدا ہوئے آپ سیہون شریف ضلع دادو سندھ) میں آرام فرما ہیں۔ اور دنیا آپ کو شہباز ولایت مخدوم اولیا حضرت حافظ سید عثمان مروندی سیوہانی سرکار المعروف لال شہباز قلندر کے نام پاک سے جانتی ہے۔ برصغیر میں آپ کو بڑی شہرت' عقیدت اور محبت حاصل ہے' سیہون سندھ کا عظیم روحانی مرکز ہے جہاں ہر وقت میلے کا سماں ہوتا ہے' ماشاء اللہ کیا روحانی سکون ملتا ہے' مزار قلندر پر کہ وہاں سے جانے کو دل ہی نہیں کرتا۔ ایسا ہی کچھ میرے ساتھ بھی ہوا تھا۔

میں جب جب وہاں سے ہٹنے کی کوشش کرتی تو ایک عجیب کیفیت طاری ہو جاتی جیسے کوئی طلسماتی چیز اپنے اور کھینچتی' میری حالت دیکھ کر بہن پریشان ہو گئی۔

''ہوا کیا ہے تمہیں' یہ اچانک رونے جیسی شکل کیوں بنا رکھی ہے؟''

''میں خود نہیں جانتی' میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟'' میں نے کھوئے ہوئے لہجے میں جواب دیا تھا۔ پھر یوں ہی گم صم حالت میں چادر چڑھائی تھی' دعا مانگتے ہوئے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا مانگوں' بس چپ چاپ کھڑی رہی کہ دلوں کے بھید تو اللہ ہی جانتا ہے' من کی مرادیں بھی وہی پوری کرے گا' اسی یقین کے ساتھ میں مزار کے صحن میں آ گئی تھی۔ وہاں زائرین کی بھیڑ' ڈھول کی آواز' گھنگھروؤں کی گونج مجھے ہوش کی دنیا میں لے آئی تھی کہ یہ تو وہی منظر ہے جو میں بار بار خواب میں دیکھ چکی ہوں' وہاں ایک عورت کوئی پینتیس برس کی ہو گی بے ترتیب کھلے بالوں کے ساتھ بلوچی لباس میں' اپنے جنوں میں مگن دھمال ڈال رہی تھی' وہاں کوئی سات آٹھ ماہ کی ایک حاملہ عورت بھی اپنی دھن میں رقص کیے جا رہی تھی۔ اُسے اس حالت میں دیکھ کر میری حالت خراب ہونے لگی کہ اُسے اپنے ہونے والے بچے کی ذرا بھی پرواہ نہیں' واہ رے مولا تیری شان اور مرشد پاک کی عقیدت کے راز تو ہی جانے.....

''چلو ناں آپی یہاں سے..... مجھے ڈر لگ رہا ہے' اِس حاملہ عورت کو دیکھ کر' کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھ پر کسی کا سایہ پڑ جائے' کیونکہ کہتے ہیں جوان کنواری لڑکیوں کا ایسی جگہ پر جانا مناسب نہیں۔ وہاں پر اکثر دوسری مخلوق بھی ڈیرے ڈال کے رکھتی ہے۔'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا تھا۔

''ہاں تو کیا ضرورت تھی اِدھر آنے کی؟'' آپی کچھ ناراض ہونے لگیں۔

''بس وہ خواب.....''

''ہاں بس ٹھیک ہے اب چلو.....'' ہم باہر آ کر اپنی گاڑی میں بیٹھ گئے' اب جو دیکھا تو ہماری گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ایک چھوٹی سی بچی جو لگ بھگ ڈھائی تین سال کی ہوگی' بڑے آرام سے بیٹھی مسکرا رہی تھی' ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف حیرانی سے دیکھا کہ یہ کس کی بچی ہماری گاڑی میں آ گئی ہے یا کوئی چھوڑ گیا ہے۔ ہم بچی کو اٹھا کر واپس مزار پر گئے کہ پتا کروائیں کہ کسی کی بچی تو کھو تو نہیں گئی ہے' وہاں ہم ایک متولی سے جا کر ملے' اور اس بات سے آگاہ کیا' اپنے بھائی کا نمبر بھی لکھ کر دیا کہ جس کی بچی ہے اِس نمبر پر رابطہ کرلے تقریباً ایک سے ڈیڑھ گھنٹہ ہم وہیں ٹہلتے رہے کہ کوئی بچی کا وارث تلاش کرتے آئے' مگر کوئی نہ آیا تب ہم گھر واپسی کے لیے روانہ ہوئے اور بچی کو بھی ساتھ بٹھالیا' وہ بالکل خاموش بس دیدے پھاڑ کر ہمیں دیکھتی رہی تھی۔

اُس روز بہت غضبناک گرمی تھی' ہمارے پسینے چھوٹ رہے تھے' سیون شریف میں تو گرمی ویسے بھی زیادہ ہی جوش مارتی ہے۔

لیکن وہ بچی بے فکر اور پُرسکون تھی' اُسے ذرا برابر بھی گرمی کا احساس نہیں ہو رہا تھا' ہم راستے بھر بار بار اُسے دیکھتے رہے تھے' مگر وہ بغیر شور کیے چپ بیٹھی رہی تھی۔

گھر پہنچ کر میں نے اُسے گود میں اٹھالیا تھا تب بھی اس نے کوئی ایسی حرکت نہیں کی جو عام طور پر بچے کرتے ہیں۔

''شکر ہے آپی کہ ہم جلدی وہاں سے نکل آئے' ورنہ آج پتا نہیں مجھے کیا ہونے والا تھا۔''

''تم مت جایا کرو کسی بھی مزار پر' معلوم نہیں وہاں دوسری مخلوق بھی پائی جاتی ہے جو اکثر جوان بچیوں کی تلاش میں رہتی ہے اگر کسی کا دل آ گیا نا تم پر تو پھر گئیں ہر کام سے.....''

''بس بھی کریں آپی کیا بہکی بہکی باتیں کر رہی ہیں' پہلے ہی سہم گئی ہوں اوپر سے آپ کی یہ باتیں.....''

''اچھا چلو میں بہت تھک گئی ہوں' سونے جا رہی ہوں اس بچی کو کچھ کھلا دَ پلا دَ پتہ نہیں کب سے بھوکی ہوگی بے چاری۔''

میں نے بچی کو کچھ کھلانا پلانا چاہا تھا لیکن اپنی کوشش میں ناکام رہی تھی۔ پھر میں بھی تھکن اتارنے کے لیے سونے کے خیال سے لیٹ گئی تھی۔

دو گھنٹے بعد میری آنکھ کھلی تو دیکھا وہ بچی میرے برابر میں پڑے صوفے پر بڑے مزے سے بیٹھی ہوئی تھی' میں نے ہاتھ بڑھا کر اُسے پیار کی تھپکی دی' تب وہ ذرا سا مسکرائی تھی مجھے تعجب سا ہوا کہ یہ کیسی بچی ہے جو ننگ ہوتی ہے نہ روتی ہے جیسے عام طور پر بچے کرتے ہیں۔

تب ہی آپی نے مجھے آواز دی تھی کہ ''میرے سر میں بہت شدید درد ہو رہا ہے ذرا بام لا کے میرے سر کی مالش کردو۔''

میں چھوٹے کمرے میں آپی کے لیے بام لینے گئی تھی اور جونہی کمرے میں قدم رکھا تھا مجھے اپنا سر ہوا میں اڑتا ہوا محسوس ہوا تھا' یوں لگا تھا جیسے کئی فٹ ہوا میں اڑ کر نیچے گری ہوں' ہائے اللہ سائیں میرا پاؤں۔

''سنو میں تیل گرم کر کے آتی ہوں اُس کی مالش سے تمہیں آرام مل جائے گا' ویسے تو میں تم سے اپنے سر کی مالش کرانا چاہ رہی تھی اب تمہارے پیر کی مالش کرنا پڑ رہی ہے۔'' آپی نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

آپی میرے لیے گرم تیل لینے چلی گئیں تھیں کہ اتنے میں لبوں پر مسکراہٹ سجائے بچی نے دھیرے دھیرے میرے پاؤں پر اپنے ہاتھ پھیرنے شروع کر دیے تھے مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی بڑا مالش

کر رہا ہو' ایک لمحے کو میں نے اپنا پاؤں ہٹانے کی کوشش کی تھی تو وہ مسکرا رہی تھی۔

''یہ لو بیٹا دودھ پی لو۔'' آپی نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دودھ کا فیڈر بچی کی طرف بڑھایا تھا۔ بچی نے آپی کے ہاتھ سے فیڈر لے کر ڈھکن کھولا تھا اور دودھ یوں پی لیا تھا جیسے گلاس میں پیتے ہیں۔ یہ دیکھ کر ہم دونوں چونک گئے تھے۔ لیکن بولے کچھ نہیں تھے۔

''اب تم آرام کرو' میں رات کے کھانے کے لیے گوشت چڑھا کر آتی ہوں۔'' میرے پیر کی مالش کے بعد' آپی کے جاتے ہی وہ بچی میرے بیڈ سے اُتر کر باہر جانے لگی تھی تو میں نے اسے آواز دی تھی۔

''بیٹا کہاں جا رہی ہو' یہیں بیٹھو۔'' مگر اُس نے میری طرف مڑ کے بھی نہیں دیکھا تھا اور باہر چلی گئی تھی۔

ابھی میں اُس بچی کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ آپی خاصے غصے میں' کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔

''میں نے تمہیں کہا تھا کہ گوشت فریج میں رکھ لینا تو کیوں نہیں رکھا؟''

''ارے آپی میں نے گوشت خود فریج میں رکھا تھا۔'' میں نے انہیں یقین دلایا تھا' مگر انہیں بھلا کیسے یقین آتا' کیونکہ گوشت تو فریج سے غائب ہو چکا تھا۔

☆.....☆.....☆

مجھے بستر پر لیٹے دو دن گزر گئے تھے' جب میں اٹھی تو پاؤں جیسے زمین پر ہی نہیں پڑ رہے تھے۔ پھر میں خود کو گھسیٹ کر باہر صحن میں آئی تو دیکھا بچی چارپائی پر بیٹھی میرے بھتیجوں کے کھلونوں سے کھیل تو رہی تھی لیکن اُن بچوں سے بالکل الگ اپنی دنیا میں مگن تھی۔

ابھی میں بیٹھی ہی تھی کہ آپی کے چلانے کی آواز آئی تھی اب میں دوڑنے سے تو رہی تھی' میرے اٹھنے سے پیشتر ہی وہ بچی بھاگنے والے انداز میں اندر جا رہی تھی' خیر میں بڑی مشکل سے آپی کے کمرے میں پہنچی تو آپی کی حالت بہت خراب تھی۔ شوگر ہائی' بلڈ پریشر ہائی وہ بہت بے چین سی تھیں' یہ ہو کیا رہا ہے ہمارے گھر میں' میں نے سوچا تھا' جب سے ہم اس بچی کو ساتھ لائے ہیں' کچھ بھی ٹھیک نہیں رہا' میری حالت کچھ سنبھلی تو آپی کی طبیعت خراب ہو گئی' اُس روز گوشت ہی فریج سے غائب نہیں ہوا تھا اور بھی کئی چیزیں گھر سے غائب تھیں' اس کے علاوہ بھی چھوٹے موٹے کئی واقعات رونما ہو رہے تھے۔

''ضرور کچھ نا کچھ گڑبڑ ہے۔'' میرے دماغ نے اپنے زندہ ہونے کی خبر مجھے دی تھی۔

بچی کو اب ہمارے گھر میں کئی دن گزر گئے تھے اُسے لینے کوئی نہیں آیا تھا' جبکہ ہم اپنا موبائل نمبر بھی متولی کو دے کر آئے تھے۔

''آپی ایسا کرتے ہیں کہ کل سیہون شریف جا کر بچی وہیں چھوڑ آتے ہیں' پتہ نہیں اس کے ساتھ کیا چکر ہے؟'' آپی نے فوراً ہی میری بات مان لی تھی لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا تھا کہ وہ اس کام کے لیے اکیلی ہی

غزل

بعد مرنے کے میرے گھر سے یہ ساماں نکلا
کچھ فسانے' کہیں غزلوں کا خزانہ نکلا
بند آنکھوں میں بسیرا تھا جو خوابوں کا مرے
جس میں وہ تھا' وہی اک خواب سہانا نکلا
بڑی خوش فہمی تھی' پھولوں سے بھرا ہے دامن
کھول کے دیکھا تو خالی میرا داماں نکلا
آسماں سارا اجالے سے بھرا تھا لیکن
مری قسمت کا نہیں تھا' کوئی تارا نکلا
زندگی ساتھ گزاریں گے کہا تھا' تم نے!
جو بہانا تھا مسافت کا پُرانا نکلا
زندگی گزرے گی تم بن بھلا تنہا کیسے
روٹھنا' منانا ایک خواب پُرانا نکلا

رضیہ ناز

جائیں گی۔

اگلی صبح آپی سیہون شریف جانے کی تیاری کر رہی تھیں' انہوں نے مجھے کہا تھا کہ میں بچی کو ہماری بھتیجی کے کپڑے پہنادوں کیونکہ اُس کے کپڑے خاصے میلے ہوگئے تھے میں نے فوراً ہی اُن کی ہدایت پر عمل کیا تھا۔

''ارے یہ کیسے ہوسکتا ہے۔'' مجھے اچانک ہی آپی کی پریشان آواز سنائی دی تھی۔

''کیا ہوا آپی؟''

''تم نے ابھی جو بچی کو کپڑے پہنائے تھے وہ اُسے پورے تھے یا چھوٹے تھے؟''

''بالکل فٹ تھے آپی! اپنی بھتیجی کی عمر کی تو ہے یہ بچی۔'' میں نے آپی کے سوال کا جواب دیا تھا۔

''تو پھر یہ چھوٹے کیسے ہوگئے؟'' اب میں نے جو غور سے بچی کی طرف دیکھا تو پاجامہ گھٹنوں تک اور فراک تو بالکل آدھی سی تھی' یہ دیکھ کر تو میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے تھے'

اب شک کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی تھی کہ اس بچی میں ضرور کچھ ایسی بات ہے جو ہمیں نظر نہیں آ رہی۔

''کیا آپ بھی وہی سوچ رہی ہیں جو میں؟''

تب آپی نے صرف اثبات میں سر ہلایا تھا اور خاموشی سے بچی کو اٹھا کر چل دی تھیں۔

سیہون شریف پہنچ کر آپی سیدھا اُس متولی کے پاس گئی تھیں اور کہا تھا کہ یہ وہی بچی ہے جو کچھ روز پہلے ہمیں یہاں سے ملی تھی' اور بچی کے حوالے سے ساری حقیقت بھی بیان کر دی تھی۔

''ہاں بیٹی اب میں جان گیا ہوں کہ یہ بچی کون ہے؟'' متولی نے بچی کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''اصل میں اُس دن میں نے زیادہ دھیان نہیں دیا تھا' لیکن جو واقعات آپ نے بتائے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ وہی بچی ہے۔

ہمارے دادا حضور یہاں مجاور تھے اور یہ داستان مجھے میرے والد صاحب نے سنائی تھی۔ 24 جولائی 1994ء کو یہ مقبرہ شہید ہوا تھا۔ اُس وقت کی وزیراعظم بے نظیر بھٹو نے روضہ شریف کی دوبارہ تعمیر کا حکم دیا تھا اس سلسلے میں نیشنل کنسٹرکشن کمپنی لمیٹڈ کو ٹھیکہ دے دیا گیا تھا جس نے امام علی رضا (مشہد شریف) کی طرز کا نقشہ بنوایا اور منصوبہ کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا اور کل خرچ 980 ملین روپیہ کا تخمینہ لگایا گیا اور جس میں ڈسٹرکٹ کوآرڈینیشن آفیسر دادو کو زیر تعمیر روضہ شریف کا پروجیکٹ ہیڈ نامزد کیا گیا' روضہ شریف کی عمارت کو بہت بلند بنایا گیا اور مقبرہ گولڈن کلر سے مزین کیا گیا ہے۔

زائرین کے قیام کے لیے مسافر خانہ آسانی کے لیے لنگر خانہ' وضو خانہ' غسل خانہ وغیرہ بھی بنوائے گئے تھے یہ جدید تعمیر محکمہ اوقات سندھ کے زیر اہتمام ہوئی جو کہ 1941ء سے درگاہ شریف پر موجود ہے' تو بیٹی رانی اس وقت سے پہلے ہی یہ جو دیکھنے میں بچی نظر آ رہی ہے ناں درحقیقت یہ بچی نہیں کوئی ایک سو برس سے پہلے ہی اس کی رہائش گاہ یہیں ہے' اور اس کا تعلق قوم اجناء سے ہے۔ بہت اچھا کیا آپ نے جو اسے واپس لے کر آئیں' واپس تو یہ خود بھی آ سکتی تھی مگر اسے شاید آپ کا رہن سہن بھا گیا تھا جو آئی نہیں' ورنہ کچھ بھی ہوسکتا تھا' کوئی بڑا نقصان نہیں ہوا شکر کریں اللہ سائیں کا۔''

''لیکن بابا یہ تو خود ہماری گاڑی میں آ کر بیٹھ گئی تھی ناں؟'' آپی نے پریشانی ظاہر کی تھی۔

''بالکل بیٹی یہ کئی لوگوں کے ساتھ ایسا کر چکی ہے پھر ایک ہی دن میں واپس آ جاتی ہے' آپ کی محبت اور سادگی نے اسے وہاں رہنے پر مجبور کیا' جو یہ وہاں مزے سے رہ رہی تھی' یہ چاہتی تو کوئی نقصان بھی پہنچا کر چلی آتی لیکن خوش قسمت ہیں آپ' ہمیشہ خوش رہو۔''

آپی بتاتی ہیں کہ میں نے اس بچی کو مزار کے صحن میں اُتارا تو اُس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور میں نے اس کی چھوٹی فراک کی طرف جو میری بھتیجی کی تھی۔ پھر وہ بچی ہاتھ ہلا کر پلٹی اور لمحوں میں غائب بھی ہوگئی تھی اور ہاں اُس کے بعد مجھے وہ خواب پھر کبھی نظر نہیں آیا ہے۔

☆☆.....☆☆

آ آ آسیب آ آ آ

رضی اختر شوق کا شعر

یہ تشنگی کا سفر ختم ہی نہیں ہوتا
کوئی بلا کوئی آسیب میری راہ میں ہے

حسین خواجہ

ہماری زندگی میں کچھ ایسے بھی واقعات رونما ہوتے ہیں جن کا بظاہر تو حقیقت کے ساتھ کوئی تعلق نظر نہیں آتا لیکن حقیقتاً وہ حقیقت کا دوسرا پہلو ہوتے ہیں۔ یہ بات آج سے دس برس پہلے کی ہے جب میں

بیس برس کا تھا اور موسم گرما کی چھٹیوں میں میری پھوپو مری سے لاہور ہمارے پاس آرہی تھیں۔ خالہ صفیہ نے ہمیں یہ خبر دی تھی۔

''آپا! آپ کی نند کا ٹیلی فون آیا ہے کہہ رہی تھی شام کی گاڑی سے آپ کے گھر آرہی ہے۔''

امی نے خالہ صفیہ کا پیغام سنتے ہی مجھے کہا تھا۔

''جلدی سے اپنے ابو کے پاس دکان پر جاؤ اور کہو پھل اور گوشت وغیرہ لے دیں' اور تم قبرستان والے راستے سے جانا جلدی پہنچ جاؤ گے اور میرا بیٹا ہاں یاد سے واپسی پر شام ہونے لگے تو قبرستان والے راستے سے مت آنا۔''

میں نے کہا۔''امی آپ شام ہونے پر قبرستان والے راستے سے ہمیشہ روکتی کیوں ہیں؟'' تو اس پر امی نے کہنے لگیں۔

''ارے بیٹا آسیب ہوتے ہیں۔'' خیر میں ابو کے پاس دکان پر جارہا تھا تو قبرستان میں ذرا دیر کے لیے رک گیا اور یہ جائزہ لینے لگا کہ آخر یہ آسیب ہوتے کیا ہیں جن کے ڈر سے امی مجھے ہمیشہ ہی روکتی ہیں' مگر قبرستان میں مجھے قبروں کے علاوہ کچھ نظر نہیں آیا تھا۔

''ابو پھوپو آرہی ہیں شام کی گاڑی سے' امی نے کہا ہے پھل اور گوشت وغیرہ لے دیں۔'' ابو نے میری یہ بات سنتے ہی فوراً ملازم کو پیسے دیتے ہوئے سامان کی لسٹ اُس کے ہاتھ میں تھما دی تھی۔

کافی دیر بعد ہمارا ملازم سودا سلف لے کر دکان پر چڑھا تو ابو اس کو کہنے لگے۔

''تمہیں کتنی بار کہا ہے قصائی کو کہا کرو کہ گوشت کو پہلے اخبار لگائے پھر شاپر میں ڈالا کرے۔ اس پر ملازم کہنے لگا۔

''رشید صاحب اس کے پاس ردی ختم ہو چکی تھی لیکن میں نے شاپر ڈبل کروایا ہے۔'' اور پھر ابو نے مجھے سودا تھماتے ہوئے تاکید کی تھی۔

''قبرستان والے راستے سے واپس مت جانا۔''

میں نے ابو سے پوچھا۔

''قبرستان والے راستے سے کیا ہوگا؟'' تو ابو کہنے لگے۔

''بیٹا آسیب وغیرہ ہوتے ہیں تم کہیں ڈرنا جاؤ اس لیے منع کرتا ہوں۔''

ابو کے پاس اس وقت اُن کے ایک قریبی دوست چچا کریم بیٹھے ہوئے تھے ابو کی اس بات پر چچا کریم نے زور سے قہقہہ لگایا اور کہا۔

''بھئی رشید برخوردار تو تمہارا شیر جوان ہے اور اوپر سے اِس کا نام بھی شیروں والا اسد اللہ ہے' بھلا اسے آسیب کیا کہیں گے؟'' ابو نے چچا کریم سے کہا۔

''یار کریم میرا ایک اکلوتا بیٹا ہے اپنی طرف سے تو احتیاط ضروری ہے نا۔'' اور پھر ابو نے مجھے کہا۔

''اسد بیٹا جلدی گھر پہنچو۔''

جب میں دکان سے چلا تو دل میں خیال آیا آج کیوں نا آسیب کا دیدار کرنے کی ایک اور کوشش کر لی جائے' بس پھر کیا تھا' میں چل پڑا قبرستان کی طرف مین روڈ سے ہمارا گھر تقریباً بیس منٹ کی مسافت پر تھا اور قبرستان والے راستے سے سات' آٹھ منٹ کی مسافت تھی۔ جب میں قبرستان کے اندر داخل ہوا تو ایک بار پھر آسیب وغیرہ کا جائزہ لینے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ اِدھر اُدھر غور سے دیکھا آسیب تو کیا آسیب کا نشان تک نہیں دکھائی دے رہا تھا ایک زوردار قہقہہ لگایا اور چل پڑا ابھی میں قبرستان کی حدود کراس کرنے ہی والا تھا کہ دل میں خیال آیا کہ ایک بار پھر سے دیکھ لیا جائے' کیا پتا اب کوئی بھوت یا آسیب نظر آ ہی جائے' میں نے پھر پلٹ کر پیچھے دیکھا مگر پہلے کی طرح وہی تنہائی تھی' میری ذات کے علاوہ وہاں اور کوئی بھی نہ تھا میں دل ہی دل میں بہت خوش تھا اور سوچ رہا تھا کہ گھر جا کر امی کو بتاؤں گا کہ آج میں قبرستان والے راستے سے گیا' اور واپس بھی آیا ہوں وہ بھی گوشت لے کر.....

بس انہی سوچوں میں گم میں گھر میں داخل ہوا اور امی کو آواز دی۔

''امی جان آپ کہاں ہیں؟'' امی کے جواب سے پتا چلا کہ وہ تو کچن میں ہیں' میں کچن میں داخل ہوا اور امی کو سودا سلف تھماتے ہوئے کہا۔

''امی میں ابھی قبرستان والے راستے سے آیا ہوں وہ بھی اکیلا' آپ نے تو مجھے ہمیشہ ہی بدھو بنایا

ہے جن بھوت اور آسیب ہوتے ہیں تم ڈر جاؤ گے قبرستان والے راستے سے مت آنا۔'' اس پر امی نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا تھا۔

''باقی باتیں پھر سنانا' پہلے گوشت لے کر آؤ وہ تو تم بھول ہی گئے ہو۔''

میں نے امی سے کہا۔

''امی گوشت تو شاپر میں ہے۔'' پھر میں نے خود سارے شاپر چیک کیے تھے اس دران میرا جسم کانپنا شروع ہوگیا تھا مجھے شدید پسینہ آیا اور ایسا محسوس ہونے لگا جیسے مجھے بخار ہو رہا ہو' اور پھر میں صحن میں پڑی چارپائی پر گر گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

جب میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو کسی بابا جی کے آستانے پر پایا۔ میرا سر امی اور پاؤں ابو کی گود میں تھے۔ پھوپو کے ہاتھ میں تسبیح تھی اور ان کے بچے میرے آس پاس کھڑے تھے۔ میں یہ تمام صورت حال دیکھ کر بہت ہی پریشان ہوا اور امی سے پوچھا۔

''امی مجھے کیا ہوا ہے؟'' ابھی میں امی کے ساتھ بات کر ہی رہا تھا کہ کمرے میں چچا کریم داخل ہوئے تھے' اور سب کو سلام کرتے ہوئے ابو سے مخاطب ہوئے تھے۔

''بھائی رشید اب اسد کا کیا حال ہے؟''

''بس بھائی ابھی ہوش آیا ہے آپ یہ بتاؤ کے اب اسد کو اور کتنی دیر یہاں لے کر ٹھہرنا ہے؟'' اتنے میں ایک شخص کمرے میں داخل ہوا اور کہنے لگا۔

''رشید صاحب آپ کے لڑکے کو ہوش آیا یا نہیں' باباجی پوچھ رہے ہیں۔''

''بابا کرامت سائیں کہہ رہے ہیں کہ اگر ہوش آ گیا ہے تو لڑکے کو لے کر ہجرے میں تشریف لائیں۔''

ابو اور چچا کریم نے مجھے سہارے سے کھڑا کیا اور بابا کرامت سائیں کے ہجرے میں لے جا کر اُن کے سامنے بٹھا دیا تھا۔ میں یہ سب صورتحال دیکھ کر بہت پریشان ہو رہا تھا۔

باباجی نے اپنی لال لال جلالی آنکھوں کے ساتھ مسکرا کر پوچھا تھا۔

''کیا آج کے بعد بھی تم ایسی کوئی حرکت کرو گے؟''

میں باباجی کے اِس سوال پر اور بھی پریشان ہوگیا تھا کہ آخر مجھ سے وہ ایسا سوال کیوں کر رہے ہیں میں نے آخر ایسی کون سی غلطی کر دی ہے یا پھر میں نے ایسا کیا کر دیا ہے؟ اور اس سے پہلے کہ میری خاموشی محفل کا ماحول خراب کرتی ابو نے جواب دیا تھا۔

''بابا سائیں اب تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''اچھا رشید میاں دوسرے بکرے کا صدقہ مت بھولنا ورنہ وہ چیز دوبارہ بھی حملہ کر سکتی ہے۔'' پھر بابا جی نے امی سے کہا تھا۔

''اگر اپنے بچے کی جان پیاری ہے تو تعویذ کا ناغہ مت کرنا بی بی' اچھا اب آپ لوگ اپنے گھر جائیں اور ہاں رشید میاں کوئی بھی وظیفہ شروع کرنے سے پہلے بسم اللہ کا کڑا اپنے سیدھے ہاتھ میں ضرور ڈال لینا۔''

ابو نے باباجی سے بڑی حیرت سے پوچھا تھا۔

''باباجی کیا کوئی وظیفہ مجھے بھی کرنا ہے۔'' تو اس پر باباجی مسکرا کر بولے تھے۔

''رشید میاں اگر تم وظیفہ نا ہی کرو تو اچھی بات ہے میں تو بس احتیاطاً کہہ رہا ہوں اگر کبھی کوئی وظیفہ شروع کرنا تو پہلے کڑا ضرور ڈال لینا' اچھا اب تم جاؤ۔''

☆.....☆.....☆

جب ہم لوگ گھر پہنچے تو میں نے امی سے پوچھا۔

''امی یہ سب کیا چل رہا ہے؟'' امی نے میرے سوال پر مجھ سے پوچھا تھا۔

''اسد تمہیں کچھ بھی یاد نہیں کہ اُس دن کیا ہوا تھا؟''

''امی کس دن کی بات کر رہی ہیں آپ اور یہ بابا جی اور بکرے کا صدقہ وغیرہ یقین کریں مجھے کچھ بھی یاد نہیں آ رہا۔''

''اچھا جس دن تمہاری پھوپو آئی ہیں اُس دن کیا ہوا تھا؟''

''امی پھوپو کس دن آئی ہیں؟''

''ارے بیٹا! آج سے دو دن پہلے تمہاری پھوپو کا فون آیا تھا کہ میں آ رہی ہوں اور پھر میں نے تمہیں تمہارے ابو کے پاس دکان پر بھیجا تھا کہ کچھ سودا سلف

لے آؤ' اور واپسی پر قبرستان والے راستے سے مت آنا لیکن تم نے تو میری ایک نا مانی اور واپس قبرستان والے راستے سے آئے تم قبرستان سے گوشت لے کر گزرے تو تم سے کسی ہوائی چیز نے گوشت چھین لیا بس اِس وجہ سے تم ڈر گئے تھے۔''

''امی یقین کریں مجھے کچھ بھی یاد نہیں .....'' تو اس پر پھوپو نے میری بات کاٹ کر کہا تھا۔

''اسد اب تمہیں کچھ بھی یاد کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' پھر پھوپو نے اپنے آپ کو کوسنا شروع کر دیا تھا۔

''ہائے میرے بچے کو میری وجہ سے کیا ہو گیا کاش میں ناہی آتی۔''

اِس پر امی بولی تھیں۔

''باجی آپ کی کوئی غلطی نہیں بس مالک کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میرے بیٹے کی جان بچ گئی۔'' اور پھر پھوپو دو دن ہمارے پاس رہ کر واپس چلی گئی تھیں۔

اب میرے باہر جانے پر مکمل طور پر پابندی عائد ہو چکی تھی۔ امی ابو میرے معاملے میں بہت محتاط رہنے لگے تھے اور میں اُن کے اِس رویے کے علاوہ اِس بات سے بھی بہت پریشان تھا کہ میرے گلے میں کالی ڈوری اور چمڑے میں تعویذ آخر کیوں ڈالا گیا ہے' وہ سانحہ جو میرے ساتھ ہوا ہی نہیں مجھے اس کا احساس کیوں دلوایا جاتا ہے۔ میرے ساتھ ایسا پہلی بار ہوا تھا خیر اب میں موسم گرما کی چھٹیاں ختم ہونے کا بہت شدت سے انتظار کر رہا تھا اور پھر جیسے ہی میرا اسکول لگا تھا تو امی نے ابو سے کہا تھا۔

''اب آپ اسد کو سائیکل لے دیں' میں یہ بالکل بھی نہیں چاہتی کہ میرا بیٹا اب قبرستان والے راستے سے گزرے۔''

بس پھر کیا تھا دوسرے ہی دن میری سائیکل آ گئی اپنی تو موج لگ گئی' اب میرا اسکول شروع ہو چکا تھا اور ذہن بھی پہلے سے زیادہ فریش ہو گیا تھا۔

ایک دن اسکول سے واپسی پر میں ایک بک اسٹال پر رک گیا تھا اور مختلف رسالوں کا جائزہ لے رہا تھا کہ اِس دوران میں نے شوکیس میں پڑی ایک

غزل

زخم دل کا جو بھر گیا ہوتا
قیس صحرا سے گھر گیا ہوتا

ایک امید ہی پہ زندہ ہوں
ورنہ میں کب کا مر گیا ہوتا

باندھ کر اک کشش نے رکھا ہے
ورنہ سب کچھ بکھر گیا ہوتا

دل میں گرچہ ملال ہوتا تو
اشک آنکھوں میں بھر گیا ہوتا

موت کا خوف دل میں رہ جاتا
میں بھی اندر سے ڈر گیا ہوتا

اُس کی صورت کو دیکھ لیتا تو
آئینہ بھی سنور گیا ہوتا

میں بھی کرتا جو سوز فنکاری
بن کے سورج اُبھر گیا ہوتا

محمد علی سوز

کتاب دیکھی۔

''چالیس دن میں عامل بنیں۔''

''بھائی وہ والی کتاب کتنے کی ہے؟''

''بیس روپے کی۔'' میں نے بیس روپے دے کر عامل بننے والی کتاب بیگ میں ڈالی اور گھر کو چل پڑا۔ گھر جا کر میں نے اپنے کمرے میں چھپ کر اُس کتاب کا مطالعہ شروع کر دیا' اس میں ایک وظیفہ تھا کہ چالیس دن میں جن بھوت اور آسیب کو قابو کریں۔

اب میرے دل میں بدلے کی آگ جل رہی تھی کہ جس آسیب کی وجہ سے میری گرمی کی چھٹیاں خراب ہوئی ہیں اس کو میں قابو کروں گا بس پھر کیا تھا وظیفہ شروع کر دیا' روز رات کو امی ابو کے سونے کے بعد میں رات تقریباً ایک بجے کے قریب وظیفہ شروع کر دیتا تھا ابھی مجھے دس دن ہی ہوئے تھے کہ دورانِ وظیفہ میں نے بہت شدید گرمی محسوس کی تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ فوراً کمرے سے باہر چلا جاؤں' لیکن کتاب میں صاف صاف لکھا تھا کہ دورانِ وظیفہ اپنی جگہ بالکل بھی نہیں بدلنی ورنہ موت بھی واقعہ ہو سکتی ہے جب گرمی کی شدت اپنے عروج کو پہنچی تو میرے کمرے میں امی داخل ہوئیں۔ اور مجھے کہنے لگیں۔

''اسد بیٹا اتنی گرمی میں کیوں بیٹھے ہو باہر آجاؤ۔'' میں نے کہا۔

''امی میں یہ تسبیح ختم کر کے آؤں گا۔'' تو امی کو میری بات پر بہت غصہ آیا اور وہ ناراض ہو کر کمرے سے باہر چلی گئیں۔

''میری تسبیح ختم ہونے میں ابھی چار دانے رہتے تھے کہ امی کی آواز میرے کانوں میں آئی تھی۔

''اسد تمہارے کمرے میں سانپ داخل ہوا ہے جلدی باہر آؤ۔''

میرے کمرے سے باہر آتے آتے میری تسبیح پوری ہو چکی تھی لیکن میں نے باہر آ کر دیکھا تو امی صحن میں موجود ہی نہیں تھیں۔ میں نے امی کو آواز دی تھی تو وہ اپنے کمرے سے اٹھ کر آئی تھیں۔

''اسد کیا ہوا؟''

''امی آپ سو رہی تھیں؟''

''کیوں خیریت ہے؟''

''کیا آپ میرے کمرے میں نہیں آئی تھیں تھوڑی دیر پہلے۔''

''نہیں..... اسد تم ڈر گئے ہو کیا؟''

اُن کی آواز میں حیرت کے ساتھ پریشانی بھی تھی۔

☆.....☆.....☆

جب میری آنکھ کھلی تھی تو میں نے خود کو دوبارہ بابا کرامت سائیں کے آستانے پر پایا تھا۔ میرا سر امی اور پاؤں ابو کی گود میں تھے اور بابا کرامت سائیں کہہ رہے تھے۔

''رشید میاں یہ تعویذ کسی وزنی چیز کے نیچے رکھنا اگر گھر میں ہاتھ والی آٹا چکی ہو تو زیادہ بہتر ہے کہ اس کے نیچے رکھا جائے۔'' ابو نے بابا کرامت سائیں سے پوچھا تھا۔

''بابا جی اب وہ چیز دوبارہ تو حملہ نہیں کرے گی نا؟'' بابا جی نے جواب دیا تھا۔

''بالکل بھی نہیں۔'' پھر وہ مسکراتے ہوئے بولے تھے۔

''رشید میاں مجھے پتا تھا تمہارا لڑکا ضرور کوئی مہم جوئی کرے گا' اگر تمہارے لڑکے نے بسم اللہ کا کڑا نہ پہنا ہوتا تو یا تو یہ پاگل ہو جاتا یا پھر تم لوگوں کا کوئی اور بہت بڑا نقصان ہو چکا ہوتا' رشید میاں اب یاد آیا میں نے تمہیں کیوں کہا تھا کہ کوئی وظیفہ کرو تو سیدھے ہاتھ میں بسم اللہ کا کڑا ڈال لینا۔''

اور پھر بابا کرامت سائیں نے زوردار قہقہہ لگایا تھا۔ چچا کریم نے بابا کرامت سائیں سے اجازت طلب کی تھی اور ابھی ہم لوگ وہاں سے نکل ہی رہے تھے کہ بابا سائیں نے کہا تھا۔

''رشید میاں! اب یہ تعویذ کھول کر مت دیکھنا کہ اس میں کیا ہے؟'' بابا جی کی اس بات پر ابو نے فوراً میری طرف دیکھا تھا اور میں نے آسمان کی طرف دیکھ کر اللہ سے ہر مصیبت سے آزاد رہنے کی دعا کے ساتھ دل میں پکا ارادہ کر لیا تھا۔

''آ بیل مجھے مار.....'' والی مثال کے مصداق آ آسیب آ والی غلطی کبھی نہیں کروں گا۔''

☆☆.....☆☆

لاہور سے چھٹی ہفت رنگ پُراسرار کہانی

سانپ کا جسم

ثمینہ راجا کا شعر

زندگی	نے	جو	ہے	دکھلایا
سانپ	کا	وہ	تماشہ	تھا

نینا خان

بھی بھی انسان کے ساتھ کچھ اس طرح کے واقعات پیش آتے ہیں۔ جنہیں فراموش کر پانا اس کے لیے ناممکن ہوتا ہے۔ جو حقیقت ہونے کے باوجود حقیقت سے دور معلوم ہوتے ہیں۔ دل چاہتا ہے کہ

ان واقعات پر یقین کرلیں اور دماغ کہتا ہے نہیں ایسا ناممکن ہے۔ دل اور دماغ کی جنگ میں کبھی جیت دل کی ہوتی تو کبھی دماغ کی' یہ جو واقعہ میں بیان کرنے جارہی ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ آپ کا دماغ اسے قبول نہ بھی کرے پر مجھے یقین ہے کہ دل گواہی ضرور دے گا کہ یہ حقیقت ہے' اور دل ایسا کیونکر کرے یہ واقعہ ایک انتہائی سچا واقعہ ہے۔ اور ہمارے دور پرے کے رشتے دار ہی ہیں جن کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا۔

ہم نانی کے گھر جاتے ہیں تو اکثر و بیشتر اُن سے انڈیا کے قصے سنتے ہیں۔ نانی کی پیدائش انڈیا میں ہوئی پھر پاکستان ہجرت کر کے پوری فیملی کے ساتھ بچپن میں ہی آ گئی تھیں۔ یہیں شادی ہوئی' بچے ہوئے اب وہ نانی دادی کے ساتھ ساتھ پرنانی بھی بن گئی ہیں۔ اب پردادی بننا باقی ہے۔ انشاء اللہ اللہ کے کرم سے وہ پردادی بھی بن جائیں گی۔

واقعہ کچھ اس طرح کا ہے کہ میری نانی کے سسرالی رشتے دار یعنی نانا کے تایا کی جب شادی ہوئی تو پورا گھرانا بہت خوش تھا۔ نانا جان کی تائی امی امید سے تھیں گھر بھر کی پہلی خوشی تھی سب بہت خوش تھے۔ تقریباً روز ہی کوئی نا کوئی مبارکباد دینے چلا آتا' اور گود بھرائی کی رسم بھی کافی اچھی طرح سے کی گئی۔ اس دور کی مناسبت سے خوب اہتمام کیا گیا۔ گھر میں کافی رونق تھی تمام رشتے دار جمع تھے گانے باجے خوب بجائے گئے۔ اسی طرح خوشیاں مناتے دن گزر رہے تھے کہ آخر کار وہ وقت آ گیا جب تائی امی نے ایک بچے کو جنم دیا۔ پر حیرت انگیز بات یہ تھی کہ وہ بچہ انسان کا نہیں ایک سانپ کا تھا۔ ایک کالا ناگ' سب کافی ڈر گئے تھے کہ یہ سب کیسے ہوگیا۔ ایسا کیسے ہوسکتا ہے شاید اس کی وجہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک ساتھ رہنا تھا۔ وہاں ناگ دیوتاؤں کے مندر ہوں اس وجہ سے' واللہ تعالیٰ عالم اللہ بہتر جاننے والا ہے۔

ایک ماں تو پھر ماں ہی ہوتی ہے ناں..... نو مہینے اپنی کوکھ میں رکھ کر ایک بچے کو پل پل بڑھتے محسوس کرنا۔ اُس کی ہر حرکت اور دھڑکنوں کو محسوس کرنا' سب گھر والوں اور رشتے داروں نے اس بچے یعنی سانپ کو جان سے مار دینے کا کہا۔ مگر اس بچے کی ماں نے منع کر دیا اور سب سے چھپ کر اس کو پالنے کا انتظام بھی کرلیا۔ وہ اُسے سب سے چھپا کر رکھتی تھیں اور پیار کرتیں' ایک پیالے میں اسے دودھ پلاتیں' اس کے بعد اُن کے گھر ایک بیٹی پیدا ہوئی' وہ بیٹی گھر بھر کی لاڈلی تھی' جبکہ اُس کالے سانپ سے بہت ڈرتے گھبراتے تھے۔ وہ اپنی ماں سے ہی قریب رہتا۔ ماں اسے پیار سے کالو کہہ کر پکارتی تھی' وہ کالو بات تو نہیں کرتا تھا مگر ہاں اپنی ماں کی ہر بات کو سمجھتا ضرور تھا اور ہر بات بہت فرمانبرداری سے مانتا بھی تھا۔

پہلے زمانے میں دیوار کے اندر ایک ایسی جگہ (طاق) بنائی جاتی تھی کہ اس میں چراغ رکھ کر جلایا جاسکے۔ ہوسکتا ہے آج بھی کچھ لوگوں کے گھر اس طرح دیوار میں فریم ٹائپ جگہ خالی رکھی جاتی ہو۔

تائی امی کالو کو اس دیوار میں رکھ کر تصویر کے پیچھے چھپا دیتی تھیں۔ تاکہ گھر آنے والے مہمان کالو کو دیکھ کر ڈر نا جائیں۔ خاندان بھر کی مخالفت سہنے کے باوجود ایک ماں نے اپنے بیٹے کو بے آسرا نہیں چھوڑا۔ کالو سے سب ڈرتے تھے کیونکہ وہ ایک سانپ تھا۔ پر اس نے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ وہ تو بس اپنی ماں کے ساتھ رہتا تھا۔ جب کوئی گھر آتا تو اپنی مخصوص جگہ جا کر چھپ جاتا تھا۔ یہ سلسلہ بس یونہی چلتا رہا یہاں تک کہ تائی امی کی بیٹی جوان ہوگئی۔ اس کی شادی کے لیے گھر میں رشتے آنے لگے۔ آخر کار ایک رشتہ سمجھ آ گیا اور شادی بھی ہوگئی۔

شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ گھر میں مہمانوں کی آمد میں اضافہ ہوگیا۔ کالو اپنی مخصوص جگہ پر لوگوں کو آتا دیکھ کر چھپ جاتا تھا۔ کیونکہ کالو کی ماں اسے کہتی تھی۔

''کالو بیٹا لوگ تجھ سے ڈرتے ہیں تو لوگوں کے سامنے کبھی مت آنا ورنہ لوگ تجھے مار ڈالیں گے۔ اور تو بنا انہیں نقصان پہنچائے ان کے ہاتھوں مر جائے گا۔ تو چھپ جایا کر لوگوں کو آتا دیکھ کر' بیٹا تیری بہن کی شادی ہو رہی ہے نا لوگ تو گھر آئیں گے' میں

تجھے پیالے میں دودھ دے جایا کروں گی دیوار کے پیچھے تو وہیں رہنا۔''

ماں کی بات سن کر اور سمجھ کر کالو دیوار کے اندر اپنی مخصوص جگہ پر تصویر کے پیچھے چھپ جاتا تھا۔ جب شادی کی تقریبات کا آغاز ہوا تو کالو سب سے چھپا ہوا تھا کہ ایک بچے نے اسے دیکھ لیا اور شور مچا دیا۔ سب لوگ سانپ کو مارنے کے لیے دوڑے تو بڑی مشکل سے تائی نے معاملے کو سنبھالتے ہوئے کالو کو وہاں سے بھگا دیا۔

یہ اُس زمانے کی بات ہے جب شادیں میں باراتیوں کا استقبال کرنے کے لیے چاولوں کا شکرانہ بنتا تھا اور باراتیوں کو وہ کھلایا جاتا تھا۔ یہ شکرانہ دراصل چاولوں کو ابال کر اس میں گھی اور شکر ڈال کر کچھ اس طرح سے بنایا جاتا تھا۔ اسے شکرانے کا نام دیا جاتا تھا۔ بارات آنے والی تھی شکرانہ بنانا تھا تائی امی کو اپنے بیٹے کالو کی بھی فکر تھی تو انہوں نے کالو سے کہا۔

''کالو آج تیری بہن کی شادی ہے گھر میں بارات آئے گی کافی لوگ گھر میں جمع ہوں گے۔ اگر کسی نے تجھے دیکھ لیا تو؟ تو کیا ہوگا۔ تُو ایسا کر جا کر نالی میں چھپ جا..... اور جب تک سب مہمان نا چلے جائیں نا تو باہر مت آنا۔''

اماں کی بات سنتے ہی کالو نالی میں جا کر چھپ گیا۔ مہمانوں کی آمد ہوئی کاموں میں پھنس کر تائی امی کو کالو کا دھیان نہیں رہا۔ وہ شکرانہ بنانے لگ گئیں۔ شکرانے کے لیے جیسی ہی انہوں نے چاول ابالے تو بے دھیانی میں ابالا ہوا گرم پانی نالی میں ڈال دیا۔ گرم پانی کی گرماہٹ سے کالو جل گیا اور وہ وہیں مر گیا۔

جب تمام مہمان چلے گئے۔ بیٹی کی رخصتی ہوگئی تو تائی امی نے کالو کو آوازیں دیں۔

''کالو..... کالو..... باہر آجا بیٹا سب مہمان جا چکے ہیں..... تیری بہن کی رخصتی ہوگئی ہے اور وہ اللہ کے کرم سے آج اپنے گھر کی ہوگئی ہے۔ بیٹا باہر آجا..... میں کب سے پکار رہی ہوں تجھے.....''

کالو زندہ ہوتا تو باہر آتا نا تائی امی نے تایا ابا کو بلایا اور ان سے کہا۔

''کالو کے ابا دیکھو اس نالی میں میں نے کالو کو چھپنے کو کہا تھا۔ وہ اب تک باہر نہیں آرہا تم دیکھو اسے ذرا۔''

''دیوار میں دیکھو تصویر کے پیچھے تو نہیں چلا گیا؟'' تایا ابا نے کہا تو تائی نے جھٹ سے کہا۔

''میں تو اسے وہاں پہلے ہی دیکھ چکی ہوں کالو کے ابا..... مجھے بہت فکر ہو رہی ہے..... کالو کی' تم اس نالی میں دیکھو۔''

''اچھا تم فکر نہ کرو میں دیکھتا ہوں۔'' یہ کہہ کر تایا ابا نے نالی میں دیکھا اور لکڑی سے اسے اپنی طرف کھینچنے لگے تو کیا دیکھتے ہیں کہ کالو جو کہ ایک کالا ناگ تھا وہ سونے کا بن چکا ہے اور اس سونے کے سانپ پر کچھ الفاظ لکھے ہیں۔

''ابا اماں جیتے جی تو کبھی تمہارے کسی کام نہ آیا ایک بیٹا ہونے کا فرض نہیں نبھا پایا' آج مرنے کے بعد سونے کا بن کر جا رہا ہوں تاکہ تم سونا بیچ کر اپنے کام میں لاسکو۔ مجھے بھی بھولنا مت میں تم دونوں کا بیٹا ہوں۔''

تایا اور تائی اب تو بہت پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ تائی اماں تو بہت ہی روئیں کہ ان کی ایک بے دھیانی کی وجہ سے کالو ان سے بچھڑ گیا۔ کالو کالو کر کے روتی رہتی تھیں۔ اور اس سانپ کو جو کہ سونے کا بنا ہوا تھا اُسے اپنے سینے سے لگائے رکھتی تھیں کہ 'یہ میرا کالو ہے' اسے میں خود سے بھی الگ نہیں کروں گی۔

اُس سونے کے سانپ کو مرتے دم تک تائی اماں نے خود سے الگ نہیں کیا۔ بہت سنبھال کر سینے سے لگائے رکھا۔ کالو تو نہیں رہا مگر مرنے کے بعد ایک بیٹا ہونے کا فرض نبھا گیا۔

یہ ایک ایسا سچا واقعہ ہے جسے میں اپنی نانی اور اپنی امی کی زبانی سنتی چلی آرہی ہوں' آج سوچا اس سچ بیتی کو سچی کہانیاں ڈائجسٹ کی نذر کروں تاکہ سچی کہانیاں پڑھنے والے صارفین کی ناچ میں ایک سچے واقعہ کا اضافہ ہوسکے۔ کیونکہ ایک سچی کہانیاں ہی ایسا ڈائجسٹ ہے جس پر یقین کیا جاسکتا ہے۔ اس کی

کہانیاں محض بناوٹی نہیں ہیں۔ خود سے تخلیق کردہ نہیں ہیں۔ یہ تو سچ بیتیاں ہیں جو ہمارے ذہن کو ایسی سوچ دیتی ہیں ایسی سوچ عطا کرتی ہیں کہ جس سے ذہن رنگ رہ جاتا ہے۔ اور ان چیزوں کے بارے میں سوچنے پر مجبور کردیتا ہے جن کا ذہن کی صلاحیتوں پر مثبت اثر پیدا ہوتا ہے۔ اور بعض اوقات ذہن پر کئی سوالات بھی چھوڑ جاتا ہے۔

اسی واقعہ سے جڑا ایک اور واقعہ بھی آپ قارئین کی نذر کرتی ہوں۔ ایک دن ہم سب فرینڈز بیٹھے باتیں کررہے تھے۔ اسی طرح کی پُراسرار باتیں چل رہی تھیں کہ میں نے اپنی دوستوں کو یہ واقعہ سنایا کالو کا واقعہ سن کر میری کچھ دوست تو میرا مذاق بنانے لگیں کہ 'لمبی لمبی پھینکنا بند کرینا..... ہاہاہا.....''

میری ایک دوست رمشا فوراً ہی بولی۔

''نینا یہ لوگ تیرے اس واقعہ پر یقین کریں یا نا کریں پر میں کرت یہں۔ کیونکہ میرے خاندان میں بھی ایک ایسا ہی سچا واقعہ پیش آچکا ہے۔ جیسے میں اپنے بچپن سے اپنی فیملی کے تقریباً سبھی لوگوں سے سنتی آئی ہوں اور ہمارے بڑے اس طرح کے جھوٹے قصے نہیں سنا سکتے۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو رمشاء کیونکہ میری فیملی ایک پٹھان فیملی ہے ہم یوسف زئی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہمارے آباؤ اجداد میں سب سچ کہنے اور بولنے کے قائل ہیں۔ زبان پر مرمٹنے والے ہوتے تھے پہلے کے لوگ..... تم مجھے اپنا واقعہ سناؤ میں پورے دل سے تمہارے قصے پر یقین کروں گی۔ میری بات سنتے ہی رمشا نے اپنے خاندان میں پیش ہونے والا واقعہ کچھ یوں سنایا تھا۔

''یہ واقعہ بھی انڈیا میں ہی پیش آیا جب ہندوستان اور پاکستان ایک ہوا کرتے تھے۔ ہمارے خاندان میں دو جڑواں بچے پیدا ہوئے۔ ایک لڑکی اور ایک سانپ' لڑکی انسان تھی جبکہ لڑکا انسان نہیں سانپ تھا۔ ایک ناگ.....''

''اب سنو پورا واقعہ کچھ اس طرح سے ہے کہ والدین نے لڑکی سے چھپ کر سانپ کو پالنا شروع کردیا۔ لڑکی کے سامنے ایک دو بار سانپ آیا تو وہ ڈر جاتی تھی اس لیے والدین نے اسے چھپا چھپا کر رکھا۔ جب لڑکپن کا دور آیا تو لڑکی تو کھیل کود میں رہتی تھی۔ جبکہ سانپ کو سب کی نظر سے چھپایا جاتا تھا۔ ایک دن ماں کسی کام سے بازار گئی تھی سانپ دودھ پینے کچن میں آگیا۔ لڑکی کھیلتی ہوئی باہر سے جیسے ہی کچن میں پانی پینے آئی تو وہاں سانپ کو دیکھ کر بری طرح سے ڈر گئی اور چیخنے چلانے لگی تو سب لوگ جمع ہوگئے اور اس سانپ کو مار ڈالا' مرتے وقت سانپ نے بددعا دی اس لڑکی یعنی اپنی بہن کو کہ اب اس خاندان میں کوئی بہن پالڑکی پیدا نہیں ہوگی۔ اگر ہوگی تو وہ زندہ نہیں رہے گی۔ اس کے بعد سے آج تک ہمارے ننھیال میں کوئی لڑکی پیدا نہیں ہوئی جو بھی لڑکی پیدا ہوتی ہے وہ چند ماہ بعد ہی مرجاتی ہے۔''

اس کی بات سن کر میں نے فوراً ہی پوچھا۔

''تو رمشا تمہاری امی بھی تو اسی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں پھر وہ.....''

''نینا میری امی لے پالک ہیں۔ ہمارے خاندان میں لڑکیاں لے کر پالتے ہیں مگر کوئی لڑکی پیدا نہیں ہوتی اگر بہت دعاؤں سے پیدا ہو بھی جائے تو زیادہ عرصے تک زندہ نہیں رہتی۔ وہ بددعا آج بھی قائم ہے۔''

اپنی دوست رمشاء کی بات سن کر میں نے سب کے لیے یہ دعا کی۔

''یا اللہ ہم سب کو بددعاؤں اور بدنظروں سے محفوظ فرما آمین۔''

واقعی انسان کی سوچ سے پرے بھی کچھ معاملات اور حالات ایسے ہوتے ہیں جسے وہ انسان سوچ تخلیق تصور کرتا ہے۔ پر درحقیقت وہ حقیقت ہی ہوتی ہے۔ ہماری دنیا کے علاوہ بھی کئی جہاں اور بھی آباد ہیں۔ اس دنیا میں جسے انسانی نظر دیکھنے سے اور سمجھنے سے قاصر ہے۔

''خدا ہم سب کو اپنی حفظ وامان میں رکھے اور ہر مصیبت اور بلاؤں سے محفوظ فرمائے آمین۔''

☆☆.....☆☆

اُن لوگوں کے قصے جو نظر تو عام سے آتے ہیں مگر ہوتے ہیں بہت خاص

اسرار کی بستی

احمد فراز کا خیال

قاصد ! ہم فقیر لوگوں کا
اک ٹھکانہ نہیں کہ تجھ سے کہیں

فیضان حسین عثمانی

آج میں آپ کو جو واقعات بتانے جا رہا ہوں وہ بہت زیادہ اہم اور اثر پذیر ہوں گے جو اس طرح کے بظاہر تو بہت عام اور سادہ ہیں مگر اُن لوگوں کے لیے لوگوں سے ملنے کی جستجو میں رہتے ہیں اور دربار اولیاء

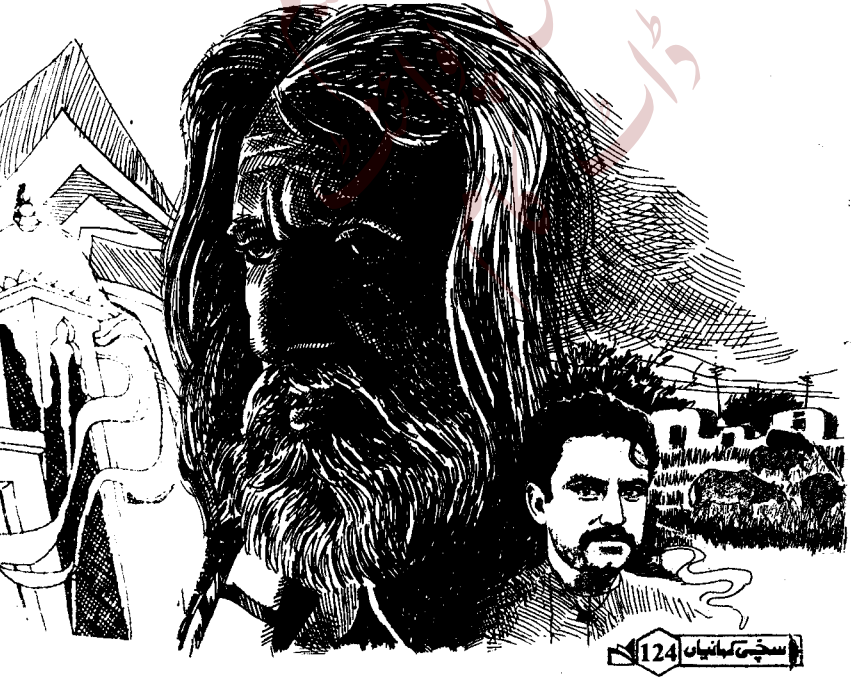

پر حاضری دیتے ہیں اور اللہ کے نیک بندوں اور ولیوں سے عقیدت کا رشتہ رکھتے ہیں وہاں سے روحانی فیوض و برکات حاصل کرتے ہیں۔ میں بھی ایسے ہی لوگوں میں سے ہوں جو اللہ والوں کی صحبت میں بیٹھ کر اُن سے فیوض و برکات حاصل کرتے ہیں' اللہ کے نیک بندوں اور ولیوں کے دربار میں حاضری دے کر اپنی روح کو روحانی غذا سے فیض یاب کرتے ہیں۔ اس حوالے سے مجھے اکثر ایسے لوگ ٹکرا جاتے ہیں جو بظاہر عام مگر اُن کے باطن بہت خاص ہوتے ہیں اور بہت کچھ اپنے اندر چھپائے ہوتے ہیں۔

ہم لوگ پُراسرار کو صرف ڈراؤنی کہانیوں' جن بھوت اور بدروح کے واقعات سے ہی منسوب کر لیتے ہیں کہ اس طرح کے واقعات کو ہی پُراسرار کہا جاتا ہے مگر ایسا نہیں ہے۔ ہر وہ واقعہ پُراسرار ہے جو اپنے اندر کوئی اسرار چھپائے ہوئے ہو' جو آپ کے ذہن میں کوئی سوال چھوڑ جائے' نقش ہو جائے۔

یہ واقعہ مارچ 2006ء کا ہے میری دوسری بہن کی شادی کو تین ماہ ہوئے تھے۔ میرے بہنوئی ایک پرائیویٹ رولنگ مل (سریہ بنانے والی) میں جاب کرتے تھے کہ اچانک اُن کی جاب ختم ہو گئی اُن دنوں وہ بہت پریشان تھے۔ ہم لوگوں سے ملنے کے لیے بہن بہنوئی کراچی سے حیدرآباد آئے ہوئے تھے۔

ایک روز مغرب کی نماز کے بعد میرے بہنوئی نے مجھے کہا کہ یار حضرت عبدالوہاب شاہ جیلانی رحمتہ اللہ علیہ کے دربار پر حاضری کے لیے آج ہم چلیں گے۔ اُن کو بھی دوسروں کی طرح میرا ولیوں کی درگاہوں سے عقیدت اور محبت کا علم تھا اور وہ خود بھی عقیدت رکھتے تھے' جب بھی حیدرآباد آتے تھے تو وہاں حاضری ضرور دیتے تھے۔

غوث اعظم دستگیر پیر عبدالقادر شاہ جیلانی رحمتہ اللہ علیہ کے شہزادے حضرت عبدالوہاب شاہ جیلانی رحمتہ الہ علیہ حیدرآباد میں مدفون ہیں اور یہاں پر روزانہ اُن کے ہزاروں عقیدت مند دور دراز علاقوں سے حاضری کے لیے آتے ہیں۔ اور یہاں سے فیوض و برکات حاصل کرتے ہیں' یہ میری خوش نصیبی ہے کہ میری رہائش حیدرآباد شہر میں ہے اور مجھے دربار شاہ جیلانی پر حاضری کا شرف حاصل ہوتا رہتا ہے۔

حضرت عبدالوہاب شاہ جیلانی سے عقیدت کا تعلق لوگوں کا ایسا ہے کہ مجھے اکثر کراچی حیدرآباد کے سفر کے دوران کئی مسافر ایسے بھی ملے ہیں جو حیدرآباد صرف درگاہ پر حاضری دینے ہر ہفتے اور ہر ماہ آتے ہیں' ایک بس سے آئے اور حاضری دی اور دوسری بس سے واپس' کیا عقیدت ہے لوگوں کی اللہ کے نیک بندوں اور اولیاؤں سے' نہ جانے کب کسی ولی کی نگاہ سے کایا پلٹ جائے کیا خبر۔

نگاہ ولی میں ایسی تاثیر دیکھی
بدلتی ہزاروں کی تقدیر دیکھی

نمازِ عشاء کے بعد کھانا کھانے سے فارغ ہو کر میں اور میرے بہنوئی درگاہ حضرت عبدالوہاب شاہ جیلانی رحمتہ اللہ علیہ پر پہنچے تھے' نمازِ عشاء کے بعد دربارہ جیلانی پر کیا روحانی اور نورانی تجلیات کا نور برستا ہے اور وہاں کیا روحانی سکون ملتا ہے بس یہ تو وہاں جانے والا ہی جانتا ہے آپ تلاوت قرآن پاک اور ذکر و اذکار کریں اور وہاں کے روحانی و نورانی فیوض و برکات حاصل کریں' تو ایسا دلی سکون میسر آتا ہے کہ بندہ ہر فکر و غم سے آزاد ہو جاتا ہے یہ میرا مشاہدہ ہے پتہ نہیں لوگ مجھ سے اتفاق کریں نہ کریں' مگر اپنے اپنے نظریات' خیالات اور احساسات کی بات ہوتی ہے' خیر ہم دونوں فاتحہ خوانی کے لیے دربار پر سر جھکائے باادب کھڑے تھے' فاتحہ خوانی کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اللہ کے اس مقرب اور نیک ولی کامل کے دربار میں دعا کے طالب تھے۔

دربار شریف میں ایک سکوت طاری تھا ہر کوئی اللہ پاک سے لو لگائے کھڑا تھا یا بیٹھا تھا' اُس وقت رات کے گیارہ بج رہے تھے میں فاتحہ خوانی کے بعد دربار شریف کے باہر آ کر دربار کے ساتھ ہی جو برآمدہ تھا وہاں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا یہ میں اب سے سترہ سال پہلے کی دربار شریف کی لوکیشن بتا رہا ہوں اُس وقت سے وہاں تعمیراتی کام چل رہا ہے

پچھلے پانچ سال میں تو دربار شریف کا نقشہ ہی بدل گیا ہے خیر میں وہاں آنکھیں بند کر کے بیٹھ گیا تھا' میرے بہنوئی اندر دعا میں مشغول تھے کہ اچانک میری آنکھ کھلی اُس وقت وہاں میں ہی تھا میں نے اپنے سامنے دیکھا تو مجھ سے ذرا فاصلے پر ایک بزرگ بیٹھے تھے جن کے گلے میں کافی ساری تسبیحاں ڈلی ہوئی تھی' سفید بال سفید داڑھی' ہاتھوں کی انگلیوں میں انگوٹھیاں تھیں اُس وقت وہ مجھے بڑے غور سے دیکھ رہے تھے لنگر جو شاید وہ باہر سے لائے تھے اُن کے ہاتھ میں تھا دال لگی ہوئی روٹی جو وہ کھا رہے تھے اچانک ہی وہ مجھ سے مخاطب ہوئے تھے۔

''لے بیٹا کھالے۔''

''نہیں بابا جی! میں کھانا کھا چکا ہوں۔'' میں نے جواب دیا تھا۔

''ابے کھالے کھالے۔'' انہوں نے دوبارہ زور دے کر کہا تھا۔

''حضرت میں گھر سے کھانا کھا کے آیا ہوں۔'' میرا جواب پھر نفی میں تھا۔

''ابے کھالے..... درگاہوں کا لنگر نصیب والے کھاتے ہیں۔'' انہوں نے اب ذرا سختی سے کہا تھا اُن کے لہجے میں نہ جانے کیا بات تھی اور آنکھیں بھی مجھ پر ہی جمی ہوئی تھیں میں بابا کے قریب جا کر بیٹھ گیا اُن کے ہاتھ سے دال لگی روٹی لے کر تین چار لقمے کھا لیے بظاہر تو عام سی تندوری روٹی پر چنے کی دال لگی تھی' مگر تھی نہایت ہی لذیذ اور خوش ذائقہ' میں ابھی اس کے ذائقے کو محسوس ہی کر رہا تھا کہ اُس بزرگ کی آواز اور الفاظ نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''بیٹا! تو جو سوچ رہا ہے وہ ملے گا نہیں اور نہ ہوگا' بہتر ہے کہ تو یہ خیال اپنے دل و دماغ سے نکال دے اللہ جو کرتا ہے انسان کی بہتری اُسی میں ہوتی ہے اللہ سے اچھی امید رکھ وہ پاک پروردگار سب اچھا کر دے گا مگر یہ یاد رکھ جو تو چاہتا ہے وہ ہوگا نہیں۔''

''اچھا بتا میں تو کہ میں کیا چاہتا ہوں؟'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

''اللہ کے دربار میں بیٹھ کر ایک فقیر سے اپنا اندر چھپا رہا ہے' بس بتا دیا جو تو سوچ رہا ہے ہوگا نہیں۔''

اُن کے الفاظ میرے کانوں سے ہوتے ہوئے میرے دل میں اتر گئے تھے اُن کو کس طرح سے معلوم ہوا کہ میرے دل و دماغ میں اِس وقت کیا چل رہا ہے اور میں نے دل میں کیا ارادہ کر رکھا ہے۔ دراصل اُن دنوں بہن کی شادی کے بعد گھر میں میری شادی کی بات چل رہی تھی' اور میں گھر والوں کو اپنے رشتے کے لیے جہاں بھیجنا چاہتا تھا' وہاں گھر والے جانا نہیں چاہتے تھے بس اُن دنوں یہی بات مسلسل ہر جگہ میرے دل اور دماغ میں چل رہی تھی۔ اللہ کے نیک بندے نے اللہ کے ولی کے دربار میں بیٹھے ہوئے مجھ جیسے گناہ گار انسان کا دماغ پڑھ کر مجھے حیرت زدہ کر دیا تھا۔ اُن کی بات سن کر میں نے اُن کے اور قریب ہوتے ہوئے پوچھا تھا۔

''اچھا حضرت کچھ اور بھی بتا دیں۔''

''بس بیٹا! انسان کو اللہ کی رضا پر راضی ہو کر ہر معاملے کو اللہ پر ہی چھوڑ دینا چاہیے' پھر دیکھو وہ پالن ہار پروردگار کس طرح اپنے محبوب ﷺ کے صدقے ہم گناہ گاروں کے بگڑے کام کیسے آسان کرتا ہے' بس یاد رکھ ہر کام من جانب اللہ ہے' اگر مگر کیوں کب' کیسے کہاں کیا' ایسا ویسا جیسا یہ سب ہماری سوچ ہوتی ہے ہوتا وہی ہے جو اللہ پاک کو منظور ہوتا ہے تُو اس وقت اللہ کے ولی اور غوث پاک کے شہزادے کے دربار میں موجود ہے دعا کر پھر دیکھ تجھے کیسا قلبی سکون ملتا ہے۔''

مجھے قلبی سکون تو مل رہا تھا اُن کی اسرار میں ڈوبی ہوئی باتوں سے اسی اثناء میں میرے بہنوئی بھی دعا سے فارغ ہو کر آ چکے تھے۔

''حضرت یہ میرے بہنوئی ہیں شادی کو تین ماہ ہوئے ہیں نوکری ختم ہوگئی ہے۔ آپ دعا کریں کہ یہ اللہ کے ولی اللہ کے دربار میں ہماری التجا پہنچا دیں۔''

میں نے اُن بزرگ سے کہا تھا۔

''میاں تم نے کسی کا جانے انجانے میں دل دکھایا ہے۔'' وہ بزرگ میرے بہنوئی سے مخاطب تھے۔

''نہیں حضرت میں نے تو ایسا نہیں کیا۔'' میرے

بہنوئی نے بڑے مودبانہ لہجے میں کہا تھا۔

''بیٹا جانے انجانے میں تم سے بھول، غلطی ہوگئی ہے۔ اب سنو میری بات ابھی کچھ دن تک تمہارے ساتھ یہ آزمائش رہے گی، اور ہر آزمائش اللہ پاک کی طرف سے ہی ہوتی ہے اللہ سے لو لگاؤ اللہ کے نیک بندوں سے لو لگاؤ، اُن کی صحبت اور سنگت اختیار کرو، انشاء اللہ جلد آزمائش ختم ہو جائے گی تمہیں تمہارے کام والے شعبے میں ہی بہت اچھی تنخواہ پر نوکری ملے گی نئی جگہ پر، نوکری کے بعد، تمہارا پرانا سیٹھ جو کہ تمہارا دوست بھی ہے، وہ تمہیں واپس بلائے گا مگر تم پرانی جگہ دوبارہ مت جانا، اب جاؤ اللہ حافظ۔''

''حضرت اگر آپ سے دوبارہ ملنا ہو تو؟'' میں نے سوال کیا تھا۔

وہ مسکراتے ہوئے بولے تھے۔

''اب اس کے بعد بھی اگر ملنا ہو تو رات دس بجے کے بعد سے فجر تک ہم حسین شاہ جیلانی کی درگاہ پر ہوتے ہیں بس اب تم جاؤ۔''

جب ہم اُس جگہ سے اٹھے اُس وقت تقریباً ساڑھے بارہ بج رہے تھے ہمیں دربار شریف پر آئے ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی۔

اُس دور میں آج سے سترہ سال پہلے ملک کے حالات بہت اچھے تھے ہماری مساجد، ہمارے مزارات امام بارگاہیں دہشت گردوں سے محفوظ تھیں، اس لیے لوگ بڑے پُرسکون ہو کر آتے جاتے تھے میں خود زیادہ تر عشاء کے بعد ہی یہاں آتا اور خاصا ٹائم گزار کے جاتا تھا۔ درگاہ سے واپسی پر مجھے اس بات پر خاصی حیرت ہو رہی تھی کہ ہم لوگ گھنٹہ بھر سے وہاں بیٹھے اُن بابا جی سے باتیں کر رہے تھے مگر وہاں کوئی اور ناں آیا تھا اور نہ ہی کوئی ہماری طرف متوجہ ہوا تھا جبکہ اندر دربار میں بہت رش تھا، باہر صحن میں جو چند لوگ بیٹھے تھے ہمارے اٹھتے ہی وہ بھی وہاں سے اٹھ گئے تھے۔

☆.....☆.....☆

تقریباً ڈھائی ماہ بعد ان بزرگ کی باتیں لفظ بہ لفظ درست ثابت ہوئی تھیں میرے بہنوئی کو دوسری رولنگ مل میں نہایت ہی اچھی تنخواہ پر نوکری مل گئی تھی اور اُس کے بعد اُن کو پرانی جگہ سے دوبارہ بلاوا بھی آیا تھا مگر وہ گئے نہیں تھے آج اس واقعہ کو سترہ سال ہو چکے ہیں۔

میری بہن کے تین بچے ہیں بڑا بیٹا اے لیول کر چکا ہے مگر میں آج تک اُن باتوں کو اپنے دماغ سے نہیں نکال سکا، میں نے اُس کے بعد اُن بزرگ کی بتائی ہوئی جگہ پر جا کر اُن کو بہت تلاش کیا مگر وہ دوبارہ کبھی نہیں ملے، میں نے انہیں دوسرے درباروں پر بھی ڈھونڈا مگر میری تلاش تلاش ہی رہی، میرے وہ دوست جو ایسے لوگوں سے عقیدت اور محبت رکھتے ہیں جب اُن کو ان بزرگ کے بارے میں معلوم ہوا تو انہوں نے بھی ملنے کی خواہش ظاہر کی مگر وہ نہیں ملے حضرت عبدالوہاب شاہ جیلانی رحمتہ اللہ علیہ کے دربار جا کر میں نے کئی بار وہاں کے پرانے خدمت گاروں سے اُن کے بارے میں معلوم کیا مگر سب نے لاعلمی کا اظہار کیا، کسی نے بھی ایسے حلیے والے بزرگ کو وہاں نہیں دیکھا تھا۔

میرے ذہن میں آج تک اُن کی گفتگو نقش ہے، اور اُن کی آنکھیں میں کبھی نہیں بھول سکوں گا۔ میرا اب بھی دربار اولیاء اللہ پر حاضری دینا معمول ہے، اور جب بھی میں دربار نخی وہاب پر جاتا ہوں، نگاہیں اِدھر اُدھر بھٹکتی رہتی ہیں، مگر جس کو تلاش کرتی ہیں وہ ملا ہی نہیں، یہ ایک اسرار ہے۔

انہوں نے ہی مجھ سے یہ کہا تھا۔

''بیٹا ہر کام من جانب اللہ ہے۔'' وہ ہستی دوبارہ ملنا تو دور کی بات مجھے نظر تک نہیں آئی۔ ایسا لگتا ہے کہ اللہ پاک نے اپنے ولی کے دربار میں ہماری مانگی ہوئی دعاؤں کو شرف قبولیت بخش کر ہماری اصلاح اور رہنمائی کے لیے اُس نیک ہستی کو ہمارے پاس بھیجا تھا، میں آج تک اس بات پر حیرت زدہ ہوں کہ دربار کے اندر مزار پر لوگ فاتحہ خوانی میں مصروف تھے صحن میں بھی تھے آ جا رہے تھے مگر کوئی ہماری طرف متوجہ نہیں تھا یہ کیا اسرار تھا بس اللہ ہی جانتا ہے۔

☆☆.....☆☆

یہ اسرار کیا ہے

تسلیم الٰہی زلفی کا شعر

میرے	چاروں	طرف	اُجالا	ہے
روشنی	آرہی	ہے	اندر	سے

اشعر جواد

''احترام'' کے جذبے کے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہوئے نامور ادیب ممتاز مفتی ایک جگہ لکھتے ہیں ''احترام ایک دیوار ہے جو محترم اور احترام کرنے والے کے درمیان کھڑی ہو جاتی ہے' جو قرب پیدا ہونے دیتی' جو خوف پیدا کرتی ہے' خوف مثبت نہیں' جذبہ ہے اور احترام کا جذبہ باہمی محبت کے امکانات

کردیتا ہے۔''..... یہ بات میں نے بہت پہلے ایک رسالے میں پڑھی تھی جو اَب تک میرے دل پر نقش ہے اور شاید اسی لیے میں ممتاز مفتی کی اِس بات یا پھر خیال کے تناظر میں اپنی زندگی سے وابستہ اکثر شخصیات کا تجزیہ کرتا ہوں' انہی شخصیات میں میرے شفٹ انچارج اقبال علی خان کا نام بھی شامل ہے۔

میں جس ورکشاپ میں کام کرتا تھا' اقبال علی خان وہاں مجھ سمیت تقریباً دس' بارہ ورکرز کے شفٹ انچارج تھے۔ نماز' روزے کے سخت پابند تھے۔ دین کے بارے میں اُن کی معلومات بہت زیادہ تھیں جن کا وہ اکثر موقع بے موقع اظہار ہمارے سامنے شعلہ فشاں خطاب کی صورت کرتے تھے اور ایسا کرتے ہوئے اُن کی آواز اور انداز میں ایک احساسِ تفاخر ہی نہیں' ہماری بے توقیری کا اظہار بھی ہوتا تھا۔

میں ہمیشہ سے اپنے کام سے کام رکھنے والا بندہ رہا ہوں' دوسروں کے کام اور کردار سے غرض نہیں رکھتا..... لیکن نجانے کیوں اقبال علی خان کا اپنے مذہبی ہونے کے حوالے سے غرور اور دوسروں کو نیچا ثابت کرنا مجھے بالکل بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ ان کے اس عمل کے دوران میں میرا دل کڑھتا' جلتا رہتا تھا لیکن میں اپنی فطرت اور عادت کے مطابق کہتا کچھ نہیں تھا' بس خاموش رہتا تھا۔

.....•.....•.....•

اُس شام ورکشاپ میں کوئی کام نہ تھا' سو ہمیں مصروف رکھنے کے لیے اقبال علی خان کا ہم سب کے سامنے نماز کے معاملے میں سستی کرنے اور دینی علم نہ رکھنے والوں کے خوف ناک انجام کے متعلق شعلہ فشاں' جاہ و جلال سے بھرا خطاب کافی دیر سے جاری تھا۔ وہ بتا یہ جاننے کہ..... سننے والوں کی اکتاہٹ کس حد کو چھو چکی ہے' وہ زور و شور سے اپنے کام میں مگن تھے۔ اُن کا بس نہیں چل رہا تھا کہ..... وہ ہم سب کو گناہ گار گردانتے ہوئے ہمارے گریبان پکڑ کر ہمیں چھترسی بھی لگاتے..... اِسی دوران قریبی مسجد کے مؤذن نے عصر کی اذان کی صورت اللہ کی بڑائی کا اعلان کرتے ہوئے نماز کی جانب بلایا تھا تو اقبال صاحب کی آواز تھم گئی تھی۔

اقبال صاحب کے اِس خطاب کے بعد میری عجیب سی کیفیت تھی۔ دل میں دین اور دنیا کے حوالے سے عجیب و غریب خیال اور وسوسے آ رہے تھے..... میں نے تین بار اللہ اکبر اور اتنی ہی بار دُرود شریف پڑھ کے اپنے ذہن و دل کو تمام وسوسوں اور خدشات سے پاک کر کے وضو کیا تھا..... اور کیونکہ نماز میں کچھ وقت تھا' اس لیے ورکشاپ کے گیٹ پر جا کے کھڑا ہو گیا تھا۔

میں ابھی ورکشاپ کے گیٹ پر آ کے کھڑا ہوا ہی تھا کہ وہاں اقبال صاحب کی بھی آمد ہو گئی تھی.....

''میاں! جماعت میں کم وقت رہ گیا ہے' تم یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو؟''..... وہ مجھ سے ہی مخاطب تھے۔

میں ابھی انہیں کوئی جواب دینے والا ہی تھا..... کہ ایک نہایت پریشان حال' مفلسی کا مارا ہوا شخص آیا اور اقبال صاحب کے سامنے دستِ سوال دراز کر دیا تھا..... کئی دن کے بھوکے اس شخص کی طلب صرف روٹی کی تھی۔

اقبال صاحب نے برا سا منہ بناتے ہوئے اس شخص کا ہاتھ غصے بھرے لہجے میں یہ کہتے ہوئے جھٹک دیا تھا کہ..... ''تو اچھا بھلا ہے' کوئی کام دھندہ کر' ویسے بھی یہ مہینے کی آخری تاریخیں ہیں' اپنا پورا انہیں پڑتا اور.....''

اس شخص نے کچھ کہنا چاہا تھا..... مگر ''بس' بس' مجھے نماز سے پہلے ہی دیر ہو رہی ہے۔'' اقبال صاحب کے اس جواب نے سائل کے ہونٹوں پہ چپ کی مہر لگا دی تھی۔

اقبال صاحب یہ کہہ کر مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے مسجد کی جانب چل دیئے تھے۔ اب اس شخص نے بھی واپسی کے لیے رخ موڑا تھا۔ ''سنو بھائی.....!'' کہہ کر میں نے آواز دی تھی۔ وہ شکستہ قدموں سے میرے پاس آ گیا تھا۔ میرے لیے بھی وہ مہینے کی آخری تاریخیں ہی تھیں مگر میں نے اللہ پر بھروسا کرتے ہوئے اس شخص کی مدد کر دی تھی۔

میں اُس ورکشاپ میں ایک معمولی ورکر تھا' میری تنخواہ چھے ہزار روپے تھی جبکہ اقبال صاحب کی تنخواہ تقریباً اٹھارہ ہزار کے قریب تھی مگر بڑے لوگوں کی ضرورتیں بھی چھوٹے لوگوں سے زیادہ ہوتی ہیں۔

میری ماں نے مجھے ہمیشہ یہ بات سمجھائی تھی

کہ..... اللہ تعالیٰ تو بندے پہ اپنے حقوق معاف کر سکتا ہے مگر حقوق العباد کی معافی تو دوسرے شخص کی معافی سے مشروط ہے۔ ہم نماز پڑھ کر واپس آ رہے تھے تو میرا ذہن اقبال صاحب کے حوالے سے نہایت انتشار بھری سوچوں میں غلطاں تھا کہ ایسے میں اچانک ہی وہ مجھ سے مخاطب ہوئے تھے۔

''آج کل جھوٹے بہروپے قسم کے فقیروں کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے' ایسے فقیروں کی مدد کر کے ثواب کی امید کرنا فضول ہے۔''

میں جو ہمیشہ اقبال صاحب کے سامنے خاموش رہتا تھا' بس اچانک جیسے بھڑک اٹھا تھا..... ''مجھے تو آپ بھی کبھی کبھی بہروپے نظر آتے ہیں' میں یقین سے کہہ سکتا ہوں' آپ جیسے دکھائی دیتے ہیں' ویسے ہیں نہیں۔''

میری یہ تلخ ترین بات سن کر اقبال صاحب نے کچھ کہا نہیں تھا' بس خاموشی سے مجھے گھورتے رہے تھے اور پھر تیزی سے قدم آگے بڑھا دیئے تھے۔ اب میرا دل کہہ رہا تھا کہ اقبال کے سامنے اتنا کڑا لہجہ' سخت جملے استعمال کر کے میں نے اپنی نوکری کے لیے خطرہ مول لیا ہے لیکن دوسری طرف میرا ذہن و ضمیر سو فیصد مطمئن تھا۔

اور پھر تین دن کے بعد ہی اقبال صاحب کی خفگی کا عذاب مجھ پر نوکری سے برخاستگی کی صورت نازل ہو گیا تھا یعنی مجھے نوکری سے فارغ کر دیا گیا تھا۔ اس وقت کے حالات میں مذکورہ صورتِ حال میرے لیے نہایت اذیت ناک تھی کیونکہ بوڑھے والدین کے علاوہ ایک بیوی اور دو بچوں کا بوجھ بھی میرے ناتواں کندھوں پر تھا۔

میں ایک کم پڑھا لکھا شخص ضرور تھا مگر اتنا جانتا تھا کہ معاشرے کی تمام خرابیوں' ہمارے ملک کے بگڑے حالات اور روز بروز بڑھتے ظلم و ستم کی ایک بڑی وجہ خود غرضی اور بے حسی ہے۔

پھر ایک دن جب میں فجر کی نماز پڑھ کر مسجد سے باہر نکلا تھا تو پیچھے سے کسی نے میرے کندھے پر آہستہ سے ہاتھ رکھا تھا اور جب میں نے مڑ کر دیکھا تھا تو میرے سامنے وہی شخص کھڑا تھا جس کی مدد کرنے کے حوالے سے میرے اور اقبال صاحب کے درمیان اختلاف ہی نہیں ہوا تھا' میری نوکری بھی گئی تھی لیکن اب تو اُس شخص کا رنگ و روپ ہی بدلا ہوا تھا' صاف ستھرا سفید براق کپڑے پہنے وہ شخص مجھے بہت تپاک سے ساتھ ملا تھا اور بہت گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے اپنا تعارف کروایا تھا۔

''میرا نام محمد بخش ہے۔ مجھے کہیں سے معلوم ہوا ہے کہ تم ان دنوں بے روزگار ہو اور بہت شدت سے کوئی اچھی نوکری تلاش کر رہے ہو۔ لو یہ خط تم اپنے پاس رکھ لو یہ نوکری کے حصول میں تمہارے لیے مددگار ہوگا۔'' اور پھر اس سے پہلے میں کچھ کہتا یا پوچھتا' وہ شخص پلک جھپکتے میں مسجد کے دائیں طرف جانے والی گلی میں گم ہو گیا تھا۔ میں اُس کے پیچھے دوڑا بھی' اِدھر اُدھر تلاش بھی کیا تھا لیکن یہ سب بے سود تھا.....

جب میں نے لفافہ کھول کے وہ خط پڑھا تھا تو اس میں ایک مشہور زمانہ آٹو موبائل کمپنی کے ایڈریس کے ساتھ وہاں کے ایک افسر جاوید اختر کے نام سفارشی خط بھی تھا جس میں میری ہنرمندی کے ساتھ کردار کی تعریف بھی کی گئی تھی' ساتھ ہی ایک چٹ پر یہ ہدایت بھی تحریر تھی کہ..... کام ہو جانے کی صورت میں اُن بزرگ کے مزار پر ضرور حاضری دوں جن کا نام اور پتہ بھی درج تھا۔

دوسرے دن میں اُس آٹو موبائل کمپنی میں جاوید اختر نامی شخص سے ملا تھا۔ وہ میرے ساتھ بہت خوش اخلاقی سے پیش آئے تھے اور مجھے نہایت پرکشش تنخواہ کے ساتھ ایک نہایت اچھی نوکری مل گئی تھی' دوسرے لفظوں میں محمد بخش صاحب کے خط نے اپنا کام بخوبی کر دیا تھا اور یوں زندگی بدلنے کا سامان ہو گیا تھا۔

•.....•.....•

جب مجھے پہلی تنخواہ ملی تھی تو میں محمد بخش کی ہدایت کے مطابق خط میں بتائے گئے بزرگ کے مزار پر حاضری دینے پہنچ گیا تھا۔ وہ مزار لوگوں میں ''دم والے بابا'' کے نام سے معروف اور مشہور تھا اور پھر جیسے ہی میں دعا کے لیے مزار مبارک تک پہنچا تو وہاں آویزاں کتبے پر نظر پڑتے ہی جیسے میں پتھر کا ہو گیا تھا کیونکہ اُس کتبے پر نقش تھا..... ''محمد بخش المعروف دم والے بابا'' جبکہ وہ مزار تقریباً ایک صدی پرانا ہے۔

☆☆.....☆☆

ماہنامہ دوشیزہ کراچی ڈائجسٹ میں اشتہار کیوں دیا جائے؟

- .....پاکستان کا یہ واحد رسالہ ہے، جس کا گزشتہ چوالیس (44) برس سے چار نسلیں مسلسل مطالعہ کر رہی ہیں۔
- .....اِس لیے کہ جریدے میں شائع ہونے والے اشتہارات پر قارئین بھرپور اعتماد کرتے ہیں۔
- .....اِس میں غیر معیاری اشتہار شائع نہیں کیے جاتے۔
- .....پوری دنیا میں پھیلے اِس کے لاکھوں قارئین متوسط اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں، جو مستند اور معیاری مصنوعات کی خریداری کو ترجیح دیتے ہیں۔
- .....اِس لیے کہ دوشیزہ ڈائجسٹ کو گھر کا ہر فرد یکساں دلچسپی سے پڑھتا ہے۔
- .....جریدے کے ہر شمارے کو قارئین سنبھال کر رکھتے ہیں۔
- .....اِس جریدے کے بڑی تعداد میں مستقل خریدار ہیں، جو اندرون اور بیرون ملک پھیلے ہوئے ہیں۔
- .....آپ کی مصنوعات کے اشتہار باکفایت اُن تک پہنچ سکتے ہیں۔
- .....جریدے کی اعلیٰ معیار کی چھپائی آپ کے اشتہار کی خوب صورتی میں اضافہ کرتی ہے۔

شعبہ اشتہارات: ماہنامہ دوشیزہ

II C-88۔ فرسٹ فلور، خیابان جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

فون نمبر: 021-35893121 - 35893122

ایک نہایت ہی منفرد، دلچسپ پُراسرار سلسلہ، جسے آپ عرصۂ دراز تک یاد رکھیں گے

اماں تاس

(پہلی قسط)

شازلی سعید مغل

''اہل.....'' اورنگزیب چیختا چلاتا پورے گھر میں اپنی چھوٹی بہن کو آوازیں لگا رہا تھا۔ عصر مغرب کے مابین وقت تھا گھر میں اس وقت اس کی ماں فائزہ اور چھوٹی بہن ہی تھیں۔

''یا اللہ خیر ہے کیا ہوا۔'' فائزہ کچن سے حواس باختہ باہر آئی۔

''کیوں پاگلوں کی طرح چلا رہے ہو؟ تمیز ہے کوئی تمہیں..... کیا مسئلہ ہے؟'' اہل ہاتھ میں کتاب اٹھائے کمرے سے برآمد ہوئی۔

''ارے واہ اتنی جلدی آ کے یہاں چھپ گئیں بلکہ پڑھنے بھی بیٹھ گئیں۔ تو نے پوری پلاننگ کی تھی نا..... اب میں تجھ کو نہیں چھوڑوں گا۔'' اورنگزیب بہن کی طرف بڑھا۔

''کیا بدتمیزی ہے دو ہاتھ لگاؤں گی ابھی.....'' فائزہ نے درمیان میں آ کر بیٹے کو ہلکا سا دھکا دے کر دور کیا۔

''آج تم میرے سامنے یہ حرکت کر رہے ہو بہت دکھ ہو رہا ہے مجھے.....''

''ہاں آپ کو تو مجھ میں ہی خرابیاں اور کیاں نظر آتی ہیں آپ کی یہ لاڈلی کیا کیا کرتی پھرتی ہے آپ کو وہ بھی نظر نہیں آئے گا۔''

''کیا..... کیا کیا ہے میں نے، تمہارا دماغ بالکل ہی چل گیا ہے، تم خود جو کرتے ہو وہ سب کو پتہ ہے۔''

''چپ کرو تم دونوں..... پاگل کر کے رکھ دیا۔ مجھے، اماں بھی جا کر اپنی بہن کے گھر سب بھول گئی ہیں مجھے، میں تم لوگوں کے مسائل دیکھوں یا گھر کے کام زینت کو بھی اسی وقت چھٹی پر جانا تھا۔'' فائزہ کو بڑ شدت سے اس وقت اپنی ساس یاد آئیں۔ وہ تھامے کرسی پر بیٹھی تھی۔

اہل دوڑ کر پانی لائی اور ماں کو پلایا، پانی پی فائزہ کے اوسان کچھ بحال ہوئے تو اس نے کہا۔

''تمیز سے کچھ بتانا ہے تو بتاؤ، ورنہ یہ تمہارے دادا اور ابو کے آنے کا وقت ہے مجھے کھانا بنانے کے لیے دیر ہو رہی ہے۔''

''تم پہلے یہ بتاؤ تم یہاں پہنچی کیسے؟ مجھے تو تم نے منع کر دیا تھا میرے ساتھ دوستوں کے سامنے۔''

''کیا..... کیا کہاں سے پہنچی؟'' فائزہ نے مداخلت کی۔

''یہ گھر میں ہے..... تم آئے ہو باہر سے دکھائی نہیں دے رہا تم کو۔''

''ای میں کالج کی بات کررہا ہوں۔''
اورنگزیب نے وضاحت کی۔
''صبح دادا چھوڑتے ہیں اِس کو' مگر آتی میرے ساتھ ہے نا..... آج جب کلاسز کے بعد میں اس کا منتظر تھا تو یہ صاحبہ سامنے سے چلی گئیں میں نے آواز بھی لگائی تو سنا نہیں' یہ کیسے گھر آئی اور کیوں پوچھو اس سے۔''
فائزہ نے تشویش ناک انداز میں اب بیٹے کا منہ دیکھا۔
''اورنگزیب واقعی تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے' یہ کالج نہیں گئی آج۔''
''کیسے کیسے نہیں گئی' صبح تیار ہورہی تھی۔''
''ہاں ہوئی تھی مگر ابا جی کو دیر ہورہی تھی اس کی خاص کلاس نہیں تھی' کل ٹیسٹ ہے میں نے روکا ہے۔''
''ہرگز نہیں ای..... آپ اس کو بچا رہی ہیں' میں نے دیکھا ہے خود۔''
''ای یہ کس قدر جھوٹ بولتا ہے مجھے پتہ ہے کیوں' کیوں یہ اتنی بڑی بڑی باتیں کررہا ہے' میں نے پرسوں اس کو نوٹس بنا کے دینے سے صاف انکار کردیا تھا۔ یہ میرے کام نہیں کرتا' میں بھی اس کے کام نہیں کروں گی۔ سب اس کا ہی بدلہ لیا ہے آج مجھ سے۔''
''بالکل جھوٹ..... یہ غلط بیانی سے کام لے رہی ہے' میں بدلہ نہیں لے رہا' میں نے خود.....''
''اوہ تو تم اصل بیانی سے کام لو۔'' فائزہ نے بیچ میں مداخلت کی۔
''کیوں اس طرح کی بے سروپا باتیں کررہے ہو' تمہیں ماں پر بھی یقین نہیں ہے کیا؟ بولو' جب میں کہہ رہی ہوں کہ ابا کو دیر ہورہی تھی اور میں بھی چاہتی تھی یہ آج نہ جائے تو.....'' اب فائزہ نے بیٹے کا بازو سختی سے پکڑ کر درشتگی سے بات محتم کی۔
''حد ہوتی ہے جھوٹ کی بھی' ایک نوٹس نہ بنانے پر تم اس طرح کی بات کرو گے بہن کے لیے۔''
اورنگزیب نے نظر اٹھائیں تو امل آنکھوں میں معنی خیز چمک لیے مسکرا رہی تھی اورنگزیب نے بھی صرف اشارتاً منہ پر ہاتھ پھیرا اور بتا دیا کہ میں پھوڑوں گا نہیں امل نے بھی شرارت سے فتح یابی کا ایک نشان بنایا اور کتاب لے کر اندر چلی گئی۔
فائزہ اپنے بکھرے کاموں کو سمیٹنے میں لگ گئیں اور اورنگزیب صحن مین درخت تلے بچھے پلنگ پر بیٹھ کر کسی گہری سوچ میں مستغرق ہوگیا۔ اس کا دماغ آج کے واقعات کی ریل بڑی تیزی سے چلا رہا تھا۔ رات کے کھانے کے وقت وہ اپنے کمرے میں بند ہوگیا۔
صبح محسن شیرازی نے گھر سے نکلتے ہوئے اورنگزیب کے بارے میں پوچھا۔
''اٹھ گئے آپ کے صاحبزادے' مزاج بخیر ہیں۔'' انہوں نے گیٹ کا لاک کھولتے ہوئے پوچھا۔
''نہیں ابھی سو رہا ہے۔'' فائزہ یہ کہتی ہوئی چور سی بن گئی۔
''اپنے لاڈلے کو اٹھاؤ اس سے کہو بہت ہوا یہ نکما پن اگر پڑھائی نہیں ہورہی تو کام کاج سیکھے کوئی' ورنہ کوئی بہت سخت فیصلہ اُس کا منتظر ہوگا۔''
''ایسا نہ کہیے پلیز.....'' فائزہ تڑپ گئی۔
''ایک ہی بیٹا ہے ہمارا.....''
''تمہاری اِس ایک ہی گردان نے تو ہی اُسے اتنا سر چڑھایا ہے' مگر تم بھول جاتی ہو کہ بیٹی بھی ہماری ایک ہی ہے' چھوٹی ہے اس سے' مگر کس قدر قابل اور ہونہار' کبھی بھی بے حد افسوس ہوتا ہے مجھے' جب میں تمہارے اس اکلوتے سپوت کو دیکھتا ہوں۔'' فائزہ نے کچھ کہنا چاہا مگر کہہ نہ سکی اور نہ ہی محسن شیرازی کو جواب کی ضرورت تھی وہ فوراً باہر نکل گئے۔ فائزہ نے ایک گہرا سانس لیا اور اندر چلی گئی۔
محسن شیرازی نے جو بات کہی تھی اس نے فائزہ کو بے حد فکر مند کردیا تھا۔ وہ اکثر اورنگزیب کی پڑھائی سے عدم دلچسپی کی بنا پر ناراض تو ہوتے رہتے تھے اور یہ ناراضگی اس وقت ہوا ہوجاتی جب اُن کی بیٹی کسی نہ کسی دن اپنی ہونہاری اور ذہانت کا ثبوت ہاتھ میں لیے گھر میں داخل ہوتی وہ چاہے پڑھائی ہو یا کالج میں کسی کمپی ٹیشن میں مقابلہ جیتنے کی بات' اور

اس دن محسن شیرازی کی ناراضگی بڑھ سی جاتی' لیکن کل کے واقعے نے اُن کو بہت دلبرداشتہ کر دیا تھا۔

رات فائزہ نے ساری بات شوہر کے گوش گزار کی تھی۔ وہ کوئی بات چھپانا نہیں چاہتی تھی اس نے اورنگزیب کو تو ڈانٹ ڈپٹ دیا تھا مگر ایک نامعلوم فکر نے اُس کے دل میں پنجے گاڑھ دیے تھے' ایسے میں صولت جہاں گھر پر نہیں تھیں' چنانچہ کل کا واقعہ شوہر کو بتانا لازمی تھا۔ وہ بات ایک طرف مگر وہ اورنگزیب کی پڑھائی کی جانب سے لاپرواہی جو کہ اب دن بدن بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ بالکل برداشت نہیں کر سکتے تھے حالانکہ وہ بڑے صبر و تحمل والے انسان تھے انہوں نے سخت فیصلہ والی جو بات کی تھی وہ فائزہ کو بے حد فکرمند کر گئی تھی وہ شروع سے اورنگزیب کی حرکتوں پر پردہ پوشی کرتی آئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اپنے اورنگزیب لیوچر کو لے کر حد سے زیادہ لاپرواہ تھا۔ کھانا' سونا دوستوں میں گھومنا بس یہی اس کی زندگی بن گیا تھا۔

اورنگزیب اور امل دونوں ایک ہی کالج میں پڑھتے تھے' اورنگزیب گریجویشن کے لاسٹ ایئر میں تھا جبکہ چھوٹی بہن سیکنڈ ایئر میں مگر وہ اورنگزیب کے تمام نوٹس بنا دیا کرتی' اور جو رہ جاتے وہ اِدھر اُدھر سے ارینج کرتا' بلکہ یہ ذمہ داری بھی امل پر ڈالی ہوئی تھی' وہ ہی اس کے لیے نوٹس فراہم کرتی' حتیٰ کہ اس کی کتابوں اور اس کے ٹائم ٹیبل تک کا خیال وہی رکھتی آئی تھی۔ دو سال کی چھٹائی بڑائی ان کے درمیان لگتی ہی نا تھی' ہم عمر لگتے تھے بلکہ جس طرح امل اس کا خیال رکھتی لوگ سمجھتے وہ بڑی بہن ہے۔

اُن دونوں بہن بھائی میں بے انتہا محبت تھی مگر کچھ دنوں سے اورنگزیب عجیب عجیب باتیں کر رہا تھا' روز ہی دونوں میں کسی نہ کسی بات کو لے کر کھٹ پٹ ہو رہی تھی مگر کل کا واقعہ بہت ہی پریشان کن تھا۔ امل کالج نہیں گئی تھی گھر میں سب اس بات کے گواہ تھے مگر اورنگزیب بضد تھا کہ وہ کالج میں تھی اور اُس نے اسے نہایت قریب سے آواز بھی لگائی تھی۔ جسے امل نے سن کر بھی اَن سنا کیا تھا جس پر اورنگزیب کے دوستوں نے اُس کا مذاق اڑایا تھا۔

شام سے پہلے پہلے صولت جہاں گھر واپس آ گئی تھیں آتی بھی کیسے نہیں' اُن کی بہو نے فون پر بات ہی ایسی سنائی تھی کہ وہ اپنا پروگرام ملتوی کر کے بہن کے گھر سے واپس اپنے گھر پہنچ گئیں' وہ سیدھی امل کے کمرے میں پہنچیں دوپہر کا وقت تھا امل سو رہی تھی۔ کچھ دیر وہ اس کے خوبصورت ملیح چہرے پر ٹیک ٹک دیکھے گئیں' پھر منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کر امل پر دم کیا۔ اور شدید اداسی بن کا شکار اپنے کمرے میں چلی گئیں اور دروازہ بند کر لیا' فائزہ کو ہدایت دے دی کہ جب تک وہ خود کمرے سے نہ نکلیں اُن کو ڈسٹرب نا کیا جائے۔

فائزہ نے ساس سے پوچھنے کی ہلکی سی ایک کوشش ضرور کی تھی کہ آخر ایسی کیا بات ہے' اور وہ یہ کوشش پہلی مرتبہ نہیں کر رہی تھی' پہلے بھی اس نے کئی بار امل کے بارے میں استفسار کیا تھا' جب جب صولت جہاں فائزہ کو امل کے کھانے سے لے کر اس کے پہننے کے کپڑوں کے رنگوں کے متعلق بے حد سختی سے باز پرس کرتیں تو فائزہ حیران سی رہ جاتی کہ ماں جیسی اُس کی ساس صرف امل کے کپڑوں کے رنگ کھانے پینے آنے جانے اور بہت سی ایسی باتوں پر اس سے اس طرح سختی سے باز پرس کرتیں جس پر کبھی تو فائزہ کو بے حد رونا بھی آ جاتا۔

صولت جہاں سے فائزہ کی یہ حالت چھپی نہ تھی وہ بعد میں تذبذب کے عالم میں شرمندہ سی بہو کی دل جوئی بھی کیا کرتی تھیں۔

مگر اس سے زیادہ وہ کچھ اور کرنے سے قاصر تھیں کیونکہ جو وہ جانتی تھیں وہ فائزہ جان نہیں پاتی تھی اور جان بھی جاتی تو برداشت کہاں کر پاتی؟ چنانچہ نا چاہتے ہوئے بھی صولت جہاں امل کے سلسلے میں اکثر بے جا ری فائزہ کو سخت سست سنا دیتی تھیں۔ اور یہ فائزہ کی بھی لائقی تھی کہ وہ بس ساس کو شکوہ بھری نگاہ سے دیکھے جاتی' مگر مجال ہے اُن کی شان میں گستاخی کر جائے دونوں کے درمیان ایک مثالی محبت کا رشتہ تھا' جو کہ فی زمانہ خال خال نظر آتا ہے چنانچہ آج بھی جب صولت جہاں نے فائزہ کو ڈسٹرب نہ کرنے کا کہہ

کرا اپنا دروازہ بند کیا تو وہ بس دیکھتی رہ گئی تھی۔

کل کا واقعہ ایسا معمولی نہ تھا کہ فائزہ خاموش رہ جاتی اس نے بھی سوچ لیا تھا کہ جونہی اماں باہر نکلیں گی' وہ امل کے بارے میں تفصیلی بات کرے گی' آخر وہ امل کی ماں ہے اس کو جاننے کا پورا حق ہے' اپنی جانب سے وہ یہ فیصلہ کر کے مطمئن ہونے کے بعد گھر کے کاموں میں لگ گئی تھی۔

مغرب کی نماز پڑھ کر صولت جہاں نے کمرے کا دروازہ کھولا فائزہ امل کے ساتھ بیٹھی باتیں کر رہی تھی اورنگزیب تھوڑی دور ناراض ناراض سا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ صولت جہاں نے پہلے تو امل پر دم کیا اور پھر اورنگزیب پر.....

''رہنے دیں دادی اپنی اس چہیتی پر ہی پھونکیں ماریں' میں سب سے سخت ناراض ہوں' آپ دم کر کے مجھے منانے کی کوشش نہ کریں پلیز۔''

''اورنگزیب.....'' فائزہ نے ٹوکا۔

''بری بات.....''

''ای آپ تو رہنے ہی دیں حد ہوتی ہے دادی کو اُن کی بہن کے گھر سے صرف اس لیے بلا لیا کہ آپ جو حمایت اِس کی نہ کر سکیں تو وہ کسر دادی پوری کریں' دادی کی تو پہلے ہی یہ سب کچھ ہے۔''

''نہیں بیٹا.....'' صولت جہاں نے اورنگزیب کو پیار کیا۔

''ایسی بات نہیں ہے' میں تو خود آ گئی' تم لوگ یاد آ رہے تھے مجھے' میرا دل جو نہیں لگ رہا تھا تم دونوں کے بغیر۔'' صولت جہاں نے پوتے کی ناراضگی دور کرنا چاہی۔

''مجھے نہیں پتہ..... میں آپ لوگوں سے سخت ناراض ہوں' آپ بے جا اس امل کی بچی کی حمایت کر رہے ہیں جبکہ بات اتنی سی ہے کہ یہ کالج گئی تھی اور میرے ساتھ نہیں آئی' یہ مان لینے میں کیا حرج ہے؟''

''اچھا اچھا چلو بس کرو' مان لیا بس۔'' صولت جہاں نے کہا۔

''دادی یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں' میں کالج نہیں گئی تھی' آپ کیوں اِس کی جھوٹی بات کو سپورٹ کر رہی ہیں۔'' امل رو دینے کو تھی اورنگزیب سنی اَن سنی کرتا باہر نکل گیا تھا کیونکہ اسی لمحے اس کے موبائل کی رنگ بج اٹھی اور وہ حسب معمول سنی اَن سنی کرتا باہر کی جانب لپکا۔ پیچھے سے فائزہ آواز دیتی رہ گئی تھی۔

امل بھی اب صولت جہاں سے ناراض تھی وہ کمرے میں چلی گئی۔

''اماں' آپ نے بھی آج فضول میں اس لڑکے کی غلط بات مان لی۔'' فائزہ نے شکوہ کیا۔

''رہنے دو فائزہ چھوڑو۔'' صولت جہاں نے کچھ ایسے لہجے میں یہ بات کہی تھی کہ فائزہ چونک سی اٹھی۔

''اماں.....'' فائزہ نے صولت جہاں کو بغور دیکھا وہ کسی گہری سوچ میں مستغرق تھیں۔

''آپ نے امل کو بھی ناراض کر دیا۔ ہمیشہ آپ مجھے اورنگزیب کی بے جا طرف داری پر ٹوکتی تھیں آج پتہ نہیں آپ نے یہ کیوں کیا؟ میں اپنی امل کو خود منانے جا رہی ہوں۔'' صولت جہاں نے فائزہ کی بات اَن سنی کر دی تھی۔

''امل کا کمرہ یہاں ہے اماں' آپ آنگن میں جا رہی ہیں۔'' فائزہ نے ساس کو کمرے کی طرف جاتے جاتے آنگن میں مڑتے دیکھ کر پوچھا۔

صولت جہاں املتاس تک پہنچی چاروں طرف گھوم کر اُس کا جائزہ لیا سر اٹھا کر اُس کے پھولوں اور پھلیوں سے بھری حسین شاخیں دیکھیں۔ درخت کے تنے پر کئی بار بہت آہستگی سے ہاتھ پھیرا تھا۔ فائزہ حیران پریشان دور کھڑی یہ سارے مناظر دیکھ رہی تھی۔ اُس سے اماں کا یہ رویہ اب برداشت نہیں ہو رہا تھا وہ مڑی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

صولت جہاں نے اب امل کے کمرے کا رخ کیا انہیں معلوم تھا امل اُن کو دیکھتے ہی ناراضگی ختم کر دے گی۔

☆.....☆.....☆

سورج نے حسب معمول اپنا رختِ سفر باندھ لیا تھا۔ درختوں کے پیچھے نیلا آسمان نارنجی رنگ سے ایسے رنگ گیا تھا گویا کسی ماہر مصور نے بڑے ماہرانہ

انداز میں اسٹروک لگائے ہوں' سورج کے اِس الوداعی رنگوں نے دریا کے پانی میں گھل کر بڑی پُراسراری فضا قائم کردی تھی' دریا کے دوسری جانب ایک چھوٹا سا جنگل تھا اور اس طرف کھیل کا میدان' یہ شہری آبادی سے دور ایک سرسبز علاقہ تھا دریا کی موجودگی نے اس علاقے کو گویا چار چاند لگا دیے تھے۔

شہر جب وسعت پانے لگیں تو جنگل باقی کہاں رہتے ہیں' چنانچہ یہاں رہائشی اسکیمیں وجود پذیر ہونے لگیں' جنگل مختصر ہوگیا یا یوں کہہ لیں صرف دریا کی وجہ سے تھوڑی سی نشانی کے طور پر رہ گیا جو جنگلی پھول دار جھاڑیوں اور درختوں سے بھرا پڑا تھا۔ دوسری جانب کھیل کا ایک وسیع عریض میدان تھا رہائشی بلاکس کو ملانے والی سڑک کے ساتھ ساتھ دریا بہہ رہا تھا' جنگل میں منگل کا سماں ہوگیا تھا اور رہائشی اسکیمیں روز بروز شروع اور آباد ہو رہی تھیں۔

شام میں کھیل کے میدان میں بچے بوڑھے جوان نکل آتے کچھ کھیلتے کچھ دریا پر وقت گزارتے' کچھ من چلے جنگل میں چھوٹے موٹے پرندوں کا شکار کرتے علاقہ محفوظ تھا جنگل کی باقیات میں کوئی خطرناک جانور نہ تھا نہ ہی رہائشی بلاکس دور تھے بچے اپنے گھروں کے ساتھ یا نوکروں کے ساتھ آتے تھے بڑے بچے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر آتے تھے۔

وہ دونوں بھی اسی طرح آتے جاتے تھے مگر اس روز وہ اکیلے ہی اس طرف نکل آئے دونوں بچوں کی عمریں بالترتیب آٹھ اور دس سال تھیں۔ لڑکا بڑا اور لڑکی چھوٹی' مگر لڑکی ہر بار لڑکے کو جتاتی کہ وہ اس سے بڑی ہے' دونوں میں ایک بحث چھڑ جاتی جس کا نتیجہ اس روز یہ نکلا کہ وہ گھر جانا بھول گئے۔ بے نتیجہ رہ جانے والی اس بحث میں جب یہ یاد آیا تو تیزی سے گھر کی جانب ہولیے' درختوں کے سائے اب لمبے ہو رہے تھے درختوں کے سائے کے ساتھ ساتھ اس رستے پر چلتے ان دونوں کے سائے بھی لمبے ہوتے جا رہے تھے' وہ ایک دوسرے کے سائے کو کاٹتے اس پر پیر رکھتے ایک دوسرے کو پکڑتے بھاگ رہے تھے۔

شام کی سرمئی ردا تیزی سے گہری ہو رہی تھی' چھوٹے کیڑے مکوڑوں اور پرندوں کی آوازیں دریا کنارے سے ابھر رہی تھیں' جس میں دریا کے بہنے کی ہلکی مگر نخریلی سی پُرشور آواز مسلسل اُن کی ہم سفر تھی' ابھی اُن کا ایک دوسرے کے سائے کاٹنے کا بے ہنگم سا کھیل جاری تھا کہ دریا کے کنارے لگی جھاڑیوں میں تیز سرسراہٹ ہوئی تھی اور ایک ننھی سی گلہری کود کر ان کے سامنے آ گئی اور دوسرے ہی لمحے دونوں کی چیخ و پکار سے گھبرا کر واپس جھاڑیوں میں گم ہوگئی۔

اب ان دونوں کو ایک اور کھیل ہاتھ آ گیا گلہری کچھ دیر تو چھپی رہی مگر پھر جیسے وہ ان کے ساتھ شامل ہوگئی' یہ سڑک پر جھاڑیوں کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور گلہری اُن کے ساتھ ساتھ جھاڑیوں میں کود رہی تھی جیسے اُن کی ہم سفر ہو' دونوں کئی بار جھاڑیوں میں گھسے مگر وہ ہاتھ نہ آئی' اِس ساری پکڑم پکڑائی میں جھٹپٹا مزید گہرا ہوتا جا رہا تھا لڑکے کو ایک دو دفعہ خوف بھی محسوس ہوا مگر لڑکی نے اِس کی ہمت از سر نو جوڑ دی گلہری کے خواب دکھائے وہ پھر سے جھاڑیوں میں گھسنے کو تیار ہوگیا' وہ اوائل نومبر کی شامیں تھیں' ہوا تیز اور خنک تھی۔

''شش.....!'' اچانک لڑکی نے لڑکے کو ہوشیار کیا' ہونٹوں پر انگلی رکھی اور جھاڑیوں میں ایک جانب اشارہ کیا' جہاں گلہری کی گچھے دار دم نظر آ رہی تھی۔ لڑکا لڑکی دونوں ابھی اپنے شکار پر جھپٹنا ہی چاہتے تھے کہ اُن کو بھی جھپٹ لیا گیا' کسی نے دونوں کو بڑے زوردار طریقے سے اپنی بکل میں چھپا لیا اور گھسیٹتا ہوا لے چلا۔ دونوں کو ہوش تو تب آیا جب دروازے سے اندر دھکیلا گیا۔ دو جھریوں بھرے ہاتھوں نے اُن دونوں کو لپک لیا اور دو دو ہتڑ کمر پر جڑ دیے۔ دونوں کی آنکھیں اور چودہ طبق ایک ساتھ روشن ہوگئے۔ سامنے بڑے سے صحن میں عدالت لگی ہوئی تھی۔ ماں باپ کے علاوہ بوڑھے دادا بھی موجود تھے۔ عدالت لگی' سزا سنائی گئی عدالت برخاست ہوئی' سب اندر چلے گئے اب بڑے سے صحن کے بیچوں بیچ سر اٹھائے درخت کے نیچے بچھے پلنگ پر دونوں اوندھے پڑے

تھے۔

یہ دونوں بچے محسن شیرازی اور فائزہ شیرازی کے تھے' محسن شیرازی آٹھ سال قبل ہی اس علاقے اس گھر میں شفٹ ہوئے تھے۔ دن مہینوں اور مہینے سالوں میں کس طرح تبدیل ہوتے ہیں کچھ معلوم ہی نہیں دیتا' پلک جھپکتے سال پر سال گزرتے جاتے' کل ہی کی بات لگتی تھی جب حسن شیرازی اور صولت جہاں' محسن شیرازی کے ماں باپ کو یہ علاقہ اس قدر پسند آیا کہ لمحوں میں فیصلہ کرلیا گیا کہ شہر سے دور یہاں دنیا بسائیں گے' بستی جدید تھی مگر صولت جہاں نے گھر کی خریداری سے پہلے واضح کردیا تھا کہ گھر چاہے چھوٹا ہی کیوں نہ ہو' مگر ایک بڑے آنگن پر مشتمل ضرور ہونا چاہیے' جدید آبادیوں میں اب آنگن تو متروک ہوتے جارہے ہیں مگر پسند اپنی اپنی' وہ آنگن کے بغیر گھر ادھورا تصور کرتی تھیں یہی حال اُن کی بہو فائزہ کا تھا چنانچہ دونوں خواتین کی پسند ملنا اس جدید آبادی میں چونکہ محال ثابت ہورہا تھا سو یہ طے پایا کہ پلاٹ لے کر مکان تعمیر کیا جائے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

جو پلاٹ انہیں ملا اس پر ایک بہت خوبصورت زرد پھولوں اور براؤن پھلیوں والے ایک درخت نے بڑی شان سے سر اٹھایا ہوا تھا۔ وہ درخت بہت خوبصورت تھا۔ گھر میں جب اُس کا ذکر ہوا تو بے اختیار صولت جہاں کے منہ سے نکلا۔ میرے آنگن کا سنگھار' یوں طے پایا کہ درخت کو کاٹنے کے بجائے صحن میں شامل کیا جائے' مکان کی تعمیر تیزی سے جاری تھی' مکان کا نقشہ بنا تو یہ درخت کچھ اس طرح صحن کے بیچوں بیچ آیا جیسے انگوٹھی میں نگینہ فٹ بیٹھا ہو' جب مکان بننے کے مراحل میں تھا تو محسن شیرازی کو یقین نہ تھا کہ اتنی تیزی سے سب اسباب ہوتے جائیں گے اور مکان دو تین مہینوں کی مختصر سی اس مدت میں یوں تکمیل پا جائے گا۔ مگر یہ سب ہوا تھا اور بالآخر وہ دن آ گیا جب محسن شیرازی دو سالہ اورنگزیب کی انگلی تھامے محض پانچ دن کی بیٹی گود میں اٹھائے اپنے ماں باپ اور بیوی سمیت اپنے پیارے سے نئے گھر میں شفٹ ہوگئے' حسن شیرازی نے جیسے ہی گھر کا صدر دروازہ کھولا..... پورا آنگن خوبصورت زرد پھولوں سے بھرا ہوا تھا۔ خوبصورت زرد پھول آنگن میں ہوائی چھیڑ چھاڑ پر جا بجا اٹھکھلیاں کررہے تھے آنگن کے درمیان کھڑے اِس زرد پھولوں کے درخت پر بھی بڑا نکھار تھا' کچھ ہی دنوں میں بڑا گھنا ہوگیا تھا جیسے وہ بھی اس گھر کا مکین بننے پر بے حد خوش ہوا ہو' تیز ہوا کا ایک جھونکا آیا عین درخت کے نیچے سے گزرتے ہوئے صولت جہاں پر زرد پھول برس پڑے' جن کی گود میں محض پانچ دن کی بیٹی تھی' سارے پھول بچی کے چہرے کو چومنے لگے بچی کسمسا گئی تھی۔

''یہ تو املتاس ہے.....'' صولت جہاں کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ یہ لفظ یہ نام سب کو اس قدر حسین لگا کہ ننھی سی بچی کا نام املتاس رکھ دیا گیا۔ یہ نام اس کو راس بھی خوب آیا آنگن میں لگے اس سرسبز پُر بہار زرد سنہری پھولوں والے درخت کی طرح املتاس بھی دن بدن نکھر رہی تھی۔ محسن شیرازی کے دونوں بچے اورنگزیب اور املتاس اسی آنگن میں کھیلتے کودتے بڑے ہورہے تھے جس کے بیچوں بیچ املتاس کا حسین درخت بہار دکھلا رہا تھا' املتاس پر تو اب بھی بہار کے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے مگر دونوں بھائیوں کی محبت املتاس کی اسی بہار کی نظر ہونے جارہی تھی۔

اُس واقعے کے بعد امل بہت خاموش رہنے لگی تھی اورنگزیب کے بیشتر کام چھوڑ دیے تھے وہ تو پہلے ہی امل کی وجہ سے تھوڑا بہت پڑھائی میں دھیان دے پارہا تھا جب امل نے اس کی ساری امداد ترک کردی تو بجائے صلح صفائی کے راستے کو اپنانے اورنگزیب نے کلاسز بنک کرنا شروع کردی تھیں۔

امل سب جانتی تھی ایک ہی کالج تھا دونوں کا' مگر اس نے گھر میں ایک لفظ اورنگزیب کے بارے میں نہیں بتایا تھا اورنگزیب امل کے اس طرزِ عمل پر حیران بھی تھا' اسے لگا تھا وہ فوراً بدلہ لے گی اور گھر میں سب کو اس کے بارے میں بتائے گی مگر جب پندرہ بیس دن گزر گئے تو اورنگزیب کی تھوڑی سی پریشانی بھی ختم ہوگئی تھی۔ وہ گھر سے کالج کے لیے جاتا مگر دوستوں کے ساتھ ہلا گلا سیر سپاٹے کرکے واپس آجاتا ابھی

اورنگزیب کا یہ جشن آزادی چل ہی رہا تھا کہ رات کے کھانے پر کھانا کھاتے ہوئے محسن شیرازی نے ایک نظر اورنگزیب پر ڈالی اور نگزیب نے بھی ایک نظر باپ کی طرف دیکھا اور دوبارہ کھانے میں مصروف ہوگیا۔

''اورنگزیب! میری بات غور سے سنو۔'' محسن شیرازی اچانک بولے۔

''جی ابو.....'' اُس نے نظریں نیچی کیے ہوئے کہا۔

''یہ تمہارے گریجویشن کا لاسٹ ایئر ہے تمہیں اچھے مارکس سے کلیئر کرنا ہے میری بڑی تمنا تھی کہ تم کوئی پروفیشنل ڈگری حاصل کرتے مگر افسوس میری یہ تمنا پوری نہ ہوسکی اور اس کے امکان نظر بھی نہیں آتے' تم سمپل گریجویشن اچھے مارکس سے کلیئر کرلو اور میرے ساتھ میرے کاروبار میں میرا ہاتھ بٹاؤ اب یہی تم سے میری آخری امید ہے۔ اب یہ وقت سونے میں مت گزار دینا۔''

''جی اچھا ابو.....'' اورنگزیب نے انتہائی فرمانبرداری سے کہا۔ جیسے صبح اٹھتے ہی کایا پلٹ ہوگئی' مگر صبح تو ہوئی لیکن ایسا کچھ نہ ہوا۔

اورنگزیب کی صحت پر کوئی اثر نہ پڑا' سب جوں کا توں ہی رہا' وہی کمپیوٹر' وہی موبائل وہ دوپہر دیر تک سونا' کالج جانا تو کلاسز بنک کرکے دوستوں کے ساتھ آوارہ گردی کرنے نکل جانا اور پھر ایک نئے طوفان نے جنم لینا شروع کردیا تھا۔

اورنگزیب کے دوست فیصل کے بڑے بھائی کی شادی تھی' شادی لان میں وہ فیصل و دیگر بلائے گئے دوستوں کے ساتھ اِدھر اُدھر گھومتے پھر رہے تھے' اورنگزیب بلیک سوٹ میں انتہائی پُرکشش لگ رہا تھا وہ اہل سے کسی طرح کم نہیں تھا' اہل کی خوبصورتی میں گو ایک دبیز اسرار چھپا معلوم ہوتا تھا تو اورنگزیب ایک اچھے قد کاٹھ کا نہایت پُرکشش لڑکا تھا۔

وہ اپنے دوستوں سے منفرد نظر آتا تھا یہاں شادی میں بھی کئی ایک فیملیز اورنگزیب کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ نظر جمارہی تھیں' کئی ایک نے تو اس سے گفتگو کرنے کی بھی کوشش کی تھی۔ وہی روایتی جملے.....

''بیٹے! آپ لڑکے والوں کی طرف سے ہو یا لڑکی والوں کی جانب سے؟'' تین چار لوگوں کو جواب دے دے کر اورنگزیب تنگ آیا' فیصل کبھی غائب ہوجاتا اور کبھی دوستوں کو جوائن کرلیتا باقی دوست بھی اپنی اپنی دلچسپیوں میں لگے ہوئے تھے۔

اورنگزیب گھومتے گھامتے لان کے نسبتاً سنسان سے گوشے میں آگیا اور قریب سے گزرتی ایک لڑکی کو دیکھ کر اُسے اپنی بہن اہل کی یاد بڑے ہی زوردار طریقے سے آئی یاد میں اتنی شدت تھی کہ وہ خود بڑا حیران تھا اُس کا دل چاہا وہ شادی کی یہ تقریب ویسے ہی ادھوری چھوڑ چھاڑ بس گھر بھاگ جائے اور اہل کو منالے' ابھی وہ انہی سوچوں میں مستغرق تھا کہ جوہی کی باڑ کے پیچھے والی ٹیبل پر بیٹھی لڑکیوں کی ہنسی کی جلترنگ نے اُس کے خیالات کا سلسلہ منقطع کردیا۔ اُس نے بے اختیار ہنسی کے تعاقب میں جو نظریں دوڑائیں تو مبہوت ہی رہ گیا۔

اُس ٹیبل پر پوری سات لڑکیاں بیٹھی تھیں' انتہائی حسین و جمیل لڑکیاں اُن کے لباس یہاں سب سے قیمتی معلوم ہوتے تھے اُن کا ہار سنگھار بھی جدا معلوم ہورہا تھا اورنگزیب جوہی کی باڑ کے اُس طرف اور وہ باڑ کے اِس طرف' بس اتنا ہی فاصلہ تھا۔ وہ جوہی کی جھاڑیوں میں تقریباً چھپا ہوا تھا لان کے اس حصے میں لائٹنگ بھی تھوڑی کم تھی لڑکیاں اپنے آپ میں ہی مگن تھیں ایسا لگ رہا تھا وہ بڑی بے چینی سے کسی کی منتظر ہوں۔ پھر جس کا انتظار تھا وہ آگئی زرد خوبصورت لباس میں ملبوس ایک لڑکی دھیرے دھیرے چلتی لڑکیوں میں آکر شامل ہوگئی تھی۔ وہ سب اس سے بڑی گرمجوشی سے مل رہی تھیں' جیسے مدتوں کے بچھڑے ملتے ہیں چاروں طرف عجیب دلفریب مہک پھیلی ہوئی تھی اورنگزیب نے اُس آنے والی لڑکی کا چہرہ ابھی تک نہیں دیکھا تھا وہ اپنی ہم جولیوں سے مل رہی تھی اِدھر اُدھر ہورہی تھی اور پھر اچانک جیسے اُن سب کے جھرمٹ میں چودھویں کا چاند طلوع ہوگیا تھا۔ وہ کوئی

اور نہیں تھی امل تھی۔

اورنگزیب سن ہو کر رہ گیا تھا' اُس نے بے ساختہ امل کو پکارنا چاہا' مگر اس کا گلا کسی نادیدہ قوت نے جکڑ لیا ہو جیسے' باوجود کوشش کے وہ آواز نہیں نکال سکا' قدم اٹھانے چاہے مگر زمین نے پکڑ لیے وہ جیسے پتھر کا بت بن گیا تھا۔ بس آنکھوں میں جان تھی جو امل کو لحظہ لحظہ تک رہی تھیں۔

ذرا دیر یہ کیفیت برقرار رہی تھی اب اُس کے دوست اُسے ڈھونڈ رہے تھے' کھانا شروع ہو گیا تھا دوست اورنگزیب کو آوازیں لگا رہے تھے' جیسے ہی اُن کی آوازیں قریب آئیں اورنگزیب سحر سے آزاد ہو گیا زمین نے ایک جھٹکے سے پیر چھوڑ دیے' اور آواز بھی وہ ہلنے جلنے کے قابل ہوا تو دیکھا' سب غائب تھا' نہ وہ لڑکیاں تھیں اور نہ امل' جو ہی کی باڑ کے اُس طرف خالی میز پڑی تھی جس پر زرد پھولوں کا ایک گچھا پڑا ہوا تھا۔ اورنگزیب کے دوست اب اس کے سر پر آ چکے تھے اس سے پہلے وہ اُن پھولوں تک پہنچتا' دوست اس کو پکڑ کر لے گئے تھے۔

اورنگزیب کا دل و دماغ اُس کے قابو میں نہیں تھا وہ بزدل لڑکا ہرگز نہیں تھا' مگر جو منظر دیکھا تھا اس میں باقی سب کے قطع نظر اُس کی لاڈلی بہن موجود تھی' باقی سارے دوست اب کھانا لینے چلے گئے تھے وہ اکیلا کھڑا تھا کہ اچانک ایک خیال روشنی کے چھماکے کی طرح اُس کے ذہن میں کوندا تھا اس نے عجلت میں جیب سے اپنا موبائل فون نکال کے ماں کا نمبر ڈائل کیا تھا۔

اُسے نہیں معلوم تھا وہ کیا بات کرنے جا رہا ہے مگر کوئی قوت تھی جو اس وقت اس کے اعصاب کنٹرول کر رہی تھی' تیسری بیل پر اس کی ماں نے فون ریسیو کیا تھا۔

ماں اُس وقت بیٹے کی کال پر بڑی حیران تھی اورنگزیب کا شادی کی تقریب میں جانے کا انہیں معلوم تھا بلکہ فیصل دعوت نامہ اپنی امی کے ساتھ گھر پر دینے آیا تھا۔ وہ سب انوائٹ تھے مگر اُس وقت اس کے ابو شہر سے باہر تھے' دادا دادی لیٹ نائٹ شادیاں اٹینڈ نہیں کر پاتے تھے' سو وہ اکیلا دوست کے ہاں شرکت کرنے چلا آیا تھا۔ اُس وقت ساڑھے گیارہ کا عمل ہو رہا تھا۔

''امی آپ سوئی تو ہرگز نہیں تھی نا؟'' اورنگزیب نے خلاف توقع بہت لگاوٹ سے کہا تھا۔

''میرا مطلب ہے ابو گھر پر نہیں ہیں مجھے دیر ہو جائے گی میں نے سوچا آپ کو فون کر لوں۔''

فائزہ بیگم جہاں کھڑی تھیں وہیں بیٹھ گئیں بیٹے پر حد سے زیادہ پیار آنے لگا تھا۔ جسے ظاہر کیے بغیر وہ بولی تھیں۔

''ہاں سب ٹھیک ہے تم آ جاؤ تو سوؤں گی' ابھی تمہارے ابو سے باتیں کر رہی تھی۔''

''امی اس وقت ابو نے آپ کو کیسے فون کر لیا؟'' اور پھر اپنے اس احمقانہ سوال پر اورنگزیب کو زندگی میں پہلی بار خود پر غصہ آیا تھا۔

''ارے میں نے کہاں کیا' یا انہوں نے مجھے کیا۔'' فائزہ بیگم جھینپ سی گئیں۔

''وہ تو امل نے کوئی فرمائش کی تھی' کوئی پینٹنگ وغیرہ منگوائی تھی' بس اس سلسلے میں بات کرنی تھی اُن کو امل سے دونوں دیر سے باتیں کر رہے تھے' ابھی ابھی تو تمہارے فون آنے سے پانچ منٹ پہلے ہی تو رکھا ہے فون اور دیکھو یہ سو بھی گئی۔ تمہیں تو پتہ ہے تمہارے ابو کہیں جاتے ہیں تو یہ میرے ساتھ سوتی ہے تاکہ مجھے ڈر نہ لگے۔'' یہ کہہ کر فائزہ بیگم نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا تھا۔ دوسری جانب اورنگزیب کے چہرے پر بھی مسکراہٹ کھل اٹھی تھی۔

''ارے یہ کیا باتیں کر رہے ہیں ہم' چلو تم گھر کب تک آ رہے ہو؟'' دوسری طرف سے اورنگزیب نے اپنا پروگرام بتایا تھا۔

''اچھا او کے بیٹا جلدی آؤ۔'' کہہ کر فائزہ بیگم نے فون بند کر دیا تھا۔

ماں سے بات کر کے اورنگزیب نے ایک گہری سانس سینے سے خارج کی تھی۔ ایسا لگا تھا جیسے منوں ٹنوں بوجھ اُس کے ذہن سے فضا میں تحلیل ہو گیا ہو۔ وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔

ماں نے امل اور ابو کی گفتگو کا ٹائم بالکل وہی بتایا تھا جب اورنگزیب اپنی زندگی کے ایک تحیر آمیز مطر سے گزر رہا تھا' یا مطر اس کے سامنے سے گزر رہا تھا۔

دوستوں کی خاطر دو چار لقمے زہر مار کر کے وہ دوبارہ دوڑتا ہوا اُسی نیم تاریک جوہی کے گوشے کی طرف گیا۔

مگر زرد پھولوں کا گچھا اب اُسے کہیں نظر نہیں آیا' اس نے بہت غور سے اچھی طرح ٹیبل کلاتھ ہٹا کر آگے پیچھے اوپر نیچے دیکھا کہ اگر کوئی اُٹھا کر لے بھی گیا ہو تو' کچھ پتیاں تو ضرور گری ہوئی ہوں گی۔ مگر وہاں کسی پتی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ ابھی وہ یہ سب کر ہی رہا تھا۔ فیصل پھر اس کو ڈھونڈتا ہوا آ گیا تھا۔

''تو بار بار یہاں کیا لینے آ رہا ہے؟'' فیصل نے معنی خیز انداز میں آنکھ دبائی تھی۔

''وہ یار کچھ نہیں والٹ گر گیا تھا میرا' یہاں ڈھونڈا یہ مل گیا۔'' اورنگزیب نے بروقت معقول بہانہ گھڑ لیا تھا۔

''اچھا فیصل میں اب چلتا ہوں ابو گھر پر نہیں ہیں امی نے جلد بلا لیا ہے۔'' اورنگزیب کی یہ بات سن کر فیصل ہونقوں کی طرح اورنگزیب کی شکل دیکھتا رہا' اور پھر ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گیا۔

''کاش میرے بھائی کی شادی کچھ سال پہلے ہو جاتی۔''

''کیا مطلب؟'' اورنگزیب نے بے محل بات پر حیرت کا اظہار کیا۔

''ابے تو میرے بھائی کی شادی میں ہی تو بڑا ہوا ہے تو اپنی فطرت کے برعکس ایک ذمے دار اور فرمانبردار بیٹے ہونے کا اظہار جو کر رہا ہے۔''

اورنگزیب کے اُس بدلتے ہوئے رنگ کے پیچھے ایسا کیا رونما ہوا تھا۔ وہ فیصل تو کیا کوئی بھی نہیں جان سکا۔

اورنگزیب کا دماغ دوسری ڈگر پر چل نکلا تھا' لمحے کے ہزارویں حصے میں انسانی قلوب میں کیا کیا انقلابات برپا ہو سکتے ہیں یہ بات وہ کتابوں سے بھی جان نہیں پایا تھا ایک وہ اورنگزیب تھا جسے گھر والے دوست احباب اساتذہ سب جانتے تھے اور اب یہاں سے وہ جا رہا تھا' جسے کوئی نہیں جانتا تھا۔

اورنگزیب کی گھر واپسی چند دوستوں کے ساتھ ہو رہی تھی وہ پورے راستے خاموش رہا تھا۔ یہاں تک کہ اُس کے گھر کا دروازہ آ گیا تھا مگر وہ سوچوں میں ہی گم بیٹھا تھا۔

''جاگو بھئی جاگو۔'' اس کے دوست وقار نے آواز لگائی تھی۔

''ہاں کیا ہوا؟'' وہ یک لخت جیسے ہوش میں آ گیا۔

''یار گھر آ گیا ہے تمہارا..... اب اترو بھی۔''

''اوہ..... اچھا او کے بائے ..... اللہ حافظ۔'' کہتا ہوا وہ گاڑی سے اترا تھا۔

اوپر ٹیرس پر فائزہ بیگم کھڑی تھیں۔ اورنگزیب کے پاس صدر دروازے کی چابی تھی وہ دروازہ کھول کر اندر آیا صحن عبور کرتے ہوئے جب وہ املتاس کے نیچے سے گزرا تو ایک زرد پھولوں کا گچھا اس پر ایسے آن گرا جیسے کسی نے بہت نشانہ باندھ کر مارا ہو۔ اورنگزیب چونک اٹھا زرد پھولوں کا گچھا زمین پر اس کے قدموں میں پڑا تھا۔ وہ ہزاروں میں پہچان سکتا تھا کہ یہ جوہی کے تاریک گوشے میں چھوڑے جانے والا زرد پھولوں کا گچھا ہے۔ وہ املتاس کے زرد پھول تھے۔

فائزہ بیگم جب تک نیچے آئیں' وہ آنگن کراس کر چکا تھا کیونکہ بہت رات ہو چکی تھی فائزہ بیگم نے اسے سونے کی ہدایت کی اور کمرے میں چلی گئیں۔ اورنگزیب نے بس گردن ہلا کر اُن کی بات کا جواب دیا' وہ کمرے میں جا کر دروازہ بند کر کے ابھی پلٹا ہی تھا کہ اُس کے سارے جسم میں ایک سرد لہر نے ڈیرہ ڈال لیا تھا۔ سامنے ڈریسنگ پر زرد پھولوں کے گچھے جا بجا رکھے ہوئے تھے۔

زرد پھولوں کے ترتیب وار باندھے گئے چھوٹے چھوٹے گچھے..... املتاس کے پھول تھے وہ.....

اِس نہایت ہی منفرد' دلچسپ پُراسرار ناول کی دوسری قسط کے لیے آئندہ ماہ نومبر کا انتظار کیجیے

روح کہانی

حفیظ ہوشیارپوری کا خیال

اے وسعت کائنات فرما
میں کون ہوں، کب سے ہوں کہاں ہوں
بے منت قصے خواں و راوی
میں آج بھی اپنا ترجمان ہوں

سلیم اختر

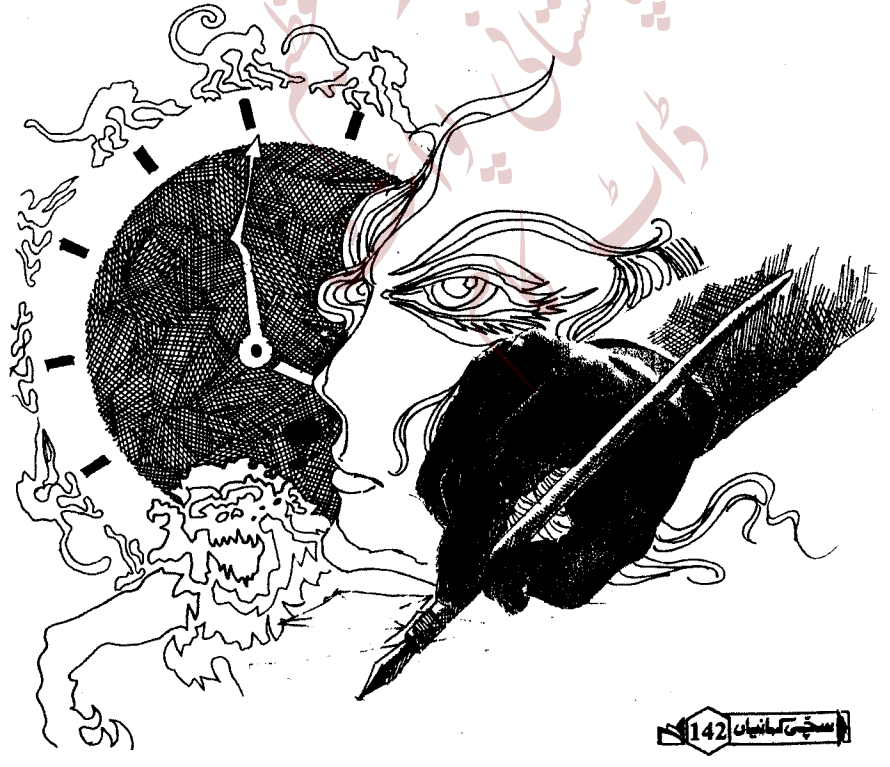

سنسکرت کی مشہور زمانہ تصنیف 'پرہت کتھا سرت ساگر' کے مصنف کا نام 'گناڈھیائے' تھا۔ اس کا زمانہ تصنیف 200ء سے 500ء کا درمیانی دور تھا۔ گناڈھیائے کے حالات زندگی جواب تک معلوم ہوئے ہیں۔ وہ غیر معتبر ہیں' کہتے ہیں کہ اس نے ہندو دیومالائی کہانیوں کو سات لاکھ اشعار میں بیان کر دیا تھا۔ جب مہاراجہ نے انہیں پسند نہیں کیا تو اس نے اپنی منظوم کہانیوں کے ایک ایک لفظ کو جنگلی پرندوں اور جانوروں کو سنا کر نذر آتش کر دیا اور خود بھی مر گیا۔

زیر نظر دس کہانیاں اسی کتاب سے لی گئی ہیں۔ یہ کہانیاں کیسی ہیں ان کی قدر و قیمت کا اندازہ قارئین خود لگالیں گے۔ لیکن یہ بتانا ضروری ہے کہ ان کہانیوں نے تمام دنیا کو متاثر کیا ہے۔ 'سرکسی کا دھڑکسی کا' پر یورپ کے عظیم ناول نگار تھامس جیفرسن 'Die Vertauscten Kaffe' نامی ناول لکھ ڈالا تھا۔ اسی بنیاد پر امریکہ کے ایکواویرا نے 'Liberetio Of American Capital' کے نام سے پیش کیا۔ 'نزاکت' نامی کہانی ایشیا سے ہوتی ہوئی سائبیریا' لیپ لینڈ اور جٹ لینڈ پہنچی' جہاں اس کے پلاٹ پر ھنس اینڈرسن 'Princess Of The Pea' نامی کلاسیکل ناول لکھا۔

ان کہانیوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان سے عوام اور خواص یکساں متاثر ہوئے ہیں۔ ان کو براہ راست سنسکرت سے اردو میں منتقل کیا ہے۔ ان میں عقل و دانش کے ساتھ ہندوستان کا پہیلیوں جیسا تمدن اور اندازِ فکر بھی موجود ہے۔ انہیں پڑھ کر حیرت اور ہنسی ایک ساتھ غلبہ کریں گے اور یہ دونوں ہی باتیں ہندو دیومالائی دماغ اور تمدن کی جان ہیں۔

آغاز

دریائے گودروری کے کنارے واقع پرتیش تھانا پر کسی زمانے میں مشہور ہندو راجا تری وکرم سین کی حکومت تھی۔ جو طاقت اور جاہ و جلال کے اعتبار سے راجا اندر سے کسی طرح کم نہ تھا۔ مشہور ہے کہ وہ راجا جب دربار میں بیٹھا حکومت کے امور سے متعلق فیصلے کر رہا ہوتا تھا تو ایک سادھو جس کا نام شانتی مل تھا اس کے پاس آتا اور ایک پھل بطور نذرانہ اسے دے کر چلا جاتا۔ راجا وہ پھل سادھو سے لے کر وزیر مال کے حوالے کر دیتا..... یہ سلسلہ دس سال تک جاری رہا۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ راجا نے وہ پھل لے کر ایک بندر کے آگے ڈال دیا۔ بندر نے اسے کھانا شروع کر دیا۔ راجا اور درباریوں کی حیرت کی اس وقت کوئی انتہا نہ رہی جب انہوں نے دیکھا کہ پھل کے اندر ایک نہایت قیمتی اور اصلی موتی جگمگا رہا تھا۔ راجا نے وہ موتی اٹھالیا اور وزیر کو بلا کر اس سے پوچھا کہ ہم اس سے پہلے جو پھل تمہیں دیتے تھے اُن کا تم نے کیا کیا؟

''مہاراج! میں انہیں مال خانے میں ڈال دیتا تھا۔ اگر حکم ہو تو مال خانہ کھلوا کر اُن کا پتا لگواؤں۔''

وزیر نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

راجا کی اجازت پا کر وزیر دربار سے چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد اس کی بارگاہ میں حاضر ہو کر عرض کی۔

''مہاراج! مجھے مال خانے میں پھل تو نظر نہیں آئے کیونکہ وہ تو گل سڑ بھی چکے ہوں گے۔ لیکن قیمتی اور نایاب موتیوں کا ذخیرہ البتہ مال خانے میں موجود ہے۔''

راجا نے وزیر کی ایمانداری سے خوش ہو کر تمام خزانہ اُسے بخش دیا۔ اگلے دن پھر جب بوڑھا سادھو راجا کی خدمت میں حاضر ہوا تو راجا نے اس سے کہا۔

''مہاراج بھگوان کی کرپا سے میرے پاس سب کچھ موجود ہے۔ پھر آپ اتنے قیمتی جواہر نذرانے کے طور پر کیوں پیش کرتے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ اگر آج آپ نے اس کا سبب مجھے نہ بتایا تو میں یہ نذرانہ قبول نہیں کروں گا۔''

سادھو کی آنکھوں میں ایک چمک دکھائی دی اور پھر معدوم ہو گئی۔ اس نے راجا کو ایک طرف لے جا کر

کہا۔

''اے مہاراجہ! دراصل مجھے ایک خاص قسم کے جاپ کو مکمل کرنے کے لیے مدد کی ضرورت ہے اور میرا مددگار آپ جیسا بہادر نڈر اور ایماندار شخص ہی ہوسکتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ مجھے مایوس نہیں کریں گے۔'' راجا نے چند لمحے توقف کیا اور پھر سادھو سے مدد کا وعدہ کرلیا۔

''مجھے خوشی ہے کہ ایک بہادر اور مہان راجا نے میری مدد کا وعدہ کیا ہے۔ اے راجا! مہینے کی آخری تاریخ کو جب چاند ڈوب چکا ہو۔ رات کے پچھلے پہر مجھ سے شمشان بھومی میں ملنا۔ میں آپ کا انتظار کروں گا۔''

مقررہ تاریخ اور وقت پر جب راجا گہرے سیاہ لباس میں ملبوس ہاتھ میں تلوار لیے پہرہ داروں کی نظروں سے بچتا بچاتا ہوا محل سے باہر نکلا اور تاریکی کی گہری چادر میں لپٹی ہوئی دہشت ناک فضا سے گزرتا ہوا شمشان بھومی میں داخل ہوا تو چاروں طرف چتائیں جل رہی تھیں اور شعلے اپنی خوفناک زبانیں ہوا میں لہرا رہے تھے' ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لاتعداد چڑیلیں اور بھوت ایک جگہ جمع ہوکر کسی وحشیانہ رقص میں محو ہوں۔ راجا بے شمار ہڈیوں اور ڈھانچوں پر قدم رکھتا ہوا بڑھتا رہا۔ ہڈیوں کے چٹخنے کی آوازیں ہوا کی سنسناہٹ شعلوں کا رقص' مردہ ڈھانچوں کا آگ سے اکڑ کر کھڑے ہوجانا۔ تیل گھی اور انسانی گوشت کے جلنے کی ملی جلی بدبو نے وہاں کے ماحول کو جہنمی ماحول بنادیا تھا۔ لیکن بہادر راجا بڑے تحمل سے آگے بڑھتا رہا۔ اور اس نے مرگھٹ کو پار کرلیا تو سامنے ہی اسے سادھو دکھائی دیا جو ایک درخت کے نیچے ایک حلقہ کھینچ رہا تھا۔ جس کے اندر بیٹھ کر اسے جاپ کرنا تھا۔

''سادھو مہاراج! میں حاضر ہوں' بتائیں میں آپ کی کیا خدمت کروں؟'' مہاراجہ نے قریب جاکر سادھو سے کہا۔

''اے بہادر راجہ میں تیری اس عنایت کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ یہاں سے جنوب کی جانب کچھ فاصلے پر شیشم کے ایک درخت پر ایک شخص کی لاش لٹکی ہوئی ہے۔ جا اور وہ لاش مجھے لادے۔'' سادھو نے کہا۔

قول کا پکا اور مضبوط ارادے کا مالک راجا فوراً ہی جنوب کی جانب چل دیا۔ رات گو تاریک تھی۔ لیکن جلتی ہوئی چتاؤں کی روشنی نے اس کی مدد کی اور آخر کار وہ مطلوبہ درخت تک پہنچ گیا۔ لاش درخت پر ٹنگی ہوئی تھی' لیکن اس کا تمام گوشت جل کر سیاہ پڑ چکا تھا اور لاش بجائے خود رات کی تاریکی کا ایک حصہ دکھائی دیتی تھی۔ راجا نے درخت پر چڑھ کر رسی کو کاٹ دیا تو لاش زمین پر آگری۔ اس کے ساتھ ہی راجا کو ایک چیخ سنائی دی جیسے کوئی درد سے بلبلا رہا ہو۔ راجا درخت سے اترا اور یہ سوچ کر کہ ممکن ہے یہ شخص ابھی زندہ ہو۔ نہایت نرمی سے اس کے جسم کو چھوا تو اسے ایک بہت ہی ہیبت ناک شیطانی قہقہہ سنائی دیا۔ راجا سمجھ گیا کہ اس پر کسی بدروح کا قبضہ ہے۔

''تم ہنس کیوں رہے ہو؟ آؤ چلیں۔'' راجا کے انداز میں بے خوفی تھی لیکن جیسے ہی اس نے یہ الفاظ ادا کیے اس کی حیرت کی کوئی حد نہ رہی۔ جب اس نے لاش کو اپنے سامنے سے غائب پایا' نظر اُٹھا کر اوپر دیکھا تو پتہ چلا کہ وہ پھر درخت پر اسی طرح لٹکی ہوئی ہے۔ راجا پھر سے درخت پر چڑھا اور لاش کو اُتار کر کندھے پر رکھ کر سادھو کی جانب روانہ ہوا۔ سچ ہے کہ بہادر آدمی کے ارادے کی پختگی ہیرے کی سختی سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ راستے میں لاش پر قابض روح نے راجا سے کہا۔

''اے مہان راجا! میں تجھے ایک کہانی سناتی ہوں' تاکہ تیرے سفر کی صعوبت میں کچھ کمی آجائے۔'' یہ کہہ کر اس نے دلچسپ کہانی شروع کی۔

☆.....☆.....☆

شادی کا حقدار کون؟

کالی ندی کے کنارے آباد برہمنوں کے ایک گاؤں میں وید کا ایک بہت بڑا عالم رہتا تھا جس کا نام کیشو سوامی تھا۔ اس کی ایک بیٹی تھی' جس کا حسن بے نظیر تھا اس کا نام مندراوتی تھا۔ جب وہ لڑکی شادی کے قابل ہوئی تو کنیا کے لیے تین بڑے قابل

خوبصورت اور حسین نوجوان برہمن اس کی امیدواری میں آئے۔ عالم یہ تھا کہ ان میں سے ہر ایک نے لڑکی کے باپ کو دھمکی دی کہ اگر حسین مندراوتی کسی اور کے ساتھ بیاہی گئی تو وہ خودکشی کر لے گا۔ اور اس ڈر سے کنیا کی کسی ایک سے شادی باقی دو برہمنوں کی موت پر منتج ہوگی' جو بہت بڑا پاپ تھا۔

لڑکی کے باپ نے اس کی شادی کسی سے بھی نہ کی اور وہ حسین و جمیل لڑکی کنواری ہی رہی۔ تینوں امیدواروں نے اُسی گاؤں میں رہائش اختیار کر لی۔ اور اب وہ تینوں لڑکی کے چاند جیسے چہرے کو تکتے ہوئے زندگی کے دن گزارنے لگے۔

آخر کار ایک روز مندراوتی اس دنیا سے چلی گئی۔ تینوں جوان کریا کرم کے لیے لڑکی کی لاش کو شمشان بھومی میں لائے اور اسے نذر آتش کر دیا۔ اُن میں سے ایک نے مرگھٹ میں لڑکی کی راکھ پر ہی رہائش اختیار کر لی اور بھیک مانگ کر پیٹ بھرنے لگا۔ دوسرے برہمن نے لڑکی کی جلی ہوئی ہڈیوں کو جمع کیا اور انہیں گنگا میں بہانے چلا گیا۔ جبکہ تیسرا برہمن سادھو بن گیا اور ایک اَن دیکھی منزل کے سفر پر نکل گیا۔ وہ جب ایک گاؤں میں پہنچا تو ایک اور برہمن نے اسے اپنا مہمان بنالیا' گھر کے سب لوگوں کے ساتھ جب وہ سادھو کھانے پر بیٹھا تو میزبان کا بچہ رونے لگا۔ ماں نے پہلے تو اسے پیار سے چپ کرانے کی کوشش کی اور جب وہ چپ نہ ہوا تو اس نے اُسے آگ کی بھٹی میں پھینک دیا بچہ جل کر کباب ہوگیا۔ رونگٹے کھڑے کر دینے والے اس منظر کو دیکھ کر سادھو کو بہت صدمہ ہوا۔ اور اس نے میزبان کی دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اٹھ کر کھڑا ہوگیا' لیکن میزبان نے بڑی لجاجت اور خوشامد سے اُسے روکا اور کہا۔

''وہ جادو کے زور پر ابھی بچے کو زندہ کر دے گا۔'' یہ کہہ کر اس نے مٹھی بھر مٹی پر ایک منتر پڑھا۔ جو ایک کتاب کے صفحے پر لکھا ہوا تھا اور مٹی کو آگ میں پھینک دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بچہ ہنستا کھیلتا آگ سے باہر نکل آیا۔

یہ دیکھ کر سادھو کو طمانیت محسوس ہوئی اور وہ کھانا کھانے لگا۔ میزبان نے منتر والی وہ کتاب دیوار کی ایک طاق پر رکھ دی۔ رات کو جب تمام گھر سو چکا تھا۔ تو سادھو اُس منتر والی کتاب کو لے کر بھاگ گیا۔ اور واپس آ کر باقی دو ساتھیوں سے آملا' اُس نے پہلے مندراوتی کی راکھ پر بنی برہمن کی جھونپڑی کو دوسرے برہمن کی مدد سے توڑا اور مٹھی بھر خاک پر منتر پڑھا اور اسے لڑکی کی راکھ پر پھینک دیا۔

فوراً ہی مندراوتی اٹھ کھڑی ہوئی' اور حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کا حسن جلنے کے بعد اور بھی نکھر گیا تھا۔ اب تینوں برہمنوں میں جھگڑا شروع ہوگیا کہ لڑکی سے شادی کا حق دار زیادہ کون ہے؟

ایک نے کہا..... ''یہ میرے منتر سے زندہ ہوئی ہے۔ اس لیے یہ میری ہے۔''

دوسرے نے کہا..... ''واہ یہ تو گنگا جل کی برکت سے زندہ ہوئی ہے۔ اس پر میرا حق ہے۔''

تیسرے نے کہا..... ''نہیں میں نے اس کی راکھ کی حفاظت کی ہے اس لیے میری ہے۔''

اتنا کہہ کر روح نے چند لمحے توقف کیا اور پھر راجا سے مخاطب ہوئی۔

''بتا اے راجا! تیرا کیا خیال ہے۔ لڑکی سے شادی کا حق دار سب سے زیادہ کون ہے؟ مگر یاد رکھ اگر تو جواب سے واقف ہے اور بتانے سے گریز کرے گا تو تیرا سر پاش پاش ہو جائے گا۔''

راجا نے جواب دیا۔

''وہ برہمن جس نے اپنے منتر کے زور سے لڑکی کو زندگی دی باپ کی حیثیت رکھتا ہے۔ لہٰذا وہ اس کا شوہر نہیں بن سکتا' جس نے لڑکی کی ہڈیوں کو گنگا میں بہایا وہ بیٹے کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ ہندو دھرم میں یہ کام دوسروں کی بہ نسبت بیٹوں کا زیادہ فرض ہوتا ہے' البتہ وہ برہمن جس نے مرگھٹ میں رہائش اختیار کر کے دنیا چھوڑ دی اور لڑکی کی راکھ کی حفاظت کی۔ اس کا شوہر بن سکتا ہے۔''

راجا کے اس جواب کو سن کر روح راجا کے کندھے پر لدی ہوئی لاش کے ساتھ غائب ہوگئی مگر

راجا پھر شیشم کے درخت تلے واپس آیا اور اس نے لاش کو پھر ویسا ہی ٹنگا ہوا پایا' ایک مرتبہ پھر راجا اوپر چڑھا اور لاش کو درخت پر سے اُتارا اور اسے کندھے پر لاد کر پھر منزل کی طرف چل دیا۔ لیکن روح نے راجا کو پھر ایک کہانی سنائی۔

☆☆.....☆☆

سر کسی کا دھڑ کسی کا

قدیم زمانے میں ایک راجا تھا۔ جس کا نام ساکیتو تھا۔ اُس کا محل شہر شوبھاوتی میں واقع تھا۔ جہاں سفید دیوی کا ایک مندر بھی تھا۔ اس مندر کے جنوبی حصے میں ایک خوبصورت تالاب تھا۔ جسے دیویوں کا تالاب کہا جاتا تھا۔ ہر سال اشدہ کے مہینے کی چودھویں تاریخ کو ہندوستان کے چپے چپے سے لوگ یہاں میلہ دیکھنے آتے اور اس تالاب میں نہا کر گناہوں کو دھوتے تھے۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ایک نوجوان دھوبی جس کا نام دھولا تھا۔ اس تالاب میں نہانے کے لیے آیا۔ یہاں اس کی نظر گاؤں کے ایک اور دھوبی سدھابت کی نوجوان حسین لڑکی مون سُندری پر پڑی اور وہ اس پر سو جان سے فریفتہ ہوگیا۔ وہ جب گھر واپس آیا تو اپنے حواس کھو بیٹھا کیونکہ محبوب سے جدائی کا تجربہ اس کے لیے بالکل نیا تھا۔ اس کی ماں نے جب بیٹے کی یہ حالت دیکھی تو اس نے اس سے سبب دیافت کیا اور بیٹے نے ساری کتھا اُسے سنا دی۔ اس نے ساری بات اپنے شوہر وملائل کو بتادی۔ وملائل نے بیٹے کو دلاسہ دیا اور کہا۔

''سدھابت! ہماری برادری کا ایک فرد ہے۔ کوئی بات نہیں اگر اس کی لڑکی ہم تمہارے لیے مانگیں گے تو وہ انکار نہیں کرے گا۔ وہ ہمیں جانتا ہے اور ہم اسے جانتے ہیں۔ وہ بہت شریف آدمی ہے۔ تو فکر نہ کر بھگوان بھلا کریں گے۔''

اگلے دن وملائل اپنے بیٹے دھولا کو ساتھ لے کر سدھابت سے ملنے شوبھاوتی جا پہنچا اور اس سے اپنے بیٹے کے لیے مون سُندری کا رشتہ مانگا۔ اُس نے ہاں کردی اور تیسرے دن ہی لگن منڈپ کے پھیرے ہوئے اور مون سُندری دھولا سے بیاہ دی گئی اور یوں یہ جوڑی ہنسی خوشی زندگی گزارنے لگی۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ سُندری کا بھائی اس کے گھر آیا اور اُس نے کہا۔

''بہن سُندری تمہیں اور بھائی جی کو پتا جی نے بلایا ہے۔''

دھولا نے اپنے سالے کو روک کر چند دن اس کی خاطر مدارت کی اور پھر اس کے ساتھ سُندری کو لے کر سسرال روانہ ہوگیا' وہ تینوں جب سفید دیوی کے مندر کے قریب سے گزرے تو دھولا نے خواہش ظاہر کی کہ وہ مندر میں جاکر پوجا پاٹ کرنا چاہتا ہے۔ لیکن سالے نے اس کی مخالفت کی اور کہا۔

''مندر میں خالی ہاتھ نہیں جانا چاہیے۔'' مگر دھولا نہ مانا اور مندر میں داخل ہوگیا۔ وہ دیوی کے سامنے منہ کے بل گر گیا اور اشلوک پڑھنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا اس عظیم دیوی نے اپنے اٹھارہ طاقت ور بازوؤں سے راکھشس رورو کو کس بری طرح شکست دی ہے اور کس طرح اُس نے مہیش کو اپنے خوبصورت اور نرم و نازک پیروں تلے روندا تھا۔ ان خیالات کے ساتھ ہی اب اُس نے سوچا کہ اس عظیم دیوی کی خوشنودی کے لیے لوگ ہر قسم کی قربانیاں دیتے ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ میں خود اپنی قربانی اپنے ہاتھ سے پیش کر کے امر ہوجاؤں۔'' یہ سوچ کر دھولا اندر گیا۔ وہاں ایک تلوار رکھی ہوئی تھی اور وہ اُسے اٹھا لایا اور اس سے اپنا سر قلم کر دیا اور وہ زمین پر گر کر ٹھنڈا ہوگیا۔

اُدھر سُندری اور اس کا بھائی دونوں دھولا کا انتظار کر رہے تھے۔ جب وہ خاصی دیر ہونے کے بعد بھی واپس نہ آیا تو سُندری کا بھائی حقیقت حال جاننے کے لیے مندر میں داخل ہوا۔ اور جب اس نے اپنے بہنوئی کو خاک و خون میں یوں لت پت دیکھا تو عالم تصور میں اسے اپنی پیاری بہن کا سہاگ اجڑا ہوا دکھائی دیا۔ پھر اس نے سوچا۔ جب بہن ہی دکھی رہے گی تو اس کا اپنا زندہ رہنا بیکار ہے۔ اُسی تلوار سے اس

نے بھی دیوی کی مورتی کے سامنے اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالا۔ تھوڑی دیر بعد سُندری مندر میں داخل ہوئی تو اس نے شوہر اور بھائی کو نہایت صبر و تحمل سے دیکھا اور ہاتھ جوڑ کر دیوی کی مورتی کے سامنے کھڑی ہوگئی اور کہنے لگی۔

''اے دیالو دیوی! میرے بھاگ اتنے بڑے کہاں تھے کہ میں تیرے حضور اتنی بڑی بھینٹ چڑھا سکتی یہ سب کچھ تیرا ہے اور تیرے لیے ہے۔ اپنے پیارے شوہر اور بھائی کی لاشوں کو دیکھ کر میرا سر فخر سے اونچا ہوگیا ہے۔ کاش میں تیرے کسی کام آسکتی۔ اب میری ایک تمنا ہے اور وہ یہ ہے کہ تو میری بھی قربانی قبول کر، مگر اگلے جنم میں، میں جس شکل میں بھی پیدا ہوں۔ میرا شوہر مجھے میرے شوہر کی حیثیت سے اور میرا بھائی مجھے بھائی کی حیثیت سے ملے۔'' یہ کہہ کر سندری نے تلوار اٹھائی اور قبل اس کے کہ وہ اپنی گردن کو جدا کرسکتی، مندر کی عمارت ایک شیریں آواز سے گنگنا اٹھی۔

''لڑکی..... ہم تیرے تدبر، تحمل اور جذبہ ایثار سے خوش ہیں۔ اٹھ اور دونوں گردنوں کو اُن کے دھڑوں سے جوڑ دے۔ یہ زندہ ہوجائیں گے۔ جا دیوتاؤں کی برکتیں تیرے ساتھ ہیں۔''

یہ سن کر سندری کا چہرہ کنول کے پھول کی طرح کھل اٹھا۔ اس نے دیوی کی ہدایات پر عمل کیا تو وہ دونوں انسان زندہ ہوگئے۔ لیکن جب وہ تینوں باہر نکلے تو یہ دیکھ کر سندری پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا کہ اس نے اپنے بھائی کی گردن شوہر کے دھڑ پر اور شوہر کی گردن بھائی کے دھڑ پر رکھ دی ہے۔

کہانی سنا کر روح خاموش ہوگئی۔ چند لمحوں بعد وہ پھر راجا سے مخاطب ہوئی۔

''ہاں تو راجا بتا کہ سندری اُن میں سے کس کو اپنا شوہر کہے اور کس کو اپنا بھائی..... مگر یاد رکھ تو اگر جواب سے واقف ہے اور بتانے سے گریز کرتا ہے تو تیرا سر پاش پاش ہوجائے۔'' راجا نے یہ دلچسپ کہانی غور سے سنی اور جواب دیا۔

''جس دھڑ پر سندری کے شوہر کا سر لگا ہوا ہے وہ جسم سندری کا شوہر ہے اور جس دھڑ پر اس کے بھائی کا سر ہے وہ اس کا بھائی ہے کیونکہ کھوپڑی میں دماغ ہوتا ہے اور دماغ جسم کا بادشاہ ہے اور اس کی مدد ہی سے جسم کو پہچانا جاتا ہے۔''

راجا یہ کہہ کر خاموش ہوگیا۔ روح نہایت خاموشی سے اس کے کندھے سے ہٹ گئی اور راجا کو پھر شیشم کے درخت تلے جانا پڑا۔ سچ تو یہ ہے کہ راجا یہ دلچسپ کہانیاں سن کر اتنی محنت شاقہ صعوبت کو بھی بھول گیا تھا اور دوسری طرف اسے سادھو سے کیا ہوا وعدہ پورا کرنا تھا لہٰذا وہ ہر قیمت پر لاش کو سادھو تک پہنچانا چاہتا تھا۔ چنانچہ حسب سابق ایک بار پھر وہ لاش کو درخت پر سے اُتار کر لایا اور اب اس نے روح سے جو کہانی سنی وہ یوں تھی۔

نزاکت

انگا کے قریب برہمنوں کی ایک بہت بڑی آبادی ہے جسے ورکشا گھاٹ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہاں کسی زمانے میں ایک امیر و کبیر برہمن رہا کرتا تھا، جس کا نام وشنوسوای تھا، وہ دیوتاؤں کو بڑی باقاعدگی سے بھینٹ دیا کرتا تھا۔ اس کے تین بیٹے تھے۔ وہ تینوں بڑے فلسفیانہ خیالات کے حامل تھے۔ ایک دن باپ نے اُن سے کہا۔

''بیٹا مجھے دیوتاؤں سے مانی ہوئی ایک منت پوری کرنی ہے۔ تم جاؤ اور دریا سے ایک مگرمچھ پکڑ کر لاؤ۔'' چنانچہ تینوں بھائی دریا پر آئے اور انہیں ایک مگرمچھ مل گیا۔ سب سے بڑے بھائی نے اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں سے کہا۔

''دیکھو تم دونوں مگرمچھ اٹھا کر گھر لے چلو، میں اسے نہیں اٹھاؤں گا چھی چھی مجھے تو اس غلیظ شے سے گھن آتی ہے۔''

دونوں بھائیوں نے یک زبان ہوکر ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''واہ جب آپ اسے نہیں اٹھا سکتے تو ہم کیوں اٹھائیں۔''

''لیکن میں کہتا ہوں کہ تمہیں اسے لے جانا

پڑے گا ورنہ کوئی ایسی ویسی بات ہوگئی تو ذمے دار تم دونوں ہو گے اور تم دونوں کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔'' بڑے بھائی نے غصے سے کہا۔

دونوں بھائی ہنس پڑے۔

''خوب یعنی آپ ہمارا فرض تو ہمیں یاد دلا رہے ہیں اور خود اپنا فرض یاد نہیں ہے۔''

''مگر تم دونوں یہ تو سوچو کہ میں کھانوں کے معاملے میں بھی کتنا نفاست پسند واقع ہوا ہوں کہ کسی ایسی شے کو جس سے مجھے ذرا سی بھی گھن محسوس ہوتی ہو' میں چھونا تک گوارہ نہیں کرتا ہوں۔''

''اس لحاظ سے تو میں عورتوں کے معاملے میں بڑا نفاست پسند واقع ہوا ہوں۔'' منجھلے بھائی نے جواب دیا۔

''تو پھر چھوٹے بھائی کو مگر مچھ گھر لے جانا چاہیے۔'' بڑے بھائی نے فیصلہ سنا دیا۔

''ارے جاؤ جاؤ میں بستر کے معاملے میں تم دونوں سے زیادہ نفاست پسند واقع ہوا ہوں۔ بھلا میں اسے کیوں لے کر جاؤں۔'' چھوٹے بھائی نے جواب دیا۔

تینوں بھائی لڑنے لگے اور آخر کار غصہ میں بے قابو ہوتے ہوئے قریبی ضلع کے حاکم کے پاس پہنچے اور اسے سارا واقعہ کہہ سنایا اور اس سے مدد طلب کی۔

''اچھا تو تم تینوں میرے پاس ٹھہرو میں تم تینوں کا امتحان لیتا ہوں اس کے بعد فیصلہ کروں گا کہ کیا کرنا چاہیے۔'' حاکم نے جواب دیا۔ پھر تینوں کو حاکم کے مہمان خانے میں پہنچا دیا گیا۔ جب کھانے کا وقت ہوا تو حاکم نے تینوں بھائیوں کو ایک مناسب جگہ پر بٹھا دیا اور حکم دیا کہ بہترین طریقے سے تیار کیا ہوا کھانا جو چھ خوشبوؤں سے معطر ہو ان تینوں بھائیوں کو کھلایا جائے۔ جب کھانا سامنے آیا تو تینوں بھائیوں میں سے ایک نے ناک پر انگلی رکھ کر اسے سونگھنا شروع کر دیا' یہ وہی نوجوان تھا جس نے اپنے آپ کو کھانوں کے بارے میں نفاست پسند بتایا تھا۔

''کھانا کھاؤ کیا بات ہے چاول تو بڑے لذیر بنے ہیں۔'' حاکم نے نہایت نرمی سے لڑکے کو کہا۔

''بات یہ ہے جناب عالی کہ اس کھانے میں مجھے جلی ہوئی لاشوں کی بُو آ رہی ہے واقعی یہ بہت لذیذ ہے مگر افسوس کہ میں انہیں کھا نہیں سکتا۔'' لڑکے نے جواب دیا۔

حاکم کے دسترخوان پر موجود تمام لوگوں نے پلیٹ کو کئی کئی بار سونگھا لیکن کسی کو بھی بدبو کا احساس نہ ہوا۔ لڑکے نے اب ناک پر کپڑا باندھ لیا تھا اور وہ کسی قیمت پر کھانا کھانے پر راضی نہ تھا۔ چنانچہ حاکم نے تحقیق کرائی تو پتہ چلا کہ جس زمین پر چاول کی فصل بوئی گئی تھی وہ کسی زمانے میں مرگھٹ کے طور پر استعمال ہوتی تھی' حاکم کو لڑکے کے نفاست پسند ہونے کے دعوے کو تسلیم کرنا پڑا تو اس نے لڑکے کو کچھ اور چیزیں کھانے کی اجازت دے دی۔ کھانے کے بعد تینوں بھائیوں کو شاہی مہمان خانے میں الگ الگ کمروں میں بھیج دیا گیا۔

رات کے پچھلے پہر حاکم نے اپنے حرم کی انتہائی خوبصورت نوجوان لڑکی کو سجا بنا کر اس دوسرے لڑکے کے کمرے میں روانہ کر دیا جو اپنے دعوے کے مطابق عورتوں کے معاملے میں بڑا نفاست پسند واقع ہوا تھا۔

چاند سا دمکتا ہوا چہرہ سرخ رخسار' گلابی ہونٹ گہرے سیاہ لانبے بال' پتلی پتلی انگلیاں' نازک کلائیاں' عشق پیچاں کی طرح بل کھاتی کمر' اس کے اندر ایک گداز تھا۔ اس کی آنکھیں کسی گہری جھیل کی مانند تھیں۔ غرض یہ کہ اس کے حسن جہاں سوز کو بیان کرنا زبان کی طاقت سے باہر ہے' جب وہ معطر دوشیزہ کمرے میں داخل ہوئی تو اس کے حسن کی چمک دمک سے کمرے کی تاریکی روشنی میں بدل گئی لیکن نوجوان برہمن نے اسے دیکھ کر اپنی ناک پر ہاتھ رکھ لیا اور چیخنے لگا۔

''اوہ اسے یہاں سے نکالو' میں مرا..... ہائے میں مرا اس میں سے بکری کی سی سڑاند آ رہی ہے۔''

حاکم کے خدمت گار جو اس لڑکی کو برہمن کے کمرے میں لائے تھے' اُسے واپس حاکم کے پاس لے گئے اور اسے ماجرا سنایا تو حاکم نے برہمن لڑکے کو بلایا اور کہا۔

''بڑے ہی تعجب کی بات ہے کہ یہ دوشیزہ نو بہار تمہیں پسند نہیں آئی ارے یہ تو میرے حرم کی حسین ترین عورتوں میں سے ہے اور اس کے جسم کو بہترین خوشبوؤں سے معطر کیا گیا ہے۔''

لیکن حاکم کی بات لڑکے کی سمجھ میں نہ آئی اور وہ اپنی ضد پر اڑا رہا۔ اور اب حاکم کے چہرے پر بھی اُلجھن اور شک کے سائے نمودار ہونے لگے۔ اس نے تحقیق کی تو پتہ چلا کہ اس عورت کے والدین اسے بہت چھوٹا سا چھوڑ کر سورگ باش ہو گئے تھے اور وہ بکری کے دودھ پر پلی تھی' حاکم کو یہ سن کر بڑا تعجب ہوا اور وہ لڑکے کی نفاست پسندی کا قائل ہو گیا۔ بعد ازاں حاکم نے خادموں کو حکم دیا کہ تیسرے نوجوان کے لیے ایک بستر تیار کیا جائے جس میں چھ نہایت نرم خوبصورت گدوں کی تہیں لگائی جائیں چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور تیسرا جوان اس بستر پر سو گیا' لیکن ابھی اسے سوئے ہوئے چند لمحے ہی گزرے تھے کہ وہ بیزاری سے منہ بناتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا' اس نے اپنے ایک پہلو کو ہاتھ سے دبا رکھا تھا' خادموں نے نوجوان کے جسم کی اس جگہ کا جائزہ لیا جہاں اس نے ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ وہاں انہیں ایک لمبی سرخ لکیر دکھائی دی۔ جیسے کسی نے سوئی کی نوک اس حصہ پر گزار دی ہو' وہ حاکم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسے سارا واقعہ سنایا۔

حاکم نے حکم دیا کہ بستر کی چادروں اور گدوں کو دیکھیں کہ کہیں کوئی نوکیلی چیز تو اس میں پڑی ہوئی ہے۔ انہوں نے بڑی احتیاط اور انہماک سے بستر کا معائنہ کیا اور آخر چوتھے گدے کے نیچے انہیں ایک بال پڑا ہوا ملا' اس بال کی لمبائی سے جسم پر پڑی ہوئی سرخ لکیر کی لمبائی کو ناپا گیا تو دونوں برابر تھیں۔

حاکم کو بڑا تعجب ہوا اور وہ تیسرے نوجوان کی نزاکت اور نفاست دونوں کا قائل ہو گیا۔ حاکم کو وہ تینوں واقعات دیکھ کر ازحد پریشانی ہوئی۔ وہ ساری رات بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ اس کی بیویوں نے جب اسے اس حال میں دیکھا تو اس کی دلجوئی کرنے لگیں' لیکن بے سود' دوسرے دن صبح کو حاکم نے اپنا فیصلہ سنایا اور کہا تینوں نوجوان نفاست میں بے مثال ہیں۔ اس نے ان میں سے ہر ایک کو سو سو اشرفیاں بطور انعام دیں۔ برہمن نوجوان اب مگرمچھ کو بھول چکے تھے انہوں نے اسی ضلع میں ہنسی خوشی رہائش اختیار کر لی۔

روح یہ کہانی سنا کر خاموش ہو گئی اور اس نے وکرم سین سے پوچھا۔

''تو بتا راجا تینوں میں سے کون سا نوجوان سب سے زیادہ نفاست پسند تھا؟ مگر یاد رکھو اگر تو جواب سے واقف ہے اور بتانے سے گریز کرتا ہے تو تیرا سر پاش پاش ہو جائے گا۔'' راجا نے چند لمحے توقف کیا اور بولا۔

''میرا خیال ہے تیسرا نوجوان سب سے زیادہ نفاست پسند تھا کیونکہ ایک بال نے جو اُس کے بستر میں چوتھے گدے کے نیچے پڑا تھا۔ اس کے جسم پر زخم ڈال دیا اور باقی دونوں جوانوں کی نفاست پسندی اس نوجوان کی نفاست پسندی کا مقابلہ نہیں کر سکتی' کیونکہ جو ثبوت انہوں نے اپنی نفاست پسندی کے بہم پہنچائے تھے وہ سنی سنائی باتوں پر مبنی ہو سکتے تھے۔''

بادشاہ کا جواب سن کر روح لاش سمیت اُس کے کندھے پر سے غائب ہو گئی اور ایک بار پھر اسے شیشم کے اسی درخت تک جا کر لاش کو واپس لانا پڑا' راستے میں روح نے راجا کو پھر ایک کہانی سنائی تاکہ ماحول کی بدمزگی راجا کو پریشان نہ کر سکے۔

تبدیلی جنس

نیپال کے ایک شہر سیور پور پر کسی زمانے میں پاسو کیتا کی حکومت تھی۔ اُس نے حکومت کے تمام کاروبار کی ذمہ داری اپنے معتبر وزیر اعظم پر چنا ساگر کے کندھوں پر ڈال رکھی تھی وہ اپنی ملکہ چندر پربھا گی کی محبت میں غرق زندگی عیش و عشرت میں گزار رہا تھا۔ اس کی ایک بیٹی تھی ششی پربھا' حسن میں جس کا کوئی ثانی نہ تھا۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ موسم بہار کے تہوار سرسوتی کے موقع پر وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ باغ میں

پھول جمع کر رہی تھی۔ اُس کے ایک ہاتھ میں ٹوکری تھی اور دوسرے ہاتھ سے وہ پھول اٹھا کر اس میں جمع کراتی جاتی تھی۔ ایک دفعہ جب اس نے ایک پھول توڑنے کے لیے ہاتھ آگے کی طرف بڑھایا تو اس کے سرخ اور سفید بدن کا کچھ حصہ عریاں ہوگیا اور اس حالت میں قریب سے گزرتے ہوئے ایک برہمن زادے کی نظر اُس پر پڑی اور وہ مبہوت ہو کر اس کے پریوں جیسے حسن کی رعنائیوں میں گم ہوگیا۔ اُس برہمن زادے کا نام من سوری تھا اور وہ بھی تہوار منانے کے لیے یہاں آیا تھا۔ اِدھر ششی نے جب اس خوبرو جوان کو دیکھا تو اسے بھی اپنا ہوش نہ رہا۔ اور وہ اس حقیقت کو فراموش کر بیٹھی کہ اس کی سہیلیاں اس کی ایک ایک حرکت پر ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر معنی خیز اشارے کر رہی ہیں اور مسکرا رہی ہیں۔ نوجوان کے ذہن میں حسن کی دیوی کو دیکھنے کے بعد خیالات کا ایک طوفان ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ کہیں یہ عشق کی دیوی تو نہیں جو عشق کے دیوتا کے لیے موسم بہار کے عطا کردہ پھول جمع کر رہی ہے تاکہ انہیں تیر بنا کر اپنے محبوب پر وار کرے۔

''یہ کون ہے..... کون..... ایسا تو نہیں کہ دیوی آکاش سے اُتر کر کرشنا کو خوش کرنے آئی ہو۔''

اُدھر ششی بھی خیالوں کی دنیا میں کھوئی ہوئی تھی اُس کی نگاہیں اب بھی برہمن زادے کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

''اوہ کتنا خوبصورت کیسا وجیہہ نوجوان ہے۔'' وہ اس سے زیادہ کچھ نہ سوچ سکی اور نوجوان کی نگاہوں میں نگاہیں ڈالے کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ یہ جمود اُس وقت ٹوٹا جب چاروں طرف سے بھاگو بھاگو کی آوازیں سنائی دیں۔

دراصل ایک ہاتھی بگڑ کر بھاگ رہا تھا۔ شہزادی کی سہیلیاں تو خوف و دہشت کی وجہ سے بھاگ گئیں' لیکن ششی گم سم سی اجنبی نوجوان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑی رہی۔ وہ بھاگ نہ سکی۔ ہاتھی قریب آچکا تھا۔ اچانک نوجوان چونکا اُس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' فوراً راج کماری کو لے کر ایک طرف کو بھاگ اٹھا اور اسے ایک محفوظ مقام پر لے جا کر کھڑا کر دیا۔

راج کماری کے دل میں جذبات کا ایک طوفان بپا تھا۔ پیار اور شرم کے ملے جلے جذبات نے اسے عجیب سی ہیجانی کیفیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ برہمن چلا گیا۔ لیکن جاتے جاتے وہ پیچھے مڑ مڑ کر راج کماری کی جانب دیکھتا رہا اور پھر وہ اس کی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

راج کماری محل میں واپس آئی تو اُس کی حالت بہت بگڑی ہوئی تھی۔ وہ اپنے آپ پر قابو پانے میں بڑی دشواری محسوس کر رہی تھی۔ اب محبوب سے جدائی کا غم اُسے کاٹی کی طرح چاٹ رہا تھا۔ اُدھر نوجوان برہمن زادہ اپنے گرو مولا دیو کے پاس پہنچا۔ جو اس زمانے کا مانا ہوا جادوگر تھا۔ اور اسے اپنی پوری کتھا سنائی اور بتایا کہ وہ ششی کے بغیر زندہ نہ رہ سکے گا۔

مولا دیو مسکرایا اور اس کی مدد کا وعدہ کر لیا۔ وہ اپنی کٹیا میں گیا اور وہاں سے دو گولیاں لے کر آیا۔ ایک گولی تو اس نے اپنے منہ میں ڈال لی اور دوسری گولی اس نے من سوری کو دی' گولی منہ میں ڈالتے ہی مولا دیو ایک ضعیف العمر برہمن میں تبدیل ہوگیا اور من سوری ایک خوبصورت لڑکی بن گئی۔ اب مولا دیو اس لڑکی کو لے کر راجا یا سوکیتو کے دربار میں حاضر ہوا اور عرض کی۔

''مہاراج! میرا ایک ہی بیٹا ہے جس کی شادی میں اس لڑکی سے کرنا چاہتا ہوں۔ اس لڑکی کو میں ایک دور دراز ملک سے لایا ہوں۔ لیکن یہاں آیا تو پتہ چلا کہ میرا بیٹا کہیں جا چکا ہے۔ اب مجھے اُس کو تلاش کرنا ہوگا۔ جبکہ میری غیر موجودگی میں یہ کنواری کنیا اکیلی رہے گی۔ آپ سے درخواست ہے کہ جب تک میں واپس نہ آؤں' یہ آپ کی نگرانی میں رہے گی۔ اور آپ کی خدمت کرتی رہے گی۔ مجھے امید ہے یہ یہاں محفوظ رہے گی۔''

راجا نے اُس کی درخواست قبول کر لی اور اسے اپنی بیٹی ششی کے ساتھ رہنے کا حکم دیا' چالاک مولا دیو چلا گیا اور اب من سوری اپنی محبوبہ ششی کے پاس پہنچ

چکا تھا۔ رات کو جب من سوری نے ششی کی بے کلی دیکھی تو اس کے دکھ کا راز جاننا چاہا۔ جس پر ششی نے من سوری پر اپنا تمام حال شروع سے لے کر آخر تک آشکار کیا۔ لڑکی کی کہانی سن کر من سوری نے محسوس کیا کہ گویا وہ ہواؤں میں پرواز کر رہا ہو' اور اپنی منزل کے قریب پہنچ چکا ہو۔ چنانچہ اس نے جادو کی گولی منہ سے نکالی اور اب وہ برہمن زادہ ششی کے محبوب کے روپ میں سامنے کھڑا تھا اور اس طرح زندگی میں پہلی بار ششی اور من سوری نے عشق و محبت کی منزل کامیابی سے طے کی۔ یوں ہی وقت گزرتا گیا اب من سوری دن کے وقت ایک خوبصورت لڑکی اور رات کو ایک وجیہہ برہمن زادے کی حیثیت سے محل میں رہنے لگا تھا' اُس کے شب و روز عیش و نشاط میں گزر رہے تھے۔

ایک دن کا ذکر ہے راجا یاسوکیتو کے بہنوئی گنگا دت کی لڑکی گنگاوتی کی شادی راجا کے سب سے معتبر وزیر پرچنا ساگر کے لڑکے سے ہوئی۔ ششی بھی اپنی خاص سہیلی من سوری کے ساتھ اپنے پھوپا کے گھر گئی۔ لیکن دولہا نے جب ششی کی سہیلی من سوری کو دیکھا تو اس کی طبیعت مچل گئی اور اس نے یہ مطالبہ کر دیا کہ وہ شادی کرے گا تو من سوری سے ورنہ نہیں..... بڑی مشکل سے موجودہ شادی کی رسوم طے ہوئیں۔ مگر دولہا اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھا اسے کئی مرتبہ دورے پڑے بالآخر وزیر نے ڈرتے ڈرتے راجا کے حضور تمام واقعہ پیش کیا۔ راجا بڑا ہی انصاف پسند تھا اور نیک باطن بھی' اس نے اپنی کابینہ کے سامنے یہ مسئلہ پیش کیا اور کہا۔

''ایک طرف تو امانت میں خیانت کا جرم ہے اور دوسری طرف پورے ملک کی سلامتی کا سوال ہے۔ کیونکہ پرچنا ساگر حکومت کا تمام کاروبار سنبھالے ہوئے ہے اور ظاہر ہے بیٹے کو نقصان پہنچنے کے بعد اس کی دلچسپی کسی چیز میں باقی نہ رہ سکے گی۔ چنانچہ دونوں باتوں پر غور کرنے کے بعد کابینہ نے فیصلہ دے دیا کہ وزیر اعظم کے لڑکی کی شادی اس لڑکی کے ساتھ کر دی جائے۔ جسے وہ چاہتا ہے تاکہ ملک تباہی سے بچ جائے۔ اب بادشاہ من سوری کی طرف متوجہ ہوا۔ اور اس نے اس کی رائے لی' بڑی سوچ بچار کے بعد من سوری نے وزیر اعظم کے لڑکے سے شادی کی تجویز منظور کر لی' لیکن شرط یہ رکھی کہ وہ حق زوجیت اس وقت تک ادا نہ کرے گی جب تک اس کا شوہر کم از کم مسلسل چھ ماہ تک مقدس مقامات اور تیرتیوں کی یاترا نہیں کر لے آتا۔

وزیر اعظم کے لڑکے نے اس شرط کو منظور کر لیا اور یوں ان دونوں کی شادی ہوگئی۔ اب وزیر اعظم کے لڑکے کی دنوں بیویاں گنگاوتی اور من سوری ایک ہی گھر میں رہنے لگیں اور وہ خود وعدے کے مطابق یاترا کو چلا گیا۔ جب من سوری نے گنگاوتی کو ہجر کی راتوں میں کروٹیں بدلتے پریشان اور اُداس دیکھا تو ایک رات اُس نے جادو کی گولی پھر اپنے منہ سے نکالی اور اس پر ظاہر کیا کہ دیوتاؤں نے اسے اپنی جنس بدل لینے کی طاقت بالکل اسی طرح بخشی تھی جیسے سورج دیوتا کے خاندان کا ایک فرد پاربتی دیوی کی بددعا کے زیر اثر ایک خوبصورت عورت میں تبدیل ہوگیا تھا اور راجا بدھ نے اس کے عشق میں مبتلا ہو کر اس سے شادی کی تھی اور پھر ان دونوں سے ہمارا ایک مشہور دیوتا پیدا ہوا تھا۔

سادہ لوح گنگاوتی من سوری کے جال میں پھنس گئی اور اب رات کو من سوری ایک مرد ہوتا اور گنگاوتی ایک عورت اور دن بھر وہ دونوں سوتن تھیں۔

اُدھر جادوگر مولا دیو کو من سوری کی تمام سرگرمیوں کا علم تھا۔ ایک مرتبہ پھر وہ اسی برہمن کے روپ میں اپنے ایک اور جادوگر دوست چندن لال کو ایک نوجوان برہمن کے روپ میں لے جا کر راجا کے دربار میں حاضر ہوا۔ اور لڑکی کی واپسی کا مطالبہ کیا جسے وہ بطور امانت راجا کے سپرد کر گیا تھا تاکہ اس کی شادی اپنے بیٹے چندر لال سے کر سکے۔ راجا بڑا پریشان ہوا اس نے اپنی کابینہ سے مشورہ کیا اور مولا دیو سے کہا۔

''دیکھو..... مجھے بہت افسوس ہے کہ تمہاری وہ لڑکی تو کہیں چلی گئی اور اب میں اسے ڈھونڈ نہیں سکتا۔ ہاں اگر تم چاہو تو میں اپنی بیٹی ششی کو تمہارے بیٹے سے

بیاہنے کے لیے تیار ہوں۔'' مولا دیو یہ بات سن کر غصہ سے سرخ ہوگیا۔ لیکن آخر کار مولا دیو نے ششی کو اپنے بیٹے چندر لال کے لیے قبول کرلیا۔ راجا نے بڑی شان و شوکت کے ساتھ ششی کو چندر لال کے ساتھ بیاہ دیا۔ اور مولا دیو ششی کو لے کر گھر آ گیا۔ اُدھر من سوری محل سے نکل کر پہلے ہی مولا دیو کے گھر پہنچ چکا تھا اور ششی کا انتظار کر رہا تھا۔ لیکن جب یہ لوگ آپس میں ملے تو چندر لال ششی سے من سوری کے حق میں دستبردار ہونے کو تیار نہ تھا کیونکہ راجا نے بہرحال ششی کو اس کے ساتھ بیاہا تھا۔ اور اس طرح ان دونوں کے درمیان جھگڑا شروع ہوگیا۔

اتنا کہہ کر روح ایک بار پھر خاموش ہوگئی اور پھر اس نے راجا سے سوال کیا۔

''ہاں تو راجا تُو بتا کہ اس مسئلے کا کیا حل ہے..... مگر یاد رکھ اگر تو جواب سے واقف ہے اور بتانے سے گریز کرتا ہے تو تیرا سر پاش پاش ہوجائے گا۔''

راجا اس کہانی سے خاص طور پر لطف اندوز ہو رہا تھا اور وہ بڑے اچھے موڈ میں تھا اس نے جواب دیا۔

''میری رائے میں ششی کا سچا حق دار چندن لال ہے کیونکہ ششی کے باپ نے قانونی طور پر اس کا ہاتھ چندن لال کے ہاتھ میں ہی دیا تھا۔ من سوری نے بے شک ششی کو دھوکے سے حاصل کیا تھا لیکن اس کی شادی باقاعدہ طور پر اس کے ساتھ نہیں ہوئی تھی اور قانون بھی یہی کہتا ہے کہ چور اپنے آپ کو مسروقہ مال کے مالک کی حیثیت سے پیش نہیں کرسکتا۔''

روح نے جب یہ جواب سنا تو فوراً ہی لاش سمیت راجا کے کندھے سے غائب ہوگئی اور پھر راجا شیشم کے درخت کی طرف واپس جا رہا تھا۔ ایک بار پھر بہادر راجا نے لاش کو درخت پر سے اُتارا اور کندھے پر رکھا اور اپنی منزل کی طرف چل دیا۔ راستے میں روح نے راجا کو پھر ایک کہانی سنائی۔

حسن کا جادو

کسی زمانے میں دریائے گنگا کے کنارے ایک شہر آباد تھا۔ جس کو کنک پور کہتے تھے۔ یہاں یاسودھن کی حکومت تھی۔ رعایا بڑے آرام سے زندگی گزار رہی تھی۔ جرم اور قانون کی خلاف ورزی کا وہاں کوئی تصور ہی نہ تھا۔ اپنے ملک کے دفاع کے لیے راجا بذات خود ناقابلِ تسخیر دیوار کی مانند تھا اور اگر وہ خود کسی جگہ کمزور پڑتا تو وہ موقع گناہ یا قانون کی خلاف ورزی کا موقع ہوتا تھا۔ ورنہ وہ بڑا نڈر بڑا جری اور بہت ہی پُر ہیبت راجا تھا۔ وہ ہمیشہ گناہ کے ارتکاب سے خوفزدہ رہتا اور دیوتاؤں سے پراتھنا کرتا رہتا کہ دیوتا اسے برائی سے بچائیں۔

اسی شہر میں ایک سوداگر رہتا تھا۔ جو بڑا امیر و کبیر تھا اس کی ایک نوجوان بیٹی تھی۔ جس کا نام روما دیوی تھا وہ بہت ہی خوبصورت تھی۔ اس کے حسن کا چرچا دور دور تک تھا۔ اُس کے کئی چاہنے والے تھے اب وہ جوان تھی اور شادی کے قابل تھی۔ چنانچہ اس کا باپ ایک دن راجا کے دربار میں حاضر ہوا اور کہنے لگا۔

''مہاراج! میری ایک ہی بیٹی ہے جسے حسن کے اعتبار سے اس دنیا کا ایک بہترین اور قیمتی ہیرا کہا جاسکتا ہے اور چونکہ آپ مہاراج دنیا کے تمام ہیروں کے مالک ہیں لہٰذا یہ میرا فرض ہے کہ قبل اس کے کہ میں یہ ہیرا کسی اور کو پیش کروں ضروری خیال کرتا ہوں کہ یہ آپ کی خدمت میں پیش کردیا جائے۔''

راجا نے یہ سن کر دربار میں موجود جوتشیوں سے زائچہ بنوایا کہ وہ دیکھیں کہ اس لڑکی کے ساتھ شادی ملک کے لیے سودمند ثابت ہوگی یا نہیں۔ جوتشی بڑے جہاندیدہ تھے۔ انہوں نے آپس میں اس بات سے اتفاق کیا کہ اگر راجا نے اتنی حسین لڑکی کو اپنی رانی بنالیا تو پھر وہ اس کے حسن و عشق میں گرفتار ہوکر ملک اور قوم کو فراموش کر بیٹھے گا اور عجب نہیں اس کے نتائج اس سے بھی زیادہ تباہ کن ثابت ہوں' چنانچہ انہوں نے دربار میں حاضر ہوکر راجا کو سلطنت کے حق میں لڑکی کے منحوس ہونے کی اطلاع دی۔

اور راجا نے ان کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے شادی سے انکار کردیا۔ لیکن راجا کی ہدایت پر لڑکی کے باپ نے اپنی بیٹی کی شادی راجا کے سپہ سالار بلادھر سے کردی۔ یوں روما دیوی اور بلادھر

خوش وخرم زندگی گزارنے لگے۔ لیکن روما دیوی کو اس بات کا غم تھا کہ راجا نے اپنے جوتشیوں کے کہنے پر اسے منحوس قرار دے کر اس سے شادی سے انکار کر دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

وقت گزرا اور سرسوتی کا تہوار آ گیا تو راجا اس موقع پر اپنے ہاتھی پر سوار ہو کر شہر میں میلے کا انتظام دیکھنے کے لیے نکلا' ہاتھی کے آگے آگے نقیب یہ ہدایت دے رہے تھے کہ شہر کی تمام عورتیں پردہ کر لیں' کہیں ایسا نہ ہو کہ راجا کے حسن کو دیکھ کر وہ اس پر فریفتہ ہو جائیں اور شہر کی معاشرتی زندگی میں کسی انقلاب کا خطرہ لاحق ہو جائے۔

روما دیوی نے جب یہ اعلان سنا تو اس نے اس کی پرواہ نہ کی اور چھت کے اوپر سے جھانک کر ہاتھی پر سوار راجا کو دیکھا۔ اُدھر راجا کی نظر بھی اس پر پڑی۔ اُس حسین و جمیل عورت کو دیکھ کر خود راجا اپنے حواس گنوا بیٹھا اور بے ہوش ہو گیا۔ اُس حالت میں اس کے خدمت گار اسے واپس محل میں لے آئے۔ جب راجا کے حواس بحال ہوئے تو اس نے اس عورت کے بارے میں دریافت کیا اور پھر اس کے غم اور غصے کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا تھا۔ جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ اسی لڑکی کے باپ نے راجا کو پیش کش کی تھی کہ وہ اس لڑکی سے شادی کرے' لیکن جوتشیوں کے کہنے میں آ کر اس نے انکار کر دیا تھا۔ چنانچہ اُس نے ان تمام بوڑھے جوتشیوں کو ملک بدر کر دیا۔ جنہوں نے لڑکی کو منحوس قرار دیا تھا۔

اب راجا کے لیے ہجر و فراق کی راتیں گزارنا بڑا ہی کٹھن مرحلہ تھا۔ وہ راتوں کو جاگ کر کہتا۔

''یہ چاند کتنا ڈھیٹ ہے اور بے شرم ہے کہ اس حسینہ کے سامنے چمکتا ہے۔'' راجا اب دن رات اس کے ہی خیالوں میں غرق رہنے لگا۔ اب وہ سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا۔ آخر ایک دن اس کے مشیروں نے اصرار کر کے اُس کے دل کا راز اگلوا ہی لیا۔

''اے راجاؤں کے راجا! یہ کون سی مشکل بات ہے۔ آپ اس سے شادی کر سکتے ہیں۔ آخر وہ آپ کی رعیت میں ہے۔''

ایک منہ چڑھے درباری نے مشورہ دیا۔ لیکن راجا نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔

سپہ سالار بلادھر کو جب اس کا پتہ چلا تو وہ راجا کی خدمت میں حاضر ہوا اور فراخدلی کے ساتھ راجا کے حق میں اپنی بیوی سے دست بردار ہونے کی پیش کش کی' لیکن اس پر راجا کو غصہ آ گیا اور وہ کہنے لگا۔

''بلادھر! تم جانتے ہو ہم اس ملک کی قسمت کے مالک ہیں۔ اگر ہم ہی اپنے بنائے ہوئے قانون کی خلاف ورزی شروع کر دیں تو رعایا میں کون ہو گا جو ہمارے حکم کی تعمیل دل و جان سے اور ہماری عزت روح کی گہرائیوں سے کرے گا۔ تم میرے قریبی عزیز ہو' لیکن تمہیں کیوں یہ خیال آیا کہ چند لمحوں کی مسرت کی خاطر میں آنے والے زمانے کے لوگوں کو اپنے اوپر ہنسنے کا موقع دوں گا اور اپنی آئندہ نسل کے لیے ایک مستقل عذاب پیچھے چھوڑ جاؤں گا۔ یاد رکھو اگر میری زندگی میں کبھی ایسا موقع آیا تو میں ایسے فعل قبیح کا ارتکاب کرنے سے زیادہ موت کو پسند کروں گا۔''

اس طرح مہان راجا نے قانون کی عظمت کو برقرار رکھا کیونکہ جو لوگ عظیم ہوتے ہیں۔ انہیں اپنی زندگی کی پرواہ نہیں ہوتی دنیاوی خوشیاں حاصل کرنے کے لیے قانون کی بھینٹ دینا کبھی انہیں پسند نہیں ہوتا۔

کچھ اور وقت گزرا راجا کی حالت زیادہ بگڑ گئی تو شہر کی پرجا' محل کے باہر جمع ہو کر راجا سے مطالبہ کرنے لگی کہ وہ روما دیوی سے شادی کر لے' لیکن راجا اپنے فیصلہ پر اڑا رہا اور آخر کار ایک دن دنیا سے رخصت ہو گیا' بلادھر نے جب راجا کی موت کی خبر سنی تو وہ اپنے عظیم مالک کی جدائی برداشت نہ کر سکا اور راجا کی جلتی چتا میں کود پڑا اور خود بھی جل مرا۔

کہانی سنا کر روح نے پھر راجا سے سوال کیا۔

''ہاں تو اے راجا! بتا دونوں میں کون زیادہ پُرخلوص تھا راجا یا سپہ سالار..... مگر یاد رکھ اگر تو جواب سے واقف ہے اور بتانے سے گریز کرتا ہے تو تیرا سر پاش پاش ہو جائے گا۔''

راجا تری وکرم سین نے جواب دیا۔

''راجا زیادہ پُرخلوص تھا۔''

''کیوں؟'' روح نے اعتراض کیا۔

''کیا سپہ سالار پُرخلوص نہ تھا۔ اس نے راجا سے اس درجے وفاداری کا ثبوت دیا کہ اس نے اپنی بیوی کو جس کی رفاقت میں اس کا ایک عرصہ گزرا تھا۔ راجا کی خدمت میں پیش کر دیا اور پھر یہ کہ وہ خود راجا کی چتا میں جل کر ہلاک ہوا اس کے خلوص اور قربانی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے۔''

راجا تری وکرم سین مسکرایا اور بولا۔

''تیرا خیال درست نہیں..... سپہ سالار جو راجا کا ایک خادم تھا اس نے جو کچھ کیا وہ اس کا فرض تھا کیونکہ خدام کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنے مالکوں کو بچانے کے لیے جانوں کی قربانی سے بھی دریغ نہ کریں لیکن ذرا راجا کی طرف تو دیکھ طاقت کے نشے میں چور قانون جس کا غلام' جاہ و جلال اور شان و شوکت کا وہ امین ایسے لوگ اگر اتنا کچھ قبضے میں رکھنے کے باوجود قانون اور انصاف کی بالادستی کو قائم رکھیں اور شہوانی خواہشات کو عوام کی فلاح و بہبود اور ملک کے سکون اور اطمینان پر قربان کر دیں اور نفس کو کچل دیں وہ واقعی عظیم کہلانے کے مستحق ہیں اب تو ہی بتا۔ کون زیادہ پُرخلوص تھا راجا یا فوجی سردار.....؟ یقیناً راجا ہی تھا۔''

وکرم سین یہ کہہ کر چپ ہو گیا۔

روح وکرم سین کا جواب سن کر ایک بار پھر راجا کے کندھے سے غائب ہو گئی اور راجا ایک بار پھر شیشم کے درخت پر سے لاش کو کندھے پر اٹھا لایا۔ روح راجا کی ثابت قدمی سے بہت خوش ہوئی راجا ایک بار پھر اپنی منزل کی جانب لاش کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ چنانچہ روح نے راجا کو ایک اور کہانی سنائی۔

ایک بیٹا تین باپ

کسی زمانے میں جنوبی ہندوستان میں وکرولا کا نامی شہر آباد تھا۔ جس پر مہاراجا سوریا پرھا کی حکومت تھی۔ یہ مہاراجا طاقت اور شان و شوکت میں کسی طرح سے راجا اندر سے کم نہ تھا۔ بڑا بانکا اور سجیلا نوجوان تھا۔ ریاست میں ہر طرف امن و امان تھا۔ اس کی رعایا نے اس کے عہد میں سکھ ہی سکھ دیکھا تھا۔ مہاراجا کی زندگی عیش و عشرت کا جیتا جاگتا نمونہ تھی۔ اور اسے اگر کوئی غم تھا تو صرف یہ کہ اُس کا کوئی بیٹا نہ تھا۔

اِس شہر کے بعد کسی دوسرے درجے کی ریاست میں ایک بندرگاہ تمراپستی واقع تھی۔ جہاں ایک بڑا امیر و کبیر سوداگر رہتا تھا۔ جس کا نام دھن پال تھا۔ اس کی ایک نہایت حسین و جمیل لڑکی تھی' اُس کا نام دھن وتی تھا۔ اس کے حسن کو دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ دیوتاؤں نے اُسے اپنے ہاتھ سے آکاش میں رہنے کے لیے بنایا' مگر کسی بددعا کے زیر اثر یا کسی جرم کی پاداش میں اسے زمین پر پھینک دیا گیا تھا۔ جب یہ شعلہ رخ لڑکی شادی کی عمر میں پہنچی تو اس کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ اب ان ماں بیٹی پر برا وقت آن پڑا۔ دھن پال کی دولت پر اس کے بھائی قابض ہو گئے اور ان دونوں کو شہر سے نکلنے پر مجبور ہونا پڑا۔ چنانچہ دھن پال کی بیوی نے چند جواہر جو اس نے آڑے وقت کے لیے چھپا کر رکھے تھے۔ اپنے ساتھ لیے اور گھر سے بیٹی کو لے کر نکل گئی۔ شہر سے باہر نکلی تو وہ ایک ویرانے میں پہنچ گئی۔ رات تاریک تھی ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔

دھن وتی اپنی ماں کا ہاتھ پکڑے ٹھوکریں کھاتی چلی جا رہی تھی کبھی کبھی کسی درخت کا کوئی پتہ کھڑکتا یا دور سے کسی گیدڑ کے رونے کی آواز سنائی دیتی تو نازو نعم میں پلی ہوئی یہ دونوں ماں بیٹی خوف سے تھر تھر کانپنے لگتیں اور ایک طرف کسی چٹان سے پیٹھ لگا کر بیٹھ جاتیں اور جب حواس ذرا بجا ہوتے تو پھر اپنا سفر شروع کر دیتیں۔ چلتے چلتے دھن وتی کی ماں کا پیر زمین پر پڑے کسی جسم سے ٹکرایا تھا' جو دراصل ایک ڈاکو تھا اور اپنے ساتھیوں ہی سے حصے کی بٹائی پر لڑ پڑا تھا اور شدید زخمی ہو گیا تھا۔ وہ اب بھی زندہ تھا جسے سوداگر کی بیوہ کا پیر اُس کے زخمی کندھے سے ٹکرایا تو وہ درد سے چلایا۔ دھن وتی اور اس کی ماں فوراً زمین پر بیٹھ گئیں تو دھن وتی کی ماں نے اُس سے پوچھا۔

''اجنبی تم کون ہو اور تمہاری یہ حالت کیسے ہوئی کیا تمہارا کوئی گھر نہیں؟''

''دھیرج دیوی دھیرج..... ایک سے میں ایک سوال.....'' ڈاکو نے اپنا درد چھپا کر کہا۔

''میں دراصل ایک ڈاکو ہوں جسے خود میرے ساتھی زخمی کر کے یہاں ڈال گئے ہیں' مگر اتنا سخت جان ہوں کہ موت نہیں آتی۔ میں ساری زندگی دوسروں کو دکھ دیتا رہا ہوں' اِس سے خود دکھ اٹھا رہا ہوں' اور جب خود دکھ اٹھا رہا ہوں تو زندگی سے نفرت ہو رہی ہے۔ بھگوان بھلی کرے مگر دیوی تم تو اپنے بارے میں کچھ بتاؤ کہ تم کون ہو؟''

دھن وتی کی ماں نے اُسے اپنا پورا ماجرا سنایا۔ جب وہ بول رہی تھی اچانک بادلوں نے شرارت کی اور چاند کے چہرے سے گھونگھٹ اٹھ گیا۔ چاروں طرف چاندنی پھیل گئی اور جب ڈاکو نے سوداگر کی نوجوان بیٹی کو دیکھا تو بے حال ہو گیا اور کہنے لگا۔

''دیوی..... بھگوان کے کارن میری ایک پرارتھنا قبول کر مجھے اپنی اس کنیا سے بیاہ دے' میں مرنے سے پہلے اپنی ایک آشا پوری کرنا چاہتا ہوں۔ اور وہ یہ ہے کہ میرا ابھی کوئی بیٹا ہو' جس سے میرے بعد میرا نام چلے۔''

''مگر تم تو سورگ باش ہونے کے قریب ہو' تمہارے لیے میری بچی کس کام کی؟'' ماں نے پوچھا۔

''سنو دیوی! یہ لڑکی میری رضا سے میرے لیے ایک لڑکے کو جنم دے گی۔ تو بس وہی کرو جو میں کہہ رہا ہوں۔ دیکھو سامنے وہ جو درخت دکھائی دے رہا ہے اُس کی جڑ میں دس ہزار اشرفیاں دبی ہوئی ہیں۔ تم وہ اشرفیاں نکال لو وہ تمہاری ہیں اور قریب ہی ایک چشمہ بہہ رہا ہوگا وہاں سے ایک کٹورے میں پانی لاؤ۔''

بیوہ کو لالچ نے آلیا۔ اُس نے وہی کیا جو ڈاکو نے بتایا تھا۔ وہ پانی کی دھار ڈاکو کے ہاتھ پر ڈالتی جاتی اور کہتی جاتی۔

''میں اپنی بیٹی دھن وتی کو تم سے بیاہتی ہوں۔''

اور اس طرح دنیائے حسن کا یہ گوہر نایاب ایک قریب المرگ کی گود میں جا پڑا۔ ڈاکو نے دھن وتی کو ہدایت کی۔

''دیکھ پتنی! میں بھگوان کے پاس جا رہا ہوں..... تجھے اجازت ہے کہ اپنی پسند کے کسی بھی نوجوان سے مل کر میرے لیے ایک بیٹے کو جنم دے۔'' اس کے بعد وہ دھن وتی کی ماں سے مخاطب ہوا۔

''دیوی جی! میری موت کے بعد میری چتا کو جلا دینا اور میری پتنی کو 'کروکا' لے جانا۔ تم بھی وہیں رہنا' اور اسے بھی وہیں رکھنا۔ وہاں تم ہر طرح امن وچین سے گزر بسر کر سکو گی۔''

یہ کہہ کر ڈاکو خاموش ہو گیا۔ اُس کے چہرے پر موت کی زردی چھا گئی اور تھوڑی دیر بعد وہ اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ یہ ماں بیٹی چپ چاپ قریب ہی واقع اپنے ایک عزیز کے گھر چلی گئیں۔ جہاں وہ اس وقت تک رہیں جب تک ڈاکو کی چتا جلا نہ دی گئی اور اُس کی ہڈیاں دریا برد نہ کر دی گئیں۔

دوسرے دن یہ دونوں مسافر اپنے زر و جواہر کے ساتھ 'کروکا' شہر پہنچ گئے اور یہاں انہوں نے ایک مکان خرید لیا۔ زندگی آرام سے گزر رہی تھی۔ اُس روز دوپہر کا وقت تھا' دھن وتی جھلملیوں سے باہر بازار کا نظارہ کر رہی تھی کہ اسے ایک نہایت خوبصورت اور وجیہہ برہمن زادہ نظر آیا۔ اُس کا نام من سوامی تھا۔ اُس کا باپ استاد تھا اور بڑا عالی نسب تھا۔ دھن وتی نے جب اس نوجوان کو دیکھا تو اسے اپنے شوہر کی ہدایت یاد آئی۔ بھاگی بھاگی اندر آئی اور ماں سے مشورہ کیا۔ چنانچہ ماں نے نوجوان بیٹی کو اجازت دے دی اُس نے فوراً ہی ایک خادمہ بھیج کر اُسے بلوالیا۔

اب اس نوجوان کی بھی سنیے۔ وہ ایک چندے آفتاب' چندے ماہتاب طوائف زادی پر جان چھڑکتا تھا۔ لیکن طوائف نے نتھ اتروائی نذرانہ پانچ سو اشرفیاں مقرر کر رکھا تھا۔ اور اس نوجوان کو پانچ سو اشرفیوں کی ضرورت تھی۔ جب خادمہ اس کے پاس اپنی مالکہ کا پیغام لے کر آئی تو اس نے کہا۔

''مجھے تمہاری ملکہ کے حکم کی تعمیل میں کوئی اعتراض نہیں لیکن میں اس کام کی اجرت پانچ سو اشرفیاں لوں گا۔'' خادمہ نے یہ بات مالکہ کو بتائی تو وہ راضی ہوگئی اور برہمن زادہ دھن وتی کے کمرے میں پہنچ گیا۔ اس طرح دھن وتی نے اپنے شوہر کی آرزو کو پورا کیا اور پھر آخر کار وہ دن بھی آ گیا۔ جب دھن وتی نے اپنے مرحوم شوہر کے للنا کو جنم دیا اور پھر ایک رات خواب میں دھن وتی اور اُس کی ماں نے شیو دیوتا کی ہدایت سنی۔

''اس بچے کو ایک ٹوکری میں رکھ کر اچھے کپڑے پہنا کر اور اس کے ساتھ ایک ہزار اشرفیاں رکھو اور مہاراجہ سوریا پربھا کے محل کے دروازے پر صبح ہونے سے پہلے پہلے چھوڑ آؤ۔''

اُس وقت ماں بیٹی کی آنکھ جو کھلی تو انہوں نے ایک دوسرے کو اپنا خواب سنایا اور پھر ان دونوں نے شیو کی ہدایت پر عمل کیا اور بچے کو مہاراجہ کے محل کے دروازے پر صبح ہونے سے پہلے پہلے چھوڑ کر چلی آئیں۔ اُدھر شیو دیوتا نے سوریا پربھا کو خواب میں ہدایت کی۔

''دیکھو ہم نے تمہاری دیرینہ آرزو پوری کی تمہارے محل کے باہر ایک ٹوکری میں ایک بچہ پڑا ہوا ہے اسے منگوالو اور بیٹے کی طرح پالو' ہم تم سے بہت خوش ہیں' جاؤ اور خوشیاں مناؤ۔''

مہاراجہ کی آنکھ جو کھلی تو اس نے فوراً ہی خدمت گاروں کو حکم دیا کہ محل کا دروازہ کھول دیں۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد خدمت گار وہ ٹوکری اٹھائے چلے آ رہے تھے۔ مہاراجہ بہت خوش تھا۔ سارے ملک میں دھوم مچ گئی ہر طرف خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ چاروں طرف شادیانے بج رہے تھے اور جشن منائے جا رہے تھے۔ مہاراجہ نے جوتشیوں کے مشورے سے بچے کا نام چندر پربھا رکھا۔ یہ لڑکا اب راجکمار تھا۔ وہی عہد سلطنت تھا اور اس کی پرورش اور تربیت بڑے ناز و نعم اور وید اور رامائن کے عالموں کی زیر نگرانی ہو رہی تھی۔

راج کمار بڑا ہوتا گیا یہاں تک کہ اب وہ سوریا پربھا کے ساتھ مل کر ملک کے نازک مسائل بڑی حاضری دماغی کے ساتھ حل کرنے لگا۔ دربار کے بڑے بڑے عالم اور وزرائے باتدبیر اس کی صلاحیتوں کے معترف ہی نہیں گرویدہ بھی تھے۔ اب سوریا پربھا کا نام کم اور چندر پربھا کا نام ہر معاملے میں سنائی دیتا۔ جب حالات نے یہ صورت اختیار کی تو سوریا پربھا نے نظام حکومت چندر پربھا کو دے دیا' اور خود تیرتھ یاترا کے لیے متھرا اور بنارس چلا گیا۔ وہیں گیان دھیان میں اتنا مصروف ہوا کہ پھر واپس نہ آیا اور اسی عالم میں مرگیا' نوجوان چندر پربھا کو جب باپ کی موت کا علم ہوا تو اس نے ملک کا انتظام اپنے ایک پرانے نمک خوار قابل اعتماد وزیر کے سپرد کیا اور ارکان کابینہ سے مخاطب ہوا۔

''میں اپنے سورگ باشی پتا کی کوئی خدمت زندگی میں نہ کرسکا۔ اب میں چاہتا ہوں کہ پہلے بنارس جاؤں اور اُن کی ہڈیوں کو خود اپنے ہاتھوں سے دریا برد کردں۔ اس کے بعد میں گیا جانا چاہتا ہوں تاکہ اپنے تمام اسلاف کی سادھیوں پر چڑھاوے چڑھا سکوں اور اس کے بعد میں مقدس سفر پر روانہ ہونا چاہتا ہوں اور اس مقصد کے لیے میں انتہائی مشرقی ساحلوں تک پہنچنا چاہتا ہوں۔ تاکہ کوئی جگہ ایسی نہ بچے جہاں میں نے پوجا پاٹ نہ کی ہو۔''

کابینہ کے بہت سے وزیروں نے عوام اور ریاست کی خوش حالی کا واسطہ دے کر نوجوان مہاراجہ کو اس طویل سفر سے باز رکھنا چاہا لیکن باعزم راجہ نے کسی کی نہ سنی اور سفر پر روانہ ہوگیا۔ عمائدین سلطنت اور عوام کی بڑی تعداد نے مہاراجہ کو رخصت کیا۔ راجا کے ساتھ اس کے خاص پروہیت بھی تھے اور چند برہمن بھی جن کے علم و فضل سے اس کے باپ اور خود اس نے بہت کچھ سیکھا تھا۔ یہ چھوٹا سا قافلہ بہت سے ملکوں اور ریاستوں سے گزرا۔ راجا ہر ملک اور ہر ریاست کے مختلف رسوم و رواج لباس' لوگوں کی چال ڈھال' بول چال دیکھ کر بہت خوش ہوا اور پھر ایک دن انہوں نے دریائے گنگا کو بھی دیکھا اور اشنان کیا۔ اشنان کے بعد مہاراجہ نے برہمنوں اور سادھوؤں کو

وان دیا۔ باپ کی ہڈیوں کو دریا برد کیا اور اس کے بعد دوسری مذہبی رسومات ادا کی گئیں۔

اس کے بعد وہ اور اس کے ساتھ پھر سفر پر تھے وہ پریاگ گئے جہاں دریائے گنگا اور جمنا کا سنگم واقع ہے۔ اس کے بعد وہ بنارس اور بنارس سے گیا پہنچے۔ یہاں بھی انہوں نے دل بھر کے پوجا پاٹ کی۔ گیا میں اس نے اپنے اسلاف اور آنجہانی باپ کی سادھیوں پر پھول چڑھائے اور پروہتوں کو نذرانے پیش کیے۔ پھر وہ ایک پنڈر بنا کر گیا کے مقدس چشمے پر پہنچا اور قدیم رسوم کے مطابق کھڑا ہو گیا تاکہ باپ کا ہاتھ باہر نکلے تو وہ اس پر رکھ دے (پنڈر ایک خاص قسم کی مٹھائی ہوتی ہے جو ہندو اپنے مرحوم بزرگوں اور رشتہ داروں کو گیا کے مقدس چشمے پر پیش کیا کرتے تھے' بالکل اسی طرح جس طرح یہ مہاراجہ اپنے باپ کو پیش کرنے کے لیے اتنی دور کا سفر کر کے یہاں آیا تھا)

لیکن اُس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ ایک کے بجائے تین ہاتھ چشمے سے باہر نکلے اور اس کے سامنے پھیل گئے۔ چنانچہ اس نے اپنے خاص پروہیت کو بلایا اور اس سے کہا کہ اس عقدے کو حل کرے۔ چنانچہ برہمن نے ہاتھوں کا بغور معائنہ کرنے کے بعد یہ فیصلہ دیا۔

''حضور! ان میں سے ایک ہاتھ تو یقیناً کسی ڈاکو کا معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس میں ایک آہنی سوئی آر پار چبھی ہوئی ہے۔ دوسرا ہاتھ جس میں چند تنکے دکھائی دے رہے ہیں۔ وہ مقدس گھاس کے ہیں اور یقیناً کسی برہمن کا ہاتھ ہے اور تیسرا ہاتھ تو آپ دیکھ ہی رہے ہیں' اس میں شاہی انگوٹھی موجود ہے جو اس بات کی ضامن ہے کہ یہی سورگ باش مہاراجہ سوریا پربھا کا ہاتھ ہے۔''

''لیکن یہ تو بتاؤ..... یہ پنڈر کس کے ہاتھ میں رکھا جائے' آخر اس کا مطلب کیا ہے؟'' مہاراجہ نے زچ ہو کر سوال کیا۔ لیکن برہمن مہاراجہ کی کوئی مدد نہ کر سکا۔

روح یہ کہانی سنا کر خاموش ہو گئی۔ چند لمحے توقف کے بعد اس نے پھر راجا سے اس مسئلے کا حل دریافت کیا اور کہا کہ اگر تو جواب سے واقف ہے اور بتانے سے گریز کرتا ہے تو تیرا سر پاش پاش ہو جائے گا۔''

راجا تری وکرم سین نے جن کی ذہانت کے قائل قارئین اب بہت اچھی طرح ہو گئے ہوں گے۔ اس مسئلے کا حل اس طرح پیش کیا۔

''بھئی میں ہندو بھرم سے خوب واقف ہوں اور میری رائے میں مہاراجہ کا اصلی باپ ڈاکو تھا' اور اسے پنڈر اس کے ہاتھ پر رکھنا چاہیے تھا۔ برہمن گو قانونِ فطرت کی رو سے اس کا باپ تھا لیکن چونکہ ایک فعل اجرت لے کر انجام دیا تھا۔ اس لیے اسے مہاراجہ کا باپ نہیں کہا جا سکتا' اسی طرح سوریا پربھا چندر پربھا کا باپ تھا۔ لیکن صرف اِس حد تک کہ اس نے اس کو بیٹے کی طرح تعلیم دی اور دیوتاؤں نے اُسے کسی مصلحت کے تحت اس کے سپرد کر دیا اور یہ کہ اس نے اس کی پرورش کی اور اپنے بعد اپنا جانشین مقرر کیا۔ لیکن دیوتاؤں نے جہاں سوریا پربھا پر اس بچے کی نگہداشت کی ذمہ داری ڈالی وہیں اُس کا خرچہ ایک ہزار اشرفیوں کی شکل میں پیشگی ادا بھی کر دیا تھا۔ لہٰذا سوریا پربھا بھی صحیح معنوں میں چندر پربھا کا باپ نہیں کہلا سکتا۔ یہی میرا جواب ہے۔''

راجا کا یہ جواب سن کر روح ایک بار پھر لاش سمیت اس کے کندھوں پر سے غائب ہو گئی اور راجہ کو ایک مرتبہ پھر اسے شیشم کے درخت تک جانا پڑا اور روح نے اُسے پھر کہانی سنائی۔

ایثار و قربانی

ہندوستان کے ایک مشہور شہر کا نام سنزر کوٹ ہے۔ کسی زمانے میں اس شہر پر کندر اوالوک نامی راجا کی حکومت تھی۔ ہر طرف امن اور خوشحالی کا دور دورہ تھا۔ عوام ذات پات کی تفریق کو گناہِ عظیم سمجھتے تھے۔ راجا کے دربار میں بڑے بڑے عالم جمع تھے اور وہ خود بھی ایک بڑے عالم کی حیثیت سے اپنا جواب نہ رکھتا تھا۔ اس کے قلم کی کاٹ بہادر سے بہادر دشمن کی تلوار سے کہیں زیادہ مہلک تھی۔ وہ غریبوں کا ہمدرد تھا اور

اپنی پرجا کا محبوب' اِن تمام اوصاف کے ساتھ وہ ایک نہایت وجیہہ شکل مرد بھی تھا۔ غرض انسان جن ممکنہ نعمتوں کا متمنی ہوسکتا ہے اسے حاصل تھیں۔ کمی تھی تو صرف اتنی کہ ابھی تک اسے کوئی ایسی دوشیزہ نہ مل سکی تھی جسے وہ اپنی رانی بنا سکتا۔

ایک روز ذہن کی پراگندگی کو دور کرنے کی غرض سے راجا اپنے مصاحبوں کے ساتھ ایک وسیع و عریض جنگل کی طرف شکار کی غرض سے چل پڑا۔ وہ نہایت شاندار پوشاک میں ملبوس بڑی شان کے ساتھ شکار کرتا چلا جارہا تھا۔ سورج پوری آب و تاب کے ساتھ آسمان پر چمک رہا تھا۔ اس نے نامعلوم کتنے شیروں کو پچھاڑا اور نہ معلوم کتنے گینڈوں کو زیر کیا۔ شکار کرتے کرتے راجا کی خواہش ہوئی کہ وہ خود تنہا جنگل کے اندر دور تک نکلتا جائے۔ چنانچہ گھوڑے کو ایڑ لگا کر اس نے سرپٹ دوڑا دیا۔ دو تین چابکوں ہی نے یہ حال کر دیا کہ اب گھوڑا ہوا سے باتیں کررہا تھا۔ اور راجا کو سمت تک کا احساس نہ رہا تھا پلک جھپکتے ہی راجا جنگل کے اندر تیس میل تک پہنچ چکا تھا۔

ایک مقام پر پہنچ کر راجا نے گھوڑے کو قابو کرلیا اور چاروں طرف گھومنے لگا۔ چلتے چلتے وہ ایک تالاب کے قریب پہنچ گیا۔ انگشت نما خوبصورت کنول کھلے ہوئے جھوم رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ راجا کو تالاب کے قریب آنے کی دعوت دے رہے ہوں' راجا گھوڑے سے اُترا' اسے نہلایا پانی پلایا اور ہری ہری گھاس چرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ پھر اس نے خود غسل کیا پانی پیا اور خالی خالی نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگا کہ اچانک اُس کی نظر ایک دوشیزہ پر پڑی جو اشوک کے درخت تلے خوبصورت پھولوں سے لدی پھندی بیٹھی تھی' وہ ایک سادھو کی بیٹی تھی اور اس کے ساتھ اُس کی ایک سہیلی بھی تھی۔ اُس کے بال بڑے قاعدے سے ایک جوڑے میں گندھے ہوئے تھے اور اس کا حسن بے مثال تھا۔ راجا نے محسوس کیا جیسے عشق کا دیوتا اُس پر محبت کے پھولوں کے تیر برسا رہا ہو۔ اس نے سوچا۔

''یہ لڑکی کون ہوسکتی ہے؟ کیا ساوتری یہاں غسل کرنے آگئی ہے؟ یا یہ شیوجی کی ٹھکرائی ہوئی پاربتی دیوی ہے جو دوبارہ تاسف اور رنج و غم کا اظہار کرکے اسے جیتنے کی کوشش کررہی ہو۔ یا کہیں یہ چاند کا پرتو' تو نہیں ہے جو خود غروب ہونے کے بعد دن کے وقت اس خطہ زمین پر اتر آیا ہے۔ چلو دیکھیں یہ کون ہے؟''

وہ لڑکی اس وقت پھولوں کا ایک ہار بنا رہی تھی۔ اُس نے جو راجا کو اپنی طرف آتے دیکھا تو ہار اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا وہ مبہوت اور بدحواس ہوکر راجا کے حسن میں کھوگئی اور دل میں کہنے لگی۔

''اِس جنگل میں ایسا شکیل و جمیل انسان! یہ کون ہوسکتا ہے؟ اِس کی شکل وصورت اتنی دلکش ہے کہ دنیا کے تمام انسان اسے دیکھ کر جئیں۔''

ان خیالات میں کھوئی ہوئی وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ شرمیلی نظروں سے اس کی طرف دیکھتی جاتی اور چلتی جاتی' اُس کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ جیسے اس نے جام کے جام لنڈھا دیے ہوں۔ یہ جام شراب عشق کے جام تھے۔ عشق جو زندگی ہے' حسن ہے نیکی ہے اور عظمت و سربلندی کا نشان.....

راجا تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اُس کے قریب جا پہنچا اور نہایت مہذب اور لجاجت بھرے لہجے میں اس سے مخاطب ہوا۔

''اے دوشیزہ بے مثال! اے ملکہ حسن! ایک مسافر بہت دور سے تیرے پاس آیا ہے کیا تو اُسے خوش آمدید نہیں کہے گی؟ وہ تیرے حسن سوز کا گرویدہ ہے اور جو تیرا مہمان ہے۔ کیا تو اس سے دو باتیں بھی نہیں کرے گی؟ کیا سادھوؤں کا شیوہ یہی ہے کہ جب کوئی مسافر یہاں پہنچے تو وہ اس سے پیچھا چھڑالیں؟''

لڑکی کی سہیلی نے جو بڑی ذہین تھی اور خود بھی حسن و رعنائی کا نمونہ تھی۔ راجا کا عندیہ فوراً سمجھ گئی اور جھک کر اُسے پرنام کیا۔ اور ایک مہمان کی حیثیت سے اس کا سواگت کیا۔

راجا جو اس حسینہ کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر ہوچکا تھا۔ اس نے اس کی سہیلی سے دریافت کیا۔

''اے حسین نیک بخت دوشیزہ کیا تو مجھے اپنی

سہیلی کے بارے میں کچھ نہ بتائے گی۔ یہ کون ہے؟ کہاں رہتی ہے؟ اس کے ماں باپ کہاں ہیں؟ اس کا نام کیا ہے؟ اور یہ اس سنسان اور ویران مقام میں آخر سادھوؤں کی سی زندگی کیوں گزار رہی ہے؟ آخر یہ کیوں اپنے حسن کی جلوہ سامانیوں سے دنیا کو محروم تماشا کیے ہوئے ہے؟''

سہیلی نے جواب دیا۔

''سن اے اجنبی! یہ لڑکی عظیم سادھو کنوا اور عظیم دیوی مینا کا کی کنواری بیٹی ہے۔ یہ کہیں پلی اور یہیں بڑھی' اس کا نام اندوالہ پربھا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے میری سہیلی اپنے باپ کی اجازت سے اس تالاب پر غسل کرنے آئی تھی۔ اس کے باپ کی کٹیا یہاں سے کچھ زیادہ دور نہیں۔''

راجا مسرت و انبساط کے عالم میں سادھو کی کٹیا کی طرف چل دیا تاکہ لڑکی کے لیے اپنا پیغام دے سکے۔ اس نے اپنے گھوڑے کو کٹیا کے باہر چھوڑا اور اندر چلا گیا۔ مہاتما کنور کٹیا کے اندر موجود تھے۔ اُن کے چہرے پر تازگی اور نور تھا۔ راجا اُن کی طرف بڑھا بڑے ادب سے پرنام کیا اور چند نذرانے پیش کیے۔ جب راجا ایک طرف آرام سے بیٹھ گیا۔ تو سادھو جی اس سے مخاطب ہوئے۔

''میرے بچے کندلا والوک! میں جو کچھ تمہارے فائدے کے لیے بتا رہا ہوں غور سے سنو! زندگی آواگون کا ایک مسلسل عمل ہے اور کائنات کے تمام جاندار اس عمل سے متاثر ہیں اور ہر وقت اسی خوف میں مبتلا رہتے ہیں کہ دیکھیے آئندہ جنم میں انہیں کون سا روپ ملے' تو میرا یہ کہنا ہے کہ تمہیں زندگی سیر و شکار اور تفریح کے لیے نہیں ملی ہے۔ بھگوان نے تم بہادروں کے ہاتھ میں تلوار اس لیے دی ہے کہ تم اس سے کمزوروں کی حفاظت کرو' حقداروں کا حق دلاؤ' جو تمہاری سلطنت تمہاری پرجا کے لیے خوف اور خطرے کا باعث ہیں اُن زہریلے کانٹوں کو اُکھاڑ پھینکنے کے کام میں اپنی تلوار استعمال کرو' ہر لمحے تغیر پذیر قسمت کی مدافعت چاہتے ہو تو اپنے ہاتھیوں' اپنے گھڑ سواروں اور اپنے اعمالِ حکومت کو ان کی فطری صلاحیتوں کے مطابق کام پر لگاؤ۔ بھگوان نے جو راج پاٹ تمہیں عطا کیا ہے۔ اُس کی نعمتوں کا شکر ادا کرو اور خوشیاں اور مسرتیں حاصل کرو۔ غریبوں' کمزوروں اور سادھوؤں پر رحم کرو۔ انہیں دھن دولت دے کر اپنی شہرت اور عظمت میں اضافہ کرو اور یہ فضول کام جس کے لیے تم نے یہ طویل سفر کیا ہے۔ اسے ترک کردو کیونکہ یہ تمہارا کام نہیں ہے' ایسی چیزوں کے پیچھے مارے مارے پھرنا جنہیں تم گھر بیٹھے حاصل کر سکتے ہو۔ تمہارے جیسے ذمہ دار اور عقل مند انسان کو اپنا وقت اس طرح برباد نہیں کرنا چاہیے۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ پندو جیسا بہادر ایک معمولی جانور کے ہاتھوں اپنی جان گنوا بیٹھا تھا۔ اس سے دیوتا الگ ناراض ہوگئے تھے کہ اتنے بہادر انسان نے ایک حقیر سے مقصد میں کمزور جانور کے ہاتھوں اپنی جان دے دی۔''

راجا کندراولوک کو سادھو کی یہ تقریر بڑی دلکش محسوس ہوئی' اس نے سادھو کا شکریہ ادا کیا کہنے لگا۔

''محترم بزرگ! آپ نے انمول اُپدیش دے کر مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ انہیں میں زندگی بھر فراموش نہ کرسکوں گا۔ میں آئندہ اس سیر سپاٹے کی زندگی سے اجتناب کروں گا تاکہ اپنی پرجا پر زیادہ توجہ دے سکوں۔ اور ملک کی خوشحالی کے لیے کام کرسکوں۔''

''مجھے خوشی ہے کہ تمہیں اپنی رعایا کی خوشی کا خیال ہے بولو کیا مانگتے ہو؟'' موقع بڑا اچھا تھا۔ راجا فوراً بول پڑا۔

''اے نیک دل بزرگ میں آپ کی بیٹی اندوالہ پربھا سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

ایسا ہی ہوا جب لڑکی اشنان کر کے واپس آ گئی تو سادھو نے راجا کے ہاتھ میں اُس کا ہاتھ دے دیا۔ اسی وقت شادی کی رسمیں ادا ہوئیں اور یہ حسن کی دیوی اپنے پتی کے ساتھ بابل کی کٹیا سے روانہ ہوئی۔ اُس کٹیا سے جہاں اس نے زندگی کا ایک بڑا ہی طویل زمانہ گزارا تھا۔ ایسا زمانہ جس کی یاد زندگی بھر عورتوں کے دل میں چٹکیاں لیتی رہتی ہے۔ اس کی سہیلیاں

اُس کی جدائی کے غم میں اشک بار تھیں اور وہ خود بھی بڑی افسردہ اور ملول دکھائی دیتی تھی۔ لیکن اس کو یہ طمانیت بھی حاصل تھی کہ اسے ایک ایسا جوان مل گیا ہے جسے اس نے پہلی ہی نظر میں عشق کی تمام تر شدتوں سے چاہا تھا۔ اس کے ساتھ پوری زندگی گزارنے کا حسین تصور بھی روح افزا تھا۔ سادھو لڑکی کی سہیلیاں اور سادھو کے چیلے دور تک دونوں کو رخصت کرنے آئے اور پھر راجا گھوڑے پر سوار ہوکر اپنے سفر پر روانہ ہوگیا۔

آسمان پر چمکتا ہوا سورج راجا کا یہ مہماتی سفر سارا دن بڑی دلچسپی سے دیکھتا رہا تھا لیکن اب وہ تھک چکا تھا۔ اس لیے وہ آرام کرنے کے لیے پہاڑیوں کے پیچھے چلا گیا۔ رات سیاہ ماتمی چادر اوڑھے برہا کی اگنی میں جلتی ہوئی کسی بدصورت دوشیزہ کی مانند فضائے بسیط پر محیط ہوگئی۔ گویا دنیا والوں کی نظروں سے بچ کر چھپ چھپ کر رو رہی ہو۔

راجا کا سفر جاری تھا کہ ایک تالاب کے کنارے اسے ایک درخت دکھائی دیا۔ جسے چاروں طرف سے چھوٹے چھوٹے پودوں نے گھیر رکھا تھا۔ یہ جگہ بڑی پُرفضا تھی۔ راجا نے وہیں شب بسری کا فیصلہ کیا' وہ گھوڑے پر سے اُتر پڑا اور اپنی حسین پتنی کو بھی اتارا۔ اُس نے تالاب کے کنارے پھیلی ہوئی گھاس پر اپنی حسین پتنی کے ساتھ آرام کیا۔ وہ منظر کے حسن میں کھو گیا' پھر اُس نے وہاں کے نرم نرم پتوں سے درخت کے نیچے بستر بنایا اور اپنی بیوی کے ساتھ وہیں دراز ہوگیا۔ ٹھیک اُسی لمحے چاند نے اپنے چہرے سے تاریکی کی نقاب اُلٹ دی' مشرق کا منہ چوم لیا اور فضا نور سے معطر ہوگئی۔ چاند کی روشنی درخت کی پتیوں پر چھن چھن کر اس جوڑے پر پڑ رہی تھی۔ وہ دونوں دنیا و مافیہا سے بے خبر عشق و محبت کی بھول بھلیوں میں گم تھے۔ دونوں راز و نیاز میں محو تھے۔ راجا آہستہ آہستہ اندوار پربھا کے دریائے حسن میں ڈوبا جا رہا تھا۔ بڑی بڑی خوبصورت غزالہ آنکھیں' لمبے لمبے گھنیر سیاہ بال' بیدلرزاں کی مانند سروقد' اُس نے اُس کے ہونٹوں' آنکھوں' رخساروں اور ان تمام اعضا پر جو شدت عشق کے حامل کہے جاسکتے ہیں۔ والہانہ علاماتِ محبت ثبت کیں۔ اور اس طرح یہ رات راجا زندگی کی انتہائی پُرجوش' طوفانی اور ہیجان انگیز رات ثابت ہوئی۔

رات گزر گئی لیکن راجا کے لیے یہ طویل رات چند لمحوں سے زیادہ نہ تھی۔ وہ اب بھی پیاسا تھا۔ اس کی روح اب بھی پیاسی تھی۔ اس میں اب بھی تڑپ تھی۔ صبح کو دونوں اٹھے اور راجا اپنے ساتھیوں اور مصاحبوں کے پاس پہنچنے کے لیے چل کھڑا ہوا۔ ٹھیک اُسی وقت سورج دیوتا نے اپنی شعاؤں کے تیر سے رات کی دیوی کو ہلاک کر دیا۔ جس نے کنول کے پھولوں کو اس قدر مرجھا دیا تھا کہ اب وہ زندگی کی آخری سانسیں لیتے دکھائی دیتے تھے۔ اور پھر راجا کے چلتے ہی اچانک ایک زور دار دھماکہ ہوا۔ گویا قیامت ٹوٹ پڑی ہو۔ ایک برہمن کا بھوت (راکھشس) جس کے جسم پر بھبھوت ملا ہوا تھا۔ راجا کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اُس کے گلے میں انسان کے اندرونی اعضا کی مالائیں پڑی ہوئی تھیں۔ اُس کے بائیں کاندھے سے داہنے کولہے تک انسانی بالوں سے بنا ہوا دھاگہ پڑا ہوا تھا۔ اُس کے ایک ہاتھ میں انسانی کاسۂ سر تھا' جس میں انسانی خون اور گوشت بھرا ہوا تھا۔ پہلے وہ گوشت کا ایک ٹکڑا منہ میں ڈالتا اور پھر خون کے گھونٹوں سے اُسے گلے کے نیچے اُتار دیتا۔ اُس مافوق الفطرت مخلوق کے منہ سے ایک قہقہہ پھوٹ پڑا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے سینکڑوں بدروحیں ایک ساتھ مل کر چیخی ہوں۔ اس نے گرجدار آواز میں راجا سے کہا۔

''نابکار! سن..... میں ایک راکھشس (بھوت) ہوں۔ اس درخت پر میرا بسیرا ہے۔ اس درخت کی بے حرمتی کی دیوتاؤں تک کو جرأت نہیں ہوسکتی۔ اور تو تو تمام رات اُس کے نیچے عیش کرتا رہا' تو نے حد سے تجاوز کیا ہے۔ اچھا ہوا کہ میں رات سیر کے بعد ٹھیک اس وقت یہاں پہنچا جبکہ تو یہاں سے روانہ ہونے ہی والا تھا' اب تو اپنے کیے کی سزا بھگتنے کے لیے تیار ہوجا۔ تو میرا مجرم ہے' اب میں تیرا دل چیروں گا' اور

ان پیؤں گا۔''

یہ دھمکیاں سن کر راجا پر لرزہ طاری ہوگیا۔ اس نے نہایت لجاجت آمیز انداز میں کہا۔

''اے طاقتور راکھشس! مجھ سے یہ سب کچھ نادانستگی میں سرزد ہوا ہے لہٰذا مجھے معاف کردے مجھے ایک ایسا مہمان سمجھ جو رات گزارنے کے لیے تیرے گھر آ کر ٹھہر گیا تھا۔ میں ہر وہ کام کرنے کے لیے تیار ہوں جو تو چاہے میں تیری پسند کا انسانی شکار بھی مہیا کرسکتا ہوں۔ لیکن مجھ پر رحم کر اور مجھے معاف کردے۔''

راجا کے ان الفاظ سے راکھشس کی تسلی ہوگئی اور اس نے دل میں سوچا۔

''کوئی حرج نہیں۔'' اور پھر زور سے بولا۔

''میں تیرے اس جرم کو چند شرطوں پر معاف کرسکتا ہوں۔ جو یہ ہیں کہ آج سے ٹھیک ساتویں دن تو خود اپنے ہاتھ سے ایک ایسے سات سالہ بچے کی قربانی دے گا۔ جو برہمن ہو اور وہ خود کو تیری جگہ قربانی کے لیے پیش کرے' مگر خیال رہے کہ وہ بچہ عمدہ کردار کا مالک اور مضبوط قوتِ فیصلہ کا حامل ہو' اور قربانی کے وقت خود اس کے ماں باپ اس کے ہاتھ پاؤں پکڑ کر اسے زمین پر لٹائیں' اور اس وقت تک اسے پکڑے رہیں' جب تک کہ قربانی مکمل نہ ہوجائے' اگر یہ شرائط پوری نہ ہوئیں تو میں پلک جھپکتے میں تجھے اور جو کچھ تیرے پاس ہے سب کو بھسم کردوں گا۔''

خوف سے لرزتے ہوئے راجا نے ان تمام شرائط کو پورا کرنے پر آمادگی ظاہر کی اور راکھشس فوراً غائب ہوگیا۔ ملول اور افسردہ راجا نے اپنی حسین رانی کو گھوڑے پر سوار کیا اور اپنے ساتھیوں کی تلاش میں چل پڑا۔

''اوہو.....'' اس نے سوچا۔

''میں بھی کتنا احمق ہوں کہ شکار جیسے فضول شوق میں ایک ایسا خطرہ مول لے لیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پنڈو کی طرح مجھے بھی اپنی زندگی سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ ایسا بچہ جو ان تمام شرائط پر پورا اترتا ہو' مجھے کہاں سے مل سکتا ہے؟ اونہہ.....'' اس نے سر کو جھٹک دیا اور خود سے کہا۔

''پہلے تو شہر چلنا چاہیے اس کے بعد آنے والے واقعات کا انتظار کرنا چاہیے۔''

ایسے ہی خیالات میں راجا اپنے ساتھیوں سے جاملا اور پھر یہ سب لوگ شہر آگئے جہاں راجا کے اعزاز میں شاندار دعوت دی گئی اور اس کی شادی کا جشن منایا گیا۔ راجا کے اندرونی غم سے رانی کے سوا کوئی واقف نہ تھا اور نہ راجا نے کسی پر اس کا اظہار کیا۔

جشن کے دوسرے دن راجا نے اپنے وزیر اور مشیروں کا ایک خاص اجلاس طلب کیا۔ اور تمام واقعہ بلاکم وکاست ان کو سنا کر مشورہ طلب کیا۔ اُن میں سے ایک وزیر جو بہت بوڑھا تجربے کار اور باتدبیر تھا۔ اُس نے اِس کام کو اپنے ذمے لے کر راجا کو اطمینان اور سکون سے رہنے کی خوشخبری دی۔ اُس وزیر نے فوراً ہی سونے کا ایک ٹھوس قیمتی بت بنوایا جو ایک سات سالہ خوبصورت سے بچے کا تھا اور پھر اُس پر موتیوں اور قیمتی پتھروں کی مالائیں ڈال دیں اور حکم دیا کہ اسے ایک گاڑی میں رکھ کر تمام شہر میں گھمایا جائے اور اعلان کیا جائے کہ اگر کوئی سات سالہ برہمن بچہ ملک و قوم کی خوشیوں پر خود کو ایک راکھشس پر قربان کرنے پر تیار ہوجائے اور اس کے والدین اس کی قربانی کے لیے اُس کے ہاتھ پیر پکڑے رہنے پر آمادہ ہوں اور اس کے فیصلے کی توثیق کریں تو راجا اس بچے کے والدین کو سونے کا یہ بت جس میں قیمتی موتی جڑے ہوئے ہیں۔ اور جس کے گلے میں قیمتی مالائیں پڑی ہوئی ہیں بچے کی زندگی کے عوض یہ ساری چیزیں بڑے عزت و احترام کے ساتھ نذرانے کے طور پر پیش کردے گا۔''

برہمنوں کی کسی آبادی میں ایک سالہ بچے نے جو بہت خوبصورت اور نیک سیرت تھا۔ اُس نے یہ اعلان سنا' اتفاق کی بات کہ انسانی خدمت اور نیکی کے جذبات اُس کی رگ رگ میں سرایت کیے ہوئے تھے۔ یہ لڑکا راجا کے کارندوں کے پاس پہنچا اور کہنے لگا۔

''تم لوگ یہیں ٹھہرو میں اپنے ماتا پتا سے اجازت حاصل کر کے ابھی آتا ہوں میں قربانی دینے کو تیار ہوں۔''

اعلان کرنے والے کارندے خوش ہو گئے اور انہوں نے بچے کو ماتا پتا سے اجازت لے کر آنے کی اجازت دے دی۔ بچہ گھر گیا اور ماں باپ کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اور کہنے لگا۔

''میرے پیارے ماتا پتا! میں اپنے اس فانی جسم کو انسانی خوشحالی پر قربان کرنا چاہتا ہوں مجھے اجازت دیں تاکہ آپ کے بھی دن پھر جائیں اور راجا سے میرے ہی جتنا سونے کا بت حاصل کر کے بقیہ زندگی خوش وخرم بسر کریں۔ پھر جب آپ خوشحال ہو جائیں گے تو بھگوان آپ کو میرے جیسے بہت سے بیٹے دے گا۔'' ماں باپ کو بیٹے کی اس جرأت پر بہت غصہ آیا اور کہنے لگے۔

''لڑکے تیرے حواس تو بجا ہیں بھلا کوئی والدین دولت کے لیے اپنے بچوں کو بھی قربان کیا کرتے ہیں؟ تو یہ کیا کہہ رہا ہے کہیں کسی بھوت پریت کا سایہ تو تجھ پر نہیں پڑ گیا؟''

لڑکے نے جواب دیا۔

''آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔ دیکھیے یہ فانی جسم، گوشت اور خون کا یہ لوتھڑا ایک دن خاک ہو جائے گا۔ یا کچھ دن بعد ہو فرق صرف اتنا ہے کہ اگر اس وقت یہ جسم فنا ہو جائے تو اس سے ایک طرف تو میں اپنے ملک اور انسانیت کے لیے ایک قربانی دوں گا اور دوسری طرف آپ کے برے دن دور ہو جائیں گے اور آپ خوشحال ہو جائیں گے۔ ورنہ دوسری صورت میں میری موت بھی دوسرے عام آدمیوں کی سی موت ہوگی۔ جس سے سوائے اس کے کہ آپ میرے جسم کو آگ کے سپرد کر دیں اور کچھ حاصل نہ ہوگا تو آپ ہی بتائیں کہ کیوں نہ میں وہ کام کروں جس میں سب کا بھلا ہو۔''

ان الفاظ سے مضبوط قوت ارادری کے مالک لڑکے نے اپنے والدین کو رام کر لیا اور اُن سے اجازت حاصل کر لی۔

وہ راجا کے کارندوں کے پاس آیا اور اُن سے سونے کا بت لے کر اپنے والدین کے پاس آ گیا۔ اور پھر وہ لڑکا اپنے والدین کے ساتھ کارندوں کی ہمراہی میں راجا سے ملنے کے لیے ستراکوٹ کی طرف چل دیا۔ راجا بچے کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ راجا نے بچے کے گلے میں ہار ڈالے نئے کپڑے پہنائے اور ایک رتھ پر سوار کر کے اس کے والدین کے ساتھ اسی درخت کی جانب چلا جہاں راکھشس رہتا تھا۔ راجا کے درباری سادھو نے درخت کے نیچے ایک حلقہ کھینچ دیا۔ آگ جلائی اور ضروری رسوم سرانجام دیں اور پھر قہقہہ لگاتا ہوا راکھشس آن موجود ہوا۔ وہ وید کے اشلوک پڑھ رہا تھا۔ وہ اس وقت بھی خون پی رہا تھا۔ وہ ناچتے ہوئے قہقہے لگا رہا تھا اور اشلوک پڑھ رہا تھا اس کی سرخ سرخ آنکھیں اور سیاہ وجود موقع پر موجود تمام لوگوں کو لرزائے دے رہے تھے۔ راکھشس جیسے ہی ان لوگوں کے سامنے آیا۔ راجا گھٹنوں کے بل اس کے سامنے جھک گیا۔

''مقدس ہستی میں تیرے لیے انسانی شکار لے آیا ہوں، آج ساتواں دن ہے۔ میرے اوپر رحم کر اور یہ قربانی قبول فرما۔''

راکھشس نے اپنی سرخ سرخ آنکھیں گھما کر برہمن لڑکے کو دیکھا اور زبان سے ہونٹوں پر لگے ہوئے خون کے قطروں کو چاٹا۔ اُدھر بچہ دل ہی دل میں بہت خوش تھا اور کہہ رہا تھا۔

''میری یہ قربانی دوسرے جہاں میں چاہے مجھے سورگ میں لے جائے یا نرگ میں..... جہاں دوسروں کی مدد کا کوئی تصور ہی نہیں، لیکن میری تمام تر تمنا یہ ہے کہ بھگوا مجھے ہر جنم میں اس قابل رکھیں کہ میں دوسروں کی خوشیوں کے لیے خود کو قربان کرتا رہوں۔''

جیسے ہی یہ خیال لڑکے کے ذہن میں آیا۔ اچانک آسمان چاروں طرف سے اوتاروں سے بھر گیا۔ جو اُس پر عقیدت کے پھول برسا رہے تھے۔ پھر اس کا جسم راکھشس کے سامنے لایا گیا۔ ماں باپ بچے کے ہاتھ پاؤں پکڑے ہوئے تھے اور جب راجا نے

اسے ذبح کرنے کے لیے تلوار اٹھائی تو بچہ ہنسنے لگا۔ اور تمام موجود لوگ یہاں تک کہ خود راکھشس بھی یہ سوچ کر کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ سب فوراً ہی رُک گئے اور بچے کے سامنے جھک گئے اور ہاتھ باندھ کر منہ کے بل سجدے میں گر گئے۔

اِس دلچسپ اور سبق آموز کہانی کو ختم کرنے کے بعد روح تری وکرم سین سے مخاطب ہوئی۔

''بتا راجا' ایسے خوفناک حالات میں وہ لڑکا کیوں ہنسا؟ یہ سوال مجھے پریشان کر رہا ہے مگر یاد رکھ کہ اگر تو جواب سے واقف ہے اور بتانے سے گریز کر رہا ہے تو تیرا سر پاش پاش ہو جائے گا۔''

''سن میں تجھے بچے کے ہنسنے کی وجہ بتاتا ہوں۔ یہ فطری اصول ہے کہ ایک کمزور سا وجود جب کسی خطرے کو محسوس کرتا ہے تو فوراً ماں باپ کو پکارتا ہے۔ اگر ماں باپ مر چکے ہوں تو راجا کو یاد کرتا ہے جو اس کا سرپرست ہوتا ہے۔ اگر راجا بھی نہیں تو وہ پھر کسی دیوی یا دیوتا کی مدد چاہتا ہے۔ لیکن اگر یہ تمام ہستیاں جو اس کی مدد کر سکتی تھیں اور جو اس کے سامنے موجود تو تھیں لیکن قطعی مختلف روپوں میں' مثلاً اُس کے والدین اسے ذبح کرنے کے لیے اس کے ہاتھ اور پیر پکڑے ہوئے تھے تاکہ انہیں دولت مل سکے۔ راجا اسے ذبح کرنا چاہتا تھا تاکہ خود کو بچا سکے۔ پھر دیوی یا دیوی کی مورتی خود راکھشس تھا جو بچے کی ہلاکت سے اپنا مقصد پورا کرنا چاہتا تھا۔ اب تم اسی سے اندازہ لگا لو کہ انسان اس بے قیمت حقیر سے فانی گوشت پوست کے جسم کے ہاتھوں کس قدر دھوکہ کھا رہا ہے کہ انسانیت کو اس نے بالائے طاق رکھ دیا ہے اور ہوس کا بندہ بن کر کتنے غم اور دکھ اس نے اپنے پیچھے لگا لیے ہیں۔ چنانچہ بچے نے سوچا کہ اس دنیا سے برہما اندر وشنو اور شیو جیسی ہستیاں گزر گئیں تو خود اس کا اپنا وجود کیا اہمیت رکھتا ہے اور پھر یہ کہ ان ہستیوں کو دوسرے جہاں میں ابدی زندگی ملی۔ نیز یہ کہ اس کی اپنی زندگی کے مقاصد پورے ہو رہے تھے اور انسانی خدمت کے لیے وہ جان دے رہا تھا۔ دنیا کی بے ثباتی' اپنوں کی بے رحمی اور مسرت جو اس نے اپنے وجود میں محسوس کی' اُس کے زیر اثر بچہ ہنس پڑا تھا۔

جب راجا اپنی بات پوری کر چکا تو روح ایک بار پھر اس کے کندھے پر سے اتر کر غائب ہو گئی۔ ناچار ایک بار پھر راجہ کو شیشم کے درخت تلے جانا پڑا۔ لاش پھر حسب سابق درخت سے لٹکی ہوئی تھی۔ راجا نے اُسے اُتارا اور کندھے پر لاد کر پھر اپنی منزل کی جانب روانہ ہوا۔ سچ ہے کہ جن انسانوں کے دل ناقابل تسخیر اور ارادے چٹانوں کی مانند اٹل ہوتے ہیں وہ عظیم ہوتے ہیں۔ جب راجا لاش کو لے کر جا رہا تھا تو راستے میں روح نے پھر اُسے ایک کہانی سنائی۔

بیوقوفی

کسی زمانے میں ہندوستان کے دھرنی والا نامی شہر پر ایک راجا کی حکومت تھی۔ اس کی سلطنت میں برہمن کثرت سے تھے اور برہمن تھلا نامی آبادی میں ایک برہمن رہا کرتا تھا۔ جس کا نام وشنو سوامی تھا۔ اس کی بیوی خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ خوب سیرت بھی تھی۔ اُن کے چار بیٹے تھے۔ جب ان چاروں نے وید کا علم سیکھ لیا اور بڑے ہو گئے تو ان کے ماں باپ سورگ باش ہو گئے۔ یہ چاروں اپنے ماں باپ کے مر جانے سے بڑی ناگوار صورت حال سے دوچار ہو گئے۔ کیونکہ رشتہ داروں نے ان کے ماں باپ کی چھوڑی ہوئی تمام جائیداد اور دولت پر قبضہ کر لیا تھا۔ ایک دن انہوں نے آپس میں مشورہ کر کے یہ طے کیا کہ اب اُس مقام پر اُن کے لیے کوئی کشش باقی نہیں رہ گئی ہے۔ بہتر ہے کہ نانا کے پاس چلے جائیں اور پھر یہ مانگتے کھاتے اپنے نانا کے گھر کی طرف چل دیے۔

راستے کی تمام مشکلات اور دشواریوں کو برداشت کرتے ہوئے جب یہ اپنے نانا کے پاس پہنچے تو معلوم ہوا کہ ان کے نانا کا بھی انتقال ہو چکا ہے۔ یہاں اُن کی ملاقات اپنے ماموں زاد بھائیوں سے ہوئی۔ ان چاروں نے ان ہی کے پاس رہائش اختیار کر لی۔ لیکن جلد ہی انہیں احساس ہو گیا کہ ان کے ماموں زاد بھائی ان کے رہنے سہنے اور کھانے پلانے پر

خوش نہیں ہیں۔ ان کا تحقیر آمیز سلوک ان چاروں بھائیوں کو بڑا ناگوار گزرا اور آخر کار ایک دن انہوں نے خاموشی سے ایک دوسری جگہ آپس میں مشورہ کیا کہ ان ناگوار صورت حال سے کس طرح نمٹا جائے۔

سب سے بڑے بھائی نے کہا۔

''عزیزو! آدمی قسمت کے آگے مجبور ہے۔ ایک بدقسمت انسان کیا کرسکتا ہے۔ مثال کے طور پر میں تمہیں آج اپنا ایک تجربہ سناتا ہوں۔ میں آج بلامقصد اِدھر اُدھر پھر رہا تھا کہ میرا گذر شمشان بھومی سے ہوا۔ میں نے وہاں ایک لاش دیکھی جو پوری طرح سڑ چکی تھی۔ میں نے اس لاش کو دیکھ کر یہ سوچا کہ یہ شخص کتنا خوش قسمت ہے کہ جس کے سر سے غموں کا بوجھ اتر چکا ہے اور اب یہ آرام کررہا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے اپنی زندگی ختم کرلینی چاہیے۔ میں نے ایک درخت میں رسی باندھ کر اپنے آپ کو پھانسی دے دی۔ میں تقریباً بے ہوش ہوگیا تھا اور قریب تھا کہ میرا جسم روح سے آزاد ہوجائے کہ میں نے محسوس کیا کہ پھندا ایک دم سے کٹا اور میں زمین پر آن گرا۔ جب میرے ہوش ذرا بجا ہوئے تو میں نے ایک شفیق اور ضعیف چہرے کو اپنے اوپر جھکے ہوئے پایا۔ وہ شخص اپنی قمیض کے دامن سے مجھے ہوا دے کر ہوش میں لانے کی کوشش کررہا تھا۔

''میرے دوست!'' اُس نے کہا۔

''ذرا مجھے یہ تو بتاؤ کہ وہ کیا وجہ ہے جس نے تم جیسے پڑھے لکھے آدمی پر اس درجہ مایوسی اور ناامیدی کو غالب کردیا ہے کہ تم خودکشی جیسے مہاپاپ پر مائل ہوگئے ہو۔ تم یہ کیوں بھول گئے کہ خوش قسمتی نیک اعمال کے بدلے اور بدقسمتی بداعمال کے سبب انسان کو ملتی ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے چہرے پر تلخی کے آثار ہیں۔ تم زندگی سے خوش نہیں ہو۔ لیکن میری ہدایت صرف یہ ہے کہ جاؤ اور نیک کام کرو۔ بھگوان تمہارا بھلا کرے گا۔ کیا تم نرگ کا عذاب پسند کرو گے؟ اگر تم ہاں کہو گے تو میں تمہیں خودکشی سے نہیں روکوں گا..... ضرور کرو..... مگر یاد رکھو زندگی کے تلخ حقائق سے منہ موڑنا نامردوں کی طرح بھاگنا بھگوان کو پسند نہیں۔''

''جب میری حالت درست ہوگئی تو وہ شخص میرے پاس سے اٹھ کر چلا گیا۔ اور مجھے خودکشی کے تمام ارادوں کو ذہن سے یکسر نکال دینا پڑا۔ اب میں اس بات کا قائل ہوگیا ہوں کہ اگر قسمت میں نہ ہو تو انسان خودکشی بھی نہیں کرسکتا۔ چنانچہ میں گھر چلا آیا۔ اور اب میرا ارادہ ہے کہ کسی مقدس جگہ پر جاکر خود کو قربان کرڈالوں۔ اس سے اور کچھ نہیں تو کم از کم افلاس سے تو نجات مل ہی جائے گی۔''

چھوٹے بھائی نے کہا۔

''مگر بھائی! میں آپ سے متفق نہیں ہوں کیونکہ یہ کبھی ہو ہی نہیں سکتا کہ ایک شخص ذہین بھی ہو اور مفلس بھی' کیا آپ کو معلوم نہیں کہ ذہانت بجائے خود ایک بہت بڑی دولت ہے۔ اور کیا آپ نہیں جانتے کہ اس دنیا میں ساری دولت موسم خزاں کے آنے جانے والے بادلوں کی مانند ہے۔ دنیاوی خوشی قسمتی ایک ایسی بیوی کی طرح ہے جو آپ سے مستقلاً محبت نہیں کرسکتی یہ ایک بے وفا دوست ہوتی ہے' بالکل ہرجائی محبوب کی طرح جسے آپ حاصل کرکے کچھ دیر تو اپنے پاس رکھ سکتے ہیں مگر ہمیشہ نہیں۔ ایک ذہین شخص کسی خاص علم میں کمال پیدا کرکے اس کی مدد سے اُس ہرجائی محبوب یا دولت کو حاصل کرسکتا ہے۔''

چھوٹے بھائی کے ان الفاظ نے بڑے بھائی کو سہارا دیا وہ چونک پڑا۔

''اچھا تو ہمیں کس قسم کے علم پر عبور حاصل کرنا چاہیے۔'' اُس نے پوچھا۔

اب وہ سب اُس نکتے پر غور کرنے لگے اور کچھ دیر بعد ایک دوسرے سے کہنے لگے۔

''بہتر یہ ہے کہ ہم سیاحت کے لیے نکل جائیں اور روئے زمین پر جو علم سب سے زیادہ دلچسپ اور مفید ثابت ہو۔ اس کو سیکھیں۔'' اب ایک خاص مقام مقرر کیا گیا۔ کہ چاروں بھائی علم سیکھ کر فلاں جگہ جمع ہوں گے اور اپنے اپنے علم کے استعمال کی تدبیر سوچیں گے۔ وقت گزرتا گیا اور آخر کار مدتوں بعد ایک دن وہ چاروں مقررہ جگہ پر جمع ہوگئے اور ایک

دوسرے سے اس کے سیکھے ہوئے علم کے بارے میں سوالات کرنے لگے۔

ایک نے کہا۔

''میں نے جو علم سیکھا ہے وہ بہت ہی عظیم ہے۔ اگر مجھے کسی جانور کی کوئی ہڈی مل جائے تو میں اپنے علم کے زور سے اس ہڈی کا گوشت اُسے واپس دلا سکتا ہوں۔''

دوسرے نے کہا۔

''میں ایک جانور کے جسم پر جس کی ہڈیاں اور گوشت موجود ہوں۔ اپنے سیکھے ہوئے علم کی بدولت اس کی کھال اور بال دوبارہ اُگا سکتا ہوں۔''

تیسرے نے کہا۔

''اگر مجھے گوشت ہڈیاں کھال اور بال دے دیئے جائیں تو میں اپنے علم کے ذریعے جاندار کے اعضا پیدا کر سکتا ہوں۔''

''اور میں.....''

چوتھے نے کہا۔

''میں اپنے علم کی مدد سے ایسے کسی بھی جسم کو جس پر گوشت پوست اور اعضا موجود ہوں' زندہ کر سکتا ہوں۔''

''بہت خوب.....تب پھر چل کر اپنے اپنے علوم کو آزمائیں۔'' ایک نے کہا اور چاروں جنگل کی طرف چل پڑے۔ اب انہیں ہڈیوں کی تلاش تھی۔ قسمت کے ماروں کو ہڈیاں بھی ملیں تو وہ شیر کی تھیں۔ لیکن یہ لوگ اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ ان کے ہاتھ میں شیر کی ہڈیاں ہیں۔ بس پھر ایک نے ہڈی پر گوشت پیدا کیا دوسرے نے کھال اور بال' تیسرے نے اعضا اور تب انہیں معلوم ہوا کہ شیر ان کے سامنے ہے۔ چنانچہ نتائج سے بے خبر چوتھے نے اس میں زندگی کی روح پھونک دی۔ شیر اینڈتا ہوا بیدار ہوا۔ وہ بھوکا تھا اِس لیے وہ چاروں کو چٹ کر گیا۔ اور بڑا مطمئن ہو کر جنگل میں غائب ہو گیا۔ اور اس طرح وہ چاروں نوجوان موت کی نیند جا سوئے۔ غربت سے انہیں نجات مل گئی۔ اب کوئی اُن سے نفرت کرنے والا نہ تھا۔ ان کی معصومیت اور سادہ لوحی کہ اُن کا اپنا ہی پیدا کیا ہوا شیر انہیں ہضم کر گیا تھا۔ یہاں پر یہ حقیقت بھی کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ علم کے ساتھ ساتھ اُس کے برتنے کا سلیقہ بھی آنا چاہیے اور پھر یہ کہ یہ کوئی لازمی بات نہیں کہ ایک علم یا ایک خاص ایجاد جو شخص کوئی حاصل کرتا ہے۔ اُس کی اپنی ذات کے لیے بھی سودمند ثابت ہو۔ کیونکہ اگر قسمت یاوری نہ کرے تو اس کا یہی علم یا یہی ایجاد جس کے حصول کے لیے دنیا کے تمام انسان رشک کر سکتے ہیں۔ ممکن ہے اُس کے اپنے لیے پیغام اجل ثابت ہو جائے۔ صرف اس صورت میں کہ اگر اس علم کے درخت کی جڑیں مضبوط ہوں۔ اور اس کی آبیاری ذہانت سے کی گئی ہو۔ مفادات کی ہواؤں سے اس درخت کو بچایا گیا ہو تو اس کا درخت بار آور ثابت ہو سکتا ہے اور اُس کا لگانے والا اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

''اے مستقل مزاج اور بہادر راجا! اب بتا کہ ان چاروں بھائیوں میں سے کون سا بھائی شیر کی پیدائش اور اپنی اور اپنے باقی تین بھائیوں کی موت کا سبب بنا۔ لیکن یاد رکھ اگر تو جواب سے واقف ہے اور بتانے سے گریز کرتا ہے تو تیرا سر پاش پاش ہو جائے گا۔''

راجا نے سوچا۔

''اگر میں نے اپنی خاموشی کو توڑا تو یہ روح پھر غائب ہو جائے گی اور لاش کو پھر سے درخت پر سے اتار کر لانا پڑے گا۔ ہونہہ' کوئی بات نہیں میں پھر لاش کو درخت پر سے اُتار لاؤں گا۔''

پھر اُس نے روح سے کہا۔

''اس تمام تباہی کا ذمہ دار صرف وہ نوجوان ہے۔ جس نے شیر کو زندگی دی تھی۔ باقی تینوں نوجوان معصوم تھے۔ انہوں نے اپنے اپنے علم کے زور سے جب شیر کی ہڈی پر کام شروع کیا تو وہ اس سے ناواقف تھے کہ یہ ہڈی کس کی ہے؟ لیکن آخری نوجوان کے سامنے شیر اپنی پوری قدرتی شکل اور اعضاء کے ساتھ موجود ہو گیا تھا۔ اب عقل مندی کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ اسے زندگی نہ دیتا لیکن صرف اپنے علم کا زور دکھانے کے لیے اُس نے شیر کو زندگی دے

دی۔ جو چاروں کی ہلاکت کا سبب بنی۔ پس ثابت ہوا کہ وہی نوجوان برہمنوں کی ہلاکت کا ذمہ دار اور مجرم ہے۔''

راجا کا جواب سن کر ایک بار پھر روح اس کے کندھے پر سے غائب ہوگئی۔ مہاراجا تری وکرم سین کو پھر درخت تک جانا پڑا اور لاش کو اُتار کر لانا پڑا۔ راستے میں پھر اس باتونی روح نے راجا کو یہ کہانی سنائی۔

اَعادۂ شباب

ہندوستان کی ایک مشہور راجدھانی میں کسی زمانے میں شوبھاوتی نام کا ایک شہر آباد تھا۔ اس شہر میں بے شمار علماء' اور شرفا رہتے تھے۔ جس طرح دوسرے جہاں میں اندر کی قلمرو میں صرف عالم' فاضل اور شریف لوگ ہی رہتے ہیں۔ یہاں کا حکمران پرادیومنا تھا جو طاقت عظمت اور جاہ وجلال کے اعتبار سے قدیم راجا پرادیومنا سے کسی طرح کم نہ تھا۔ جس کے کارناموں سے تاریخیں بھری پڑی ہیں۔ اس کی سلطنت میں بدقسمتی کا نام ونشان تک نہ تھا۔ ٹیڑھا یا ترچھا پن صرف کمانوں میں دکھائی دیتا تھا۔ تیزی اور طراری صرف حاضر جوابی اور باتدبیری میں پائی جاتی تھی۔

اس شہر کے اطراف میں راجا نے زمین کا ایک قطعہ برہمنوں کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ جہاں یہ بہت بڑی تعداد میں آباد تھے۔ اس قلعہ آبادی کو بیجنا ستھلا کہتے تھے۔ اس بستی میں وید کا ایک بہت بڑا عالم رہتا تھا جس کا نام بیجنا سوما تھا۔ اس کی امارات کا یہ عالم تھا کہ دیوتا اس کے مہمان ہوا کرتے تھے اور وہ ان پر خوب بھینٹیں چڑھاتا' اس برہمن کو بھگوان نے بڑی دعاؤں کے بعد ایک بیٹا دیا۔ ''ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔'' کے مطابق یہ لڑکا دیوتا سمان تھا۔

وہ بچپن ہی سے دوسرے بچوں سے مختلف نظر آتا تھا اس نے شروع ہی سے علم کی جانب توجہ دی اور جب وہ سولہ سال کا ہوا تو عادت واطوار' سیرت اور علم کے معاملے میں اس نوجوان نے سب کو پیچھے چھوڑ دیا۔ لیکن اچانک اُسے بخار نے آلیا۔ ماں باپ نے اس قدر جانفشانی کے ساتھ بیٹے کی تیمارداری کی کہ مثال بن گئی اور جب وہ مرگیا تو کافی عرصے تک دونوں اس کی لاش کو مسالہ لگا کر سینے سے لگائے رہے۔ اور مرگھٹ بھیجنے پر تیار نہ ہوئے۔

''برہمن! تعجب ہے کہ تم جیسا آدمی جو دنیا کے نشیب وفراز سے اچھی طرح واقف ہے اور وید کے علوم پر بے مثل عبور رکھتا ہے ایسی حرکت کر رہا ہے۔ تمہیں نہیں معلوم کہ یہ زندگی کس قدر ناپائیدار اور بے وفا ہے۔ یہ دنیا سراب کی طرح ہے اور زندگی سطح آب کے بلبلے سے زیادہ دیرپا نہیں ہے۔ بڑے بڑے جلیل القدر اور باجبروت راجا جن کی سیناؤں سے کبھی دھرتی کا کلیجہ کانپتا تھا' اور جن کی خدمت میں بے شمار حسین اور نوخیز دوشیزائیں داسیوں کی طرح لگی رہتی تھیں۔ جن کے جسم ہمیشہ مشک وعنبر کی خوشبوؤں سے مہکتے تھے۔ جو ہمہ وقت محلوں میں خوبصورت جڑاؤ کے بستروں پر پڑے ہوئے مدھم سریلی دھنوں سے جی بہلایا کرتے تھے' وہ سب ایک ایک کر کے شمشان بھومی لائے گئے اور چتا میں جلا دیے گئے۔ اگر انہیں سرخ سرخ زبانیں لپکاتے ہوئے شعلوں کے حوالے نہ کیا گیا ہوتا تو وہ گیدڑوں کی خوراک بنتے اور وقت نے ان کے جسموں کو خاک میں ملا دیا ہوتا۔ آج ہم ان کے لیے بھی آنسو کا کوئی قطرہ نہیں بہاتے تو دوسروں کا کہنا ہی کیا۔ بھلا موت پر کسی کا کیا زور' اب تو ہی بتا اے عقلمند عالم آخر اس لاش کو سینے سے چمٹائے پھرنے سے کیا حاصل.....؟''

بستی کے لوگوں نے اس انداز میں بیجنا سوما کو سمجھا بجھا کر لاش کو مرگھٹ پہنچانے پر مجبور کیا بڑی ردو قدح کے بعد وہ اپنے بیٹے کی لاش لوگوں کے حوالے کرنے پر رضامند ہوا۔ مذہبی رسوم ادا کی گئیں اور لاش کو ایک چارپائی پر رکھ کر لوگ مرگھٹ کی جانب لے کر چلے۔ ایک جم غفیر تھا جو لاش کے پیچھے روتا اور پچھاڑیں کھاتا چل رہا تھا۔ مرگھٹ میں ایک یوگی سادھو جوشو کے پجاری طبقے مہاپاسوپتا سے تھا ایک چھوٹی سی کھوہ میں اپنے ایک چیلے کے ساتھ رہا کرتا

تھا۔ اُس کا جسم عمر کی طوالت اور گیان دھیان کے سبب کمزوری اور لاغری کے اس درجے کو پہنچ گیا تھا کہ اس کے جسم کی وریدیں تاروں کی مانند جسم میں پھیلی ہوئی تھیں۔ جن سے جسم جڑا ہوا تھا اور اگر ایسا نہ ہوتا تو اس کے جسم کا ایک ایک حصہ الگ ہو کر گر پڑتا اس کا نام راما شو تھا۔ اس کے جسم پر چھوٹے چھوٹے سے بال تھے جو راکھ سے اَٹے ہوئے تھے۔ اُس کے سر کے سنہرے بال ایک تاج کی مانند جوڑے میں بندھے رہا کرتے تھے۔ وہ عظیم دیوتا شو کا مہا پجاری تھا۔ اس کا شاگرد بڑا ہی بے وقوف اور شیطان صفت لڑکا تھا۔ جو مانگ تانگ کر گزارہ کرتا تھا۔

سادھو نے لوگوں کے رونے دھونے کی آواز سنی تو اپنے شاگرد سے کہا۔

''جا اور جا کر دیکھ کہ یہ غیر معمولی ماتم کی آواز کہاں سے آ رہی ہے..... جا اور جلد واپس آ۔''

''ہونہہ..... میں کیوں جاؤں؟ میرا مانگنے کا وقت جا رہا ہے۔ جاؤ اور خود معلوم کرو۔'' منہ پھٹ اور گستاخ شاگرد نے جواب دیا۔

''لعنت ہو تم پر..... پیٹ کے پجاری..... ابھی صبح بھی ٹھیک سے نہیں ہوئی..... یہ تمہاری روزی کا کون سا وقت ہے؟'' سادھو نے کہا۔

''لعنت ہو تم پر بڈھے ہڈیوں کے پنجر' کھوسٹ' نہ میں تمہارا شاگرد' نہ تم میرے استاد' میں جا رہا ہوں اپنا تام جھام سنبھالو۔'' یہ کہہ کر لڑکا اٹھا اور باہر نکل گیا۔

سادھو مسکراتا ہوا اٹھا اور باہر آ گیا۔ برہمن لڑکے کا جنازہ چتا کی جانب لے جایا جا رہا تھا۔ نوجوان کی لاش دیکھ کر برہمن کی رال ٹپک پڑی۔ وہ اپنے موجودہ جسمانی غلاف سے اُکتا چکا تھا۔ اور اب اسے بدلنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے کھڑے کھڑے فیصلہ کیا کہ وہ برہمن لڑکے کے جسم میں حلول کرلے گا' وہ فوراً ہی ایک ویران گوشے میں چلا گیا اور پوری آواز سے چلانے اور رونے لگا۔ اور پھر ٹھمک ٹھمک کر ناچنا شروع کر دیا اور یوگا کے جادو کے ذریعے برہمن نے اپنی روح کو جسم کے لباس سے آزاد کیا اور فوراً ہی برہمن لڑکے کے نوجوان جسم میں داخل ہو گیا۔ سوکھی لکڑیوں پر رکھی ہوئی لڑکے کی لاش میں حرکت پیدا ہوئی۔ لڑکے نے آنکھیں کھول دیں اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ جب لڑکے کے رشتے داروں نے اسے زندہ ہوتے دیکھا تو مسرت وانبساط کے نعرے بے اختیار اُن کے ہونٹوں سے نکل گئے۔

''بھگوان نے کرم کر دیا..... نیا جیون دے دیا..... نیا جیون دے دیا۔'' وہ چیخے مہا پجاری نے لوگوں کو حقیقت سے آگاہ نہیں کیا بلکہ کہنے لگا۔

''میں ابھی ابھی دوسری دنیا سے واپس آ رہا ہوں۔ دیوتا شو نے ذاتی طور پر اپنے حکم سے مجھے یہ زندگی دی ہے اور حکم دیا کہ میں مہا پاسوپتا طبقے سے اپنا ناتا جوڑ کر گیان دھیان میں جیون گزاروں' چنانچہ میں فوراً ہی دنیا کو تج کر جنگلوں میں چلا جانا چاہتا ہوں۔ ورنہ میری زندگی پھر مجھ سے چھن جائے گی' لہٰذا مجھے میرے حال پر چھوڑ دو تاکہ میں اپنا فرض بجالاؤں۔''

لوگوں کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو غم اور خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ واپس چلے گئے۔ اس کے بعد یہ یوگی جس نے دوسری مرتبہ شباب حاصل کرلیا تھا۔ اپنا پرانا جسم گڑھے میں دبا کر کسی دوسرے علاقے میں چلا گیا۔

کہانی سنا چکنے کے بعد روح نے راجا سے پھر سوال کیا۔

''بتا اے راجا کہ یوگی لڑکے کے جسم میں داخل ہونے سے پہلے چلایا اور رویا کیوں اور بعد میں ناچا کیوں؟ مگر یاد رکھ اگر تو جواب سے واقف ہے اور تو بتانے سے گریز کرتا ہے تو تیرا سر پاش پاش ہو جائے گا۔''

راجا نے جواب دیا۔

''سن! بوڑھے پجاری کے ذہن میں جو خیال تھا وہ یہ تھا۔ اب میں اپنے اُس جسم کو خیر آباد کہہ رہا ہوں۔ جس کی پرورش میرے ماتا پتا نے کی تھی۔ جس کی رفاقت میں میں نے بچپن گزارا جوانی گزاری' یہاں تک کہ بوڑھا ہو گیا' اور جس کی مدد سے میں نے یوگا سیکھا' اسی غم میں وہ رونے لگا کیونکہ ہر شخص کو اپنے

جسم سے بے پناہ محبت ہوتی ہے۔ اس کے بعد وہ ناچنے لگا' وہ سوچ رہا تھا۔ میں ایک نئے جسم میں داخل ہو کر نئی شکتی حاصل کرنے جا رہا ہوں۔ جس کے بعد میں اس سے بھی طاقتور یوگا سیکھ سکوں گا۔ ظاہر ہے کہ نوجوانی کی تمنا ہر شخص کو ہوتی ہے نوجوانی کے حصول کا خیال ہی اس کے لیے حیات آفریں تھا۔ وہ اپنے پرانے جسم کو کھونے اور نئے جسم کو پانے کی خوشی اور غم کی مختلف اور متضاد کیفیتوں میں مبتلا تھا۔''

راجا کا یہ جواب سن کر ایک بار پھر روح اس کے کندھے پر سے غائب ہوگئی اور اسے پھر ایک مرتبہ درخت تک جا کر لاش کو واپس لانا پڑا۔ وہ لاش کو واپس لا رہا تھا کہ اسے روح نے پھر ایک کہانی سنائی۔

گورکھ رشتہ

کسی زمانے میں جنوبی ہند پر ایک گورنر دھرم کی حکومت تھی۔ یہ شخص انصاف پسند حکمرانوں کی فہرست میں سرفہرست تھا۔ اس کے بہت سے رشتہ دار بھی تھے اُس کا نام دھرم تھا۔ اس کی بیوی مالوے کی رہنے والی تھی۔ یہ عورت بھی اپنے خاوند کی طرح حسین عورتوں میں اپنا جواب آپ تھی۔ اس کا نام چندراوتی تھا اور اس عورت سے دھرم کی صرف ایک بیٹی تھی جس کا نام لونیاوتی تھا۔ یہ لڑکی حسن و جمال میں یکتائے روزگار تھی۔ جب اس لڑکی نے جوانی کی حدود میں قدم رکھا تو گورنر دھرم کو سازشی عناصر نے معذول کر دیا اور اس طرح گورنر کی دولت اور ملک کے حصے بخرے ہوگئے۔ دھرم اپنی بیوی اور بیٹی کو لے کر رات کی تاریکی میں محل سے فرار ہوگیا اور زر و جواہر کا وہ خزانہ جو اُس نے ایسے ہی آڑے وقت کے لیے محفوظ کیا تھا۔ اپنے ساتھ لے گیا۔ دھرم اپنے خسر کے پاس جانا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ عازم مالوہ ہوا۔ چلتے چلتے پھر رات آ گئی اس وقت تینوں مسافر کوہ وندھیاچل کے جنگلات میں داخل ہو چکے تھے۔

دھرم جنگل میں چلتا رہا ایسے وقت میں رات اس کی رفیق تھی۔ تاریکی اور ہواؤں کی سنسناہٹ اور شبنم کے گرتے ہوئے قطرے' گویا یہ سب دھرم کے سب سے زیادہ وفادار ساتھی کی حیثیت سے پیش پیش تھے۔

رات جیسے سیاہ ماتمی لباس میں اس کی بربادی پر سسک رہی تھی۔ چلتے چلتے یہ قافلہ ایک ایسے مقام پر پہنچا جہاں بھیل قبائل آباد تھے۔ ان لوگوں کا پیشہ لوٹ مار اور قتل و غارت گری تھا۔ انہوں نے جیسے ہی دھرم کو شاہی لباس میں دیکھا ایک گروہ مہلک ہتھیاروں سے مسلح لوٹ مار کی غرض سے باہر نکل آیا تھا۔ دھرم نے جب یہ صورت حال دیکھی تو اپنی بیوی اور بیٹی کو جھاڑیوں کے پیچھے چھپ جانے کے لیے کہا اور خود تلوار اور ڈھال لے کر مقابلے کے لیے تیار ہوگیا۔ دونوں عورتیں جھاڑیوں میں چھپی تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ دھرم نے ڈاکوؤں کا بڑی جوانمردی سے مقابلہ کیا اور ان میں سے بہت سے لوگوں کو مار گرایا۔ ان کے سردار نے جب یہ صورت حال دیکھی تو قبیلے کے تمام افراد کو دھرم کے مقابلے پر لے آیا اور آخر کار وہ بہادر انسان داد شجاعت دیتے ہوئے زخمی ہو کر گرا اور ختم ہوگیا۔ ڈاکو دھرم کی قیمتی پوشاک اور تمام دولت لوٹ کر لے گئے۔ ان کے جانے کے بعد چندراوتی جھاڑیوں سے اپنی جوان بیٹی کے ہمراہ باہر نکلی دھرم کی لاش دیکھ کر ماں بیٹی کے دل خون ہوگئے اور غم واندوہ کے تاریک سائے ان کے چہروں پر لہرانے لگے۔ صبح ہو چکی تھی۔ لہٰذا یہ دونوں وہاں سے چل دیں اور ایک دوسرے جنگل سے مالوے کی طرف روانہ ہوئیں۔

دوپہر ڈھل رہی تھی۔ رانی چندراوتی اپنی بیٹی کو لیے چلی جا رہی تھی۔ آخر اشکو کے ایک درخت کے نیچے ستانے کے لیے دونوں بیٹھ گئیں اور رونے لگیں۔ اسی دوران ایک معزز اور نیک دل کندا سبھا نامی شخص اپنے بیٹے سبھا پر اکرما کے ساتھ شکار کی غرض سے گھوڑے پر اُدھر سے گزرا۔ اچانک اُس کی نظر دونوں ماں بیٹی کے قدموں کے نشانات پر پڑی۔ ریت میں یہ نشانات بہت واضح تھے۔ اس نے اپنے بیٹے سے مشورہ کیا کہ ان نشانات کا پیچھا کرنا چاہیے۔ اگر ان میں سے کوئی عورت میں نے تمہارے لیے موزوں پائی تو میں اس سے تمہاری شادی کر دوں گا۔''

''پتا جی! یہ چھوٹے چھوٹے قدموں والی عورت مجھے بڑی خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔ میری خواہش ہے کہ اس سے شادی کروں۔'' بیٹے نے کہا۔

''مجھے یقین ہے کہ یہ عورت میرے لیے اچھی بیوی ثابت ہوگی اور وہ بڑے بڑے قدموں والی عورت اُس سے آپ شادی کر لینا۔''

''واہیات ابھی تمہاری ماں کو مرے دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ جو میں دوسری کی فکر کروں۔ بھلا اُس جیسی وفا شعار اور حسین بیوی اب مجھے کہاں مل سکتی ہے۔'' باپ نے جواب دیا۔

''پتا جی! میں اس بات کو نہیں مانتا۔ آپ کو شادی کرنی ہی پڑے گی۔ ایک گرہستی والا گھر عورت کے بغیر سُونا ہوتا ہے' اور کیا آپ نے مول دیو کا یہ قول نہیں پڑھا کہ اگر کسی گھر میں خوبصورت بھاری کولہوں اور متناسب جسم کی عورت شوہر کا انتظار دروازے پر کھڑی نہ کرے تو وہ گھر ایک جیل ہے۔ جہاں بغیر بیڑیاں پہنائے قیدیوں کو رکھا جاتا ہے اور جس میں صرف بے وقوف لوگ ہی داخل ہو سکتے ہیں۔ اگر آپ نے اس بڑے قدموں والی عورت سے شادی نہ کی تو میں اس زندگی پر لعنت بھیج دوں گا۔''

ناچار کندا سبھا نے بیٹے کی اس خواہش پر رضا مندی ظاہر کر دی۔ اور یہ لوگ خاموشی اور آہستگی کے ساتھ اشوک کے درخت کی جانب بڑھنے لگے۔ جہاں یہ معزز خواتین بیٹھی بین کر کے رو رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے ماں بیٹی کو جا لیا۔

دونوں عورتیں کھڑی ابھی تک کانپ رہی تھیں۔ خوف ہراس اور رنج و الم کے آثار اُن کے چہروں سے ظاہر تھے۔

''تم دونوں آخر اس قدر پریشان کیوں ہو بیٹھ جاؤ اور ہمیں اطمینان سے بتاؤ کہ تم کون ہو اور یہاں کیوں آئی تھیں۔ اپنے تمام اندیشوں کو دل سے نکال دو۔ تمہارے نام مستی اور مسرت تو نہیں ہیں جو عشق کی موت پر آنسو بہانے آئی ہو۔ اور جسے شو دیوتا کی تیسری آنکھ سے نکلنے والی آگ نے کیلاش کے پہاڑ پر جلا کر بھسم کر دیا تھا؟ تم دونوں کا حسن تو اس قابل ہے کہ محلوں میں رانیاں بن کر رہو۔ اور بہت سے انسانوں کے دلوں پر حکومت کرو۔ تم دونوں رونے دھونے اور تکلیفیں اٹھانے کے لیے نہیں پیدا کی گئی ہو۔ دیکھو..... تمہارے پیروں میں چھالے پڑ گئے ہیں۔ جگہ جگہ کانٹے چبھے دکھائی دیتے ہیں حالانکہ یہ پیر تو اس قابل ہیں کہ اطلس اور کمخواب کے فرش پر رکھے جائیں۔ ہمیں تم دونوں کو اس حال میں دیکھ کر سخت صدمہ ہوا ہے۔ یہ حسین چہرے جن کے حسن کی آب و تاب کو خاک و دھول کی اتنی موٹی تہہ بھی دھندلا نہ سکی۔ آہ! ان کی قدر و قیمت کوئی ہمارے دل سے پوچھے۔ تم پہلے ہمیں اپنی کتھا سناؤ ہم تو سوچ بھی نہیں سکتے کہ تم جیسی دیویاں اس خونخوار درندوں سے پُر جنگل میں کبھی پہنچ سکتی ہیں۔''

کندا سبھا کی اس مہذب پُر اثر اور طویل تقریر سے دونوں ماں بیٹی کو قدرے سکون ملا اور چندراولی نے اپنی دردناک داستان اُسے سنا دی۔ باپ بیٹے پر اس داستان کا گہرا اثر ہوا اور وہ انہیں نہایت عزت و احترام سے اپنے محل میں لائے جو تاپاپوری میں واقع تھا بڑے پیروں والی عورت چندراولی کی بیٹی ثابت ہوئی اور اس نے کندسبھا یعنی باپ سے شادی کی' چھوٹے قدموں والی عورت ماں ثابت ہوئی یعنی چندراولی اور اس نے سبھا پرا کرما سے شادی کر لی۔ کیونکہ دونوں باپ بیٹے میں پہلے ہی اس مسئلہ پر قول و قرار ہو چکا تھا۔ اس طرح قدموں کے نشانوں سے پیدا ہونے والی غلط فہمی نے یہ دلچسپ صورت حال پیدا کر دی کہ ماں اپنی بیٹی کی بہو بنی اور بیٹی ماں کی ساس' کچھ عرصے کے بعد دونوں ماں بیٹی کے بیٹا اور بیٹی پیدا ہوئے۔ اور پھر ان کی نسل چل نکلی اور اس طرح اس نئے خاندان نے جنم لیا۔

جب راستے میں روح نے اس کہانی کو ختم کر دیا تو اس نے تری وکرم سین سے پوچھا۔

''راجا بتا! ماں بیٹی اور باپ بیٹے سے اس طرح پیدا ہونے والے بچوں کا رشتہ آپس میں کیا ہوگا؟''

یہ سوال بہت مشکل تھا۔ راجا نے بڑا غور و خوض کیا لیکن اس کی سمجھ میں نہ آ سکا اور وہ خاموشی سے

راستہ طے کرتا رہا۔ اُدھر روح یہ سوچ رہی تھی کہ راجا اس کے سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔ اور وہ بڑی خوشی سے منزل مقصود کی طرف جا رہا ہے مگر میں اس نیک دل بہادر اور عظیم راجا کو دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتی۔ کیونکہ وہ بدمعاش سادھو گھات لگائے بیٹھا ہے کہ کب راجا لاش اس کے پاس لے کر پہنچے اور کب وہ اپنے مکروہ عزائم کو پورا کرے مگر میں اس کے تمام عزائم خاک میں ملا دوں گی۔ وہ خبیث ہے اور اسے وہ شکتی نہیں ملنی چاہیے۔

جس کے لیے اس نے یہ سب کھڑاگ پالا ہے۔ میں وہ عظمت و سربلندی جس کے لیے اس ناہنجار سادھو نے اتنے مہان راجا کو دھوکے میں ڈال کر اس کی جان تک لینے کی کوشش کی ہے۔ اسی راجا کو عطا کروں گی کیونکہ یہ حقیقت میں اس کا مستحق ہے۔ یہ سوچ کر روح راجا سے مخاطب ہوئی۔

''اے مہان راجا! مجھے اس بات کا احساس ہے کہ اتنی دفعہ آنے جانے سے تو تھک چکا ہوگا لیکن حیرت کی بات تو یہ ہے کہ اب تک تیرے چہرے پر اکتاہٹ یا ماتھے پر غصے کے آثار نظر نہیں آئے۔ میں تیرے اس غیر معمولی تحمل سے بہت خوش ہوں۔ اور میں تجھے اجازت دیتی ہوں کہ اس لاش کو اس سادھو کے پاس پہنچا دے جس سے تو نے وعدہ کیا ہے لیکن سن جب تو وہاں پہنچے گا تو وہ ناہنجار سادھو پہلے تو اپنے عمل کے زور پر مجھے طلب کرے گا۔

چنانچہ میں اس کے سامنے پہنچوں گی تو وہ میری پوجا کرے گا اور اس کے بعد تجھ سے کہے گا کہ زمین پر اس طرح سجدہ کر کہ تیرے آٹھوں اعضا زمین کو چھوئیں تجھے ایسا حکم دے کر دراصل وہ تجھے قربان کرنا چاہے گا۔ چنانچہ تم اس سے کہنا کہ پہلے تم خود سجدہ کر کے دکھاؤ تاکہ میں ویسا ہی کروں' بس وہ خود عملی طور پر سجدہ کر کے تجھے بتائے گا کہ تجھے اس طرح سجدہ کرنا ہے۔ بس یہی موقع تیرے لیے ہوگا کہ تم فوراً اس کا سر تن سے جدا کر دو۔

ایسا کرنے کے بعد اس کی جگہ تم لے لو گے اور ماورائے ادراک قوتوں پر تجھے حکمرانی مل جائے گی۔ بس تو اسے ختم کر دے اور روئے زمین پر تیری حکمرانی ہوگی۔

یہ کہہ کر وہ روح راجا کے کندھے پر سے غائب ہوگئی اور راجا لاش کو لیے چلتا رہا۔ اُسے اس بات کا بڑا غم تھا کہ سادھو نے اسے اتنا بڑا دھوکہ دیا اور اس کی سادگی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔

راجا لاش لے کر سادھو کے پاس پہنچ گیا۔ مرگھٹ اس وقت بھی بڑا بھیانک منظر پیش کر رہا تھا۔ سادھو نے درخت کے نیچے ایک حلقہ کھینچ رکھا تھا۔ جس میں زمین پر چاروں طرف خون ہی خون دکھائی دیتا تھا۔ یہ حلقہ انسانی ہڈیوں کے سفوف سے کھینچا گیا تھا۔ حلقے کے اندر چاروں طرف چراغ جل رہے تھے۔

جن میں انسانی چربی استعمال کی گئی تھی اور اس طرح سادھو نے وہ تمام ماحول مہیا کر دیا تھا جو کسی ایسے جاپ کے لیے ضروری ہوسکتا ہے۔ راجا کو لاش لاتے دیکھ کر سادھو کی باچھیں کھل گئیں۔ خباثت کے اثرات اس کے چہرے پر گہرے ہوگئے اور اس نے کہا۔

''مہاراج کی جے..... تُو نے میرے لیے ایک ناممکن کام کو ممکن بنا دیا ہے۔ بھلا تیرے جیسی اعلیٰ ہستی کا یہاں اس ویرانے میں اس خوفناک مقام پر کیا کام..... واقعی تیرے عوام اگر تجھ پر جان چھڑکتے ہیں تو غلط نہیں کرتے کیونکہ تو اس کا مستحق ہے۔ تو وعدے کا سچا ہے اور شجاعت میں لاجواب ہے۔ میں تجھے خراج عقیدت پیش کرتا ہوں۔ جیسا کہ داناؤں نے کہا کہ عظیم انسان کی عظمت کا راز اس حقیقت میں پوشیدہ ہے کہ وعدہ کر کے اس کے ایفا میں اگر جان بھی جاتی ہے تو پیشانی پر شکن ڈالے بغیر موت کو قبول کر لے۔''

باتیں کرتے کرتے سادھو نے راجا کے کندھے پر سے لاش اتروائی اور اسے خوشبوؤں میں بسایا۔ اس پر پھولوں کے ہار چڑھائے اور حلقے کے اندر لا کر رکھ دیا۔ چند لمحے وہ بے حس و حرکت کھڑا رہا۔

اس کے بائیں کندھے سے دائیں کولہے تک ایک دھاگا جو تمام برہمن پہنتے ہیں اور جسے جنیؤ کہتے ہیں پڑا ہوا تھا..... وہ دھاگا انسانی بالوں سے بنایا گیا

تھا۔ اُس کا تمام جسم سفید راکھ سے اَٹا ہوا تھا۔ اور وہ منتر پڑھ رہا تھا۔ اپنے جادو کے زور سے اس نے اُسی روح کو بلایا اور اسے لاش کے اندر داخل ہونے پر مجبور کیا۔ اُس کے بعد اس نے پوجا پاٹ شروع کی۔ پہلے اس نے روح کو نذرانے پیش کیے۔ جو ایک انسانی کاسۂ سر میں رکھے ہوئے تھے۔ نذرانے میں انسانی دانت ایک پھول' دو انسانی آنکھیں اور انسانی گوشت تھا' اور اس طرح پوجا پاٹ سے فارغ ہونے کے بعد وہ راجا کی طرف مڑا۔

''اے نیک دل راجا! اس مہان جادوگر کے سامنے جو اس وقت یہاں موجود ہے۔ سجدہ کر اس طرح کہ تیرے آٹھوں اعضا زمین کو چھوئیں اور دلی مراد حاصل کر۔''

راجا کو روح کی ہدایت یاد آ گئی اور اس نے سادھو سے پہلے خود سجدہ کرنے کو کہا تا کہ وہ دیکھے کہ یہ سجدہ کس طرح ہوگا۔ سادھو فوراً ہی سجدے میں گر پڑا اور راجا نے ہدایت کے مطابق اس کی گردن تن سے جدا کر دی۔ پھر اس کا سینہ چاک کر کے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کیے اور سر اور دل روح کے حضور بطور نذرانہ پیش کیے۔

راجا اب بہت سی نامعلوم روحوں کی آواز سن رہا تھا جو اس لاش کے اندر سے آتی ہوئی سنائی دے رہی تھیں۔ ان آوازوں میں روح کی آواز سب سے نمایاں تھی جو تھوڑی دیر پہلے اس سے مخاطب تھی۔

''اے راجا..... جب تیری سلطنت پر سے تیری حکمرانی ختم ہو جائے گی۔ تو بہت سی آسانی قوتوں پر تیری حکمرانی شروع ہوگی۔ میں نے تجھے بڑی تکلیف پہنچائی اور تو نے نہایت استقلال سے اسے برداشت کیا۔ میں تجھ سے بہت خوش ہوں۔ بول کیا مانگتا ہے۔''

''اے مقدس روح! جب تو مجھ سے خوش ہے تو تیری خوشی سے زیادہ مجھے کسی اور بات کی تمنا نہیں ہو سکتی۔ لیکن یہ اگر تیرا حکم ہے تو میں تجھے اپنی خواہش سے ضرور آگاہ کروں گا۔ میری یہ خواہش ہے کہ تیری یہ دس کہانیاں جو تُو نے مجھے سنائی ہیں' رہتی دنیا تک انسانوں کے درمیان مقبول رہیں۔''

''ایسا ہی ہوگا۔'' روح یہ کہہ کر غائب ہوگئی۔ اس کے بعد بھگوان دیوتاؤں کے ساتھ خود آئے۔ انہوں نے کہا۔

''اے میرے سپوت تُو نے بہت بڑا کارنامہ سر انجام دیا ہے۔ بڑی بہادری کا ثبوت دیا ہے۔ میں تجھ سے بہت خوش ہوں۔ یہ ناہنجار' بدکردار بوڑھا طاقت کے بل پر اُن دیکھی طاقتوں کو زیر کرنا چاہتا تھا۔ جان لے کہ میں نے تجھے خود اپنے جسم کے ایک حصے سے پیدا کیا ہے تا کہ تو وحشی انسانوں کے درمیان موجود بھوت پریتوں کا خاتمہ کر سکے۔ تو بہادر ہے مہان ہے جب تجھے تمام روئے زمین پر اور اس کے اندر جو کچھ ہے۔ اس پر غلبہ حاصل ہو جائے گا۔ تو آسمان تجھے اپنی آغوش میں لے لے گا۔

تو وہاں کا بہت عظیم حکمران ثابت ہوگا۔ لیکن ایک دن تجھے میرے پاس لوٹنا ہوگا۔ لے یہ تلوار میری طرف سے تحفہ ہے۔ جو نصرت کا نشان ہے اور جس کی مدد سے ہر وہ شے جو تُو چاہے گا تجھے ملے گی۔'' اور اس طرح بھگوان تری وکرم سین کو تلوار دے کر رخصت ہوئے۔

راجا نے جب دیکھا کہ کھیل ختم ہو چکا ہے تو وہ اپنی راجدھانی کی طرف لوٹا۔ رات ختم ہو رہی تھی۔ صبح کا وقت تھا۔ راجا محل کی طرف جا رہا تھا۔ شہر پہنچا تو شہر کے دروازے پر عوام کو استقبال کے لیے تیار پایا کیونکہ انہیں راجا کی اس مہم کا علم ہو گیا تھا۔ جس پر وہ رات گئے خفیہ طریقے سے چلا گیا تھا۔ سارے ملک میں خوشی کے شادیانے بجائے گئے۔

جشن منائے گئے اور راجا سارا دن غریبوں اور کمزوروں کی مدد کرتا رہا۔ چند ہی سالوں کے مختصر سے عرصے میں راجا نے بھگوان کی عطا کردہ تلوار اور اپنی بہادری سے تمام روئے زمین پر اور زمین کے اندر جو کچھ ہے۔ اس پر بھی حکومت حاصل کر لی۔ اور جب اس کا دل اس شان و شوکت سے بھر گیا۔ تو وہ بھگوان سے جا ملا۔

(ختم شد)

سچی کہانیاں میں شائع ہونے والی یادگار کہانی

وہ ہمارے خاص مہمان

تنویر سپرا کا شعر

شاید میں غلط دور میں اترا ہوں زمیں پر
ہر شخص تحیر سے مجھے دیکھ رہا ہے

پروین حیدر

میں پہلے مختصراً اپنے خاندان کے چند صاحب کرامت بزرگوں کا ذکر کروں گی جو مجھے میرے بزرگوں نے سنائے اور جو واقعہ میں آپ کو سنانے جا رہی ہوں اس کی چشم دید گواہ میں خود ہوں۔ یہ تمام

واقعات دھاگوں کا ایک ایسا الجھا ہیں جن کا ہر سرا ایک دوسرے سے منسلک ہے مگر جب سوچنے اور سلجھانے بیٹھو تو کوئی سرا ہاتھ نہیں آتا۔

میرے مورثِ اعلیٰ قبلہ سید عبداللہ شاہ سبزواریؒ تھے' اُنؒ کا سلسلۂ نسب حضرت زید شہیدؒ سے ملتا ہے۔ اُنؒ کا مزار قصبہ قادری باغ ڈبائی میں مرجع خاص و عام ہے۔ انہی کے خاندان میں صاحبِ کشف و کرامات بزرگ سید محب علی شاہؒ اور سید محبوب علی شاہؒ کی اولاد آج بھی قادری باغ (انڈیا) میں مقیم ہے۔ میرے خاندان کے ایک بزرگ سید صفدر علی شاہؒ 1857ء کی جنگِ آزادی کی خوں ریز تباہ کاریوں کے بعد دنیا سے بے زار ہو کر بالکل گوشہ نشین ہو گئے تھے' اُنؒ کی خانقاہ میں (جو کہ ایک جنگل میں تھی)' اپنے وقت کے بہت سے نامور اور صاحبِ کرامت بزرگوں کی آمد و رفت رہتی تھی۔ ایک مرتبہ آپ دوسرے قصبے گنور جانے کے لیے روانہ ہوئے۔ ڈبائی اور گنور دونوں ہی ضلع بلند شہر (یوپی بھارت) کے قصبے ہیں۔ ان دونوں قصبوں کے درمیان ایک گہری ندی پڑتی تھی۔ (اب ندی پر پل بن گیا ہے) لوگ ندی کشتی اور ناؤ کے ذریعے پار کرتے تھے۔ ان بزرگ نے ایک ناؤ والے سے اس پار لے جانے کے لیے کہا۔ ناؤ والے نے دو ٹکے مانگے۔ آپ نے ایک ٹکے پر اصرار کیا مگر ناؤ والا نہ مانا۔ آپ نے غصے سے کہا۔ ''اچھا' اب دیکھ' پہلے کون پہنچتا ہے' تو یا میں؟''

ناؤ والا ان کی کرامات سے ناواقف تھا۔ اس نے تمسخرانہ انداز سے آپ کی طرف دیکھا اور مسافروں کو ناؤ میں بٹھا کر ناؤ کھینے لگا۔ اسی اثناء میں لوگوں نے دیکھا کہ میرے بزرگ اپنے پائنچوں کو ٹخنے تک چڑھائے ندی میں ایسے چلے جا رہے ہیں جیسے خشکی پر چل رہے ہوں اور ناؤ بیچوں بیچ ندی میں پہنچ کر باوجود کھینے کے' ایک جگہ ٹھہری ہوئی ہے۔ آپ دوسرے کنارے پر پہنچے اور ناؤ والے سے باآوازِ بلند کہا۔ ''بول' اَب کیا چاہتا ہے؟'' ناؤ والا بے چارہ اپنی ساری توانائی ناؤ چلانے کی کوشش میں صرف کر کے بے دم ہو چکا تھا' خوف سے لرزتے ہوئے بولا۔ ''سید صاحب.....! معاف کر دیں' میں نے آپ کو پہچاننے میں غلطی کر دی ہے۔''

آپ نے اسی گرج دار آواز میں ناؤ کو مخاطب کر کے کہا۔ ''اور کب تک ٹھہری رہے گی' بس اب چل پڑ.....''

پھر تو ناؤ اتنی سبک خرامی سے چلی جیسے کاغذ کی ہو' کنارے پہنچ کر ناؤ والے نے چاہا کہ بزرگ کے قدموں پر گر کر معافی مانگے مگر آپ دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو چکے تھے۔ یہی بزرگ ایک مرتبہ ایک ایسے بھڑ بھونجے کے بھاڑ میں لیٹ گئے جو لوگوں کو تنگ کرتا تھا۔ وہ بھاڑ میں آپ کی موجودگی سے لاعلم تھا' وہ موٹی موٹی لکڑیاں اور گھاس لیٹ ڈال کر بھاڑ میں آگ جلانے کی اپنی سی تمام کوششیں کر رہا تھا مگر آگ جل کے نہیں دے رہی تھی۔ کافی دیر بعد جب اس نے جھنجلا کر بھاڑ میں جھانکا تو آپ کو لیٹا پایا' آپ بھاڑ میں سے اپنے کپڑے جھاڑتے باہر آئے اور بھاڑ والے سے کہا۔ ''مخلوقِ خدا کو ناحق تنگ کرے گا تو تیرا بھاڑ ٹھنڈا ہی رہے گا۔''

بھڑ بھونجے نے ندامت سے معافی مانگی۔ اب جو بھاڑ کی طرف دیکھا تو اس میں سے آگ نکل رہی تھی۔ بھڑ بھونجا آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے جونہی مڑا' آپ وہاں نہیں تھے۔

آپ ایسے پہنچے ہوئے بزرگ تھے کہ آپ کے انتقال پر اہلِ ڈبائی اور گردونواح کے لوگ آپ کے کفن کا بچا ہوا کپڑا بطورِ تبرک و عقیدت لے گئے اور مدتوں اس تبرک کے بارے میں عجیب و غریب واقعات جو انہیں پیش آئے' سناتے رہے۔ انہی بزرگ کے بڑے بیٹے سید شجاعت علی شاہؒ جنہیں مسلمان اور ہندو سب باپو کہتے تھے' بہت بے باک' نڈر اور بہادر تھے۔ ان کی کرامتوں کی وجہ سے کئی ہندو' مسلمان ہوئے تھے۔ ان کی بہادری کی وجہ سے ملکۂ برطانیہ نے انہیں خصوصی مراعات کے علاوہ ''خان بہادر'' کا خطاب بھی دیا تھا۔ جنگِ آزادی کی ابتدا ہوئی تو انہیں مسلمانوں کی بے کسی اور بے بسی کا بڑی شدت سے احساس ہوا۔ انہوں نے انگریزوں کے

خلاف اپنے عقیدت مندوں کا ایک بڑا لشکر ترتیب دیا اور اپنے طور پر اسے ٹریننگ دینے لگے۔

ایک مرتبہ کچھ غیر ملکی خواتین نے انہیں دیسی اسلحے سے ٹریننگ دیتے دیکھ کر ان کا تمسخر اڑایا۔ آپ کو جلال آ گیا۔ آپ نے اپنی تلوار کو اسی کیفیت میں یوں ہوا میں گھمایا کہ وہ دور کھڑی ان خواتین میں سے ایک عورت کے سر کو دھڑ سے جدا کرتی گزر گئی۔ انگریزوں نے انہیں گرفتار کر کے جیل میں ڈالا اور ہتھکڑی' بیڑی اور گلے میں بھاری طوق پہنا دیا لیکن جب آپ قید میں نماز پڑھتے تھے تو ہتھکڑی اور بیڑی خود بہ خود ان کے جسم سے الگ ہو جایا کرتی تھی۔ اس جیل کا جیلر جو انتہائی سخت گیر تھا' ایک بار اس نے انہیں بغیر ہتھکڑی' بیڑی کے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو ان سے ڈانٹ کر پوچھا کہ تمہاری ہتھکڑی اور بیڑی کس نے کھولی؟''

آپ نے جیلر کو شانِ بے نیازی سے جواب دیا۔ ''خود ہی ہتھکڑی اور بیڑی سے پوچھ لے۔''

جیلر نے بگڑ کر کہا۔ ''کیا بکواس ہے؟ کیا لوہا بھی بول سکتا ہے؟ سچ سچ بتاؤ' اس جیل کے کون کون سے سپاہی تم سے مل گئے ہیں؟''

آپ کو غیض آ گیا' ہتھکڑی' بیڑی اور طوق کی طرف اشارہ کر کے آپ نے انہیں حکم دیا کہ اپنی اپنی جگہ پر آ جاؤ' ہتھکڑی' بیڑی اور طوق فوراً ہی آپ کے ہاتھوں' پیروں اور گلے میں آ گئے۔ جیلر نے جو یہ منظر دیکھا تو بہت خوف زدہ ہوا اور تمام آنکھوں دیکھا واقعہ اپنے افسرانِ بالا کو سنایا مگر کسی نے بھی جیلر کی باتوں پر یقین نہیں کیا۔ اس کے بعد ایک انگریز افسر جیل میں آیا اور اپنے ہاتھوں سے انہیں دہری ہتھکڑی اور بیڑی جو منوں وزنی تھی' پہنائی۔ اس وقت آپ نے انتہائی طیش کے عالم میں کہا۔ ''جو زیور تو مجھے پہنا رہا ہے' یہ میرے آباؤ اجداد بھی پہنتے آئے ہیں مگر یاد رکھنا ظالم! تم میرے ملک سے پلٹ کر واپس جاؤ گے اور تو؟ میں تیرا خراب انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔''

اتنا غیض و غضب اور وہ بھی ایک ایسا مجرم جس سے قتل جیسا سنگین جرم سرزد ہو چکا تھا' دیکھا رہا تھا۔ انگریز کے لیے انتہائی حیرت انگیز تھا۔ اُس وقت جیل کے تمام افسران آپ کی کڑی نگرانی کر رہے تھے۔ آوازِ اذان سنتے ہی آپ نے نماز کی نیت باندھی۔ جیلر اور اس انگریز سمیت تمام عملے نے دیکھا کہ اللہ اکبر کہتے ہی طوق' ہتھکڑی اور بیڑی ان کے جسم سے الگ ہو کر ایک زوردار آواز کے ساتھ زمین پر آ گرے۔

آپ نے انتہائی اطمینان اور خشوع و خضوع کے ساتھ نماز ادا کی۔ نماز ختم ہوتے ہی سارا آہنی زیور خود بخود ان کے جسم پر سج گیا۔ وہ لوگ یہ منظر دیکھ کر سکتے میں آ گئے۔ جیلر نے آپ کی کرامت دیکھتے ہی آپ کے قدموں پر گر کے معافی مانگی لیکن انگریز افسر نے اس منظر کو جادو کہا اور بڑبڑاتا ہوا بیرک سے باہر نکل گیا۔ اپنے گھوڑے پر بیٹھ کر اس نے ایڑ لگائی ہی تھی کہ بالکل اچانک وہ زمین پر ایسے آیا کہ اس کا ایک پاؤں بری طرح رکاب میں پھنسا ہوا تھا' دوسرا پاؤں اور جسم ہوا میں معلق تھا۔ آنکھیں خوف اور دہشت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ لوگوں نے بہ دقت تمام اس کا پاؤں رکاب سے نکال کر اسے زمین پر لٹایا ہی تھا کہ اس کے گھوڑے نے اپنے سموں سے کچل کر اسے اس طرح مارا تھا کہ لاش مسخ ہو گئی تھی۔ دوسری صبح جیل انتظامیہ نے دیکھا کہ آپ کی بیرک میں تالا تو لگا ہوا تھا مگر آپ غائب تھے۔

آپ کی تلاش بے سود ثابت ہوئی اور پھر دیکھنے والوں نے انہیں جیل سے میلوں دور بنے اپنے حجرے میں آتے جاتے دیکھا مگر سپاہی جب بھی ان کی تلاش میں آئے' انہیں ناکامی ہوئی۔ ان بزرگ کا مزار ان کے حجرے ہی میں ہے جہاں مسلمان اور ہندو عقیدت سے انہیں سلام کرنے اور مرادیں مانگنے آتے ہیں۔

یہ واقعات سنانے کا مقصد اپنے خاندان کی صدیوں پر پھیلی بزرگی اور کرامتوں کے بارے میں صرف تمہید باندھنا نہیں تھا' یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ اب میں جو واقعہ آپ کو سناؤں گی' اس کی کڑیاں بھی انہی کرامتوں سے ملتی ہیں۔

ماں کے نانا اور دادا آپس میں سگے چچازاد تھے۔ نانا کا انتقال نوجوانی میں اس وقت ہوا جب میری بڑی خالہ پانچ برس کی اور ماں پیدا ہونے والی تھیں۔ نانی کی عمر اس وقت صرف انیس سال تھی' کم عمری کی شادی اس وقت برصغیر کا رواج تھا۔ نانی کی اتنی کم عمری میں بیوگی نے ان کے دونوں بھائیوں اور غریب والدین کو ادھ موا کر کے رکھ دیا۔ دادا دادی نے بہت چاہا کہ ان کا نکاحِ ثانی اپنے دوسرے بیٹے سے کردیں لیکن نانی اس کے لیے تیار نہیں ہوئیں اور اپنے میکے آگئیں۔

نانی بچپن سے باشرع' باحیاء اور پردہ دار تھیں۔ انہوں نے اتنے عظیم سانحے کو مصلحتِ خداوندی سمجھتے ہوئے بڑے شکر اور صبر کے ساتھ برداشت کیا اور اپنے آپ کو دین اور اپنی دونوں یتیم بچیوں کے لیے وقف کردیا۔ دادا بھی ایسے کوئی صاحبِ حیثیت نہیں تھے مگر اپنی بہو اور پوتیوں کی حتی الامکان کفالت کرتے تھے۔ پاکستان بنا تو بہت سے عزیزوں کے ساتھ ساتھ نانی کا گھرانہ بھی ہجرت کر کے یہاں آ گیا۔ اس وقت بڑی خالہ آٹھ سال کی اور ماں تین سال کی تھیں۔ نانی بھی اس وقت انتہائی خوبصورت اور جوان تھیں' یہاں آ کر انتہائی خراب حالت میں نئے سرے سے زندگی کا آغاز کرنا کچھ اتنا آسان نہیں تھا۔

نانی جنہیں ان کے دونوں بھائی اور بیٹیاں بوا کہتے تھے' سیدھی سادی گھریلو عورت تھیں۔ ان کے بڑے بھائی عابد شاہ تھوڑے سے مجذوب اور کم صم رہنے والے آدمی تھے جبکہ چھوٹے بھائی زاہد شاہ اور بڑی خالہ تقریباً ہم عمر تھے۔ ان دونوں کو ماں اور خالہ مما کہتی تھیں۔ ہم بچے پیدا ہوئے تو نانی ہماری بھی بوا تھیں اور مما ہمارے بھی مما تھے۔ نانی بوا کے پاس تھوڑا سا پیسا اور زیورات کی شکل میں کچھ جمع پونجی تھی جو انہوں نے اس وقت تک بہت کفایت شعاری سے استعمال کی جب تک زاہد مما کچھ کام کرنے کے قابل ہوئے۔

ان لوگوں کی رہائش ایک عزیز کے گھر تھی جنہوں نے زاہد مما کو اسکول میں ایڈمیشن بھی دلوا دیا تھا۔ عابد مما چونکہ مجذوب ٹائپ کے تھے' اس لیے انہوں نے دنیاوی تعلیم بالکل بھی نہیں حاصل کی تھی بلکہ بوا بتاتی تھیں کہ کبھی کبھی تو وہ بغیر بتائے ایسے غائب ہوتے تھے کہ مہینوں شکل نہیں دکھاتے تھے۔ بوا کی دونوں بیٹیاں بے انتہا خوب صورت بھی تھیں اور انتہائی سلیقہ شعار بھی' انہیں شعور آتے ہی جیسے ہی دونوں کے رشتے آئے' بوا نے نامساعد حالات میں بھی بہترین طریقے سے دونوں کو اُن کے گھروں کا کردیا۔ عابد مما نے شادی نہیں کی تھی۔ بوا نے زاہد مما کی شادی اپنے ہی جیسے ایک گھرانے میں کردی۔ زاہد مما جہاں ملازم تھے' اس محکمے نے اپنے لیبر کے لیے ایک ایک کمرے کے کوارٹر بنوائے تھے۔ شادی کے کچھ عرصے بعد ہی زاہد مما اپنی بیوی کے ساتھ وہاں شفٹ ہوگئے۔

خالہ کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ میں ماں کی پہلی بیٹی تھی۔ مجھے ننھیال اور ددھیال دونوں جگہ سے بے انتہا محبتیں اور لاڈ و پیار ملا۔ جب مجھے شعور آیا تو عابد مما اور بوا سکھر میں ایک سرکاری کلب میں رہائش پذیر تھے۔ اس کلب میں بڑے مما کے کسی جاننے والے نے انہیں ملازم رکھوایا تھا۔ (کون سا کلب تھا' یہ تو اب مجھے یاد نہیں لیکن اتنا یاد ہے کہ بہت صاف ستھری اور سنسان جگہ تھی اور یہ سڑک جس پر اس کلب کی عمارت تھی' ایک سرکٹے کی کہانی کی وجہ سے مشہور تھی) کلب کی مینیجنگ کمیٹی' دوسرے کام کرنے والے اسٹاف کی نگرانی' کسی صدر' گورنر' وزیر یا سفیر کی وہاں آمد یا قیام کی صورت میں ان کی سیکوریٹی پر نظر رکھنا' ان کے لیے کچن کے انتظامات کروانا' عابد مما کی ڈیوٹی تھی جو وہ بہت جانفشانی سے انجام دے رہے تھے۔

کلب کا محلِ وقوع اور خود کلب بہت خوب صورت تھا۔ اس کی عمارت کافی قدیم اور پختہ تھی۔ وسیع و عریض راہداری میں کافی چلنے کے بعد جہاں راہداری ختم ہوتی تھی' وہاں ایک عظیم لکڑی کا منقش دروازہ لگا ہوا تھا۔ اس دروازے کے باہر کافی میلوں تک پھیلے ہوئے پھل اور پھول دار درختوں کے کنج تھے۔ ان ہی درختوں کے اطراف میں یہاں کے

ملازمین کے لیے مٹی سے لپی ہوئی صاف ستھری روشن اور ہوادار دو دو کوٹھریاں' چھوٹا سا کچا صحن' ایک کونے میں چھپر اور کھپریل ڈال کر بنایا گیا تھا۔ باورچی خانہ جس میں اینٹوں کا چولہا اور ایک بڑا تنور بنا ہوا تھا۔ صحن سے اچھا خاصا فاصلہ طے کر کے درختوں کے جھنڈ کی طرف ٹین کی چھتوں والا ٹائلٹ اور غسل خانہ تھا جو کافی بڑا تھا۔ ایک فیملی بوا اور عابد مما تھے' دوسری فیملی جو صحن کے اُس طرف تھی' اُن کے گھر کافی خواتین' بچے اور مرد تھے۔ انہوں نے صحن میں ٹاٹ کے بڑے بڑے پردے ڈال کر پردہ اور پارٹیشن کرلیا تھا۔ بوا یا اس گھر کا کوئی بھی فرد کبھی اس طرف نہیں گیا تھا۔ اس گھر کی عورتیں اکثر گھونگھٹ نکالے پانی بھرنے غسل خانے سے بھی بہت دور لگے ہوئے ہینڈ پمپ کی طرف جاتی نظر آتی تھیں۔ عابد مما چونکہ کلب میں نگران تھے' اس لیے ان کے مردوں سے اکثر بات چیت کرلیتے تھے۔

میری دادی کی رہائش کوٹ ڈیجی میں تھی۔ ان کا لال اینٹوں اور سیمنٹ سے بنا پختہ مکان ہر آسائش سے بھرا ہوا تھا مگر بوا کے کچے اور بہت طریقے سے لپے پتے گھر میں مجھے جتنا مزہ آتا تھا' وہ بیان سے باہر ہے۔ ہم لوگ کراچی میں رہتے تھے۔ جب گرمیوں میں اسکول کی چھٹیاں ہوتی تھیں تو ہم لوگ دو ماہ کوٹ ڈیجی اور سکھر میں گزارتے تھے۔ جون' جولائی میں کھجور اور آم پکنے کے ساتھ جہنم جیسی گرمی میں وہاں رہائش پذیر لوگ بھی پکتے تھے لیکن ان شہروں کی شام اور راتیں کتنی خوب صورت ہوتی تھیں' اس کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔

یہ آج سے تقریباً ستائیس' اٹھائیس سال پہلے کی بات ہے۔ اُس وقت میرا لڑکپن تھا۔ ابھی اسکول کی چھٹیاں ہونے میں تین چار ماہ باقی تھے کہ ایک دن اچانک ہمارے گھر کراچی میں تار آیا کہ بوا کی طبیعت بہت خراب ہے اور عابد مما بھی حسب سابق بغیر کچھ بتائے پندرہ دن سے غائب ہیں' فوراً آجاؤ۔

یہ تار خالو جان نے دیا تھا۔ ماں نے رونا پیٹنا شروع کردیا۔ بابا نے بہت عجلت میں اپنی ایک رشتے دار خاتون کو گھر میں کچھ دن رہنے اور میرے چھوٹے بہن بھائیوں کی دیکھ بھال کے لیے بلایا اور اُسی رات میں ماں اور بابا سکھر ایکسپریس سے سکھر روانہ ہو گئے۔

بوا واقعی شدید بیمار تھیں' دبلی پتلی تو وہ پہلے بھی تھیں لیکن اَب اُن کی بیماری نے جیسے انہیں نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ زاہد مما کی بیوی اور بڑی خالہ اُن کے پاس رہ کر اُن کی تیمارداری کررہے تھے۔ دس پندرہ روز بعد جب اُن کی طبیعت تھوڑی سی سنبھلی تو سب کو اپنا اپنا گھر یاد آیا۔ اُس وقت میں بوا کے پاس مزید رہنے کے لیے مچل گئی۔ بوا ویسے تو میرے سارے بہن بھائیوں کو چاہتی تھیں مگر مجھے انہوں نے ٹوٹ کر چاہا تھا۔ گرمیوں کی چھٹیاں ہونے سے بہت پہلے وہ صرف میرے لیے اپنے ہاتھوں سے ریوڑیاں' گجک' تل کے لڈو' مُرمُرے' بتاشے' چاول کے پاپڑ' گڑ مبا' نمکی اور نہ جانے کیا کیا بنانا شروع کردیتی تھیں حالانکہ بابا پی آئی اے میں تھے۔ دنیا بھر کی چاکلیٹس' بسکٹس' چیونگ گم' کولڈ ڈرنکس کے ٹن ہمارے گھر ہمیشہ آتے تھے مگر بوا کے ہاتھوں کی بنی چیزوں کی بات ہی کچھ اور تھی۔ خیر' بوا میری ضد دیکھ کر ماں سے میرے لیے سفارش کررہی تھیں اور ماں جاتے جاتے بوا سے کہہ رہی تھیں۔ ''بوا.....! اس لڑکی میں جسس کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ ذرا خیال رکھیے گا ورنہ آپ کو پریشان کردے گی۔'' سو سب اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ یہاں میں تھی اور بوا تھیں کہ عابد مما بھی دو دن بعد اچانک ہی آگئے تھے۔

ہمت' حوصلہ' محنت اور مسلسل محنت کی کدال سے زندگی کے سنگلاخ پتھر کو توڑتے توڑتے بوا کے بازو شل' جسم لہولہان اور انگلیاں فگار ہوچکی تھیں مگر اس عمر میں کہ جب ایک عمر کی مشقتوں کے بعد زندگی اور وقت سے کچھ دیر ستا لینے کی مہلت مانگی جاتی ہے۔ بوا کو وہ وقت بھی کبھی میسر نہ آسکا۔

ہم لوگ یہاں سال کے بعد صرف دو مہینوں کے لیے آتے تھے اور ان دو مہینوں میں ہر روز دودھیالی اور ننھیالی رشتے داروں کے گھر دعوت یا چائے پر لازمی

جانا ہوتا تھا اس لیے بوا اور عابد مما کے روز و شب کے معمولات کے بارے میں زیادہ آگاہی نہیں تھی اور بوا خود کسی کے گھر نہیں جاتی تھیں مگر اَب جبکہ میں یہاں تنہا تھی اور کہیں آنا جانا بھی نہیں تھا تو میں نے بڑے غور سے یہاں کے حالات و واقعات اور معمولات کو دیکھا تھا۔

نو' دس سال کی عمر کوئی اتنی سنجیدہ عمر نہیں ہوتی کہ بچے زندگی کو اتنے غور سے دیکھیں اور حالات سے بہ قدرِ ضرورت تجربات کشید کریں مگر میں اُس وقت بھی ایسی ہی تھی۔ زندگی کے بارے میں بنیادی سوالوں کیوں؟ کیا؟ کب؟ کہاں؟ اور کیسے؟ کے گرد گھومنا اور ہر چیز کی جستجو میں لگے رہنا' اُسے کھوجنا قدرت نے شاید میری فطرت اور بنیاد میں رکھ دیا تھا۔ میں نے بتایا ہے کہ کچی کوٹھریوں کے آگے وسیع صحن تھا اور جہاں یہ اونچا سا صحن ختم ہوتا تھا' وہاں ایک چھوٹی سی پگڈنڈی نما جگہ چلنے کے لیے چھوڑ کر درختوں کا ایک لمبا سلسلہ تھا۔ وہاں سبزہ بھی تھا' جھولے بھی پڑے تھے' وہیں الٹے ہاتھ پر گالف کھیلنے کے لیے لق و دق میدان تھا۔

عابد مما نے ایک دن بہت اچھے موڈ میں کہا تھا۔

''بیٹا! شام ڈھلے ان درختوں یا میدان کی طرف کبھی مت جانا' دوپہر میں بھی کبھی جاؤ تو بوا کے ساتھ جانا' درختوں' پودوں اور میدانوں کے پاس سے نہ جانے کیسی کیسی بری بھلی ہوائیں گزرتی ہیں۔''

عابد مما نے یہ کہہ کر میرے ذوقِ تجسس کو مہمیز کر دیا تھا۔ اَب مجھے فکر تھی تو یہ کہ بری بھلی ہوائیں کیا ہوتی ہیں؟ ہوا تو صرف ہوا ہوتی ہے' یہ نہ ہو تو پھر حبس ہوتا ہے۔ اَب تو مجھے کسی دن وہاں اکیلے جا کر ضرور بری اور بھلی ہواؤں کا مشاہدہ کرنا پڑے گا۔

عابد مما اَذانِ فجر کے ساتھ ہی بیدار ہو جاتے تھے۔ وہ پہلے مٹی کی اینٹوں سے بنے چولہے میں لکڑیاں سلگاتے پھر صحن میں بندھی بکریوں کا دودھ دوہ کر چائے بنانے کے لیے رکھتے۔ اتنی دیر میں ہلکی ہلکی آنچ پر چائے تیار ہوتی۔ وہ نماز پڑھتے پھر بوا کو اٹھاتے تھے۔ بوا نماز پڑھتیں پھر دونوں وہیں چولہے کے پاس بیٹھ کر پاپے اور چائے کا ناشتا کرتے۔ میں اٹھ جاتی تھی تو میں بھی خالص دودھ کی چائے اور پاپے سے ناشتا کرتی تھی۔ عابد مما چائے کے برتن وہیں کھڑونچی پر رکھے مٹکے سے پانی نکال کر دھوتے۔ بوا تھوڑی سی روشنی ہونے کا انتظار کرتیں پھر بڑے لحن سے کلام مجید کی تلاوت شروع کر دیتی تھیں۔ سورج جب مشرق کے کونے سے اپنی ذرا سی جھلک دکھاتا تو میری ہی عمر کا ایک لڑکا جس کا قد بے تحاشہ لمبا تھا' سفید لٹھے کا پاجامہ' گھٹنے سے بہت نیچا باریک ململ کا کرتا اور پاؤں میں لکڑی کی کھڑاویں پہنے دونوں ہاتھوں سے کھانے کی سینی کی رکابیوں میں انتہائی لذیذ کبرے یا دنبے کا سالن' ایرانی تافتان کی طرح آدھ آدھ گز لمبی روٹیاں' تام چینی کے کٹورے میں اصلی گھی سے بنا حریرہ سلیقے سے رکھ کر چلا جاتا تھا۔ بوا اور میں بہت دنوں سے انواع و اقسام کے ایسے ہی کھانے کھا رہے تھے۔

میں نے کئی مرتبہ بوا سے پوچھا بھی تھا کہ ''یہ لڑکا کون ہے جو بالکل بات نہیں کرتا اور یہ اتنا لذیذ کھانا اتنی پابندی سے کیوں اور کہاں سے لاتا ہے؟''

مجھے لگتا تھا' وہ مجھے ایسے ہی ٹالنے کے لیے کہتی تھیں۔ ''یہاں کچھ اور لوگ بھی رہتے ہیں' اُن کے بچے میرے پاس قرآنِ مجید پڑھنے آتے ہیں۔ میری بیماری کی وجہ سے وہ بچے ابھی چھٹی پر ہیں لیکن اپنے گھر سے کھانا پکوا کر لے آتے ہیں' بس ایک دو دن میں کہہ دوں گی کہ میں اَب صحت یاب ہو گئی ہوں' کھانا نہ لائیں اور بہت چھٹیاں ہو گئیں' اَب قرآن پڑھنے آجائیں۔''

دو دن بعد نمازِ فجر کے فوراً بعد چار بچے جو اپنے سروں کو ٹوپی اور دوپٹے سے ڈھانپے ہوئے تھے' ہاتھوں میں قرآن پاک اور رحل لے کر صحن میں چادر بچھا کر بیٹھ گئے۔ میں جو اُس وقت بیدار ہو گئی تھی' اپنے پلنگ پر سے اتر کر منہ ہاتھ دھو کر خود بھی اُن کے پاس بیٹھ گئی۔ بوا جس ترنم اور کیف سے قرآن پاک پڑھا رہی تھیں' اُس سے کہیں زیادہ خوبصورت لحن میں وہ چاروں میرے ہم عمر بچے دہرا رہے تھے۔ جب بوا پاؤ

سیپارہ پڑھا چکیں تو وہ چاروں بہت اَدب سے سَلام کر کے جانے کی اجازت لے کر جانے لگے' تب میں نے اچانک ہی کہا۔ ''بوا! کل سے اِن چاروں کے ساتھ آپ مجھے بھی سیپارہ پڑھائیں گی۔ میں اِن سے دوستی بھی کروں گی اور اِن کے ساتھ کھیلوں گی بھی۔''

''بیٹا! اِن سے پوچھ لو' یہ تمہارے ساتھ کھیلیں گے؟ کیونکہ انہیں تمہاری دنیا کے کوئی کھیل نہیں آتے۔''

بوا نہ جانے کس رَوا رَوی میں یہ بات کہہ گئیں۔

''کیوں بوا؟ ہماری دنیا کے کھیل انہیں کیوں نہیں آتے؟ کیا یہ جنات ہیں؟'' میں نے بہت معصومیت سے بوا سے پوچھا تھا۔

''کیوں بیٹا! شیونہ اور رُوحانہ' اور بیٹے ابزام اور اسحاق! تم لوگ ہماری بٹیا کے ساتھ کھیلو گے؟''

بوا کے اِس سوال پر چاروں نے اَثبات میں سر ہلایا اور سَلام کر کے چلے گئے۔

میرا اُن کے ساتھ کھیلنے کا خواب' خواب ہی رہا تھا کیونکہ پھر میری آنکھ اُس وقت کبھی نہیں کھلی تھی جب وہ قرآن پڑھنے آتے تھے۔ میں بوا سے ناراض ہو کر کہتی تھی۔ ''آپ مجھے اس وقت کیوں نہیں جگاتی ہیں؟''

بوا کہتی تھیں۔ ''تمہیں آواز تو دیتی ہوں مگر تم اُٹھتی ہی نہیں ہو۔''

بوا مجھے شام میں سیپارہ پڑھاتی تھیں چونکہ وہ ابھی تک مکمل طور پر صحت یاب نہیں ہوئی تھیں اس لیے وہ لڑکا اپنے معمول کے مطابق منع کرنے کے باوجود کھانا لا رہا تھا۔

جس روز میں نے پہلا سیپارہ ختم کر لیا تھا' اُس دن بوا بہت خوش تھیں۔ عابد مما بھی خوش تھے۔ وہ لڑکا دوسرے دن کھانا رکھ کر جانے لگا تو بوا نے کہا۔ ''ایلیا' شیونہ کو یہ خوشخبری سنانا کہ ہماری بٹیا کا پہلا سیپارہ ختم ہوا ہے۔''

اُس سے اگلے دن جب وہ لڑکا نعمت خانے میں کھانا رکھ چکا تو بوا کے پاس آ کر اُس نے ایک مخملی تھیلی دی اور کہا۔ ''اماں جان نے بہت بہت مبارک باد کے ساتھ آپ کی بٹیا کے لیے یہ تحفہ بھیجا ہے۔''

میں نے مارے اشتیاق کے وہ تھیلی بوا کے ہاتھ سے لے کر اسے کھولا تو وہ اچھے خاصے وزنی چمچماتے ہوئے ایسے سکوں سے بھری ہوئی تھی جن کے بیچ میں اچھے خاصے بڑے سوراخ تھے۔ عابد مما نے بتایا تھا۔ ''یہ سونے کے سکے ہیں' بہت احتیاط سے کہیں رکھ دو' جاتے وقت ساتھ لے جانا۔'' افسوس کہ میں نے انہیں بہت زیادہ احتیاط کرتے ہوئے زمین میں کسی ایسی جگہ گڑھا کھود کر چھپایا کہ پھر باوجود تلاش کے' وہ سکے مجھے دوبارہ دیکھنا نصیب نہیں ہوئے۔''

بوا کی عادت تھی کہ وہ روزانہ سوتے وقت مجھے کوئی نہ کوئی اسلامی کہانی ضرور سناتی تھیں۔ حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسمٰعیلؑ کا قصہ' حضرت سلیمانؑ اور ملکۂ سبا کا قصہ' ہاروت' ماروت' اصحابِ کہف' یاجوج ماجوج' حضرت یوسفؑ و زلیخا' سب قصے مجھے بوا نے ہی سنائے تھے۔ ایک رات جبکہ وہ سوچ رہی تھیں کہ آج کون سی کہانی سنائی جائے؟ میں نے اُن سے بالکل اچانک کہا تھا۔ ''بوا! آپ کو حضرت سلیمانؑ کی قسم ہے۔ آج آپ مجھے جنوں کی کوئی سچی کہانی سنائیں۔''

بوا مارے حیرت کے گنگ سی ہو گئیں۔ ایک دس برس کی کھلنڈری لڑکی اپنی عمر سے کہیں بڑھ کر اچانک ایک ایسی فرمائش کر رہی تھی جس کا تعلق بوا سے بھی تھا۔

بوا تھوڑی دیر بالکل خاموش رہیں پھر بولیں۔ ''چلو' تمہیں کل پتا چل ہی جاتا تو ہم آج ہی تمہیں کیوں نا اپنا قصہ سنا دیں پھر تم نے قسم جو اتنی بڑی دی ہے۔''

بوا! کیا آپ جن ہیں؟'' میں نے ڈرتے ہوئے پوچھا تھا۔

''نہیں بٹیا! ہم جن نہیں ہیں مگر جنوں کے ساتھ رہتے ایک عمر گزر گئی ہے۔'' انہوں نے میرے بالوں میں اپنی نرم انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

''بوا! جن کیسے ہوتے ہیں؟'' میں نے سوال کیا

تھا۔

''جب ہمارے سامنے آتے ہیں تو ہمارے ہی جیسے ہوتے ہیں' تم مل تو چکی ہو ابزام' اسماق' شیمونہ اور رُوحانہ سے۔'' بوا نے میری حیرت میں اضافہ کرتے ہوئے بتایا۔ ''بٹیا! انسانوں کی طرح جنوں کے یہاں بھی کئی قسمیں اور مذاہب ہیں مگر یہ گروہ مسلمان اور انتہائی مہذب ہے۔ خیر' اَب سچی کہانی سنو۔ نیند آنے لگے تو بتا دینا' اگر کہانی باقی رہی تو اگلی رات سن لینا۔''

انہوں نے اپنے ہاتھوں پر میرا سر رکھتے ہوئے کہانی سنانا شروع کی تھی۔ ''بٹیا! یہ گئے زمانوں کا ذکر ہے' ہمارے پردادا کے دادا جو کہ ایک مجذوب تھے' اُن کا نام قاسم علی شاہ تھا' وہ بستی اور آبادی میں کم نظر آتے تھے' زیادہ تر لوگوں نے انہیں صحرا اور بیابانوں میں ہی دیکھا تھا اس لیے اُن کا نام مجذوب بیابانی پڑ گیا تھا۔ وہ نہ جانے کہاں کہاں کی دربدری کے بعد کبھی کبھی تو کئی کئی سالوں کے بعد بالکل اچانک گھر آ جاتے تھے مگر اُن کی وحشت انہیں زیادہ دیر گھر میں رہنے نہیں دیتی تھی۔ وہ فوراً گھر کی دیوار پر ایسے بیٹھتے تھے جیسے گھوڑے پر بیٹھ کر اس کی لگام پکڑے ہوئے ہوں اور دیوار کو حکم دیتے تھے کہ وہ انہیں فلاں بیابان میں فلاں بزرگ کے پاس چھوڑ آئے۔ لوگ دیکھتے تھے کہ دیوار آہستہ سے اپنی جگہ سے سرکتی اور پلک جھپکتے وہ بزرگ غائب ہو جاتے تھے۔ اُن کی والدہ اپنے اکلوتے بیٹے سے بہت محبت کرتی تھیں۔ وہ اپنے بچے میں کرامات اُس کی پیدائش کے بعد سے دیکھ رہی تھیں۔ والدہ نے بہت کم عمری میں ہی اپنے بیٹے کی شادی کر دی تھی۔ اُن بزرگ کے گھر کافی عرصے بعد ایک بیٹا پیدا ہوا۔ اُس کے بعد اُن پر جذب کی ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ وہ کسی کو بھی پہچانتے نہیں تھے اور پھر اچانک کہیں غائب ہو گئے تھے۔ اُن کی والدہ اپنے بیٹے کو صرف ایک نظر دیکھنے کے لیے روتے روتے اندھی ہو گئی تھیں لیکن بیٹے کی سالوں کوئی خبر ہی نہیں ملی تھی۔

ایک دن ہمارے یہی بزرگ کسی صحرا میں چلّہ کاٹ رہے تھے کہ اچانک اَجتاء کا ایک لشکر تیر و تفنگ سے لیس عین اُسی جگہ اترا جہاں وہ نماز پڑھ رہے تھے۔ نماز ختم کر کے انہوں نے جنوں میں ہی سے ایک ایسے شخص سے جو اُنکا سردار معلوم ہوتا تھا' پوچھا۔ ''کیا ماجرا ہے؟ کیا کوئی رَزم درپیش ہے؟'' تو انہیں بتایا گیا کہ جناتوں کا ایک گروہ جو کہ مشرک اور بہت سرکش ہے' اُن مسلمان اَجتاء کے درپے آزار ہے اور مختلف حیلے بہانوں سے جنگ کرنا چاہتا ہے اور آج اسی سے معرکہ ہے۔''

مجذوب بیابانی نے سردار سے کہا۔ ''اگر ہمیں بھی کوئی اسلحہ دے دیا جائے تو آج ہم بھی اپنی تلوار کے جوہر دکھائیں گے۔'' سردار نے انہیں بہت عزت و احترام کے ساتھ دو دھاری تلوار پیش کی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہاں اتنا شور بپا ہوا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ مشرک جناتوں کا گروہ اپنے خداؤں کے نام کے نعرے لگاتا میدان میں آ پہنچا تھا اور پھر وہ گھمسان کا رن پڑا کہ دہشت سے زمین کانپ رہی تھی۔ ظہر کے وقت جنگ شروع ہوئی اور عصر کے وقت اس خوں ریز لڑائی کا اختتام ہوا۔ جناتوں کے وہی سردار مجذوب بیابانی کے پاس آئے اور اپنی تلوار اُن کے قدموں میں رکھ کے کہا۔ ''آج کی فتح کا سہرا آپ کے سر ہے۔ آپ نے تنہا اپنی تلوار سے ان کی پہلی اور بہت مضبوط صف کا خاتمہ کیا ہے' باقی لشکر کی ہمت تو ٹوٹ ہی چکی تھی' اس لیے ان کا صفایا کرنے میں ہمیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی' ان کے جو لوگ بچ گئے ہیں اَب ہماری قید میں ہیں۔ آپ مانگیں' کیا مانگتے ہیں؟''

مجذوب بیابانی نے ایک جذب کے عالم میں نعرہ لگایا۔ ''قلندروں کو دینے کے لیے تمام دنیا کے خزانوں میں کچھ بھی نہیں ہے' کچھ بھی نہیں ہے' بس ہماری اولادوں کے حق میں بھلائی اور دُعا کرنا۔'' یہ کہہ کر وہ مراقبے میں چلے گئے۔ اُس وقت سے لے کر اَب تک جنات کسی نہ کسی شکل میں ہر خوشی اور ہر مشکل گھڑی میں ہم لوگوں کے ساتھ رہے اور کام بھی آئے اور آج بھی کام آ رہے ہیں۔ پگلی.....! میری

بیماری میں تُو نے دیکھا نہیں' کتنی پابندی سے کتنا مزے دار کھانا پک پک کر آتا رہا ہے؟ وہ سب یہیں باغ میں مقیم ہیں اور انسانی شکلوں میں یہاں آتے جاتے ہیں۔''

''بوا.....! عابد مما ایک دن مجھے باغ میں جانے سے اسی لیے منع کر رہے تھے' شاید اسی لیے' وہ کچھ اچھی بری ہواؤں کا بتا رہے تھے۔''

''ہاں' تم ٹھیک سمجھیں' تم بچی ہو' اچانک وہ تمہارے سامنے آتے تو تم ڈر بھی سکتی تھیں اس لیے مما تمہیں اکیلے جانے سے منع کر رہے تھے۔''

کہانی سناتے سناتے کافی رات بیت چکی تھی اور ہم دونوں ہی کو نیند بھی آ رہی تھی۔ بوا اور میں فوراً ہی خوابِ خرگوش کے مزے لوٹنے لگے تھے۔

.....•.....•.....•

مجھے یہاں آئے دو ماہ ہونے کو آئے تھے' نہ تو بوا جانے دے رہی تھیں اور نہ ہی ابھی میں جانا چاہ رہی تھی۔ بابا ایک مرتبہ مجھے لینے بھی آئے تھے لیکن میری ضد کے آگے ہتھیار ڈال کر جا چکے تھے حالانکہ میرے اسکول کی چھٹیاں بھی کافی ہو چکی تھیں۔

ایک دن صبح صبح بوا کے گھر میں بڑی گہما گہمی تھی۔ زاہد مما' چھوٹی ممانی' بڑی خالہ' بوا اور عابد مما سب ہی مختلف کاموں میں لگے ہوئے تھے۔ کلب میں صفائی کرنے والا سوپر کچے صحن کو کوٹھریوں اور راستوں پر خوب صاف کر کے جھاڑو لگا رہا تھا۔ اس کے جھاڑو لگانے کے بعد بہشتی اپنی مشک سے صحن اور کوٹھریوں میں چھڑکاؤ کر کے چلا گیا تھا۔ زاہد مما اور عابد مما بازار سے دو تنومند دنبے خرید لائے تھے جنہیں حلال کرنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ بڑی خالہ اور ممانی پیتل کی بڑی بڑی سینیوں میں آٹا گوندھ چکی تھیں۔ بوا تنور گرم کر کے اُن لوگوں کے ساتھ پیڑے بنا کر رکھ رہی تھیں۔ میرے پوچھنے پر بوا نے بتایا تھا۔ ''آج عابد کے کچھ مہمان آئیں گے۔''

اُن کی دعوت سے لگ رہا تھا' مہمانوں کی تعداد کافی زیادہ ہے جو اتنے ڈھیر سارے آٹے کی روٹیاں پک رہی تھیں۔ دونوں مما صحن میں دنبے حلال کر کے انہیں سالم پکانے کے لیے صحن ہی میں ہلکا سا گڑھا کھود کر اس پر لکڑیاں اور کوئلے ڈال کر اس کے کافی اونچائی پر بانس لگا رہے تھے تاکہ اُن پر دنبوں کو لٹکا سکیں۔ میں حیران ہو ہو کر کھانا پکنے کی تیاریاں بھی دیکھ رہی تھی اور دل ہی دل میں خوش بھی ہو رہی تھی کہ شاید اُن مہمانوں میں کچھ بچے بھی ہوں گے' خاص طور سے لڑکیاں' خواتین بھی ہوں گی' تب تو بڑا مزہ آئے گا لیکن میری آرزوؤں اور خوشیوں پر اُس وقت اوس پڑ گئی جب ممانی' خالہ' خالو اور زاہد مما سب کاموں سے فارغ ہوئے اور کھانا کھا کے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

دوپہر سے شام اور شام سے رات ہو گئی مگر مہمان نہیں آئے۔ میں نے بجھے ہوئے دل سے روہانسی ہو کر بوا سے پوچھا۔ ''اتنا ڈھیر سارا کھانا' منوں روٹیاں کیا ہوں گی بوا؟ مہمان تو آئے ہی نہیں' اور رات ہو گئی ہے؟''

''بٹیا! مہمان آئیں گے مگر کب' یہ عابد کو پتا ہے۔'' پھر بوا نے اپنے اور میرے لیے بھنے ہوئے دنبے کا گوشت رکابیوں میں نکالا اور ہم دونوں نے صحن میں بچھی چارپائیوں پر بیٹھ کر کھانا کھایا۔ بوا بہت تھکی ہوئی تھیں اور میں بھی صبح سے اٹھ کر مستقل اپنے طور پر چھوٹے چھوٹے کام بھاگ بھاگ کر کر رہی تھی اس لیے کھانا کھا کے چارپائی پر لیٹتے ہی مجھے نیند آ گئی تھی۔

وہ نہ جانے پچھلی رات کا کون سا پہر تھا جب میری آنکھ کھلی۔ ''بوا.....! بوا.....! ٹوائلٹ جانا ہے' میرے ساتھ چلیں۔'' میں انہیں آہستہ آہستہ جھنجوڑتے ہوئے کہہ رہی تھی' کافی دیر بعد بوا کی نیند ٹوٹی تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔

''بٹیا.....! کیا بات ہے؟'' انہوں نے آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا۔

''بوا.....! ٹوائلٹ تک میرے ساتھ چلیں۔'' وہ میرے ساتھ جانے کے لیے اٹھیں۔ راستے ہی میں وہ کوٹھری تھی جس میں عابد مما رہتے تھے۔ کوٹھری کا دروازہ بند تھا۔ دیوار پر بنی ایک بڑی سی کھڑکی جس

میں لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں' اس پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ بوا نے آہستہ سے بڑبڑاتے ہوئے کہا تھا۔ ''معلوم نہیں' مہمان ہیں یا جا چکے ہیں؟'' اس کے ساتھ ہی انہوں نے دبے پاؤں کھڑکی کے پاس پہنچ کر پہلے تو کچھ سننے کی کوشش کی مگر وہاں اتنا سکوت تھا کہ سوئی بھی گرتی تو آواز پیدا ہوتی۔ انہوں نے کھڑکی پر پڑا پردہ تھوڑا سا سرکا کر اندر دیکھنے کی کوشش کی تھی اور پھر نہ جانے انہوں نے اندر کیا دیکھا تھا کہ اُن کے لبوں سے ایک گھٹی ہوئی چیخ نکلی تھی اور وہ دیوار پکڑ کر زمین پر بیٹھتی چلی گئی تھیں۔

میں نے انہیں اِس حالت میں دیکھ کر زور زور سے رونا شروع کر دیا' تب ہی ہمارے صحن سے تقریباً ملے ہوئے صحن سے ایک خاتون دوڑتی چلی آئیں' انہوں نے بوا کو اِس طرح زمین پر بے سدھ بیٹھے اور مجھے روتے دیکھا تو وہ بھی پریشان ہو گئیں۔ ''کیا ہوا بٹیا.....؟ کیوں رو رہی ہو اور تمہاری بوا کو کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں' کچھ نہیں.....'' بوا ایک دم ہوش میں آتے ہوئے بولیں۔ ''بٹیا کو ٹوائلٹ جانا تھا' مجھے بالکل اچانک چکر آ گئے اور میں زمین پر بیٹھ گئی۔ بچی نے پریشان ہو کر رونا شروع کر دیا۔''

بوا یقیناً خاتون سے غلط بیانی کر رہی تھیں۔ میں حیران ہو کر انہیں دیکھ رہی تھی کہ بوا جھوٹ کیوں بول رہی ہیں؟ کیوں نہیں بتاتیں کہ ابھی ابھی انہوں نے کھڑکی سے اندر کچھ ایسا منظر دیکھا ہے کہ اُن کی چیخ نکل گئی تھی؟ اُن خاتون نے بوا کو سہارا دے کر اٹھایا اور پلنگ پر لا کر بٹھا دیا پھر میرے ساتھ ٹوائلٹ تک گئیں۔

صبح بہت دیر کے بعد عابد مما کی کوٹھری کا دروازہ کھلا۔ اُس دن اُن کی حالت ہی عجیب تھی' ملگجے کپڑے' پریشان' بکھرے ہوئے بال اور خون کی طرح سرخ آنکھیں' چائے پیتے ہوئے انہوں نے بوا سے کہا۔ ''رات تو ہمیں اُس حالت میں تم نے دیکھ لیا مگر آیندہ کبھی تم نے یا کسی نے بھی ہمیں اُس طرح دیکھ لیا تو پھر ہمیں اصلی حالت میں زندہ نہیں دیکھ پائے گا۔''

مجھے نہیں علم کہ بوا نے عابد مما کو کس حالت میں دیکھا تھا؟ اُس وقت میرا تجسس بھی اتنا بڑا نہیں تھا کہ میں کھڑکی کی اونچائی تک پہنچ پاتی یا اندر دیکھ سکتی مگر بوا کا خوف اور بڑے مما کی اجڑی اجڑی حالت بتا رہی تھی جیسے وہ صدیوں کی بیماری ایک رات میں گزار آئے ہوں۔ اِس واقعے کے چوتھے دن بابا مجھے کراچی لے آئے تھے۔

•.....•.....•

میری بچپن سے یہ عادت تھی اور ہے کہ میں نے کبھی ماضی کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھا' گزری ہوئی کل کی کوئی بات میں نے کبھی نہیں دہرائی' نئی چیزوں کی دریافت' اُن کے بارے میں کھوجنا' سوچنا اتنی مہلت ہی نہیں دیتا کہ ماضی کو اِمروز بنا کر رکھ سکوں۔ بوا کے گھر سے آنے کے بعد میں نے ماں یا بہن بھائیوں سے وہاں کی کسی بھی بات یا واقعے کا ذکر نہیں کیا' حد تو یہ ہے کہ سونے کے سکوں کا بھی نہیں۔ اُن چھٹیوں میں دادا دادی کراچی آئے ہوئے تھے۔ دادا اپنی کسی بیماری کے سلسلے میں چیک اپ کرانے آئے تھے اِس لیے اس بار ہم لوگ سکھر نہیں جا سکے تھے۔ بابا وہاں جا کر بوا کو مل اور دیکھ آئے تھے۔ بابا نے بتایا تھا۔ ''عابد مما پھر کہیں چلے گئے ہیں اور تین چار ماہ سے اُن کی کوئی اطلاع نہیں ہے۔''

مجھے یقین تھا کہ بوا تنہا ہونے کے باوجود تنہا نہیں ہوں گی' اُن کے اردگرد بظاہر نہ نظر آنے والے لیکن اُن کا بہت خیال رکھنے والے بہت سے لوگ موجود ہوں گے۔

اُس سے اگلے سال ہم لوگ سکھر گئے تو میں عمر کی اُس منزل میں قدم رکھ چکی تھی جہاں شعور کو شعور آنے لگتا ہے۔ اِن دو سالوں میں بوا کافی ضعیف اور لاغر ہو چکی تھیں مگر اس کے باوجود اُن کی پوری شخصیت صدیوں کے رُموز کے ایک پراسرار خول میں بند نظر آتی تھی۔

تنہائی میں موقع ملتے ہی میں نے پوچھا تھا۔ ''بوا.....! ابزام' اسباق' شیونہ اور رُوحانہ کلام پاک ختم کر چکے ہوں گے۔ اَب بھی آتے ہیں یا نہیں؟''

بوا نے آہستہ سے بتایا تھا۔ ''آج کل وہ یہاں

نہیں ہیں' کہیں دور گئے ہوئے ہیں۔ واپسی ہوگی تو ضرور آئیں گے' اَب تو وہ کئی کئی مرتبہ تفسیر اور ترجمہ پڑھنے آتے ہیں۔''

اگلے دن ہم لوگوں کا پروگرام دادی کے گھر جانے کا تھا مگر میں پھر بوا کے پاس رک گئی۔ ماں اور باقی سب بہن بھائی خیر پور روانہ ہو چکے تھے۔

اُس دن بالکل اچانک عابد مما واپس آ گئے۔ پاؤں سے لپٹی گرد اور چہرے پر موجود غبار بتا رہا تھا کہ لمبی مسافتیں طے کر کے یہاں تک پہنچے ہیں۔ ابھی انہیں آئے چار دن ہی ہوئے تھے کہ گھر میں ایک مرتبہ پھر مہمانوں کے استقبال اور دعوت کی تیاریاں ہونے لگیں پھر اُسی طرح سالم دنبے' منوں روٹیاں اور نہ جانے ضیافت کا کیا کیا سامان تیار ہوا۔ اِس مرتبہ میں نے بھی تندور میں روٹیاں ڈالی اور نکالی تھیں پھر اُسی طرح صبح سے شام اور شام سے رات ہو گئی تھی۔ اُس دن بھی بوا تھکن سے ایسی نڈھال ہوئیں کہ کھانا کھاتے ہی سو گئیں مگر میں وہ منظر اب تک نہیں بھولی تھی جب ایسی ہی ایک رات بوا نے کوئی ایسا منظر دیکھا تھا کہ چیخ مار کر زمین پر گر سی گئی تھیں۔

وہ آدھی رات کا وقت تھا' فضا میں سکوت اور سناٹے کا راج تھا۔ مدھم مدھم سی چاندنی کسی بیوہ کی اجڑی مانگ کی طرح ایک لکیر سی بناتی صحن کے بیچوں بیچ سے گزر رہی تھی۔ دیو قامت درختوں کے عکس یہاں سے وہاں تک بھٹکی ہوئی روحوں کی طرح رقصاں تھے۔ اس مہیب اور ملگجے اندھیرے میں' میں آہستہ سے چارپائی سے اتر کر دبے پاؤں بغیر کسی خوف کے اس طرف جا رہی تھی جہاں عابد مما کی کوٹھری تھی۔ اَب میرا قد اتنا لمبا ہو چکا تھا کہ میں کھڑکی میں سے باآسانی اندر جھانک سکتی تھی۔ کوٹھری کے مضبوط دروازے کے پاس پہنچ کر تھوڑی دیر دم سادھے میں اندر مہمانوں کی آوازیں سننے کی کوشش کرتی رہی مگر وہاں تو شہرِ خموشاں جیسی خاموشی نے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ میں نے آہستہ سے کھڑکی پر پڑا ہوا پردہ اٹھا کر اندر دیکھنے کی کوشش کی مگر روشنی سے سفر کرتی آنکھیں اندھیرے سے اتنی مانوس نہیں ہوئی تھیں کہ اتنی جلد گھپ اندھیرے میں کچھ نظر آ سکتا۔ کچھ دیر بعد جب تھوڑی سی روشنی اور ہوئی تو اندر کا ہلکا سا منظر نظر آیا۔ فرش پر رکھی ہوئی سینیوں میں ہڈیوں کا ڈھیر رکھا ہوا تھا۔ روٹیوں کی خالی چنگیریں ایک چارپائی پر پڑی ہوئی تھیں' دوسری چارپائی پر جو کچھ بھی تھا' وہ عابد مما نہیں تھے' لگتا تھا' کسی روئی کے گڈے کو کسی نے ادھیڑ کر پورے پلنگ پر بکھرا دیا ہو۔ میں بہت دیر تک اندازے بھی لگاتی رہی اور بڑے مما' بڑے مما پکارتی بھی رہی مگر نہ کوئی مہمان نظر آیا نہ عابد مما۔ میں جتنی خاموشی اور جوش سے یہاں تک آئی تھی' اس سے کہیں زیادہ احتیاط اور پژمردگی کے عالم میں واپس لوٹ آئی اور بوا کے پہلو میں لیٹ کر نہ جانے کب گہری نیند سو گئی۔

صبح کسی کے زور زور سے کنڈی کھٹکھٹانے کے شور سے میری آنکھ کھل گئی۔ بوا بڑے مما کی کوٹھری کا دروازہ بہت دیر سے کھٹکھٹا رہی تھیں۔ میں بھی جلدی سے اٹھ کر بوا کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ بوا کنڈی کھٹکھٹاتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ ''عابد منع کرتا ہے کہ کبھی ایسے موقع پر جھانکنا نہیں جب مہمان آ کر چلے گئے ہوں' کب سے آوازیں دے رہی ہوں کہ نمازِ فجر قضا ہو گئی۔ سورج نکلنے ہی والا ہے مگر عابد سنتا ہی نہیں' دروازہ ہی نہیں کھول رہا ہے۔''

کافی دیر بعد بے تاب و بے قرار ہو کر بوا نے کھڑکی کا پردہ اٹھا کر اندر دیکھا اور عابد! عابد! کہتی دونوں ہاتھوں سے اپنا سینہ کوٹتی زمین پر بیٹھ کر رونے لگیں' برابر والی فیملی کے تمام افراد ان کے رونے کی آواز سن کر دوڑے چلے آئے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ کوئی سانحہ ہو چکا ہے۔ اُن کے مردوں نے پریشان ہو کر کھڑکی میں سے جھانکا اور خوف زدہ و پریشان ہو کر کہنے لگے۔ ''لگ رہا ہے' سید صاحب کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔'' ایک آدمی زاہد مما کو بلانے دوڑا۔ اُن کے آنے کے بعد کوٹھری کے دروازے کو توڑا گیا۔ پلنگ پر عابد مما تو تھے مگر اِس طرح کہ پورے پلنگ پر اُن کے جسم کے اعضاء بکھرے ہوئے تھے مگر کہیں بھی خون کی ایک بوند بھی نہیں تھی۔

بوا ہچکیاں لیتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ ''ہمیشہ کہتا تھا کہ اگر مجھے چھپ کر اِس حالت میں دیکھ لیا تو پھر کبھی زندہ نہ دیکھ پاؤ گی۔ ارے' یہ میں نے کیا کیا؟ اُس کے خود سے اٹھنے کا انتظار کیوں نہیں کر لیا؟''

مجھے آج جو بات خون کے آنسو رلاتی ہے' وہ یہ ہے کہ کسی کو بھی علم نہیں کہ بوا نے تو انہیں اُس حالت میں بعد میں دیکھا تھا' اُن سے پہلے تو میں دیکھ چکی تھی مگر اُس وقت میری آنکھوں پر قدرت نے ایسا پردہ ڈال دیا تھا کہ باوجود کوشش کے' مجھے کچھ ٹھیک سے دکھائی نہیں دیا تھا اور میں بڑے مما کو روئی کا گڈا سمجھی تھی۔ یہ اچھا ہی ہوا تھا ورنہ عابد مما کو اتنے ٹکڑوں میں بٹا دیکھ کر میرا ہارٹ فیل ضرور ہو جاتا۔

بڑے مما کو چھوٹے مما نے غسل و کفن دیا تھا۔ اُن کی وصیت تھی کہ انہیں اُن کے بزرگ مجذوب بیابانی کے مزار کے احاطے میں دفن کیا جائے۔ اتنی جلدی یہ ناممکن تھا۔ ماں سمیت سارے ہی رشتے داروں کی رائے تھی کہ انہیں بطور امانت بابا صدرالدین بادشاہؒ کے مزار کے اطراف میں دفن کر دیا جائے۔ اُن کی وصیت پر عمل کرنے میں تو نہ جانے کتنا عرصہ لگے گا۔

انہیں رات میں روہڑی ہی میں دفن کیا گیا مگر صبح جب رشتے دار اُن کی قبر پر فاتحہ پڑھنے گئے تو انہوں نے دیکھا کہ قبر میں میت نہیں تھی بلکہ کھدی ہوئی قبر گلاب اور موتیا کے پھولوں سے بھری ہوئی تھی۔ اُسی رات انہوں نے بوا کو خواب میں آ کر کہا تھا کہ آپ پریشان نہ ہوں۔ مجھے مجذوب بیابانی اپنے ساتھ لے گئے ہیں اور اب میں اُن کے پہلو میں دفن ہوں۔

•.....•.....•

چھوٹے مما نے جن کا کئی برس پہلے انتقال ہو چکا ہے' مجھے بتایا تھا کہ بڑے مما جو دعوت کرتے تھے' یہ ہمارے خاندان کا ہر بڑا بیٹا باقاعدگی سے کرتا تھا۔ اُس دعوت میں خاص مہمان جتاتوں کے وہی بزرگ ہوتے تھے جن کے کام ہمارے بزرگ آئے تھے اور وہ بزرگ جو خود بخود رُوپوش ہو گئے تھے یعنی جن کے مرنے کا کسی کو علم نہیں ہوا تھا۔ اِس دعوت میں اُن کی فاتحہ ہوتی تھی مگر یہ فاتحہ اور کھانا خاندان سے باہر کے کسی بھی فرد کو کھانے کی اجازت نہیں تھی۔

چھوٹے مما بھی اِس راز سے واقف تھے کہ دعوت کے بعد محفلِ سماع ہوتی تھی جس میں بڑے مما کے جسم کا ایک ایک عضو الگ ہو کر اللہ اللہ کی صدا لگاتا تھا۔ چھوٹے مما کے چونکہ بیٹیاں تھیں' کوئی بیٹا نہیں ہوا تھا اِس لیے بوا کے اور اُن کے انتقال کے بعد جتاتوں کا آنا جانا اور بزرگوں کی دعوت وغیرہ جیسے تمام سلسلے ختم ہو گئے۔ اَب ہمارے گھروں میں اُن بزرگوں کی صرف فاتحہ ہوتی ہے جو آج بھی باہر کا کوئی فرد نہیں کھا سکتا۔

☆☆.....☆☆

فرق صاف ظاہر ہے

موٹاپے کے مریض نے اپنے دوست کو بتایا کہ اس کا معالج اسے کھانے کے لیے گولیاں دیتا ہے جنہیں کھا کر وہ خواب دیکھتا ہے کہ حسین و جمیل لڑکیوں کے پیچھے بھاگ رہا ہے جب وہ بیدار ہوتا ہے تو خوب پسینے میں نہا رہا ہوتا ہے۔ اس طرح اس کا وزن برابر کم ہو رہا ہے۔ یہ سن کر مریض کا دوست بھی اسی ڈاکٹر کے پاس گیا۔ ڈاکٹر نے اسے گولیاں دے دیں۔ مریض نے خواب دیکھا کہ آدم خور وحشی اس کے پیچھے بھاگ رہے ہیں اور وہ ڈر کر بھاگ رہا ہے جب مریض جاگا تو وہ پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ اس نے ڈاکٹر کے پاس جا کر شکوہ کیا کہ میرے دوست کو گولیاں کھانے کے بعد حسین و جمیل لڑکیاں خواب میں نظر آتی ہیں اور مجھے آدم خور وحشی..... اس کی کیا وجہ ہے؟ فرق صاف ظاہر ہے ڈاکٹر نے جواب دیا۔

''تمہارا دوست میرا پرائیویٹ مریض ہے اور تم سرکاری اسپتال میں آ کر علاج کروا رہے ہو۔''

ناول

حمیرا خان

نواب

آخری قسط

اُس نوجوان کی سرگزشت؛ جس کے سینے میں انتقام کا جوالا مکھی بھڑک رہا تھا

نواب کھیتوں میں اس کا منتظر تھا' عالیہ کے چہرے پر نظر پڑتے ہی نواب کے دل پر چوٹ سی لگی اُس کا رنگ زرد ہو رہا تھا اور چہرے پر اس وقت بھی آنسوؤں کے نشان تھے بے تحاشا روتے رہنے کی وجہ سے اس کی آنکھیں سوجی ہوئی اور سرخ ہو رہی تھیں۔ لباس پر بے شمار شکنیں پڑی تھیں شاید اس نے پچھلے دو دن سے کپڑے بھی نہیں بدلے تھے بال بھی بے ترتیبی سے پونی میں لپٹے ہوئے تھے جو کئی جگہ سے باہر نکل رہے تھے نواب کو سامنے پا کر عالیہ کی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو چمکنے لگے نواب نے اپنے بازو پھیلا دیے تو وہ بے اختیار اس کے سینے سے لگ کر سسکنے لگی۔

☆.....☆.....☆

''میں تمہارے بنا نہیں رہ سکتی نواب مجھے یہاں سے دور لے چلو۔'' وہ نواب کے سینے سے لگی التجا کر رہی تھی۔

''میں بھی تمہارے بنا کب رہ سکتا ہوں میری جان مگر وہ یہ بات نہیں سمجھ رہے۔'' نواب کے لہجے میں بے بسی تھی۔

''نہیں سمجھتے تو نہ سمجھنے دو تم بس مجھے اپنے ساتھ لے چلو میں اب گھر واپس نہیں جاؤں گی۔'' عالیہ باغی لہجے میں کہہ رہی تھی نواب کسی گہری سوچ میں ڈوبا نظر آ رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

عالیہ کے گھر سے نکلنے کے کچھ دیر بعد ہی اس کا بھانڈا پھوٹ گیا تھا کہ چوہدرائن اُسے سمجھانے کی غرض سے اس کے کمرے میں چلی آئی تھی اور اس نے وہاں عالیہ کی بجائے رانی کو دیکھا تو سارا معاملہ لمحوں میں سمجھ گئی باقی کی بات دو چار تھپڑ کھانے کے بعد رانی نے بتا دی ذرا سی دیر میں حویلی کے سبھی مکینوں تک یہ خبر پہنچ گئی کہ عالیہ گھر سے غائب ہے۔ وسیم غصے سے بے حال ہو رہا تھا جوان خون تھا غصہ کنٹرول کرنا مشکل ہوتا ہے اور وہ بھی جب معاملہ غیرت کا آ جائے تو بات اور گھمبیر ہو جایا کرتی ہے۔

وسیم نے گھر سے نکلتے وقت گن اٹھالی تھی۔ چوہدری اور چوہدرائن کے علاوہ کچھ ملازم بھی اس کے ساتھ ہو لیے نہ جانے کیسے حویلی سے باہر یہ خبر پھیلی اور گاؤں کے لوگ بھی اس چھوٹے سے قافلے کا حصہ بنتے چلے گئے۔ نواب اور عالیہ اپنی باتوں میں لگے ہوئے تھے انہیں بالکل احساس نہیں ہوا کہ لوگ ان کی طرف بڑھے چلے آ رہے ہیں۔ چونکے تو تب جب وہ سب ان کے بالکل قریب پہنچ گئے ماں باپ اور بھائی کو اس طرح اچانک سامنے دیکھ کر عالیہ گھبرا گئی اور نواب کا بازو تھام کر اس کے پیچھے ہو گئی جیسے خود کو اس کے ساتھ محفوظ تصور کر رہی ہو۔ اس کی اس ادا نے جہاں نواب کو اپنے اہم ہونے کا احساس دلایا تھا وہیں وسیم کے غصے کو بڑھا دیا تھا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور اس نے عالیہ کا بازو پکڑنا چاہا لیکن نواب اس کے راستے میں آ گیا۔ اور اس نے وسیم کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ نواب کی یہ مداخلت وسیم کو بہت ناگوار گزری تھی۔

''تم سامنے سے ہٹ جاؤ۔'' وسیم غرایا۔

''تم اسے کچھ نہیں کہو گے۔'' نواب نے اسے پیچھے دھکیلتے ہوئے کہا۔ اس بات پر وہ دونوں آپس میں الجھ پڑے۔

''میں تمہیں جان سے مار دوں گا کمینے انسان تم نے ہماری عزت کے ساتھ کھیلنے کی کوشش کی ہے۔'' وسیم نے اسے گھونسا مارتے ہوئے کہا۔

''میں نے ایسا کچھ نہیں کیا میں اس سے محبت کرتا ہوں۔''

نواب چلایا۔ وسیم نے گن ہاتھوں میں سنبھالتے ہوئے اس کا نشانہ لیا تو نواب کے پیچھے چھپی عالیہ نکل کر سامنے آ کھڑی ہوئی۔

''بھائی تمہیں گولی مارنی ہے تو مجھے مارو اس کو کچھ مت کہو۔'' عالیہ نے کہا۔

''تو بھی مرے گی اور یہ بھی۔'' وسیم نے نشانہ باندھا چوہدری اور چوہدرائن چیخ چیخ کر وسیم کو گولی چلانے سے منع کر رہے تھے لیکن اس کے سر پر خون سوار تھا وہ کسی کی نہیں سن رہا تھا۔ یہ صورت حال دیکھتے ہوئے نواب نے بھی اپنی گن نکال کر وسیم کا نشانہ باندھ لیا عالیہ کے لیے یہ بہت مشکل وقت تھا ایک طرف اُس کا اکلوتا بھائی تھا جس سے بے شک اس

کی کبھی نہیں بنی تھی لیکن وہ اُس کا بھائی تھا دوسری طرف اس کا محبوب تھا۔ جس کے لیے وہ جان بھی دے سکتی تھی۔

''بھائی ہمیں جانے دو۔'' عالیہ نے وسیم سے درخواست کرتے ہوئے کہا اسی دوران چوہدری اپنے بیٹے کے بالکل قریب پہنچ گیا تھا اور یہی لمحہ تھا جب وسیم نے گولی چلائی' چوہدری نے اس کا ہاتھ پکڑ کر گن کا رخ آسمان کی طرف نہ کر دیا ہوتا تو وہ گولی نواب کی زندگی کا خاتمہ کر دیتی گولی چلنے کی آواز پر لمحہ بھر کو وہاں سکوت طاری ہو گیا۔ جیسے سب پر کسی نے جادو کر دیا ہو سب کو پتھر کا کر دیا ہو۔ عالیہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی نواب کو اور کبھی وسیم کو دیکھ رہی تھی۔

''اگر گن کا رخ آسمان کی طرف نہ ہوتا تو۔'' اس 'تو' کے آگے کی سوچیں بہت خوفناک تھیں۔

''مجھے تمہارے جیسے ظالم لوگوں کے پاس نہیں رہنا مجھے نواب کے ساتھ جانا ہے سنا تم نے؟'' عالیہ نے چلا کر کہا اس کا لہجہ اتنا اٹل تھا کہ چوہدری کے کاندھے جھک گئے جیسے وہ زندگی کی سب سے بڑی بازی ہار گیا ہو اور اس سے بڑی ہار کسی بھی باپ کے لیے کیا ہو سکتی ہے کہ اس کی جان سے پیاری بیٹی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرے وہ بھی کسی اجنبی مرد کے لیے.....

گاؤں کے لوگوں کے سامنے عالیہ کا اس طرح یہ سب کہنا چوہدری کی بے عزتی کرانے کے لیے کافی تھا۔ وسیم دوبارہ گن تانے انہیں گولی مارنے کے لیے کھڑا تھا۔ چوہدری اس کے ہاتھ سے پستول چھیننے لگا وہ مزاحمت کر رہا تھا۔ نواب اس دوران خاموشی سے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے آگے کا لائحہ عمل تیار کر رہا تھا۔ اتنا تو طے تھا کہ اسے عالیہ کو یہاں چھوڑ کر نہیں جانا تھا۔ اب یہ دیکھنا تھا کہ وہ آرام سے اسے ساتھ لے جا تا یا اس کے لیے قتل و غارت کرنا پڑتا۔

''مجھے جانے دو ابا مجھے نواب کے ساتھ رہنا ہے اسی کے ساتھ زندگی گزارنی ہے۔''

عالیہ اپنے باپ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہہ رہی تھی اس لمحہ چوہدری کا چہرہ سپاٹ ہو گیا یوں لگا جیسے وہ کسی فیصلے پر پہنچ گیا ہو۔

''تم لوگ یہاں سے چلے جاؤ۔'' گاؤں والوں نے حیرت سے چوہدری کو کہتے سنا جو نواب اور عالیہ کو وہاں سے چلے جانے کے لیے کہہ رہا تھا۔ چوہدر ائن آنسو بہاتے ہوئے خاموش تماشائی بنی ہوئی تھی' مجمع میں چوہدری کی اس بات پر چہ مگوئیاں ہونے لگیں۔ نواب نے اپنی گن ابھی تک واپس نہیں رکھی تھی اس نے عالیہ کا ہاتھ تھاما اور ایک طرف چلنے لگا' عالیہ بلا جھجک اس کے ساتھ چل رہی تھی اس کے چہرے پر کسی قسم کا کوئی ملال تھا نا اپنوں سے بچھڑنے کا کوئی افسوس دکھائی دے رہا تھا اُس کی آنکھوں میں فتح کی چمک تھی اور چہرے پر بے حد سکون پھیلا ہوا تھا۔

نواب اور عالیہ ساتھ ساتھ چلتے مجمع سے دور ہوتے چلے گئے ان کا رخ نواب کے گھر کی طرف تھا جہاں نواب کی گاڑی کھڑی تھی۔

☆.....☆.....☆

عالیہ کے گاڑی میں بیٹھتے ہی نواب نے گاڑی دوڑا دی تھی اسے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ سب کچھ اتنی آسانی سے ہو گیا ہے۔

''تم ٹھیک ہو نا؟'' نواب نے گاڑی چلاتے ہوئے عالیہ کی طرف رخ موڑ کر پوچھا جو اس کے برابر کی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ عالیہ نے جواب میں ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے گویا اسے تسلی بھی دی اور اپنی خیریت بھی بتائی۔

''اگر وہ مجھے نہ جانے دیتے تو کیا تم مجھے چھوڑ کر چلے جاتے؟'' عالیہ نے ذہن میں آتا سوال نواب کے سامنے دہرایا وہ اس وقت گاؤں سے کافی دور نکل آئے تھے۔

''ہرگز نہیں' میں تمہیں چھوڑ کر جانے کے لیے یہاں نہیں آیا تھا چاہے کیسے بھی' لیکن میں نے تمہیں اپنے ساتھ لے کر ہی جانا تھا اچھا ہوا کہ معاملہ آسانی سے طے ہو گیا ورنہ.....'' نواب نے بات ادھوری چھوڑ دی عالیہ نے بھی دل ہی دل میں سکون کا سانس لیتے ہوئے نواب کے کاندھے سے سر ٹکا دیا اور آنکھیں موند لیں اس کے لبوں کی مسکراہٹ بتا

رہی تھی کہ اس کی بند آنکھوں کے پیچھے بہت سہانے خواب اتر آئے تھے۔

☆.....☆.....☆

چوہدری اپنے بیوی بیٹے سمیت گھر لوٹ آیا تھا اور اب بڑی حویلی میں اتنے زیادہ نوکر چاکروں کے باوجود خاموشی چھائی ہوئی تھی' بلکہ وہاں سوگ کی کیفیت طاری تھی ملازم سبھی وفادار تھے اور اپنے مالکوں کے غم اور خوشی میں شریک تھے۔ چوہدری اپنے کمرے میں چلا گیا تھا اور اتنی دیر سے باہر نہیں نکلا تھا' وسیم بھی اپنے کمرے میں بند تھا بس ایک چوہدرائن تھی جو مسلسل روئے جا رہی تھی۔

''تم نے ایسا کیوں کیا' ابا تم نے اسے اس طرح کیوں جانے دیا؟'' شام کو جب تینوں ایک کمرے میں اکٹھے ہوئے تو وسیم نے باپ سے سوال کیا۔

''تو تمہارے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہیے تھا؟'' چوہدری نے تحمل سے پوچھا۔

''اُس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے لیکن اس طرح ہماری عزتوں کے ساتھ کھیل کر نہ جانے دیتے۔'' وسیم کے کہنے پر چوہدری اداسی سے مسکرایا اور بولا۔

''کیا ایسا کرنے سے ہماری عزت بچ جاتی جو بے عزتی ہوئی ہے وہ نہ ہوتی؟'' چوہدری کے پوچھنے پر وسیم جھنجلا گیا۔

''جو بھی ہوتا لیکن انہیں اس طرح یہاں سے نہیں جانے دینا چاہیے تھا، یہ بزدلی ہے۔'' وہ اپنی بات پر ڈٹا ہوا تھا۔

''جب تم باپ بنو گے بیٹا تب جان جاؤ گے کہ کوئی باپ بزدل کیوں ہو جایا کرتا ہے۔'' چوہدری کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا وسیم نے اس سے آگے کچھ نہیں کہا اس روز وہ گھر عالیہ کو ہمیشہ کے لیے رخصت کر چکا تھا اور جنہیں ہمیشہ کے لیے رخصت کر دیا جائے وہ پھر لوٹ کر نہیں آیا کرتے اور عالیہ کو شاید واپسی کی کوئی فکر تھی نہ خیال۔

☆.....☆.....☆

نواب نے فون پر اکرم کو سب حالات بتا دیے تھے اور اس نے اسلم کو سب بتا کر عالیہ کی آمد کے بارے میں بتا دیا

سچی کہانیاں میں شائع ہونے والا لازوال ناول 'تاشون' کتابی شکل میں دستیاب ہے

قدیم علوم کا سائنٹیفک نظریہ
ان کے ذاتی تجربات اور اصل حقائق واثرات
سعادت ونحوست کا حساب، حیرت وتجسس پر مبنی ناول

تاشون

تحریر: شازلی سعید مغل

۴۵۰ صفحات

Postage Rs: 50

برصغیر میں علم تسخیر کے بانی حضرت کاش البرنی کی عاملیت وکاملیت، روحانیت، محبت، تصوف اور دوسری دنیا کے تجربات ومشاہدات پُراسراریت کے نت نئے راز کھولتا ایک سحر انگیز ناول جس کے مرکزی کردار حضرت کاش البرنی ''بنام'' ''تاشون'' ہیں

ابھی رابطہ کر کے اپنی کاپی بک کروائیں یا اپنے قریبی بکسٹال پر اپنا آرڈر بک کروائیں۔

Auraq Publishers, Ibrahim market, PIB Colony, Karachi 74800

تھا۔ جس وقت نواب اور عالیہ گھر پہنچے ان کا بہت اچھے طریقے سے استقبال کیا گیا۔ عالیہ خود کو کوئی شہزادی محسوس کر رہی تھی جس کی خوب آؤ بھگت کی جا رہی تھی۔

اسلم یا اکرم کے رویے سے اسے ایک پل کے لیے بھی یہ محسوس نہیں ہوا تھا کہ وہ وہاں کوئی اجنبی ہے نہ ہی انہوں نے ایسی کوئی بات کی تھی جس سے عالیہ کو احساس ہوتا کہ وہ کسی خاص قسم کے حالات میں وہاں پہنچی ہے۔ ان کا رویہ عالیہ کے ساتھ بالکل نارمل تھا اس وجہ سے نواب نے بھی بہت سکون محسوس کیا تھا' کھانا بہت خوشگوار ماحول میں کھایا گیا تھا۔ کھانے کے بعد نواب نے عالیہ کو گھر دکھانے کا کہا تو وہ بھی تھکی ہونے کے باوجود خوشی خوشی گھر دیکھنے کو تیار ہوگئی۔ وہ گھر عالیہ کی سوچ سے بہت بڑا اور خوبصورت تھا' گھر کیا تھا محل تھا بس عالیہ حیرت اور خوشی سے اپنا نیا گھر دیکھ رہی تھی اور اسے خوش ہوتا دیکھ کر نواب مسکرائے چلا جا رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

جلد ہی ایک شاندار تقریب میں عالیہ اور نواب کی منگنی کر دی گئی اور اس کے کچھ دن بعد وہ دونوں شادی کے بندھن میں بندھ گئے اس روز وہ دونوں تو خوش تھے ہی لیکن اسلم بھی بہت خوش تھا۔ اس نے نواب کے لیے ایک اچھی اور نارمل زندگی کے خواب دیکھے تھے اور اس کے یہ خواب پورے ہو گئے تھے اور وہ اپنی بہن اور بہنوئی کے سامنے بھی سرخرو ہو گیا تھا۔ عالیہ اور نواب کے لیے زندگی جنت بن گئی تھی اور وہ دونوں اپنی اس جنت میں بے حد خوش تھے۔ کچھ عرصے بعد اکرم کے لیے بھی ایک اچھی سی لڑکی دیکھ کر اس کی بھی شادی کروا دی گئی اسی گھر کے ایک پورشن میں عالیہ اور نواب رہتے تھے اور انہی کے پورشن میں ان کے کمرے سے کچھ فاصلے پر لان کے دوسری طرف ایک کمرے میں اسلم رہتا تھا جبکہ تیس چالیس میٹر چھوڑ کر دوسرے پورشن میں اکرم اپنی بیوی نائلہ کے ساتھ اپنی نئی زندگی کا آغاز کر چکا تھا یوں تو ہونا یہ چاہیے تھا کہ اسلم اکرم کے پورشن میں قیام کرتا لیکن یہ بھی نواب کی ضد تھی کہ اسلم اکرم کے بجائے اس کے پورشن میں اس کے ساتھ رہے اکرم اور اسلم نے اس کی یہ اپنائیت بھری ضد مان لی تھی۔

لیکن ساتھ میں یہ شرط بھی رکھ دی تھی کہ وہ اس کے پورشن میں ضرور رہے گا لیکن اس کے لیے گھر سے ہٹ کر ایک کمرہ بنوا دیا جائے وہ ان میاں بیوی کی پرائیویسی میں مخل نہیں ہونا چاہتا تھا۔ مجبوراً نواب نے اسلم کی یہ بات مان لی تھی اور اس کے کہنے کے مطابق اپنے گھر کی بلڈنگ سے ہٹ کر ایک کمرہ تعمیر کروا دیا تھا جس میں اس نے دنیا کی ہر آسائش مہیا کرنے کی کوشش کی تھی۔

☆.....☆.....☆

''السلام علیکم کیسی ہو اماں؟'' وہ جانے کن سوچوں میں گم بیٹھی تھی کہ اسے وسیم کے آنے کی خبر تک نہ ہوئی چونکی تو تب جب اس نے زوردار آواز میں سلام کرتے ہوئے اس کی خیریت پوچھی۔

''تم رو رہی ہو؟'' وسیم کی آواز سن کر چوہدرائن نے غیر ارادی طور پر جلدی سے اپنا چہرہ دوپٹے سے صاف کیا تھا لیکن وہ اپنے آنسو تو صاف کر گئی تھی لیکن بھیگی ہوئی سرخ آنکھوں نے اس کے رونے کا بھید کھول دیا۔

''اتنا وقت ہو گیا تو آج بھی اس کم ظرف کو یاد کر کے روتی ہے اماں جس نے مڑ کر تیری خبر بھی نہیں لی ہے۔'' وسیم کو ماں کی حالت پر دکھ بھی تھا لیکن اسے اس طرح چھپ چھپ کر روتے دیکھتا تھا تو غصہ بھی بہت آتا تھا ماں پر اور ایسے میں وہ بہت تلخ ہو جایا کرتا تھا۔

''ماں اور بچوں میں یہی تو فرق ہوتا ہے بیٹا بچے بھول جاتے ہیں اپنی زندگیوں میں اپنی خوشیوں میں مگن ہو جاتے ہیں لیکن ماں کی تو زندگی بھی اس کے بچے ہوتے ہیں اور اس کی ہر خوشی بھی اس کے بچوں میں ہوتی ہے۔'' چوہدرائن نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے ماں اور بچوں کے رشتے کی سچائی بیان کی وہ بھی جواب میں بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن جانے کیا سوچ کر خاموش رہ گیا تھا شاید ایک پیار کرنے والی ماں کے سامنے اسے اپنی ہر دلیل بیکار لگ رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

جمال نے بہت عرصے بعد نواب کے پاس اپنے خاص آدمی منشا کو بھیجا تھا کام بھی اتنا ہی خاص تھا تبھی منشا خود آیا تھا الیکشن قریب تھے اور اس وقت سیاستدان ہر طرح کے داؤ کھیلنے میں لگے ہوئے تھے۔ اسی سلسلے میں جمال کو نواب کی ضرورت آن پڑی تھی۔ منشا کو اپنے گھر پر دیکھ کر نواب چونکا تھا اس کا خیال تھا کہ بنا کہے یہ بات سب جان چکے ہوں گے کہ وہ یہ سب کام چھوڑ چکا ہے اس لحاظ سے منشا کا وہاں آنا نہیں بنتا تھا کیونکہ اس کے علاوہ جمال اور نواب کے درمیان اور کوئی وجہ نہیں تھی ملنے کی اس نے منشا کو عزت سے بٹھایا اور اس کے لیے چائے منگوانے کے لیے انٹر کام کا ریسیور اٹھایا تو منشا نے منع کر دیا۔

''تکلف رہنے دیں نواب صاحب میں بہت جلدی میں ہوں۔'' منشا کے کہنے پر نواب نے ریسیور واپس رکھ دیا اور سوالیہ نظروں سے منشا کی طرف دیکھنے لگا جیسے پوچھ رہا ہو۔

''بتاؤ میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں۔'' اس کی نظروں کا مطلب سمجھتے ہوئے منشا نے کنکھار کر اپنا گلا صاف کیا اور پھر وہ اپنے آنے کا مقصد بیان کرنے لگا نواب خاموشی سے اس کی بات سنتا رہا۔

''میں سمجھتا تھا کہ جمال صاحب بہت باخبر آدمی ہیں۔'' منشا کے خاموش ہونے کے بعد نواب کے اس فقرے پر منشا حیران دکھائی دینے لگا۔

''میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھا آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔'' آخر اس نے پوچھ لیا نواب ہلکے سے مسکرایا۔

''میں یہ سب کچھ چھوڑ چکا ہوں اور میرا خیال ہے یہ خبر جمال صاحب تک ضرور پہنچ گئی ہوگی اس کے باوجود یہ پیغام بھیجنا میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔'' نواب نے سہولت سے اپنی بات کہہ دی۔

''ارے نواب صاحب کام تو چلتے رہتے ہیں۔'' منشا نے بات ہنسی میں ٹالنا چاہی۔

''نہیں چلتے رہتے اب میں ایک بزنس مین ہوں جمال صاحب جتنا بڑا نہ سہی لیکن بہرحال ایک عزت دار بزنس مین ہوں۔'' منشا کے برعکس نواب بے حد سنجیدہ تھا منشا کے ہنسنے کے جواب میں وہ ہلکا سا مسکرایا تک نہیں تھا۔

''میرا خیال ہے آپ اس طرح انکار نہ کریں جمال صاحب مائنڈ کریں گے آپ تھوڑا سوچ لیں پھر بھی.....'' منشا نے درمیان کی راہ نکالنا چاہی۔

''مجھے کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں ہے میں فیصلہ کر چکا ہوں اور اپنے فیصلوں پر قائم رہنے والا انسان ہوں۔'' نواب نے منشا کی بات کاٹتے ہوئے کہا منشا اس کی انکار سن کر وہاں سے چلا گیا اور اس کے جانے کے بعد نواب گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

☆.....☆.....☆

منشا نے نواب کا انکار جمال تک پہنچا دیا تھا جسے سن کر وہ بہت غصے میں آ گیا تھا' لیکن وہ ایک سیاستدان تھا اپنے غصے کو کنٹرول کرنا اسے اچھی طرح آتا تھا ویسے بھی جمال کو اس وقت نواب کی ضرورت تھی۔ اور ضرورت پڑنے پر گدھے کو باپ بنانا سیاستدانوں سے زیادہ بہتر طریقے سے کس کو آتا ہے بھلا..... جمال نے ایک بار پھر نواب کے پاس پیغام بھجوا دیا اس بار اس نے نواب کو ملنے کے لیے بلوایا تھا۔ پیغام ملنے پر ایک بار تو نواب کے دل میں آئی کہ انکار کر دے کیونکہ وہ اس دعوت کے پیچھے چھپے مقصد کو جانتا تھا اور منع بھی کر چکا تھا اس لیکن پھر کچھ سوچ کر نواب نے ملنے کے لیے ہاں کر دی۔

☆.....☆.....☆

نواب اور جمال کی یہ ملاقات زیادہ خوشگوار نہیں رہی تھی' نواب نے جمال کے سامنے بھی بنا کسی مروت کے انکار کر دیا تو جمال نے اسے ہر ممکن طریقے سے قائل کرنے کی کوشش کی یہ اس کا بہت اہم وقت تھا الیکشن سر پر تھے ایسے میں اسے نواب کا انکار بری طرح کھل رہا تھا آخر بات تلخ کلامی تک آ پہنچی جمال اسے اپنی حیثیت اپنی طاقت جتا رہا تھا اور یہ بات نواب کہاں برداشت کرنے والا تھا اس ملاقات کا اینڈ بہت ناخوشگوار تھا۔

☆.....☆.....☆

''میں الیکشن میں کھڑا ہونا چاہتا ہوں۔'' گھر واپسی پر نواب نے اسلم اور اکرم کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو وہ کچھ حیرت سے اسے تکنے لگے۔

''یہ اچانک تمہیں سیاست میں آنے کی کیا سوجھی؟'' اسلم نے پوچھا۔

''بات یہ ہے ماما کہ ہمارے پاس پیسے کی کمی نہیں ہے ماشاء اللہ کاروبار بہت اچھے چل رہے ہیں لیکن اس ملک میں صرف دولت مند ہونا کافی نہیں ہوتا بلکہ طاقت حاصل کرنا بھی ضروری ہوتا ہے بھی آپ سکون سے اپنی زندگی گزار سکتے ہیں۔'' نواب نے دھیرے دھیرے انہیں ساری بات بتادی جو اس کے اور جمال کے درمیان ہوئی تھی۔ جمال نے اسے طعنہ دیا تھا کہ آخر وہ ایک ڈاکو تھا اور جتنا بھی بزنس کر لیتا لوگ اسے ایک ڈاکو کے طور پر ہی یاد رکھیں گے وغیرہ وغیرہ..... وہ جو اپنا ماضی بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا اس طعنے پر غصے میں آ گیا تھا۔

''تمہیں جو کرنا ہے کرو لیکن میں اتنا ضرور کہوں گا کہ جو بھی کرنا ہے سوچ سمجھ کر کرنا اور دشمنیاں بنانے سے گریز کرنا۔'' اسلم ساری بات سن کر فکر مند ہو گیا تھا جمال جیسے انسان کی دشمنی نواب کو خاصی مہنگی پڑ سکتی تھی اور یہی بات اسلم کو پریشان کر رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

اس روز عالیہ کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی نواب اس وقت گھر پر نہیں تھا' وہ الیکشن کی تیاریوں کے سلسلے میں زیادہ دیر گھر سے باہر رہا کرتا تھا اکرم بھی اس کے ساتھ ہی ہوتا تھا لیکن اس روز اتفاق سے اکرم گھر پر تھا وہی عالیہ کو ہاسپٹل لے گیا اور پھر وہاں ڈاکٹر نے انہیں خوشخبری سنائی کہ عالیہ ماں بننے والی ہے نواب تو کیا خوش ہوتا جو چاچا بننے کی خبر سن کر اکرم خوش ہوا۔ اس نے فوراً نواب کو فون لگا دیا نواب اسی وقت ساری مصروفیات چھوڑ چھاڑ کر عالیہ کے پاس اسپتال پہنچ گیا وہ کمرے میں آیا تو عالیہ نے شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ نواب کا استقبال کیا نواب کے چہرے پر بھی مسکراہٹ بکھر گئی۔

☆.....☆.....☆

نواب نے باقاعدہ طور پر الیکشن لڑنے کا اعلان کر دیا تھا اور آج کل اس کے دن رات اسی مصروفیت کی نظر ہو رہے تھے البتہ وہ پھر بھی جیسے تیسے عالیہ کے لیے وقت نکال لیا کرتا تھا وہ اسے باقاعدگی سے اسپتال چیک اپ کے لیے لے کر جاتا تھا اور اس کے کھانے پینے کا بھی خود خیال رکھتا۔

''کوا ہنس کی چال چل رہا ہے۔'' جمال نے نواب کے الیکشن لڑنے کی خبر سن کر طنزیہ مسکراتے ہوئے کہا تھا جواب میں اس کے حواری نواب کا مذاق اڑا کر اس کا ساتھ دینے لگے اور وہ سب مل کر نواب کی کھلی اڑانے لگے۔

☆.....☆.....☆

اس روز نواب ابھی آفس کے لیے نکل رہا تھا کہ منشا کی آمد ہوئی اس واقعے کے بعد سے نواب کی پہلی بار منشا سے ملاقات ہو رہی تھی وہ اس کی آمد پر کچھ حیران ہوتا ہوا سلام دعا کر رہا تھا۔

''ہاں جی تو اب کیا پیغام بھیجا ہے تمہارے سیٹھ نے۔'' چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے نواب نے ہلکے پھلکے انداز میں پوچھا۔

''بات یہ ہے نواب صاحب میں آج آپ کے پاس اپنے ایک ذاتی کام کے سلسلے میں آیا ہوں۔'' منشا نے جواب میں کہا۔

''ہاں بولو کیا کر سکتا ہوں میں تمہارے لیے؟'' فطری طور پر نواب تجسس میں مبتلا ہو گیا تھا کہ آخر منشا کو اس سے کیا کام پڑ سکتا ہے۔

''میں نے سنا ہے کہ آپ الیکشن کی تیاریاں کر رہے ہیں دوسری طرف میں جمال صاحب کو چھوڑنا چاہ رہا ہوں ایسے میں اگر آپ مجھے اپنے پاس جاب دے دیں تو مہربانی ہو گی۔'' منشا کی بات نے نواب کو چونکا دیا اس کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ لیکن وہ جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہتا تھا اس لیے فوری طور پر ہاں یا ناں کرنے کی بجائے اور بات کرنے لگا۔

''کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اچانک تمہارا ایسا کیا اختلاف نکل آیا جس کی وجہ سے تم اسے چھوڑنا چاہتے ہو؟'' نواب نے محتاط انداز میں وجہ جاننا چاہی۔ جواب میں منشا ایک لمحے کو خاموش رہ گیا پھر جیسے اس نے سب کچھ بتانے کا فیصلہ کرلیا اور کہنے لگا۔

''اختلاف یہ ہے نواب صاحب کہ مجھے جمال صاحب کی بہن سے محبت ہوگئی ہے اور ظاہر ہے یہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے اب یہ تو طے ہے کہ میں مزید ان کے ساتھ کام نہیں کرسکتا اس سے پہلے کہ وہ مجھے جاب سے نکالیں میں خود ان کو چھوڑنا چاہتا ہوں۔'' محبت کی بات سن کر نواب کا دل نرم پڑ گیا' اسے بھی اس معاملے کی تھوڑی بہت بھنک لگی تھی اس لیے اس نے منشا کی بات پر یقین کرلیا تھا وہ خود محبت میں ان حالات سے گزر چکا تھا اس لیے اسے منشا سے ہمدردی تھی دوسرے اُسے یہ بھی اچھی طرح اندازہ تھا کہ بے شک منشا عمر میں اس سے کافی چھوٹا تھا لیکن جمال کے ساتھ رہ کر منشا سیاست کے رموز بہت اچھی طرح سمجھ چکا تھا بلکہ ایک طرح سے وہ جمال کا رائٹ ہینڈ بنا ہوا تھا اور نواب کو ایسے تجربہ کار لوگوں کی بہت ضرورت تھی جو الیکشن لڑنے میں اس کی مدد کرپاتے' اس نے منشا کو جاب پر رکھ لیا تھا اور آنے والے وقت میں منشا نے محنت اور لگن سے کام کر کے ثابت کردیا تھا کہ نواب نے اسے رکھ کر غلط فیصلہ نہیں کیا تھا۔

☆.....☆.....☆

انہی بھاگتے دوڑتے دنوں میں ایک دن نواب کے لیے بہت بڑی خوشخبری لے کر آیا وہ دو جڑوں بچوں کا باپ بن گیا تھا اللہ نے اسے ایک ساتھ رحمت اور نعمت دونوں سے نواز دیا تھا' وہ جتنا بھی خوش ہوتا کم تھا۔ نواب نے خیرات وصدقات کی انتہا کردی تھی۔ عالیہ اس کی دیوانگی دیکھ دیکھ کر ہنستی رہتی اور خود پر ناز کرتی رہتی کہ اسے کتنا چاہنے والا شوہر ملا ہے انہوں نے بچی کے نام ثانیہ اور بیٹے کا نام شرجیل رکھا۔ دونوں بچوں کی آمد نے ان کے گھر کو مکمل کردیا تھا۔

☆.....☆.....☆

ایک ہفتہ ہاسپٹل میں گزار کر عالیہ بچوں کو لیے گھر لوٹ آئی یہ پورا ہفتہ نواب نے بیوی بچوں کے ساتھ گزارا تھا وہ جیسے بھول ہی گیا تھا کہ ان کے علاوہ بھی اس کی کوئی مصروفیت ہے' وہ چوبیس گھنٹے عالیہ کے ساتھ ہوتا تھا عالیہ کے ٹوکنے پر ہی وہ کچھ دیر کے لیے گھر جاتا تاکہ نہادھو کر کپڑے وغیرہ بدل لے اور پھر واپس آجاتا۔

''سر آپ سے بات کرنی ہے۔'' جس روز وہ گھر لوٹے منشا نے نواب سے کہا وہ اب نواب کو سر کہنے لگا تھا۔

''ہاں بولو کیا بات ہے۔'' بچوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے نواب نے مصروف سے انداز میں پوچھا۔

''سر آپ آج کل سارا وقت گھر پر گزار رہے ہیں۔'' منشا کے کہنے پر نواب نے اُلجھ کر اسے دیکھا جیسے اس بات کا مقصد سمجھ نہ آیا ہو۔

''سر پارٹی آفس کو آج کل آپ کی توجہ کی بہت ضرورت ہے۔'' منشا نے اپنا مدعا بیان کیا۔

''اوہ ہاں اچھا.....'' نواب جیسے کسی خواب سے جاگا تھا اور منشا کے احساس دلانے پر اسے خیال آیا تھا کہ واقعی وہ آفس اور الیکشن کو بہت بری طرح اگنور کررہا تھا جو کہ اس کے لیے نقصان دہ ثابت ہوسکتا تھا اب اگر وہ سیاست کے میدان میں اتر ہی رہا تھا تو اسے یہاں بھی کامیابی چاہیے تھی ہمیشہ کی طرح ہر جگہ کی طرح.....اتفاق سے اکرم نے بھی اسی روز اس سے اس سلسلے میں بات کی تھی کہ وہ اب الیکشن پر توجہ دے اور نواب نے اس سے وعدہ کرلیا تھا کہ اب وہ ایسا ہی کرے گا اور اس نے ایسا ہی کیا بھی تھا۔

☆.....☆.....☆

نواب نے بچوں کی پیدائش کی خوشی میں بہت بڑی پارٹی کا اہتمام کیا تھا جس کی ساری ذمہ داری منشا نے اٹھائی تھی اور اس کے کیے گئے انتظامات کو بہت پسند کیا جارہا تھا۔ تقریباً ہر مہمان نے نواب سے پارٹی کی تعریف کی تھی جس پر نواب کی نظروں میں منشا کی اہمیت اور بڑھ گئی تھی۔ منشا نے پارٹی میں آنے والے ہر فرد کا خیال رکھا تھا بچوں کے لیے لطف اندوز ہونے کے لیے الگ سے انتظامات کیے گئے تھے۔ اسی طرح مردوں کے لیے بار اور مختلف گیمز کا انتظام تھا تو

خواتین کے لیے ان کی پسند کے حساب سے تیاریاں کی گئی تھیں۔ اس پارٹی کی مہمان خصوصی عالیہ تھی جو بلیک کلر کی ستاروں سے سجی ساڑھی میں خود کوئی اپسرا لگ رہی تھی' ماں بن کر اس کے چہرے پر ایسا نکھار آیا تھا جس نے اس کی خوبصورتی میں اضافہ کر دیا تھا بدن کے گداز میں اضافہ ہو گیا تھا۔ تقریب میں وہ سبھی کی نگاہوں کا مرکز بنی ہوئی تھی لیکن دو آنکھیں مسلسل اسی کا طواف کر رہی تھیں اور یہ آنکھیں منشا کی تھیں' منشا کا نواب کے گھر آنا جانا رہتا تھا عالیہ سے بھی سلام دعا ہوتی رہتی تھی لیکن آج جس طرح منشا کی نگاہیں عالیہ کے سراپے سے اُلجھی تھیں ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا اس کے ذہن میں بہت سے خیالات آ جا رہے تھے' اِدھر اُدھر مہمانوں کے ساتھ مصروف ہونے کے باوجود اس کا ذہن ایک منصوبہ بنانے میں لگا ہوا تھا اور پارٹی کے آخر تک اس کے ذہن میں ایک مکمل قسم کا پلان بن چکا تھا اب بس اس پر عمل کرنے کی دیر تھی پھر اس کی زندگی میں سب کچھ بدل جانا تھا جس کے لیے وہ کئی سالوں سے کوشش کر رہا تھا لیکن اسے کوئی راستہ نہیں مل رہا تھا اب اسے وہ شارٹ کٹ مل گیا تھا جس کا وہ برسوں سے متلاشی تھا۔

☆.....☆.....☆

شہر کے بڑے بڑے لوگوں سے نواب کے رابطے تھے پہلے بھی وہ جمال کے علاوہ کچھ دوسرے لوگوں کے لیے بھی کئی کام کر چکا تھا پھر اس کا بزنس بھی اس کی پہچان تھا شہر کے بڑے بزنس مینوں میں اس کا شمار ہوتا تھا ان میں کئی سیاستدان بھی تھے جن کے ساتھ اس کا اٹھنا بیٹھنا تھا اس کے لیے ایک بڑی سیاسی پارٹی کا ٹکٹ لینا کوئی زیادہ مشکل کام ثابت نہیں ہوا تھا وہ پارٹی فنڈ میں اپنا حصہ ڈالنے کے قابل تھا شہر میں بااثر افراد میں شامل تھا اور پارٹی کے لیے بہت اچھا اضافہ ثابت ہو سکتا تھا اس لیے اسے ایم این اے کی سیٹ پر الیکشن لڑنے کے لیے پارٹی کا ٹکٹ مل گیا تھا۔ یہ ایک بڑی کامیابی تھی لیکن اصل کام اب شروع ہوا تھا اصل کام لوگوں کو اس بات کے لیے تیار کرنا کہ وہ نواب کو ووٹ دے کر کامیاب کرائیں۔ نواب کی کاروباری حلقوں میں تو سب سے جان پہچان تھی لیکن عوامی سطح پر کبھی لوگوں کے قریب آنے کا موقع نہیں ملا تھا اگرچہ اس کا نام لوگوں کے لیے اجنبی نہیں تھا لیکن سیاست کے حوالے سے نہیں بلکہ لوگ اسے سابقہ ڈاکو اور حال کے بزنس مین کے طور پر جانتے تھے اور اب نواب کو لوگوں کو یہ یقین دلانا تھا کہ وہ ان کا مسیحا ہو سکتا تھا ان کے مسائل حل کر سکتا تھا نواب کے پاس وقت بہت تھوڑا تھا اور کام بہت بڑا اور بہت زیادہ تھا لیکن اکرم اور منشا ہر طرح سے دن رات اس کے لیے کام کر رہے تھے اور اسے امید تھی کہ اسے کامیابی حاصل ہو جائے گی۔

☆.....☆.....☆

ٹکٹ ملتے ہی نواب کی مصروفیات میں اضافہ ہو گیا اب اس کا دن رات کا زیادہ تر وقت پارٹی آفس میں گزرتا اکرم نے اسے کاروبار کی فکروں سے آزاد کرتے ہوئے سب کچھ خود سنبھالا ہوا تھا اس لحاظ سے اب نواب کی ساری توجہ الیکشن مہم پر تھی۔ اس سلسلے میں ہونے والی پارٹی اور جلسوں وغیرہ کا انتظام منشا کر رہا تھا۔ نواب بہت تیزی سے لوگوں میں مقبول ہو رہا تھا اس نے اپنے علاقے کے لوگوں کو خاص طور پر اپنی فیکٹریوں میں نوکریوں پر رکھنا شروع کر دیا تھا اس کے علاوہ بھی وہ دن میں دو تین گھنٹے اپنے آفس میں عام لوگوں سے ملا کرتا اور ان کے مسائل جان کر جس حد تک ہو سکتا ان کی مدد کرتا یہ لوگوں کے لیے ایک نئی بات تھی ان کے لیے سیاستدان ایک بڑی چیز ہوتا تھا جس سے ملنا بھی ان کے لیے ممکن نہ ہوتا تھا کہ انہیں اپنے مسائل بتا سکیں اور اگر کبھی الیکشن کے دنوں میں ملنے کا موقع مل بھی جاتا تھا تو بات بس ملنے کی حد تک رہتی تھی ان سے وعدے کیے جاتے تھے جو کبھی پورے نہیں ہوتے تھے لیکن اب جھوٹے دلاسے نہیں دیے جا رہے تھے وعدے نہیں کیے جا رہے تھے بلکہ سچ مچ ان کے مسائل حل کیے جا رہے تھے ایسے سیاستدان کا لوگوں میں جلدی سے مقبول ہو جانا کوئی عجیب بات نہیں تھی۔

☆.....☆.....☆

انہی بھاگتے دوڑتے دنوں میں آخر الیکشن کا دن آ پہنچا علاقے میں بڑی ٹینشن کا ماحول تھا نواب کا مدمقابل جمال تھا جو کئی بار ایم این اے بن چکا تھا اور اس بار بھی بہت امید بلکہ پُریقین تھا کہ اس کے پشتوں کی یہ سیٹ آخر اسی کو ملنے والی تھی

لیکن جب ٹی وی پر رزلٹ کا اعلان ہوا تو جیتنے والا نام نواب کا تھا نواب جو کہ کبھی ایک ڈاکو ہوا کرتا تھا اب ایم این اے نواب بن چکا تھا۔ اس رات نواب کے لوگ جیت کا جشن منا رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

نواب بے حد خوش تھا اور اپنی اس جیت کا سارا کریڈٹ منشا کو دے رہا تھا جس نے نا صرف نواب کی جیت کے لیے دن رات کام کیا تھا بلکہ اسے بہت سے مفید مشورے بھی دیے تھے۔

''مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ اگر تم نہ ہوتے تو شاید آج یہ جیت میری نہ ہوتی۔'' نواب نے پُر جوش انداز میں منشا کو گلے لگاتے ہوئے کہا تو وہ مسکرا دیا اس کی مسکراہٹ بہت معنی خیز تھی لیکن نواب اس کی معنی خیزی کو نہیں سمجھا تھا۔ اس دن کے بعد سے منشا نواب کے لیے پہلے سے بڑھ کر اہم ہو گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

جمال نے تصور بھی نہیں کیا تھا کہ نواب جیسا نوخیز سیاستدان اسے شکست دے سکتا ہے۔ وہ غصے سے پاگل ہو رہا تھا اسے بالکل سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ سب کیسے ہو گیا اس نے تو ہمیشہ کی طرح جلسے جلوس کیے تھے لیکن اصل بات یہ تھی کہ سالوں سے جیتتے جیتتے اس کی عادت بن گئی تھی اور اس نے اس سیٹ کو اپنی ملکیت اپنا حق سمجھ لیا تھا اور وہ یہ بات نظر انداز کر گیا تھا کہ برسوں سے وہ صرف وعدے کرتا چلا آ رہا تھا لیکن اس نے اپنے وعدے پورے نہیں کیے تھے ایسے میں لوگوں کا نواب کی طرف متوجہ ہو جانا اور اسے ووٹ دینا کوئی عجیب بات نہیں تھی نواب کی صورت میں انہیں مسیحا دکھائی دیا تھا تو وہ اسے ووٹ دے کر کامیاب کیوں نہ بناتے لیکن جمال یہ سب باتیں نہیں سمجھ رہا تھا اسے صرف نواب سے ہارنے کا رنج کھائے جا رہا تھا اور سیٹ جانے کا دکھ الگ تھا۔

☆.....☆.....☆

منشا کا پہلے بھی نواب کے گھر آنا جانا لگا ہی رہتا تھا لیکن اب تو بات ہی اور ہو گئی تھی اب وہ نواب کے گھر آنے کے لیے موقع کی تلاش میں رہتا تھا اور صرف اتنا ہی نہیں وہ عالیہ اور بچوں کے کافی کلوز ہو چکا تھا۔ عالیہ ویسے ہی ایک خود پسند عورت تھی ایسے میں منشا کی کی گئی تعریفیں اسے آسمان پر پہنچانے کے لیے کافی تھیں' ویسے بھی آئینہ اسے بتاتا رہتا تھا کہ وہ دو بچوں کی ماں ہو کر بھی کسی سے کم نہیں ہے اور یہ سچ بھی تھا وہ آج بھی اپنی عمر سے بہت کم دکھائی دیتی تھی اور دو بچوں کی ماں تو وہ کسی بھی اینگل سے نہیں لگتی تھی۔ بچے منشا چاچو کے اتنا کلوز ہو چکے تھے کہ نواب کی بجائے منشا سے فرمائشیں کیا کرتے اور اس کے ساتھ مل کر کبھی پکنک تو کبھی کہیں سیر کا پروگرام بناتے اور ظاہر ہے ان کے ہر پروگرام میں عالیہ بھی ان کے ساتھ ہوتی تھی نواب کی مصروفیت بڑھتی جا رہی تھی اور بچوں اور عالیہ سے دوری بھی لیکن اسے ابھی اس بات کا احساس نہیں ہونے پایا تھا شاید عالیہ پر یقین بہت زیادہ تھا یا اپنی محبت پر۔

☆.....☆.....☆

جمال اپنے ٹی وی لاؤنج میں بیٹھا ہوا تھا اس کے عین سامنے ٹی وی چل رہا تھا' اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اس کا موڈ اس وقت بہت خراب تھا اور ٹی وی پر چلتی رپورٹ اسے بہت ناگوار گزر رہی تھی لیکن پھر بھی وہ ٹی وی اسکرین پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ آج کل نواب میڈیا میں چھایا ہوا تھا در اصل اس نے شہر میں ایک نیا پراجیکٹ شروع کیا تھا یہ ایک فیکٹری تھی اور اس میں مزدور سے لے کر آفیسر تک سب کے سب لوگ اس نے اپنے ہی شہر اور خاص طور سے اپنے علاقے سے لیے تھے۔ یہ ایک نیا کام تھا جسے عام لوگوں کے علاوہ میڈیا میں بھی خوب سراہا جا رہا تھا اور اس کے بارے میں رپورٹس بھی چل رہی تھیں پرنٹ میڈیا پر بھی اس پر آرٹیکل لکھے جا رہے تھے نواب کی بڑھی ہوئی شہرت جمال کو جلا کر خاک کرنے کے لیے کافی تھی۔ وہ ٹی وی پر نظریں جمائے گہری سوچ میں کھویا ہوا تھا۔

☆.....☆.....☆

جیسے جیسے نواب کی مصروفیات بڑھ رہی تھیں ویسے ویسے اس کا منشا پر انحصار بھی بڑھتا چلا جا رہا تھا' منشا اب اس کے

لیے صرف اس کا رائٹ ہینڈ نہیں رہا تھا بلکہ اب وہ اس کے لیے چھوٹے بھائی کی طرح تھا نواب واقعی اسے بہت عزیز رکھتا تھا اور منشا بھی ہمیشہ فرمانبردار بھائی کا رول پلے کرتا تھا۔ گھر کے اندر بھی منشا کا اختیار بہت بڑھ چکا تھا' عالیہ کے ساتھ اس کا افیئر زوروں پر تھا جس کی ابھی تک کسی کو بھنک نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اکرم کو منشا ہمیشہ سے بہت کھٹکتا تھا بظاہر وہ بڑا کام کا بندہ تھا اور اس سے نواب کو بہت فائدہ بھی پہنچ رہا تھا لیکن وہ اکرم کو بہت ناپسند تھا اس نے پہلے کبھی اپنی اس ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن گھر میں منشا کی بڑھتی ہوئی آمد و رفت پر اکرم تشویش کا شکار ہو گیا تھا۔

''اپنے دفتر کے لوگوں کو دفتر تک محدود رکھا کرو نواب یہی بہتر ہوتا ہے۔'' اس روز اس نے آخر نواب سے کہہ ہی دیا۔

''میں سمجھا نہیں تم کس کی بات کر رہے ہو؟'' آج وہ دونوں کافی عرصے بعد اس طرح فرصت سے اکیلے بیٹھے ہوئے تھے نواب سمجھ نہیں سکا تھا کہ اکرم کا اشارہ کس طرف ہے۔

''میں منشا کی بات کر رہا ہوں اس کی گھر میں آمد و رفت اور گھر کے معاملات میں دخل اندازی بہت بڑھ گئی ہے نواب بہت کچھ بدل رہا ہے پتا نہیں تمہاری توجہ اس بات کی طرف کیوں نہیں ہوئی ہے ابھی تک۔'' وہ اشارہ دے رہا تھا لیکن نواب کی توجہ واقعی اس طرف نہیں تھی اکرم کی بات پر وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

''ارے منشا بھی تو اب گھر کے فرد کی طرح ہے نا سچ کہوں تو مجھے وہ چھوٹے بھائی کی طرح عزیز ہو گیا ہے۔'' نواب نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

''گھر کا فرد ہونے اور گھر کا فرد جیسا ہونے میں بہت فرق ہوتا ہے میرے بھائی' تمہارے جذبات اپنی جگہ لیکن پھر بھی میں تمہیں یہی مشورہ دوں گا کہ اپنے کان اور آنکھیں کھلی رکھو۔'' وہ صاف صاف اسے یہ بات نہیں کہنا چاہتا تھا کہ وہ منشا اور عالیہ کے درمیان بڑھتی ہوئی بے تکلفی پر توجہ کرے یہ کوئی چھوٹی بات نہیں تھی جبکہ اس کے پاس کسی بات کا کوئی ثبوت بھی نہیں تھا یہ تو بس اس کی چھٹی حس تھی جو اسے اشارہ دے رہی تھی لیکن چھٹی حس کی بنیاد پر وہ نواب کو کوئی بات بھی بات نہیں کہہ سکتا تھا صرف اتنا ہی تھا کہ وہ نواب کو خبردار کر دیتا اور وہ اس نے کر دیا تھا لیکن نواب کی لاپرواہ طبیعت اسے مزید بے چین کر گئی تھی بہرحال اس نے خاموشی سے حالات کا جائزہ لینے کا فیصلہ کیا تھا اور نواب کو سمجھانے کا کام پھر کسی وقت پر چھوڑ دیا تھا کیونکہ فی الحال یہی بہترین فیصلہ ہو سکتا تھا۔

☆.....☆.....☆

صبح کا وقت تھا نواب اور اس کی فیملی ناشتے کی ٹیبل کے گرد بیٹھی ہوئی تھی تبھی ملازم نے منشا کی آمد کی خبر دی تو نواب نے اُسے وہیں بلوا لیا۔

''آؤ منشا ناشتہ کرو۔'' نواب نے منشا کے سوال کا جواب دیتے ہوئے ناشتے کی دعوت دی تو وہ بھی بنا کسی تکلف کے فوراً ہی ایک کرسی پر آ بیٹھا بچے منشا کو دیکھ کر بہت خوش ہو گئے تھے۔

''آج ہم منشا چاچو کے ساتھ اسکول جائیں گے۔'' شرجیل نے اعلان کرنے کے انداز میں کہا تو ثانیہ نے بھی زور و شور سے اس کی تائید کی۔

''بیٹا کیوں چاچو کو تنگ کرتے ہو تم لوگ ڈرائیور ہے نا اس کے ساتھ جاؤ۔'' نواب نے ان کی بات سن کر پیار سے سرزنش کی۔

''آپ خود تو کبھی ہمیں وقت دیتے نہیں ہیں اور اب منشا چاچو کو بھی منع کر رہے ہیں۔'' شرجیل کے الفاظ سے زیادہ اس کا لہجہ بہت خراب تھا اس کے لہجے میں صرف شکوہ نہیں تھا نفرت بھی بیزاری بھی اجنبیت بھی اس کے اس طرح بولنے پر جہاں عالیہ اور منشا نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا تھا وہیں نواب بھی چونکے بنا نہیں رہ سکا تھا۔

''کچھ نہیں ہوتا نواب بھائی میں ویسے بھی اس وقت فری ہوں اور کافی دنوں سے بچوں سے گپ شپ بھی نہیں ہوئی ہے اسی بہانے تھوڑی باتیں بھی ہو جائیں گی۔'' منشا نے مداخلت کر کے سنجیدہ ہوتے ہوئے ماحول کو بہتر کر دیا تھا منشا کی بات پر نواب کندھے اچکاتے ہوئے مسکرا دیا اور پھر باتوں کا رخ بدل گیا تو یہ بات آئی گئی ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

''یہ نواب اب ناقابل برداشت ہوتا جارہا ہے ایسے لگتا ہے جیسے وہ کوئی جادوگر ہے جس نے پورے شہر پر اپنا جادو کردیا ہے جہاں دیکھو اُسی کی تعریفوں کے پل باندھے جارہے ہیں۔'' جمال غصے سے کہہ رہا تھا اس کا بس نہ چل رہا تھا لوگوں میں نواب کا نام ونشان اس شہر سے مٹا ڈالے۔

''تو اتنی ٹینشن پالنے کی کیا ضرورت ہے جناب۔'' سامنے کھڑے آدمی نے مکارانہ انداز میں آنکھیں گھماتے ہوئے کہا۔

''کیا کہنا چاہتے ہو؟'' جمال نے چونک کر پوچھا۔

''جناب اس شخص کو تو بہت پہلے راستے سے ہٹا دینا چاہیے تھا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ بڑھتا جارہا ہے تو کیوں نا.....'' اس نے اسی انداز میں کہتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی اور مسکراتے ہوئے جمال کو دیکھا جو اس کی بات پر سوچ میں پڑ گیا تھا۔

''کہتے تو تم ٹھیک ہی ہو مگر یہ کام کرے گا کون؟'' جمال نے پُرسوچ انداز میں سوال کیا تو اس آدمی کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔

''آپ حکم کریں جناب باقی سب مجھ پر چھوڑ دیں۔'' اس کی بات پر جمال نے یہ کام اس کے ذمے لگا دیا اور نواب کو مارنے کا فیصلہ کر کے وہ مطمئن دکھائی دینے لگا۔

☆.....☆.....☆

''پھر تم نے کیا سوچا ہے کب تک اس سونے کے پنجرے میں قید رہنے کا ارادہ ہے۔'' منشا نے عالیہ کی زلفوں سے کھیلتے ہوئے سوال کیا وہ دونوں اس وقت عالیہ کے بیڈروم میں تھے۔

''سب کچھ ٹھیک تو چل رہا ہے۔'' عالیہ نے لاپرواہی سے کہا۔

''کچھ ٹھیک نہیں چل رہا میری جان تنگ آ گیا ہوں میں اس طرح چوری چھپے کی ملاقاتوں سے۔'' منشا کو اس کی لاپرواہی اچھی نہیں لگی تھی لیکن اس نے اپنی ناپسندیدگی ظاہر کرنے کی بجائے لگاوٹ کا مظاہرہ جاری رکھا تھا۔

''کیا چاہتے ہو تم' نواب کو گھر سے نکال کر تمہیں یہاں مستقبل لے آؤں؟'' عالیہ ہنسی۔

''آئیڈیا تو برا نہیں ہے لیکن یہ اس طرح نہیں ہوسکتا۔'' منشا بھی مسکراتے ہوئے بولا۔

''تو پھر؟'' عالیہ نے سوال کیا۔

''ہمیں نواب کا کانٹا بیچ سے نکالنا ہوگا۔'' منشا کا لہجہ پُرسکون تھا۔

''تمہارا مطلب ہے کہ.....'' عالیہ سنجیدہ ہوگئی۔

''ہاں میرا یہی مطلب ہے نواب بہت جی چکا ہے اب اسے اس دنیا سے رخصت ہوجانا چاہیے تاکہ ہم دونوں سکون کی زندگی گزار سکیں۔'' منشا کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ نواب کو مارنے کا پکا ارادہ کر چکا تھا۔

''ذرا دھیان سے نواب بہت خطرناک انسان ہے اگر اسے تمہارے منصوبوں کی ذرا سی بھی بھنک پڑ گئی تو بہت برا ہوگا۔'' عالیہ نے اس کے منصوبے سے اختلاف نہیں کیا تھا بلکہ اسے محتاط رہنے کا مشورہ دیا تھا اس لمحے اگر نواب خود اپنے کانوں سے بھی عالیہ کو بولتے ہوئے سن لیتا تب بھی اسے یقین نہ آتا کہ یہ سب اس کے بارے میں عالیہ کہہ رہی تھی اس کی جان سے پیاری محبوبہ اور محبوب بیوی' یہ وہ عالیہ تو نہیں تھی جو نواب کے لیے جان دینے کو تیار رہا کرتی تھی یہ تو کوئی اجنبی عورت تھی کوئی ظالم بے وفا عورت۔

''تم فکر مت کرو میں نے سب کچھ سوچ لیا ہے۔'' منشا نے اس کے ہاتھ کو چومتے ہوئے اس کی تسلی کرائی۔

☆.....☆.....☆

''سوگئی ہو کیا؟'' نواب نے بستر پر عالیہ کے برابر میں لیٹتے ہوئے پوچھا عالیہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''ارے یار اتنی جلدی سو تو نہیں سکتی ہو تم جواب دو نا۔'' نواب نے عالیہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچا۔

''کیا ہے سونے کیوں نہیں دیتے مجھے۔'' عالیہ اس کے اس طرح کرنے پر جھنجلاتے ہوئے کہہ رہی تھی اس کے لہجے میں بیزاری تھی لیکن نواب نے اسے محسوس نہیں کیا بلکہ اسی طرح شرارت کرتا رہا تو بستر سے اٹھ کر اس سے دور ہو گئی۔

''کیا ہوا ہے تمہیں موڈ اتنا خراب کیوں ہے تمہارا؟'' نواب پیار سے پوچھ رہا تھا اس کو لگ رہا تھا کہ نواب کی بڑھتی ہوئی مصروفیت کی وجہ سے عالیہ اس سے ناراض ہے اس لیے اس طرح کا رویہ اپنا رہی ہے وہ تو خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ عالیہ کا دل اس سے بھر چکا ہے۔ عالیہ کی زندگی میں نواب کی جگہ کوئی اور لے چکا ہے۔

''مجھے آرام کرنا ہے پلیز۔'' عالیہ کا لہجہ اب بھی بیزاری لیے ہوئے تھا۔ نواب نے ہاتھ پیچھے ہٹا لیا اور ایک سائیڈ پر ہو کر لیٹ گیا۔ عالیہ اپنی جگہ پر لیٹ گئی اور اس نے نواب کی طرف پیٹھ کر لی۔

''کاش میں تمہیں بتا سکتی تمہارا ساتھ میرے لیے کتنا اذیت ناک ہو چکا ہے' تمہارے پہلو میں سونا تم سے بات کرنا تمہارا مجھے چھونا مجھے کتنا ناقابل برداشت لگتا ہے۔'' وہ رخ موڑے پڑی تھی اور خیالوں میں نواب سے مخاطب ہو کر کہہ رہی تھی دوسری طرف نواب یہ سوچ کر اطمینان کی نیند سو گیا تھا کہ عالیہ تھکی ہوئی ہے۔ ایک کمرے ایک بستر پر موجود دونوں انسان کتنے مختلف قسم کے جذبات رکھتے تھے۔

☆.....☆.....☆

نواب کو مارنے کا منصوبہ تو عالیہ اور منشا نے بنایا ہی تھا ساتھ ہی اس نے دونوں بچوں کے دلوں میں بھی نواب کے خلاف زہر بھرنا شروع کر دیا تھا کیونکہ نواب کے لیے اس کے دل میں کچھ بھی کیوں نا ہو لیکن وہ اپنے بچوں کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتی تھی اگرچہ منشا کو اس کا یہ آئیڈیا کچھ خاص پسند نہیں تھا لیکن وہ اس معاملے میں عالیہ کی مخالفت کر کے سارا معاملہ خراب نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے اس نے عالیہ کی یہ بات مان لی تھی۔ نواب کی مصروفیات اور منشا کی توجہ کی وجہ سے بچے پہلے ہی نواب سے دور ہو چکے تھے باقی کا کام عالیہ کی باتوں نے کر دیا جب بھی موقع ملتا عالیہ بچوں کو نواب کے خلاف بھڑکاتی کبھی اس کے کردار کے حوالے سے بات کرتے ہوئے خود کو بدقسمت گردانتی تو کبھی اپنے ماں باپ کو یاد کر کے بچوں کے سامنے آنسو بہاتی اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتی کہ نواب نے اسے بہکا کر اس کے ماں باپ سے جدا کر دیا تھا اور تو اور اس نے بچوں کو یہ یقین دلا دیا تھا کہ نواب کو اپنی دولت سے پیار ہے اور بیوی بچوں کی کوئی پرواہ نہیں ہے یہی وجہ تھی کہ بچے نواب سے ذہنی طور پر بہت دور ہو چکے تھے۔

☆.....☆.....☆

''کیسے ہو بیٹا؟'' نواب گھر پہنچا تو دونوں بچے ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے ٹی وی پر کارٹون دیکھ رہے تھے نواب بھی ان کے قریب صوفے پر بیٹھ گیا اور پیار سے شرجیل سے کہنے لگا جو اس کے قریب ہی بیٹھا تھا۔

''آپ دیکھ نہیں رہے میں ٹی وی دیکھ رہا ہوں۔'' شرجیل نے نواب کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے بدتمیزی سے کہا تو وہ حیرت سے اُسے دیکھ کر رہ گیا۔

''سارا موڈ خراب کر دیا چلو ثانیہ روم میں چل کر کھیلتے ہیں۔'' اس سے پہلے کہ نواب کچھ اور کہتا وہ دونوں پاؤں پٹختے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔

''یہ بچوں کو کیا ہو گیا ہے اتنے بدتمیز کیوں ہو رہے ہیں بات کرتا ہوں آج عالیہ سے مسئلہ کیا ہے؟'' وہ پریشانی سے سوچ رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

''اب یہ کیا بات ہوئی بورڈنگ کا آئیڈیا تمہیں کس نے دیا۔'' نواب عالیہ کی بات سن کر پوچھ رہا تھا۔

''مجھے کس نے آئیڈیا دینا تھا تمہیں تو بچوں کی کوئی فکر نہیں ہے تو ظاہر ہے میں نے ہی ان کے بارے میں سوچنا ہے نا'' عالیہ تڑخ کر بولی۔

''بورڈنگ بھیجنے میں بچوں کی کون سی بھلائی ہے۔'' نواب کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ عالیہ کو آخر ہوا کیا ہے وہ کیوں ہاتھ دھو کر بچوں کو بورڈنگ بھیجنے کے پیچھے پڑ گئی ہے۔

''وہاں جانے میں ان کی بھلائی ہے تو میں بھیج رہی ہوں نا ورنہ کون سی ماں اپنے بچوں کو دور بھیجنا چاہے گی بھلا' دیکھو وہاں انہیں بہتر ماحول ملے گا اور پڑھائی بھی زیادہ اچھے سے ہوگی۔'' آخر عالیہ نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی۔

''بچے خود بھی ایسا ہی چاہتے ہیں۔'' نواب کو کسی طرح قائل نہ ہوتے دیکھ کر عالیہ نے بچوں کا حوالہ دیا بچوں کا سن کر نواب خاموش رہ گیا اور اس طرح یہ طے پا گیا کہ بچے بورڈنگ شفٹ ہو جائیں گے جس پر نواب دل سے خوش نہیں تھا۔

☆.....☆.....☆

''کیا بات ہے نواب بھائی آپ کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہیں۔'' نواب آفس میں بیٹھا بچوں کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا کہ منشا اس کے کمرے میں داخل ہوا اسے اتنی گہری سوچ میں دیکھ کر نواب سے پوچھنے لگا۔

''کچھ نہیں یار زندگی کی کچھ سمجھ نہیں آ رہی ہے سب کچھ ٹھیک ہوتے ہوئے بھی کچھ ٹھیک نہیں لگ رہا۔'' نواب کی پریشانی اس کے ایک ایک لفظ سے ظاہر ہو رہی تھی۔

''ایسا کیا ہوا ہے کچھ بتائیں گے۔'' منشا سب کچھ جانتا تھا لیکن انجان بنا پوچھ رہا تھا نواب بھی شاید کسی ہمدرد کا منتظر تھا اس نے اپنا دل کھول کر منشا کے سامنے رکھ دیا عالیہ کا بدلا ہوا بیزار رویہ بچوں کا اس سے دور ہونا ایک ایک کر کے سب کچھ بتاتا چلا گیا۔

''مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ مجھ سے کہاں غلطی ہوئی ہے جو میرا بنا بنایا گھر اس طرح بکھرتا چلا جا رہا ہے۔'' آخر میں وہ پریشانی سے کہہ رہا تھا۔

''نواب بھائی آپ سے کہیں غلطی نہیں ہوئی ہے گھروں میں یہ سب چلتا رہتا ہے۔'' منشا سمجھانے کے انداز میں کہہ رہا تھا اور پھر منشا کی باتوں نے واقعی اس کی پریشانی میں کافی حد تک کمی کر دی تھی۔

☆.....☆.....☆

اکرم مختلف کاموں کے سلسلے میں اکثر شہر سے باہر رہتا تھا جبکہ منشا نواب کا سایہ بنا ہوا تھا نواب کو اس کی عادت ہو گئی تھی وہ اس پر بہت زیادہ انحصار کرنے لگا تھا اب تو ایسا بھی ہوتا تھا کہ بہت سی باتوں میں وہ اکرم سے بات کرنے کے بجائے منشا کے مشوروں پر ہی عمل کر لیا کرتا۔ جب بچوں کو بورڈنگ بھیجنے کا فیصلہ ہوا اور جب وہ گھر سے گئے اس وقت بھی اکرم شہر سے باہر تھا اور اسے اس بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم تھا جب اکرم شہر لوٹا اور اس نے بچوں کے جانے کی خبر سنی تو اسے نواب کا یہ فیصلہ بالکل اچھا نہیں لگا تھا۔

''بچوں کی پڑھائی ٹھیک جا رہی تھی یار پھر کیوں انہیں خواہ مخواہ گھر سے دور بھیج دیا گھر کی رونق ہی ختم ہو گئی ہے۔'' اکرم نے کھل کر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا جواب میں نواب نے عالیہ اور بچوں کی خواہش کا بتایا تو وہ چپ کر گیا لیکن اس کے ذہن میں بار بار ایک خیال آئے جا رہا تھا اور وہ تھا کہ بچوں کو یہاں سے ہٹا کر کون سا مقصد حاصل کیا جائے گا؟ وہ اب بھی اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ کسی قسم کے شک کا اظہار کر سکتا ہے یہ بہت نازک معاملہ تھا اسے بہت احتیاط کرنا تھی۔

☆.....☆.....☆

اس روز نواب اور منشا آفس سے نکل کر پارکنگ میں پہنچے اور ابھی وہ گاڑی میں بیٹھ ہی رہے تھے کہ نواب پر فائرنگ ہوئی عین وقت پر منشا نے گولی چلانے والے کو دیکھ لیا تھا اس نے نواب کو دھکا دے کر دور کر دیا اسے تو گولی نہیں لگی لیکن منشا اس گولی سے نہ بچ سکا گولی اس کے دائیں بازو میں لگی تھی' گولی چلانے والے اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے وہاں سے فرار ہو گئے تھے۔ نواب نے منشا کو گاڑی میں بٹھایا اور اسے سپیدھا ہاسپٹل لے گیا جہاں اسے فوری طبی امداد دے دی گئی نواب کی وجہ سے انہیں فوری طور پر قانونی کارروائی کے چکر میں نہیں ڈالا گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

عالیہ اپنے گھر پر تھی جب نواب نے اسے فون پر اپنے اوپر ہونے والے حملے کے بارے میں خبر دی ساتھ ہی منشا کے زخمی ہونے کے بارے میں بھی بتایا تو وہ منشا کے زخمی ہونے کا سن کر بے حد پریشان ہوگئی اور نواب کے منع کرنے کے باوجود بھی فوراً ہاسپٹل جانے کے لیے گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔

''آپ ٹھیک تو ہیں نا؟'' ہاسپٹل پہنچ کر عالیہ مصنوعی پریشانی سے نواب کے لیے فکرمندی جتاتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''بس یہ سمجھو کہ منشا کی وجہ سے تم آج مجھے زندہ دیکھ رہی ہو ورنہ میں تو آج گیا تھا۔'' نواب نے جان بوجھ کر مزاحیہ انداز اختیار کیا وہ عالیہ کی پریشانی کم کرنا چاہ رہا تھا اس بات سے بے خبر کہ عالیہ کو اس کی رتی بھر بھی پرواہ نہیں تھی وہ تو اس بات سے اُلجھی ہوئی تھی کہ منشا نے نواب کی جان کیوں بچائی تھی۔

''یہ سب کیا ہے تم نے خود حملہ کروایا اور پھر خود ہی ہیرو بن کر اس کی جان کیوں بچائی؟'' فون آنے پر نواب فون سننے کے لیے روم سے باہر چلا گیا تو اتنی دیر سے تنہائی ملنے کا انتظار کرتی عالیہ منشا سے پوچھنے لگی۔

''شش کیا کرتی ہو آہستہ بولو وہ ابھی آجائے گا۔'' منشا نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اچھا بتاؤ نا کیا ہوا تھا تم نے اس کو کیوں بچایا؟'' عالیہ ایسے بات کر رہی تھی جیسے وہ اپنے محبوب شوہر کے بارے میں نہیں بلکہ کسی اجنبی کے بارے میں بات کر رہی ہو۔

''یہ حملہ میں نے نہیں کروایا اور میں نے اس کی جان اس لیے بچائی کیونکہ بعد میں جب اس کا قتل ہوگا تو مجھ پر شک نہیں جائے گا۔'' منشا نے ہلکی آواز میں اسے اپنا منصوبہ بتایا۔

''لیکن اس سب کی ضرورت کیا تھی جب کام آسانی سے ہو رہا تھا تو ہونے دینا تھا۔'' عالیہ کو نواب کی موت کی کچھ زیادہ ہی جلدی تھی منشا جواب میں کچھ کہتا لیکن تبھی نواب دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوا اور اس طرح اُن کی بات ادھوری رہ گئی۔

☆.....☆.....☆

''میں نے تمہیں اس بات کے پیسے نہیں دیے تھے کہ تم مجھے اپنی ناکامی کی خبر سناؤ۔'' جمال بہت غصے میں سامنے کھڑے بندے سے کہہ رہا تھا یہ ایک کرائے کا قاتل تھا جسے جمال نے نواب کو قتل کرنے کا کام سونپا تھا۔

''یہ میری زندگی میں پہلی بار ہوا ہے کہ میری چلائی ہوئی گولی سے کوئی بچ کر نکل جائے۔'' کرائے کے قاتل نے جواب دیا۔

''پہلی بار یا دوسری بار لیکن بات یہ ہے کہ تمہارا نشانہ خطا ہوگیا ہے جو کہ میرے حق میں بالکل بھی اچھا نہیں ہے۔'' جمال نے کہا۔

''آپ مجھے ایک موقع اور دیں آپ کا کام ہو جائے گا۔'' اس نے تسلی کرائی تو جمال نے اسے گھور کر دیکھا لیکن اس بار کچھ کہا نہیں کچھ دیر بعد اسے مزید ہدایات دے کر رخصت کر دیا گیا۔

☆.....☆.....☆

نواب پہلے بھی منشا کو بہت مانتا تھا اس حملے کے بعد تو وہ منشا کا احسان مند بھی ہوگیا تھا عالیہ کے مشورے پر نواب منشا کو اپنے گھر لے آیا تھا تاکہ اس کی اچھی طرح دیکھ بھال کی جاسکے۔ اور عالیہ واقعی دل و جان سے اس کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ جبکہ نواب بیوی کی کارکردگی پر خوش تھا جو اس کے احسان کا بدلہ چکانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اکرم نے البتہ ہلکا سا اعتراض کیا تھا اس کا کہنا تھا کہ منشا کی دیکھ بھال ہاسپٹل میں زیادہ بہتر طریقے سے ہوسکتی تھی لیکن نواب اس کی بات کو ٹال گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

منشا تو گھر کا ہو کر رہ گیا تھا عالیہ نے سختی سے اس کا کہیں آنا جانا بند کر رکھا تھا اور نواب کو بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن یہ تھا کہ منشا کہ نہ ہونے کی وجہ سے نواب کی مصروفیات میں اضافہ ہوگیا تھا وہ زیادہ تر گھر سے باہر رہتا تھا۔ دوسری

طرف جمال بہت غصے میں تھا کہ ابھی تک نواب زندہ کیوں ہے اس نے قاتل کو دھمکی بھی دی تھی کہ اگر اس نے جلد یہ کام نہ کیا تو اس کے لیے اچھا نہیں ہوگا۔ عالیہ اور منشا نے مل کر سارا پلان کر لیا تھا کہ نواب کو کب اور کیسے ختم کرنا تھا دن اور تاریخ تک طے ہو چکا تھا نواب ان سب سے بے خبر تھا۔

☆.....☆.....☆

نواب اور اکرم بہت دن بعد شام کی چائے ساتھ پی رہے تھے۔

''میں آج بہت مطمئن ہوں میں نے شاکر کو مار کر اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لے لیا ہے اب اگر میں مر بھی جاؤں تو مجھے کوئی غم نہیں ہوگا۔'' نواب نے چائے کا سپ لیتے ہوئے مطمئن لہجے میں کہا۔

''یار آج خوشی کا موقع ہے اس موقع پر ایسی باتیں تو نہ کرو۔'' اکرم اسے ٹوکے بنا نہیں رہ سکا تھا جواب میں نواب ہلکے سے مسکرایا۔ وہ دیر تک ماضی دہراتے رہے اچھے برے وقتوں کو یاد کرتے رہے تبھی نواب کے موبائل پر کال آنے لگی منشا کی کال تھی نواب نے کال ریسیو کی اور بات کر کے فون بند کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

''کہاں چلے یار کچھ دیر اور بیٹھو اچھا لگ رہا ہے تم سے باتیں کرنا۔'' اکرم اسے اٹھتے دیکھ کر بولا۔

''منشا کی کال ہے مجھے پارٹی آفس جانا ہوگا۔'' نواب نے جواب دیا۔

''اچھا پھر واپسی پر ملاقات ہوتی ہے۔'' اکرم اس کی بات سمجھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''واپسی پر تو میں شاید لیٹ ہو جاؤں کل ملتے ہیں۔'' نواب کے کہنے پر اکرم نے سر ہلا دیا اور نواب اسے خدا حافظ کہتا گھر کے اندر کی طرف بڑھ گیا تاکہ عالیہ کو اپنے جانے کے بارے میں بتا سکے۔

☆.....☆.....☆

''ارے یار یہ کیا؟'' نواب نے ٹیبل پر سجی ہوئی شراب کی بوتلیں دیکھ کر کہا۔

''نواب بھائی میں جانتا ہوں، آج آپ کے لیے بہت اہم دن ہے اور آپ کی خوشی میری خوشی ہے نا تو میری طرف سے آج یہ چھوٹی سی پارٹی۔'' منشا نے ٹیبل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن تمہیں تو پتا ہے یار مجھے شراب پینے کی عادت نہیں ہے تھوڑی سی پی کے ہی آؤٹ ہو جاتا ہوں۔'' نواب نے ہنستے ہوئے کہا۔

''کوئی بات نہیں نواب بھائی آج میری خوشی کے لیے پی لیں۔'' منشا نے گلاس میں شراب نکالتے ہوئے کہا۔

''تیرے لیے تو جان بھی حاضر ہے۔'' نواب بھی ترنگ میں بولا اسی دوران کچھ ملنے والے بھی آ گئے گپ شپ کا دور چلتا رہا اور رات کے بارہ بج گئے نواب کو کافی نشہ ہو چکا تھا۔

''اچھا یار اب میں گھر چلتا ہوں۔'' نواب نے منشا سے کہا اور کرسی سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن دوبارہ کرسی پر گر پڑا منشا اسے گرتے دیکھ کر تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔

''چلیے میں آپ کو گاڑی تک چھوڑ دوں۔'' اکرم نے نواب کو سہارا دے کر اٹھاتے ہوئے کہا نواب کو اٹھانا اس کے لیے کوئی آسان کام ثابت نہیں ہوا تھا وہ پچانوے کلو کا اونچا لمبا مرد تھا جیسے کیسے ڈرائیور کی مدد سے منشا نے نواب کو اس کی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بٹھا دیا نواب کی آنکھیں بند تھیں وہ سیٹ پر تقریباً لیٹا ہوا تھا۔

''انہیں گھر لے جاؤ۔'' نواب کو بٹھانے کے بعد منشا نے ڈرائیور کو ہدایت دی تو ڈرائیور نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ گاڑی چلاتے ہوئے اس نے مرر میں دیکھا نواب کی آنکھیں بند تھیں اور وہ ہلکے ہلکے خراٹے لے رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

گھر پہنچ کر ڈرائیور نے نواب کو جگایا تھا کہ وہ اتر کر گھر کے اندر چلا جائے نواب جیسے تیسے اتر کر لڑکھڑاتا ہوا اندر کی طرف بڑھا۔

''سر میں آپ کو اندر تک چھوڑ دوں۔'' نواب کو لڑکھڑاتے دیکھ کر ڈرائیور نے کہا۔ لیکن نواب نے ہاتھ اُٹھا کر اسے روک دیا اور خود اندر کی طرف بڑھ گیا لڑکھڑاتے قدموں سے چلتا وہ تھوڑی دور تک چلا اور پھر لان میں پڑی چیئرز میں سے ایک پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا اور فوراً ہی سو گیا۔

☆.....☆.....☆

''باہر نکلو اور اس کو چیک کرو۔'' منشا فون پر عالیہ سے کہہ رہا تھا فون بند کر کے عالیہ گھر کے اندرونی حصے سے باہر نکلی لیکن نواب اسے کہیں نظر نہیں آیا وہ اِدھر اُدھر دیکھتی ہوئی آگے بڑھی اور پھر اس نے نواب کو لان چیئر پر بیٹھے دیکھ لیا وہ دبے قدموں سے اس کی طرف بڑھی قریب پہنچ کر اس کو آواز دی لیکن نواب گہری نیند میں تھا۔

''نواب' نواب یہاں کیوں بیٹھے ہو اندر چلو۔'' عالیہ نے نواب کے قریب پہنچ کر آہستہ سے کہا لیکن نواب پر اس کی آواز کا کوئی اثر نہیں ہوا وہ ایسے ہی سویا رہا اچھی طرح تسلی کرنے کے بعد عالیہ نے منشا کا نمبر ملا دیا۔

''وہ لان میں چیئر پر سویا ہوا ہے۔'' عالیہ نے فون پر منشا کو بتایا تو وہ ہولے سے ہنس دیا۔

''کیا کھلایا ہے تم نے اسے۔'' عالیہ کو تجسس ہوا نواب کو ایسے سویا دیکھ کر پوچھنے لگی۔

''نیند کی گولیاں ملائی تھیں شراب میں ویسے اس کے لیے تو شراب ہی کافی تھی لیکن پھر بھی احتیاط بہتر ہوتی ہے۔'' منشا ہنستے ہوئے بتا رہا تھا۔

''اچھا اب وہیں بیٹھے باتیں کرتے رہو گے یا آؤ گے بھی۔'' عالیہ نے کہا۔

''آ رہا ہوں میری جان بس تھوڑا سا انتظار۔'' منشا بے حد ریلیکس تھا۔

''جلدی آؤ۔'' عالیہ نے اتنا کہہ کر کال کاٹ دی اور مڑ کر نواب کی طرف دیکھنے لگی وہ بہت گہری اور پُرسکون نیند سو رہا تھا کچھ دیر ایسے ہی نواب کو دیکھتے رہنے کے بعد وہ واپس اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

☆.....☆.....☆

عالیہ سے بات کرنے کے بعد منشا نے اپنا اصل فون نکالا اور اپنے دوست کا نمبر ملانے لگا۔

''ہاں تیار ہو؟'' کال ریسیو ہوتے ہی منشا نے پوچھا۔

''ہاں بالکل تیار ہوں تم کب تک پہنچ رہے ہو۔'' دوسری طرف سے جاوید نے پوچھا۔

''بس نکل رہا ہوں۔'' اتنا کہہ کر منشا نے فون بند کر دیا اور پھر پستول نکال کر گولیاں چیک کرنے کے بعد اسے اپنے کپڑوں میں رکھ لیا اور گھر سے نکل پڑا وہ گاڑی کی بجائے بائیک پر جا رہا تھا راستے میں اس نے اپنے دوست کو پک کیا اور پھر پلان کے مطابق دونوں نواب کے گھر کی طرف بڑھے۔ نواب کے گھر سے تھوڑا فاصلے پر پہنچ کر منشا نے بائیک روک لی اور وہاں سے وہ دونوں پیدل آگے بڑھے اور دیوار پھلانگ کر گھر کے اندر داخل ہو گئے نواب اسی طرح لان میں کرسی پر سویا ہوا تھا اور عالیہ بھی وہیں لان میں ان کی منتظر تھی۔

''اتنی دیر لگا دی میں کب سے انتظار کر رہی ہوں۔'' انہیں دیکھتے ہی عالیہ نے کہا منشا نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا پستول نکالا اور نواب کے سر کا نشانہ لے کر گولی چلا دی نواب نے جھٹکا کھایا اور ہمیشہ کی نیند سو گیا مزید گولیاں چلانے کی ضرورت نہیں تھی لیکن منشا ہر طرح سے تسلی کر لینا چاہتا تھا اس نے یکے بعد دیگرے نواب کے سینے پر سات گولیاں ماریں عالیہ اور جاوید قریب کھڑے اسے گولیاں چلاتے ہوئے دیکھتے رہے۔

''چلو اب تمہیں تمہارے کمرے میں بند کر دیں۔'' منشا نے اپنے کام سے فارغ ہو کر عالیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا وہ کچھ کہے بنا اپنے کمرے کی طرف چل پڑی منشا اور جاوید اس کے پیچھے تھے اپنے کمرے میں داخل ہو کر اس نے مڑ کر منشا کو دیکھا۔

''یاد ہے نا آگے تم نے کیا کرنا ہے۔'' منشا کے پوچھنے پر عالیہ نے اثبات میں سر ہلا دیا منشا نے اس کے کمرے کو باہر سے کنڈی لگا دی اور جس طرح وہ دیوار پھلانگ کر آئے تھے اسی طرح واپس چلے گئے۔

☆.....☆.....☆

جب عالیہ کو یقین ہوگیا کہ منشا اور جاوید وہاں سے جاچکے ہوں گے تب اس نے اپنے موبائل سے اکرم کا نمبر ملایا۔

''اکرم بھائی آپ فوراً ہمارے پورشن میں آئیے یہاں کچھ بہت غلط ہوگیا ہے انہوں نے نواب کو۔'' اتنا کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اکرم اس کے رونے سے پریشان ہوگیا۔

''نواب کہاں ہے اور تم کہاں ہو؟'' اکرم نے پوچھا۔

''انہوں نے مجھے کمرے میں بند کردیا ہے اور نواب لان میں ہے۔'' اکرم نے مزید کچھ کہے بنا فون بند کردیا اور نواب کے پورشن کی طرف آنے سے پہلے دراز سے پستول نکال کر اپنے ہاتھ میں پکڑلی۔ اکرم جس طرف سے آیا تھا وہاں سے لان دور تھا اور گھر کی بلڈنگ قریب وہ سیدھا نواب کے کمرے کی طرف بڑھا دروازہ باہر سے بند کیا گیا تھا اکرم نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا دروازہ کھولتے ہی عالیہ باہر نکل آئی وہ بری طرح رو رہی تھی اور کچھ بول بھی رہی تھی جو رونے کی وجہ سے سمجھ نہیں آرہا تھا۔ اکرم اسے ایسے ہی روتا ہوچھوڑ کر لان کی طرف بھاگا وہ نواب کو آوازیں بھی دے رہا تھا۔ نواب کی طرف سے کوئی جواب نہیں آرہا تھا اور پھر اس نے نواب کو کرسی پر دیکھا ایک نظر دیکھنے میں ہی پتا چل رہا تھا کہ نواب اب اس دنیا میں نہیں تھا وہ تیزی سے نواب کی طرف بڑھا۔

''نواب.....'' اس نے پھر نواب کو پکارا اور اس کے کندھے کو چھوا تو اس کا ہاتھ نواب کے خون سے بھر گیا اکرم نے بمشکل خود کو حواس میں رکھا ہوا تھا اس نے سب سے پہلے پولیس کو فون کیا اور اس کے بعد مختلف لوگوں کو کال کر کے اس حادثے کے بارے میں بتانے لگا کچھ ہی دیر میں وہاں لوگوں کی بھیڑ لگ گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

پولیس نے ضروری کارروائی کرنے کے بعد نواب کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دیا۔ عالیہ کی حالت بہت خراب تھی وہ کسی قسم کا بیان دینے کے قابل نہیں تھی البتہ اکرم اور منشا نے جمال پر شک کا اظہار کرتے ہوئے کچھ دن پہلے جمال کی نواب کو دی گئی دھمکی کے بارے میں بھی بتایا تھا پولیس نے ابتدائی بیانات قلم بند کرنے کے بعد ایک ٹیم کو جمال سے پوچھ گچھ کے لیے روانہ کردیا۔ جمال نے اس قتل سے کسی بھی قسم کے تعلق سے انکار کردیا تھا کوئی ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے اتنے طاقت ور انسان کو گرفتار کرنا ممکن نہیں تھا لیکن ایف آئی آر میں جمال کا نام شامل کردیا گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

پولیس کے لیے کئی ایسے سوال تھے جن کے جواب فی الحال ان کے پاس نہیں تھے سب سے پہلا سوال یہ تھا کہ نواب اتنی رات کو لان میں کیا کر رہا تھا اور وہ اس وقت پینٹ کوٹ میں کیوں تھا جبکہ اسے نائٹ سوٹ میں ہونا چاہیے تھا کیا وہ اسی وقت کہیں سے آیا تھا یا پھر اس کے پاس کوئی آیا ہوا تھا۔ اور سب سے اہم بات چھ فٹ دو انچ ہائٹ اور پچانوے کلو وزن والے آدمی کو سر میں گولی مارنے کے لیے یا تو اس سے بھی بڑا قد چاہیے تھا یا پھر قاتل کو بلندی پر ہونا چاہیے تھا لیکن گولی بہت قریب سے ماری گئی تھی اس لیے قاتل کے بلندی پر ہونے کی بات کی نفی ہوگئی تھی۔ اس قتل کا چشم دید گواہ اسلم تھا اس کے مطابق اس نے چار لوگوں کو دیوار پھلانگ کر گھر میں داخل ہوتے دیکھا پھر انہوں نے نواب کو گولیاں ماریں اور وہاں سے بھاگ گئے۔ اسلم کے مطابق وہ چار لوگ تھے لیکن اس کی بات پر یقین نہیں کیا جاسکتا تھا کیونکہ اس کی نظر بہت کمزور تھی اور وہ اس وقت اپنے کمرے میں تھا جو کہ کافی فاصلے پر تھا دوسرے اس رات شدید سردی تھی اور دھند بہت گہری تھی اتنی دھند میں اتنے فاصلے سے سب کچھ ٹھیک ٹھیک دیکھا جانا ممکن نہیں تھا۔ عالیہ کے مطابق نواب اس رات بھی ہمیشہ کی طرح رات کے وقت اپنے ماما اسلم کو دیکھنے کے لیے اس کے کمرے میں گیا تھا اس کی عادت تھی کہ وہ ہر روز رات میں ایک بار ضرور اسلم کی خیریت معلوم کرنے کے لیے اس کے کمرے میں جایا کرتا تھا اس رات بھی یہی ہوا تھا لیکن جب عالیہ نے باہر کچھ آوازیں سنیں تو وہ باہر نکلی اور پھر اس نے ان اجنبی لوگوں کو دیکھا جنہوں نے چہروں کو نقاب میں چھپایا ہوا تھا انہوں نے عالیہ کو اس کے کمرے میں بند کردیا اور نواب کو مار کر چلے گئے۔ انہوں نے صرف نواب پر گولیاں چلائیں اور یہ

یقین کرنے کے بعد ہی وہاں سے گئے کہ نواب مر چکا ہو اس کے علاوہ انہوں نے گھر میں موجود کسی بھی دوسرے انسان کو مارنے کی کوشش نہیں کی تھی یہ بات پولیس کے لیے حیران کن تھی۔ نواب کے قتل کی رات صرف مین گیٹ پر پہرے دار موجود تھا باقی کے سبھی ملازم چھٹی پر تھے اس کی کوئی وجہ گھر والے نہیں بتا سکے تھے۔

☆.....☆.....☆

دو دن بعد نواب کی باڈی اس کی فیملی کے حوالے کر دی گئی جسے اسی روز دفن کر دیا گیا۔ بچے بھی بورڈنگ سے گھر آ چکے تھے اور اس وقت بہت سہمے ہوئے اور پریشان تھے ان کا باپ جس سے وہ نفرت محسوس کرنے لگے تھے اچانک انہیں چھوڑ کر چلا گیا تھا تو انہیں احساس ہو رہا تھا کہ ان کے سر پر سے چھت ہٹ گئی تھی وہ بالکل تنہا رہ گئے تھے۔ اکرم نے انہیں بتایا تھا کہ ان کا باپ انہیں کتنا یاد کیا کرتا اور کیسے ان کی کمی محسوس کرتا تھا وہ دونوں یہ باتیں سن کر رو رہے تھے باپ کے جانے کے بعد انہیں اپنے دل میں باپ کے لیے بہت سی جگہ نظر آ رہی تھی۔ بہت سی باتیں یاد آ رہی تھیں جن کا پہلے احساس نہیں ہوتا تھا لیکن آج یاد آ رہا تھا کہ نواب ان کے لیے کیا کچھ کرتا تھا انسانوں کی یہی غلط عادت ہے بڑے ہوں یا بچے انہیں عام طور پر کسی کے جانے کے بعد ہی اس کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔

☆.....☆.....☆

کچھ دن بعد اکرم دوبارہ تھانے گیا اور اس نے ایف آئی آر بدلنے کا کہا۔

''پہلی بار بھی آپ نے ہی ایف آئی آر لکھوائی تھی اب اسے بدلنے کی وجہ۔'' انسپکٹر نے پوچھا تھا۔

''پہلی بار جب میں نے ایف آئی آر لکھوائی اس وقت منشا بھی میرے ساتھ موجود تھا وہ بہت خطرناک انسان ہے مجھے اس سے اپنی جان کا خطرہ تھا لیکن اب میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ نواب کا قاتل کوئی اور نہیں بلکہ منشا ہے اور میرا باپ اس قتل کا چشم دید گواہ ہے۔'' اکرم نے جواب دیا۔

''لیکن منشا کے پاس نواب کو قتل کرنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔

''نواب کی بیوی عالیہ' جس کا منشا کے ساتھ افیئر چل رہا تھا ان دونوں نے مل کر اس قتل کا پلان کیا اور نواب کو اپنے راستے سے ہٹا دیا۔'' اکرم نے اس بار تفصیل سے ان کے بارے میں بتایا انسپکٹر نے منشا کو گرفتار کرنے کے لیے ایک ٹیم اس کے گھر پر بھیج دی لیکن پولیس کے پہنچنے سے پہلے ہی منشا وہاں سے فرار ہو چکا تھا۔ نئی ایف آئی آر کے مطابق منشا کی گرفتاری کے آرڈر جاری کر دیے گئے تحقیقات سے پتا چلا کہ جس رات نواب کا قتل ہوا تھا اس رات منشا نے رات کو اپنے دوست جاوید کو کال کی تھی یعنی منشا اس رات دیر گئے تک جاگ رہا تھا۔ عالیہ سے دوبارہ پوچھ گچھ کی گئی لیکن وہ اپنے بیان پر قائم رہی۔

☆.....☆.....☆

عالیہ بے حد پریشان تھی اس نے اس سب کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ پولیس نے خبریوں کو ہائی الرٹ کر رکھا تھا اور جلد ہی انہیں ایک خبری نے منشا کے بارے میں خبر پہنچا دی وہ شہر کے ایک ہوٹل میں چھپا ہوا تھا پولیس نے اسے وہاں سے گرفتار کر لیا اور عالیہ کو بھی اس کے گھر سے گرفتار کر لیا گیا۔ دونوں سے دوبارہ پوچھ گچھ کی گئی دونوں اپنے بیانات پر قائم رہے لیکن جب پولیس نے منشا کو ڈرائنگ روم کی سیر کروائی تو اس نے اقرار جرم کر لیا لیکن عالیہ کے ساتھ کسی بھی قسم کے تعلق سے انکار کرتے ہوئے اس نے قتل کی وجہ یہ بتائی کہ اس کے اور نواب کے درمیان ذاتی رنجش تھی جس کی وجہ سے اس نے نواب کا قتل کر دیا۔ پولیس نے عالیہ اور منشا کو عدالت میں پیش کر دیا۔

☆.....☆.....☆

بچے اس نئی صورت حال سے بہت پریشان تھے ان کا باپ قتل ہو چکا تھا اور الزام ان کی ماں اور بہت پیارے منشا چاچا پر آ رہا تھا۔ عالیہ نے جیل میں بچوں سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا لیکن بچوں نے اپنی ماں سے ملنے سے انکار کر دیا تھا اور وہ اپنے باپ کے قاتلوں سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ منشا نے عدالت میں نواب کے قتل سے انکار

کر دیا تھا سوائے اس بات کے کہ وہ اس رات لیٹ نائٹ جاگ رہا تھا پولیس کے پاس ان کے خلاف کوئی ثبوت نہیں تھا اور رات گئے تک جاگنا کوئی جرم نہیں تھا۔ دو ماہ جیل میں رہنے کے بعد منشا اور عالیہ کی ضمانت ہوگئی تھی ضمانت کے بعد عالیہ بنا جھجک منشا کو اپنے ساتھ گھر لے آئی تھی۔

☆.....☆.....☆

عالیہ نے گھر آتے ہی اسلم اور اکرم کو گھر چھوڑ دینے کا کہہ دیا تھا اس کے کہنے کے مطابق وہ اپنے گھر میں کسی دوسرے کا وجود برداشت نہیں کر سکتی تھی گھر ویسے بھی عالیہ کے نام تھا اکرم نے خاموشی سے ایک دن کے اندر اندر وہ گھر چھوڑ دیا تھا لیکن بچوں نے عالیہ اور منشا کے ساتھ رہنے سے انکار کر دیا تھا اس لیے اکرم بچوں کو بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ کیس بے حد کمزور تھا اس لیے بہت جلد یہ کیس بھی ان کیسز کی قطار میں لگ گیا جو بلائنڈ کیس کہہ کر بند کر دیے جاتے ہیں۔

☆.....☆.....☆

عالیہ اور منشا ایک دوسرے کے ساتھ بہت خوش تھے صرف اتنا تھا کہ عالیہ کو بچوں کے اپنے ساتھ نہ ہونے کا دکھ تھا لیکن وہ نا امید نہیں تھی اسے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن بچے اپنی ماں کے پاس واپس آ جائیں گے۔

''فرمایئے کیسے آنا ہوا؟'' اس روز اکرم عالیہ کے گھر آیا تھا وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اسے اپنے کیے پر کوئی پچھتاوا ہوا ہے یا نہیں عالیہ اجنبی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

''تم نے اب تک جو بھی کیا وہ تم بھی جانتی ہو اور میں بھی پولیس کچھ بھی کہے عدالت جو بھی فیصلہ کرے لیکن سچ ہم دونوں جانتے ہیں۔ اگرچہ نواب مجھے جان سے بھی عزیز تھا لیکن اس کے بچوں کی خاطر میں تمہیں معاف کرنے کو تیار ہوں تم منشا کو اپنی زندگی سے نکال دو اور اپنے بچوں کو اپنے ساتھ رکھو میں انہیں سمجھا دوں گا، سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' اکرم نے سیدھی بات کی اکرم کی بات سن کر عالیہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی اس کا انداز مذاق اڑانے والا تھا۔

''تو تمہارا خیال ہے کہ میں اپنی زندگی تمہارے کہنے کے مطابق گزاروں گی؟'' وہ تمسخر سے پوچھ رہی تھی۔

''تمہیں کرنا تو یہی چاہیے اگر اپنی زندگی پیاری ہے تو۔'' اکرم نے اس کے لہجے کا اثر لیے بنا سنجیدگی سے کہا۔

''تمہاری یہ جرأت کہ تم مجھے میرے ہی گھر آ کر دھمکی دے رہے ہو۔'' صاف پتا چل رہا تھا کہ عالیہ کو اس کی بات سے بہت غصہ آ گیا تھا۔

''یہ دھمکی نہیں ہے میری بات کو دھمکی سمجھنے کی غلطی مت کرنا ورنہ پچھتانے کا بھی موقع نہیں ملے گا۔'' اکرم نے کہا۔

''اپنی دھمکیاں اپنے پاس رکھو اور یہاں سے چلے پھرتے نظر آؤ۔'' عالیہ نے بدتمیزی سے کہا۔

''ایک بار پھر سوچ لو؟'' اکرم نے کہا۔

''تم جاتے ہو یا گارڈ کو بلواؤں؟'' عالیہ نے اسی لہجے میں کہا تو اکرم چپ چاپ اس کے گھر سے نکلتا چلا گیا' عالیہ کے گھر سے نکلنے کے بعد اکرم نے تھوڑے فاصلے پر اپنی گاڑی روک دی تھی اور فون پر ایک نمبر ملا کر بات کرنے لگا۔

''کام ٹھیک طریقے سے ہو جانا چاہیے۔'' اکرم نے اتنا کہہ کر فون بند کر دیا اور گاڑی جانے پہچانے راستوں پر دوڑا دی۔

☆.....☆.....☆

ٹی وی لاؤنج میں اکرم اور نائلہ کے علاوہ شرجیل اور ثانیہ بھی موجود تھے چاروں کے چہروں پر سنجیدگی چھائی ہوئی تھی ٹی وی پر ایک ایکسیڈنٹ کی خبر چل رہی تھی جس میں نواب قتل کیس کے مشتبہ عالیہ اور منشا اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ اسکرین پر ایکسیڈنٹ کے بعد گاری کی حالت دکھائی جا رہی تھی گاڑی کو ایک بڑا ٹرک بری طرح کچل گیا تھا منشا اور عالیہ نے موقع پر ہی دم توڑ دیا تھا ٹرک اور ٹرک ڈرائیور غائب تھے اسے ہٹ اینڈ رن کیس کہا جا رہا تھا۔

(ختم شد)

آپ کی ڈائری

یہ ہے آپ کی پسند' آپ کا انتخاب

مرتب: اشعر جواد

بات تو سچ ہے مگر.....

میں ایک سیاست دان کے جلسے میں گیا' وہاں عوام کا ایک جمِ غفیر اپنے مقبول راہنما کی تقریر سننے کے لیے جمع تھا۔ راہنما نے کھدر کا کرتا اور کھلے کی شلوار پہنی ہوئی تھی۔ وہ عوام کی حالتِ زار بیان کرتے ہوئے بتا رہا تھا کہ غریب لوگوں کا جینا دوبھر ہو گیا ہے۔ وہ انصاف کے لیے ترس رہے ہیں۔ انہیں علاج کی سہولتیں میسر نہیں۔ ان کے بچے تعلیم حاصل نہیں کر سکتے۔ ان کی بچیوں کے ہاتھ پیلے نہیں ہوتے' چنانچہ خودکشی کی شرح میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ یہ کہتے ہوئے لیڈر پر رقت طاری ہو گئی اور اسے تقریر روکنا پڑ گئی۔ اس دوران میں پنڈال میں موجود نمازندہ باد کے نعروں سے گونجتا رہا۔ راہنما کو فرط جذبات سے تقریر ادھوری چھوڑ کر جانا پڑا۔ اسے جلسے سے بھی جانے کی جلدی تھی کیونکہ شہر کی وہ تمام مقتدر شخصیتیں جن کی وجہ سے عوام کی زندگی اجیرن ہو چکی تھی' ایک ڈنر میٹنگ پر اس کی منتظر تھیں جہاں عوام کی زندگیوں کو مزید اجیرن بنانے کے ایجنڈے کو حتمی شکل دی جانی تھی۔

میں اپنے ایک محبِ وطن دوست کے پاس بیٹھا تھا۔ وہ اس بات پہ مغموم تھا کہ لوگوں میں حب الوطنی کا جذبہ کم ہوتا جا رہا ہے۔ پاکستان میں نافذ ظالمانہ نظام کے خلاف جدوجہد کرنے کی بجائے لوگ دلبرداشتہ ہو کر گھروں میں بیٹھ گئے ہیں بلکہ ان میں سے جو بیرونِ ملک سیٹل ہو سکتے ہیں' وہ امریکا اور کینیڈا سیٹل ہوتے جا رہے ہیں۔ وہ اس بات پر اداس تھا کہ مغربی معاشرے میں رہنے والے پاکستانی اپنے سارے مادی خواب تو ایک نہ ایک دن پورے کر لیتے ہیں لیکن جب ان کی اولادیں خصوصاً بچیاں جوان ہوتی ہیں تو ان پر برا وقت آنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ لوگ اگر اپنی ایک آدھ نسل کو 'ڈومیسٹک مارشل لا' کے ذریعے (جو ان ممالک میں ممکن نہیں) اپنی اولاد کو دینی' قومی اور ثقافتی پہچان برقرار رکھنے میں کامیاب ہو بھی جائیں تو بھی اگلی نسل کا' پاکستان اپنی زبان' کلچر اور اپنے مذہب سے کوئی تعلق نہ ہو گا۔ دوست مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ یہ کیسے لوگ ہیں جو وقتی آسائشوں کے حصول کے لیے اتنی بڑی قربانی دینے پر تیار ہو جاتے ہیں؟ میں نے اس کی سنجیدگی کو نارملائز کرنے کے لیے کہا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں بلکہ اگر ان کے پاس امریکی پاسپورٹ ہو گا تو وہ پاکستان کے وزیراعظم بن سکیں گے۔ اگر اور کچھ نہیں تو یہ امریکی' برطانوی پاسپورٹ ہولڈرز وزیر' مشیر' ایم این اے' ایم پی اے تو با آسانی بن سکیں گے۔ یقین نہ آئے تو ہمارے مقتدر طبقے کے پاسپورٹس چیک کر لو' ان کی ایک بڑی تعداد ڈوئل نیشنلٹی کی حامل ہے مگر میرے دوست کو میری یہ ہلکی پھلکی گفتگو بے موقع محسوس ہوئی اور اس کی سنجیدگی برقرار رہی۔ اگلے روز میں امریکن ایمبیسی کے سامنے سے گزر رہا تھا تو دیکھا' میرا یہ محبِ وطن دوست امیگریشن ویزہ کے حصول کی لائن میں لگا ہوا تھا۔

عطاء الحق قاسمی کے کالم ''جہاں میں تھا'' سے اقتباس

حسنِ انتخاب۔ محمد نعیم' کراچی۔

موت

موت صرف لفظوں کو ہی خوبصورت نہیں کرتی بلکہ یہ انسان کو تخلیق کی جانب لے جاتی ہے۔ دنیا بھر میں فنونِ لطیفہ کے جتنے شعبے ہیں' ادب' مصوری' گلوکاری' سنگتراشی' موسیقی وغیرہ ان سب کا محرک موت ہے۔ اگر یہ حیاتِ جاوداں ہوتی تو کوئی ناول لکھا جاتا نہ کوئی تصویر بنائی جاتی اور نہ ہی کوئی گیت سنائی دیتا۔ یہ فنا کا احساس ہے جو انسان کو تخلیق پہ ابھارتا ہے کہ میرے پاس اس دنیا میں ایک بہت مختصر حیات ہے تو میں اس میں اپنا وجود ثابت کر جاؤں' وہ جو سب سے بڑا تخلیق کار ہے' اس کے قریب اس طرح آ جاؤں کہ میں بھی تخلیق کروں کہ اس کو تو رہنا ہے اور مجھے بھی جانا ہے اس لیے جتنا بڑا ادب ہے' مصوری یا موسیقی ہے' وہ سب المیہ ہے' اس میں سوگواری اور فنا کی دھنیں ہیں یہاں تک کہ مذہب کی بنیاد بھی تو موت پہ ہے۔ حیات بعد از موت ہے۔ انسان کو اگر ابدی حیات مل جاتی تو وہ کسی مذہب کو نہ مانتا۔ یہ موت کا خوف ہے جو اسے مذہب کے قریب لے جاتا ہے البتہ صوفیائے کرام کے نزدیک موت کا تصور بہت جدا ہے۔ وہ اسے محبوب کے ساتھ وصل کی ساعت قرار دے کر اس کے لیے بے چین ہوتے ہیں' اس کے منتظر رہتے ہیں۔ حضرت بابا بلھے شاہ اساں مرناں ناہیں' گور پیا کوئی ہور' منطق الطیر والے حضرت فرید الدین عطار کی دکان پہ ایک فقیر آیا۔ حضرت عطار نے دھتکار دیا تو فقیر نے کہا۔ ''تم فقیروں کو یوں دھتکارتے ہو تو مرو گے کیسے؟''

عطار نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''جیسے تم مرو گے۔''

فقیر دکان کے آگے زمین پر لیٹا' چادر کھینچی اور مر گیا۔ فرید الدین عطار نے اُسی لمحے دنیا ترک کی۔ دکان سے باہر نکل کر جنگل کی راہ لی اور درویش ہو گئے۔ تو یہ ہے موت جو آپ کو سب سے بڑی سچائی کے قریب لے جاتی ہے۔

مستنصر حسین تارڑ کی تصنیف ''کارواں سرائے'' سے اقتباس

حسنِ انتخاب۔ سید سرور ندیم۔ حیدر آباد

یونیورسٹی

کہتے ہیں' جب کسی کالج کی انتظامیہ اس میں دلچسپی لینا بند کر دے تو وہ یونیورسٹی کہلاتا ہے۔ ویسے بھی کالج اور یونیورسٹیاں تو اس لیے بنائی گئی ہیں کہ لوگوں کو جہالت کی تلاش میں مارا مارا نہ پھرنا پڑے۔ امریکی صدر روز ویلٹ تو یہاں تک کہتا ہے کہ اگر کوئی بندہ کبھی اسکول نہیں گیا تو وہ زیادہ سے زیادہ مال گاڑی کی بوگی ہی چرا سکتا ہے لیکن جو یونیورسٹی گیا ہو تو وہ پوری ریل کی پٹڑی ہی چرا لے گا اسی لیے ہمارے طلباء یونیورسٹی میں دل لگا کر پڑھنے کے لیے دل لگانے میں لگے رہتے ہیں تاکہ پھر پڑھ سکیں۔ آخر میں تعلیمی اخراجات کی رسیدوں کے طور پر انہیں ڈگریاں اور سندیں دے دی جاتی ہیں' یوں ہمارے یہاں بے روزگار بننے کے لیے بندے کو یونیورسٹی میں کئی کئی سال انتظار کرنا پڑتا ہے۔

ڈاکٹر یونس بٹ کی کتاب ''عکس بر عکس'' سے انتخاب

حسنِ انتخاب۔ تحسین جونیجو' بورڑی شریف۔

عام حاضری

ڈسپنسری کے ڈاکٹر نے بڑے احترام سے قدرت کو مخاطب کیا۔ کہنے لگے۔ ''کل تو آپ کی طبیعت خراب تھی اس لیے موقع سے فائدہ حاصل نہ کر سکے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے آج پھر موقع دیا ہے۔ اگر آپ کی طبیعت ٹھیک ہو تو آج حرم میں تشریف لے چلیے۔ آج پھر مسجدِ نبوی ﷺ خصوصی طور پر علمائے کرام کے وفد کے اعزاز میں کھل رہی ہے۔''

قدرت نے بڑی لجاجت سے ڈاکٹر صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ ''جدہ کے طویل سفر کے بعد مجھ میں اتنی ہمت نہیں رہی کہ مسجدِ نبوی ﷺ میں حاضری دے سکوں۔''

ڈاکٹر عفت اور میں حیرت سے قدرت کی طرف دیکھ رہے تھے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ قدرت اتنی

ی نعت کو کیوں ٹھکرا رہے ہیں؟ آخر وہ مسجدِ ﷺ میں خصوصی حاضری کے اِس موقع پر کیوں انکار رہے تھے؟ کیوں پہلوتہی کر رہے تھے؟

جب ڈاکٹر صاحب مایوس ہو کر چلے گئے تو عفت اور میں دونوں ہی قدرت پر برس پڑے۔ ''آخر وفد کے ساتھ مسجد میں حاضری دینے میں کیا حرج ہے؟ آپ جانے پر رضامند کیوں نہیں ہوتے؟''

عفت بولیں۔ ''کل جو آپ نے ناسازیٔ طبع کی بات کی تھی' وہ تو محض بہانہ تھا' آج بھی آپ سفر کی تکان کا بہانہ لے بیٹھے ہیں؟''

ہم دونوں کا جارحانہ رویہ دیکھ کر قدرت کے چہرے پر مجبوری اور بے بسی کی گھٹائیں امڈ آئیں۔ ''نہیں۔'' وہ بڑی منت سے بولے۔ ''میں ان حالات میں حاضری نہیں دے سکتا۔''

''کن حالات میں؟'' ڈاکٹر عفت نے پوچھا۔

''ان حالات میں۔'' انہوں نے ملتجیانہ انداز سے کہا۔

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' عفت نے پوچھا۔

''میں مسجدِ نبوی ﷺ میں ایک عام فرد کی حیثیت سے حاضری دے سکتا ہوں' خصوصی فرد کی حیثیت سے نہیں۔'' انہوں نے اٹک اٹک کر کہا اور کرسی سے اٹھ کر کھڑے ہوئے۔ اُس وقت اُن کا بند بند آبدیدہ تھا۔

ممتاز مفتی کی کتاب ''لبیک'' سے انتخاب

حسنِ انتخاب۔ رضوانہ کوثر۔ لاہور

یقین کامل

اپنے وطن کی قدر اور اسے اپنا جان لینے سے ہی بات بنے گی اور باہمی اعتماد ہمیں ایک دوسرے کے قریب تر لا سکتا ہے۔ ہم میں اعتماد کا فقدان ہو چکا ہے لیکن یہ ختم نہیں ہوا۔ ہمارا مذہب ایک دوسرے سے محبت کا درس دیتا ہے۔ ہم دن دیکھے خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔ اِس جذبے اور یقین کو کامل کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں اس بات کا تو یقین ہے کہ دو گولی اسپرین سے سر درد کو فوری آرام مل جائے گا۔ فلاں ہارٹ سرجن اگر آپریشن کرے گا تو مریض مر نہیں سکتا چاہے وہ کچھ دیر کے لیے مریض کے سینے سے دل باہر ہی نکال کے کیوں نہ رکھ دے لیکن ہمیں اس بات پر یقین نہیں ہوتا ہے کہ فلاں آیتِ مبارکہ پڑھنے سے سر درد کو فوری آرام مل جائے گا یا رزق میں برکت آئے گی۔ اس بات پر یقین نہیں کہ صدقہ دینے سے اس کا دس فیصد دنیا اور ستر فیصد آخرت میں اضافہ ملے گا۔ اگر صرف اس ایک بات پر عمل پیرا ہو جائیں گے' ہم انفرادی طور پر اپنے مالوں سے صدقہ' خیرات کرنا شروع کر دیں تو یقین کیجیے کہ کوئی محتاج یا زکوٰۃ لینے والا نہ رہے۔ ہم اگر باہمی اتحاد کا مظاہرہ کریں' مٹی سے پیار اپنے عقیدے میں شامل کر لیں اور خدا کی مکمل رحمت پر یقین کر لیں تو ہم ایسے بالکل نہ رہیں گے جیسے آج ہیں۔ اگر ہمیں دو گولی ڈسپرین سے زیادہ یقین اپنے ربِ کریم پر آ جائے اور ہم سرکار کو ایک طرف رکھ کر اپنے مسائل کی بابت خود سوچنے لگیں تو ہم زیادہ خوش و خرم اور توانا ہو جائیں گے۔ بات آنکھیں بند کر کے مکمل اور کامل یقین کی ہے اور اس یقین میں کوئی شک و شبہ یا وہم نہ ہو۔ ہمارا دل' جسم یک زبان ہو کر خدا کی قدرت پر یقین رکھ کر تھیا تھیا ناچ رہے ہوں پھر کسی میں نہ ہمیں جدا کرنے کا یارا ہوگا اور نہ ہمیں کسی پر تنقید کی ضرورت ہوگی۔ ہمارا نفس مطمئن ہوگا اور ہم کبھی پریشان حال نہ ہوں گے۔

اشفاق احمد کی کتاب ''زاویہ 3'' سے انتخاب۔

حسنِ انتخاب۔ نصرت نصر اللہ۔ پشاور

خیال آرائی

سنہری باتیں

☆ جو شخص دوسروں کی خوشحالی پہ نظر رکھتا ہے' وہ خود ہمیشہ غمگین ہی رہتا ہے۔

☆ کوئی بھی شخص تمہاری پیٹھ پہ سواری نہیں کر سکتا جبکہ وہ جھکی ہوئی نہ ہو۔

☆ جو کرتا ہے' اللہ کرتا ہے اور اللہ جو کرتا ہے' وہ صحیح کرتا ہے۔

☆ جب تک انسان میں اترانا اور غصہ باقی ہے' اپنے آپ کو وہ اہلِ علم میں شمار نہ کرے۔

☆ خدا ہر طائر کو رزق دیتا ہے مگر اس کے گھونسلے میں نہیں ڈالتا۔

☆ صرف وہ ہی شخص کاہل نہیں جو کچھ نہ کرے بلکہ وہ شخص بھی کاہل ہے جو بہتر کام کر سکتا ہے لیکن کرتا نہیں۔

☆ جانور تک اپنے مالک کو پہچانتا ہے مگر انسان اپنے رب کو بھی پہچان نہیں پاتا۔

☆ جو لوگ اپنے لیے اصول نہیں بناتے پھر انہیں دوسروں کے بنائے اصولوں پر چلنا پڑتا ہے۔

☆ حسد دیمک کی طرح انسان کو کھا جاتا ہے۔

مرسلہ: صوبیہ خان۔ کوئٹہ

زندگی کیا کچھ ہے

☆ زندگی کو خوابوں میں ضائع مت کرو بلکہ خود کسی کا خواب بن جاؤ۔

☆ زندگی زہر نہیں' امرت ہے۔

☆ زندگی زندہ دلی کا نام ہے۔

☆ زندگی ایک سفر ہے اور آدمی ایک مسافر۔

☆ زندگی ایک گاڑی ہے اور آدمی ایک ڈرائیور۔

☆ زندگی میں اپنی خواہشوں کو کم کرو گے تو سکون پاؤ گے۔

☆ زندگی ایک ڈرامہ ہے اور ہم سب اس کے کردار ہیں۔

☆ زندگی ایک تنظیم ہے اور ہم سب اس کے کارکن۔

☆ زندگی ایک مدرسہ ہے اور ہم سب اس کے طالب علم۔

☆ زندگی ایک جنگ ہے اور ہم سب اس کے سپاہی۔

مرسلہ۔ صائمہ خان۔ لاہور

حکومت اور قانون

خداوند کریم نے انسان کی تخلیق کرتے ہوئے اسے اپنا نائب مقرر کیا۔ پھر اس کی ضرورتیں محسوس کرتے ہوئے بے شمار اشیاء اور جانیں پیدا کیں۔ پانی' ہوا' مٹی اور آگ چاروں عناصر کو اس کے لیے ضروری قرار دیا۔ پہاڑ' دریا' سمندر' سورج' چاند' ستارے' بادل' بجلی' بارش' دھوپ چھاؤں' ہری بھری لہلہاتی کھیتیاں' پھل پھول' پودے نیز لاتعداد نظارے اُس کی بے پناہ قدرتوں کے مرہون منت ہیں۔ چرند پرند درندے غرض حشرات الارض سبھی انسان کے لیے لازم وملزوم قرار دیے گئے اور اس کی ضرورتوں کے پیش نظر بے پناہ سامان میسر کیے تاکہ وہ کسی بھی چیز شے یا ضرورت کے لیے پشیمان نہ ہو۔

لامحدود ضروریات زندگی گزارنے پر اس نے بندے پر کچھ قوانین بھی مرتب کیے اور انسان کے ساتھ ساتھ چرند پرند کیڑے مکوڑوں کے علاوہ درندوں پر بھی اسے ضروری قرار دیا۔ اور پھر جو جس سے بڑا' ذہین اور شریف النفس ہوا۔ اسے بادشاہ بنا کر کرسی سونپ دی۔ پھر اسی کی ہدایت' حکومت اور حاکمیت پہ جیون کی نیا رواں دواں کر دی تاکہ لڑائی جھگڑے اور فساد برپا نہ ہو اور امن برقرار رہے۔

انسان کو جہاں سبھی سے افضل بنا کر شاہی سونپی وہاں اُسے سبھی پر فوقیت اور بے پناہ طاقت بھی عطا کی تاکہ ہر شے اس کے قابو میں رہے مگر..... آج کا انسان وزارت اور شاہی کا غلط استعمال کرتے ہوئے اپنے اندر کی ہوس اور لالچ کے چکر میں صرف اپنی تجوریاں بھرنے میں مصروف عمل ہے۔ اور غاصب بن کر رعیت اور عوام کا ذرہ بھر احساس نہیں کرتا۔ اور قانون..... وہ تو جنگلی درندوں کے قانون سے بھی بدتر ہے اور جب حکمرانوں کے دلوں میں ایسی گھٹیا سوچ اور پستی آجائے تو سبھی کچھ بچنا محال ہو جایا کرتا ہے شاید اصل حکومت اور حاکمیت اعلیٰ تو خداوند کریم کے اختیار میں ہے۔ وہ جسے چاہے حکومت دے دے اور جسے چاہے عزت سے نواز دے' مگر جب ظلمت اور بربریت بڑھ جائے تو وہ سبھی کو مٹا کر خاکستر کر دیا کرتا ہے اور پھر نئے سرے سے نئی حکومت اور نیا قانون ترتیب دیتا ہے جو سبھی کے لیے معیاری موثر اور بہتر ہے۔

مرسلہ: ایم حسن نظامی' قبولہ شریف

زندگی

ہمارے پیروں سے بندھے راستے نہ گنتی کے ہیں نہ گننے کے' زندگی ضرورت کی انگلی پکڑے دوڑتی چلی جاتی ہے۔ کوئی آواز کوئی وعدہ اس کو روک نہیں سکتا۔ خواہشوں کا شور آواز کو دھندلا کر دیتا ہے اور ضرورت کی عمر بڑھتی رہتی ہے' زندگی' زندگی بھلا کہاں رکتی ہے۔

خواب

دور کوئی بھی ہو بیٹوں کے لیے ماؤں کے خواب ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ اُن خوابوں کی زری میں کبھی تو دعاؤں کی گرہیں لگنے لگتی ہیں اور کبھی امید کی شیرینی بانٹی جاتی ہے۔ لیکن اکثر سرمے کی کالی لکیروں کے راستے راستے خواب بہہ جاتے ہیں کیونکہ تاریخ کو صرف ایک ہی رنگ پسند تھا..... لال رنگ.....

مرسلہ: ایم افضل۔ کراچی

موبائل فون

موبائل فون کی ایجاد سے پہلے لوگوں کا رابطہ ٹیلی فون پر ہوا کرتا تھا۔ اگر کسی کے پاس ٹیلی فون سہولت نہیں ہوتی تھی تو اسے ٹیلی فون کے بڑے دفتر (تار گھر) میں جا کر لمبی لمبی قطاروں میں کھڑے ہو کر کئی کئی گھنٹے انتظار کرنے کے بعد دوسرے شہر یا دوسرے ملک میں کسی عزیز دوست یا رشتہ دار کے ساتھ بات کرنے کا موقع ملا کرتا تھا۔ چند منٹ بات کرنے کے لیے کافی رقم خرچ ہو جایا کرتی تھی۔ مگر موبائل فون نے ہم سب کو اس مصیبت سے نکال دیا ہے۔ اب اگر ہمیں کسی دوسرے شہر یا دوسرے ملک میں اپنے عزیز دوست اور رشتہ دار سے بات کرنے کی ضرورت ہوتی ہے تو کسی قسم کی زحمت اٹھانا نہیں پڑتی بلکہ گھر بیٹھے موبائل فون پر مطلوبہ نمبر ملائیں اور باتیں کریں۔ چند منٹ بات کرنے کی بہت کم لاگت آتی ہے۔ اس طرح سے موبائل فون ہم سب کے لیے ایک عمدہ ذریعہ ثابت ہوا ہے۔ مگر دوسری طرف دیکھا جائے تو کچھ لوگوں نے اس کا غلط استعمال کر کے اس سہولت کو بدنام کر دیا ہے۔ اس نئی ایجاد سے فائدہ اٹھانے کی بجائے دوسرے لوگوں کو نقصان پہنچانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ بلکہ ہم سب کو چاہیے کہ اس ایجاد سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں نا کہ کسی کو نقصان پہنچانے کی۔ مثلاً اگر کوئی اچھا پیغام ہو یا اچھی بات ہو حدیث پاک ہو اچھا مشورہ ہو اچھی نصیحت ہو' وہ دوسرے لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ ہمارے ملک میں جو افراتفری مچی ہوئی ہے وہ ختم ہو جائے۔ ایک دوسرے کو حوصلہ اور تسلی دے کر ہی زندگی اچھے انداز میں گزاری جا سکتی ہے۔

موبائل فون کو ایجاد کرنے کا یہ مقصد نہیں تھا کہ اسے غلط طریقے سے استعمال کیا جائے بلکہ اس لیے ایجاد کیا گیا تھا کہ لوگ اپنے شہر سے دوسرے شہر یا دوسرے ملک میں اپنے عزیز دوست یا رشتہ دار سے بات کرنے کے لیے اس سہولت سے فائدہ اٹھائیں۔ مگر بدقسمتی سے ہمارے ہاں اس کو وبال جان بنا دیا گیا ہے۔ خصوصاً آج کل کی نئی نسل اسی ایجاد کی وجہ سے بے راہ روی کا شکار ہو رہی ہے۔ جرائم پیشہ افراد اس سے بھرپور فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ لہٰذا حکومت کو چاہیے کہ ایسے اقدامات کرے کہ جرائم پیشہ افراد اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکیں۔

مرسلہ: شیخ معظم الٰہی۔ لاہور

اقوالِ زریں

☆ اپنے دوست کو محبت دو' راز مت دو۔

☆ زندگی کیا ہے' اعتبار اور بے اعتباری کے درمیان کا انتہائی تکلیف دہ سفر۔

☆ جب اعتماد ٹوٹتے ہیں' یقین ٹوٹتے ہیں تو انسان اندر سے کس طرح کرچی کرچی ہوتا ہے' یہ وہی جان سکتا ہے جو اس کرب سے گزرا ہو۔

☆ کسی کو ناراض کرنا بہت آسان ہے لیکن منانا بہت مشکل ہے۔

☆ جب دوست مانگے تو کل کا سوال ہی نہیں۔

☆ جو اونچی جگہ پر کھڑے ہوتے ہیں' انہیں ہی زیادہ آندھیوں اور طوفانوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

☆خواہشات کی یلغار انسان کو کمزور بنا دیتی ہے۔

☆جب کسی کو چاہو تو اپنے دل کو جھوٹ' فریب اور شکوک وشبہات سے پاک رکھو۔

☆جو لوگ چپ چاپ سب کچھ برداشت کر لیتے ہیں' ان کے بارے میں طے ہے کہ ان کا دل زخم خوردہ ہے۔

مرسلہ: ایم اقبال۔ کراچی

انمول باتیں

☆صبر ہمیشہ امید رکھ کر کیا جاتا ہے۔

☆زندگی گزارنے کے لیے بہت سی چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو ہمیں بغیر پیسہ خرچ کیے مل جاتی ہیں مثلاً پیار' سکون' محبت' نفرت' خوشی' غم وغیرہ۔

☆چہرہ دل کی کتاب ہوتا ہے۔

☆زندگی کو چلانے کے لیے امید اور خوشی کی ضرورت ہوتی ہے۔

☆جس طرح کار کو چلانے کے لیے پیٹرول کی ضرورت ہوتی ہے' اُسی طرح رشتوں کو چلانے کے لیے پیار کی ضرورت ہوتی ہے۔

☆انسان کی زندگی کی سب سے بڑی سچائی بے چارگی' بے یقینی ہے۔

☆موت لافانیت سے فانیت کی طرف ایک راستہ ہے۔

☆ہر دن کو اپنی زندگی کا آخری دن سمجھ کر گزارو' اس طرح تم گناہوں سے دور ہوتے جاؤ گے۔

مرسلہ: مس فریحہ مریم۔ گوجرانوالہ

خوب صورت بات

زندگی کی مثال یوں لیں جیسے آپ نے کافی کا ایک کپ ہاتھ میں لے رکھا ہے' ایک خوبصورت' سہانے موسم میں اپنی کھڑکی کے پاس رکھی آرام دہ کرسی پر باہر کا خوبصورت نظارہ کرتے ہوئے جب اس کافی کا گھونٹ آپ نے بھرا تو معلوم ہوا کہ اس میں چینی ڈالنا تو بھول ہی گئے۔ اب کون اٹھے اور جا کر چینی لائے اور ڈال کر ہلائے؟ اسی خیال سے آپ ہولے ہولے اسی کڑوی کافی کے گھونٹ اپنے اندر اتارتے رہتے ہیں اور جب کافی ختم ہوتی ہے تو کپ کی تہہ میں پڑی چینی نظر آتی ہے جسے ہم نے کافی میں گھولا ہی نہیں۔ کتنی حیران کن بات ہے نا' یہی زندگی ہے۔ ہم اس بات کو جاننے کی کوشش ہی نہیں کرتے کہ ہمارے اندر یا آس پاس کیا ہے جو ہماری زندگی میں مٹھاس لا سکتا ہے؟ ہوسکتا ہے کہ مٹھاس ہمارے اندر ہی ہو جس کا ہمیں علم ہی نہ ہو؟

مرسلہ۔ رفیق چوہدری' ملتان

ذرا مسکرایئے

طالب توجہ

ایک صاحب کی خیرات وسخاوت کی بڑی شہرت تھی۔ ایک روز ایک اجنبی ان کے پاس پہنچا اور گلوگیر آواز میں بولا۔ ''جناب والا! میں آپ کی توجہ ایک انتہائی غریب اور مصیبت زدہ کنبے کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ کنبے کا سربراہ انتقال کر چکا ہے' اس کی بیوی اور 9 بچے انتہائی کسمپرسی کی حالت میں دن گزار رہے ہیں' چھے ماہ سے انہوں نے مکان کا کرایہ بھی ادا نہیں کیا۔ اگر دو چار دن کے اندر اندر انہوں نے کرایہ نہ دیا تو اس کڑکڑاتی سردی میں انہیں مکان سے نکال دیا جائے گا۔ کرائے کی رقم چھے ہزار روپے بنتی ہے۔''

''بڑا افسوس ہوا یہ سب سن کر۔'' وہ صاحب بولے۔ ''میں ضرور ان کی مدد کروں گا' ویسے بائی دا وے' آپ کون ہیں؟''

''میں ان کا مالک مکان ہوں۔'' اجنبی نے جواب دیا۔

مرسلہ۔ محمد آصف' حیدرآباد

نہلے پہ دہلا

دو شہری بابو کار میں سفر کر رہے تھے' ایک جگہ انہیں سڑک کے کنارے دیوار کے عقب میں سرخ سرخ سیبوں سے لدے پھندے درخت دکھائی دیے۔ وہ سیبوں کا باغ تھا۔ شہری بابوؤں کو ایک شرارت سوجھی'

گاڑی ایک طرف کھڑی کر کے دیوار کود کر اندر گئے اور بہت سے سیب توڑ لائے۔ سیب گاڑی میں رکھ کر آگے روانہ ہوئے تو چار دیواری کے کونے میں مالی کی جھونپڑی نظر آئی جہاں مالی آرام سے بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ شہریوں کو شرارت سوجھی' انہوں نے سوچا' مالی کو اپنے کارنامے سے آگاہ کر کے گاڑی بھگا لے جائیں گے' چنانچہ گاڑی چلانے والے نے اسپیڈ کم کی اور سر نکال کر بولا۔

''بڑے میاں' برا نہ ماننا' ہم نے تمہارے باغ سے آٹھ کلو سیب توڑ لیے ہیں۔''

بڑے میاں حقے کا کش لے کر اطمینان سے بولے۔ ''بیٹا' تم بھی برا نہ ماننا' جب تم سیب توڑ رہے تھے تو میں نے تمہاری گاڑی سے جیک' اسپیئر وہیل اور ٹول کٹ نکال لی تھی۔''

مرسلہ: رافع علی۔ بدین

ایک سے بڑھ کر ایک

امریکی سفارت خانے میں ویزے کے حصول کے لیے بے انتہا رش تھا۔ ایک طویل قطار لگی ہوئی تھی' قطار میں کھڑے ہوئے ایک خوبصورت اور ماڈرن نوجوان نے محسوس کیا' کسی نے اس کی پیٹھ تھپتھپائی ہے۔

اس نے مڑ کر دیکھا تو اس کے پیچھے ایک حسین و جمیل دوشیزہ کھڑی تھی۔ دوشیزہ نے کہا۔

''مسٹر' قطار میں کھڑے کھڑے میرا گلا خشک ہو گیا ہے' میں ذرا سامنے اسٹال پر کولڈ ڈرنک پینے جا رہی ہوں۔''

نوجوان دل ہی دل میں خوش ہوا مگر بظاہر بے توجہی سے بولا۔

''ضرور جایئے' مجھے بھلا کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟''

''مجھے اندازہ تھا کہ تمہارا جواب ایسا ہی روکھا ہوگا اس لیے میں نے تمہاری شرٹ پر چیونگ گم چپکا دی ہے تاکہ مجھے اپنی جگہ تلاش کرنے میں آسانی رہے۔''

دوشیزہ نے اطمینان سے جواب دیا۔

مرسلہ: عائشہ خان۔ کراچی۔

بزم آرائی

کیا تلاش کرتے ہو؟

ہاتھ کی لکیروں میں
کیا تلاش کرتے ہو؟
ان فضول باتوں میں
کس لیے الجھتے ہو؟
جس کو ملنا ہوتا ہے'
بن لکیر دیکھے ہی
زندگی کے رستوں پر
ساتھ ساتھ چلتا ہے
پھر کہاں بچھڑتا ہے
جو نہیں مقدر میں'
کب ہمیں وہ ملتا ہے؟
کب وہ ساتھ چلتا ہے؟
ہاتھ کی لکیروں میں
کیا تلاش کرتے ہو؟

(فاخرہ بتول)

مرسلہ: انجم حفیظ' کراچی

مورنی

بارش نے جب سے مجھ کو
پازیب پہنائی ہے'
میں رقص میں ہوں
اور اتنی خوش ہوں کہ
اپنے پیروں کی بدرنگی کو
دیکھ دیکھ کے بھول رہی ہوں
پر پھیلائے بھیگے ہوئے جنگل میں
مسلسل ناچ رہی ہوں

(پروین شاکر)

پسند: عظمیٰ' لاہور

سوگوار لمحے

نہ میں نے چاند دیکھا
اور نہ کوئی تہنیت کا پھول کھڑکی سے اٹھایا

میرا ملبوس ابھی ملگجا ہے
حنا سے خالی ہاتھ اور چوڑی سے خالی کلائی
نہ میرے پاس تھے تم
اور نہ میرے شہر سے گزرے
میں کیا افشاں لگاتی،
مانگ میں سیندور بھرتی،
رنگ اور خوشبو پہنتی،
چاند کی جانب نظر کرتی
کہ میری لذت دیدار تم ہو
میرا اتہوار تم ہو

(پروین شاکر)

پسند: مہتاب خان۔ ہری پور ہزارہ

آؤ.....

بے ادب
ستاروں نے
نیند میں مخل ہو کر
تم سے کچھ
کہا ہوگا
آؤ.....
آ کے خود دیکھو
مضطرب
کہاں ہوں میں؟

(مظہر امام)

پسند: آیت سلیم۔ حیدر آباد

وقت

قربتوں میں بھی ایک دوری تھی
اب تو ہم ہو گئے ہیں اور بھی دور
کتنا ظالم ہے زندگی کا سفر
سوچتا ہوں بھی کبھی تنہا
جانے کس موڑ، کس دوراہے پر
وقت کی آندھیاں اڈا آئیں؟
اور ہم سوچتے ہی رہ جائیں

(رسا چغتائی)

پسند: نجیب۔ کراچی

جیت

بے بس ہو کر دل کے ہاتھوں میں نے سوچا
آج میں اس کو فون کروں گی
اور کہوں گی
میں نے تم کو لاکھ بھلایا
لوح دل سے نام تمہارا لاکھ مٹایا
لیکن جاناں..... سچ پوچھو تو
دل کے ہاتھوں ہار گئی میں
آداب کی بار ملیں تو مر کر بچھڑیں
نمبر اس کا ڈائل کر کے
اس کے نرم سے لہجے کی 'ہیلو' سن کر بھی
چپ نہیں ٹوٹی
دھڑک دھڑک کے دل بھی مچلا
کچھ تو بولو لب تو کھولو
لیکن آج ریسیور رکھ کر، کچھ بھی نہ کہہ کر
اپنے دل سے
بالآخر میں جیت گئی ہوں

(فاخرہ بتول)

پسند: ربیدہ طارق۔ کراچی

اب کے برس

اب کے برس کچھ ایسا کرنا
اپنے گزرے بارہ ماہ کے
دکھ سکھ کا اندازہ کرنا
بسری یادیں تازہ کرنا
سادہ سا اک کاغذ لے کر
بھولے بسرے پل لکھ لینا
پھر اس سے بیتے اک اک پل کا
اک اک موڑ احاطہ کرنا
سارے دوست اکٹھے کرنا
ساری بحثیں حاضر کرنا
ساری شامیں پاس بلانا
اور علاوہ ان کے دیکھو
سارے موسم دھیان میں رکھنا
اک اک یاد گمان میں رکھنا

پھر محتاط قیاس لگانا
گر تو خوشیاں بڑھ جاتی ہیں
تو پھر تم کو میری طرف سے
آنے والا سال مبارک
اور اگر غم بڑھ جائیں تو
مت بے کار تکلف کرنا
دیکھو..... پھر تم ایسا کرنا
میری خوشیاں تم لے لینا
مجھ کو اپنے غم دے دینا
اب کے برس کچھ ایسا کرنا

(اختر ملک)

پسند: راحیلہ فردوس۔ کراچی

غزل

ہماری ہستی مٹا رہے ہو' تمہاری مرضی
نشان عبرت بنا رہے ہو' تمہاری مرضی

مرے جگر میں جفا کے خنجر اتار کر تم
وفا کے نغمے سنا رہے ہو' تمہاری مرضی

تمہاری خاطر جو ساری دنیا کو چھوڑ آیا
اسی سے دامن چھڑا رہے ہو' تمہاری مرضی

مری امیدوں کے آشیانے اجاڑ کر تم
کسی کی دنیا بسا رہے ہو' تمہاری مرضی

تمہارا دیدار اک بہشتِ نظر ہے لیکن
تم اپنا چہرہ چھپا رہے ہو' تمہاری مرضی

تم اپنے یاور سے توڑ کر دوستی کا رشتہ
ہر اک سے رشتہ نبھا رہے ہو' تمہاری مرضی

(یاور عظیم)

پسند: صفیہ سلطانہ۔ جیکب آباد

غزل

بند دریچے' سونی گلیاں' اَن دیکھے انجانے لوگ
کس نگری میں آ نکلے ہیں پاگل' ہم دیوانے لوگ؟

ایک ہم ہی ناواقف ٹھہرے روپ نگر کی گلیوں سے
بھیس بدل کر ملنے والے سب جانے پہچانے لوگ

شکوہ کیا اور شکایت کیسی' آخر کچھ بنیاد تو ہو
تم پر میرا حق ہی کیا ہے' ہم ٹھہرے بیگانے لوگ

شہر کہاں خالی رہتا ہے' یہ دریا ہر دم بہتا ہے
اور بہت سے مل جائیں گے ہم جیسے دیوانے لوگ

پسند: ایم الیاس آذر۔ پنڈی

غزل

اس کو شہزادہ ملا بھی یا کہیں خود کھو گئی؟
داستاں گو' پھر وہ شہزادی کہاں گم ہو گئی؟

خوف شب خوں دن کو ذہنوں پر مسلط تھا مگر
شہر کی خلقت پر کیا گزری کہ شب کو سو گئی

یا لہو پیتے ہوئے کھیتوں نے اگلیں میتیں
یا عدو کی فوج دھرتی میں کٹے سر بو گئی

احتجاجاً صبح کی قاتل ہوا سے روٹھ کر
سر برہنہ رات آئی اور مقتل کو گئی

اک لہو کا رنگ تیرے جرم عریاں کر گیا
اک لہو کی بوند میرے پیرہن کو دھو گئی

اس سے آگے کیا تھا' اک اندھی گلی' اجڑا مکاں
یہ غنیمت جان' دنیا اس کے گھر تک تو گئی

اک صدی آتے دنوں کے دکھ میں ہے محسن اداس
اک صدی کی بیوگی' مرتے دنوں کو رو گئی

(محسن نقوی)

پسند: اشعر جواد' کراچی

☆☆.....☆☆

نقشِ قدم

ماہنامہ 'دوشیزہ' بہت جلد اپنے صفحات پر ایک نئے سلسلے 'نقشِ قدم' کا آغاز کررہا ہے۔اس سلسلے میں اُن خواتین کے انٹرویوز شامل ہوں گے' جو زندگی کے مختلف شعبوں کے علاوہ سرکاری و غیر سرکاری اداروں میں منتظم کے فرائض انجام دے رہی ہیں..... 'نقشِ قدم' سلسلہ ہے اُن خواتین کی صلاحیتوں کے اعتراف اور تشہیر کا' جو مردوں کے شانہ بشانہ چلتے ہوئے صرف معاشرے کی فلاح و بہبود میں ہی اپنا کردار بہت مثبت انداز میں ادا کررہی ہیں' ساتھ ہی زندگی اور بندگی کا حق بھی ادا کررہی ہیں۔

مسئلہ یہ ہے

خلقِ خُدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ خلقِ خُدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے اوّلین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادّی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کر دینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو اِن وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اُسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورتِ حال یہ ہوگئی کہ اگر ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد بہرحال محدود ہے۔ اِن ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپردِ ڈاک کرنا خاصا وقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ اِن صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دُعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مُردہ) کے لیے دُعائے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپردِ ڈاک کرنے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہِ کرم جوابی لفافے کے ساتھ =/300 روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کر دیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اِس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحبِ استطاعت حضرات ٹوکن منی =/300 روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسبِ استطاعت اِس رقم میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

(1).....مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جھوٹے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔

(2).....منی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کریں۔

(3).....اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

C II 88- خیابانِ جامی۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

□ ہُما شاہ۔ حیدر آباد۔

○ قابلِ احترام بابا صاحب! السلامُ علیکم! بابا صاحب! میں شدید تکلیف اور پریشانی کے اِس عالم میں اللہ اور اس کے رسولؐ کے بعد آپ سے آس لگا رہی ہوں۔ میرے چار چھوٹے بچے ہیں۔ پانچواں چار ماہ کا حمل ہے۔ شوہر سے کوئی امید نہیں ہے کہ میرا علاج کرا سکے۔ میں ایک سال سے یہ تکلیف جھیل رہی ہوں جبکہ شوہر کہتا ہے کہ میں ناٹک کر رہی ہوں۔ بہر حال اَب میں مسئلے کی طرف آتی ہوں۔ تقریباً ایک سال پہلے مجھے اپنے دائیں سینے میں بہت زیادہ تکلیف محسوس ہوئی۔ اُن دنوں میں بچی کو فیڈ کراتی تھی۔ میں نے اُس کا دودھ چھڑا دیا اور چیک کرایا۔ مختلف ٹیسٹ ہوئے۔ رپورٹ میں ایک چھوٹی سی گٹھلی آئی تو انہوں نے تین مہینے کی دوا بازار سے لکھ دی۔ غربت کی وجہ سے صرف دو مہینے دوا کھائی۔ تکلیف دور نہیں ہوئی تو ڈاکٹر نے فوری طور پر چھوٹا سا آپریشن کر دیا۔ آپریشن کے بعد جو گٹھلی نکلی اُسے آغا خان میں ٹیسٹ کرانے کے لیے دیا تھا لیکن میرے ظالم شوہر نے وہ ٹیسٹ نہیں کرایا اور سمپل ضائع کر دیا۔ اَب میں شدید تکلیف میں مبتلا ہوں۔ سمجھ نہیں آتا کیا کروں؟ کچھ لوگ کہتے ہیں مجھ پر سفلی عمل کرایا ہے۔ اِس سلسلے میں تو میں کسی کو بھی نہیں جانتی علاج تو بہت دور کی بات ہے۔ بابا صاحب! میں موت سے نہیں ڈرتی کیونکہ دنیا میرے لیے عذاب ہے لیکن اپنے بچوں کی وجہ سے زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ خدا کے واسطے مجھے بتائیں میں کیا کروں؟ میرے خط کا جواب جلدی سے دیں اور میرے لیے خصوصی دُعا ضرور کرائیں۔ مجھے شوہر کے رویے کا بھی بہت دُکھ ہے۔ وہ میری بیماری کو ہنسی میں ٹال رہا ہے۔

☆ بیٹی ہُما! تمہارا خط پڑھ کر بہت دُکھ ہوا۔ دنیا میں ایسے بھی لوگ ہیں جو دوسروں کی پرواہ بالکل نہیں کرتے لہٰذا ایسے لوگوں کی تمہیں بھی پرواہ نہیں کرنی چاہیے۔ اپنا علاج خود کراؤ کیونکہ زندگی اللہ تعالیٰ کی اَمانت ہے۔ اِس میں جو بھی خیانت کرے گا وہ اللہ تعالیٰ کو جواب دہ ہوگا۔

مندرجہ بالا آیت ہر نماز کے بعد دو گھونٹ پانی پر پڑھ کر دَم کرو اور یہ پانی بسم اللہ پڑھ کر پی لو۔ جہاں جہاں گٹھلی محسوس کرتی ہو وہاں گرم گرم موم سیکاؤ۔ افاقہ ہوگا۔ مدت 1 4 دن ہے۔

□ بتول حسین۔ جھنگ۔

○ محترم باباجی! السلامُ علیکم! میں نے آپ سے کسی بیرونِ ملک کام کرنے والے لڑکے سے شادی کے لیے تعویذ لیا تھا اُس تعویذ کو سال سے اوپر ہو گیا ہے لیکن یہ مسئلہ ابھی حل نہیں ہوا۔ باباجی! برائے کرم کوئی ایسا جلالی وظیفہ بتائیے جس سے میری شادی بیرونِ ملک کام کرنے والے لڑکے سے نہ سہی ملک میں ہی کسی بھی اچھے لڑکے سے فوراً ہو جائے۔ باباجی! میرے گھر کے حالات خراب ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو بڑا مسئلہ بنا دیا جاتا ہے۔ باباجی! میں بہت مجبور ہوں۔ مہربانی کر کے ایسا کوئی وظیفہ بتائیے جس سے میرا مسئلہ فوراً حل ہو جائے۔ ساری زندگی آپ کو دُعائیں دوں گی۔

☆ بیٹی بتول! اللہ تمہاری حاجات قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ بیٹی! وظیفہ مستقل مزاجی سے کیا جاتا ہے۔ نماز قضا مت ہونے

اطلاعِ عام

قارئین بھائی، بہنوں سے گزارش ہے کہ مسئلہ بھیجنے کے لیے ہمارا نیا پتا نوٹ فرمالیں اور آئندہ اپنا مسئلہ دیے گئے۔ نئے ایڈریس پر روانہ کیجیے۔

نیا پتا: C II-88 ۔ فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

مسئلے سے متعلق معلومات کے لیے رابطہ کیجیے۔ 021-35893121 - 35893122

دو۔ اللہ سب خیر کرے گا۔

□ ناہید خان۔ کراچی۔

○ باباجی! السلامُ علیکم! میں آپ کا کالم ''مسئلہ یہ ہے'' بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ آپ ہزاروں لوگوں کے مسئلے حل کرتے ہیں۔ میرا مسئلہ بھی حل کردیں' تمام زندگی دُعائیں دوں گی۔ میرا مسئلہ دانتوں کا ہے۔ کئی سال سے اِن میں درد رہتا ہے۔ بہت علاج کروا چکی ہوں۔ وقتی فائدہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر پائیوریا کہتے ہیں۔ اَب تو سارے دانت ہل چکے ہیں۔ برائے کرم مجھے دانتوں کی دوا بھجوادیں تاکہ یہ تکلیف دور ہو۔ جواب میں مجھے ہدیہ اور منگوانے کا طریقہ بھی بتادیں۔

☆ بیٹی ناہید! تمہارے دانتوں کی تکلیف کے لیے میرے پاس بہت مؤثر دوا موجود ہے۔ تم مجھے بذریعۂ جوابی لفافہ خط لکھو' میں دوا منگوانے کا طریقہ تحریر کردوں گا۔

□ طلعت علی۔ سیالکوٹ۔

○ محترم باباجی! السلامُ علیکم! پچھلے ماہ بازار میں ''سچی کہانیاں'' ملا تو میں گھر لے آئی۔ جیسے ہی آپ کا کالم دیکھا' دل کو امید سی ہوگئی کہ میرا مسئلہ حل ہوجائے گا اور اَب ہمت کرکے میں آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ برائے کرم آپ میرے مسائل حل کردیں۔ اللہ آپ کو اِس نیکی کا اَجر دے گا۔ (آمین!) میں ضلع سیالکوٹ کے ایک نواحی گاؤں میں پیدا ہوئی۔ ہم پانچ بہن بھائی ہیں۔ میں سب سے بڑی طلعت ہوں۔ باباجی! جب تک ہم اپنے تایا کی فیملی کے ساتھ رہے' بہت خوش حال تھے' لیکن علیحدگی کے بعد تو جیسے مصیبتوں نے ہمارا گھر دیکھ لیا۔ میرے ابو جس کام میں بھی ہاتھ ڈالتے ہیں' ہمیں نقصان ہی ہوتا ہے۔ دو دفعہ باہر جانے کی کوشش کی لیکن نہ صرف ناکام لوٹے بلکہ اُن پر بہت سا قرض بھی چڑھ گیا۔ مزید یہ کہ میرے تین بہن بھائیوں کی نظر بھی کمزور ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ یہ پیدائشی نقص ہے۔ میرا بھائی ماشاء اللہ' جوان ہے لیکن نظر کی وجہ سے ناکارہ ہے۔ اَب سے ڈیڑھ سال پہلے میرے ابو نے بینک سے قرض لے کے ٹریکٹر لیا تھا لیکن پھر بیچ کر پارٹنر کو پیسے دے دیئے اور وہ بھاگ گیا۔ اِس طرح ہم پھر ایک بار خالی ہاتھ ہوگئے۔ باباجی! مہربانی کرکے کوئی ایسا وِرد یا عمل بتائیں کہ ہمیں ہمارے پیسے بھی مل جائیں اور ہمارے گھر میں خوش حالی ہو۔ ایک بات اور باباجی! وہ یہ کہ ابو تو نماز پڑھتے ہیں لیکن اُن کے سختی کرنے کے باوجود بھی گھر میں کوئی اور نماز نہیں پڑھتا حالانکہ میرے ابو کی خواہش ہے کہ تمام گھر والے نماز پڑھیں۔ گھر کا ماحول عجیب سا ہے' کوئی ایک دوسرے کی عزت نہیں کرتا ہے۔ پلیز باباجی! ہمارے لیے کچھ کریں۔ اللہ آپ کو خوشیاں عطا کرے۔ (آمین!)

☆ بیٹی! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور بعد نمازِ فجر اور عشاء کے 7-7 تسبیح سورۃ الواقعہ آیت 7 پڑھو اول و آخر دُرود شریف 7-7 بار' پھر حاجت بیان کرو۔ مدت 41 دن ہے۔ خیال رہے' نماز قضا نہ ہو۔

□ نوشین خان۔ پنڈی۔

○ محترم جناب باباجی! السلامُ علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ومغفرہ! باباجی! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری دور کی نگاہ کمزور ہے۔ باباجی! میں نے ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں اکثر آپ کی جانب سے دیا گیا دور کی نگاہ کے بارے میں وظیفۂ علاج اور دُعا پڑھی ہے لیکن مجھ سے وہ مِس ہوگئی۔ باباجی! کوئی ایسی آیات یا وظیفہ پڑھنے کے لیے دے دیں کہ میری دور کی نگاہ صحیح ہوجائے اور مجھے صاف نظر آنے لگے۔ ویسے میری دور کی نگاہ کا نمبر 1.50 ہے۔ مجھے اپنے چہرے پر چشمہ اچھا نہیں لگتا۔ باباجی! آپ دکھی انسانیت کی خدمت کررہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ عزوجل آپ کو اِس کا اَجر دے۔ (آمین!) میرا یہ مسئلہ حل کردیں۔ میں ساری زندگی آپ کو دُعائیں دوں گی۔

☆ بیٹی نوشین! اپنی خوراک متوازن کرو۔ مچھلی' دودھ اور دہی' موسمی پھل اور کچی سبزیاں آنکھوں کے لیے بہت مفید ہیں۔ اِس کے علاوہ روزانہ بعد نمازِ فجر ٹھنڈے پانی پر 7 بار یَا نُوْرُ پڑھ کر دَم کرواور روئی کے پھاہے کی مدد سے وہ پانی آنکھوں پر لگاؤ۔ یہ عمل بلاناغہ 41 روز کرو۔ سونف بہ کثرت استعمال کرو۔

□ فرمان اللہ جان۔ پشاور۔

○ پیارے باباجی! السلامُ علیکم! آپ کی خیریت اللہ سے مطلوب چاہتا ہوں۔ عرض یہ ہے کہ میری عمر 21 سال ہے اور سال بھر پہلے میری شادی ہوئی اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اللہ نے ایک پیارا سا بیٹا بھی عطا کیا ہے۔ باباجی! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں بے روزگار ہوں۔

گھر میں ہم چار بھائی ہیں' اُن کی شادیاں بھی ہوچکی ہیں۔ میں سب سے چھوٹا ہوں۔ اللہ کے فضل سے گھر میں صرف میں نے تعلیم پائی ہے۔ باقی بھائیوں نے تعلیم نہیں پائی' وہ اَن پڑھ ہیں' لیکن کاروبار میں اچھے چل رہے ہیں۔ ماشاء اللہ' میرے تینوں بھائی بہت اچھے اور خیال رکھنے والے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ ابھی ہم موجود ہیں کہ تیرا اور تیری بیوی بچوں کا بوجھ اٹھا سکیں لیکن باباجی! ساری عمر تو دوسروں کے سہارے نہیں گزاری جا سکتی۔ میں چاہتا ہوں کہ کوئی اچھی سی نوکری مل جائے یا پھر اچھا سا کاروبار شروع ہوجائے تاکہ میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہوجاؤں۔ فی الحال تو میں ایک پرائیویٹ اسکول میں ٹیچر ہوں لیکن وہاں میری تنخواہ صرف پندرہ سو روپے ہے جو اِس مہنگائی کے دور میں کچھ بھی نہیں۔ باباجی! میں بہت پریشانی کی حالت میں آپ کو یہ خط لکھ رہا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آپ میری مدد ضرور کریں گے۔ کوئی وظیفہ یا وِرد بتائیں تاکہ میں کرسکوں۔ الحمدُ للہ' میں اللہ کے فضل و کرم سے پانچ وقت کی نماز پڑھتا ہوں اور تلاوتِ قرآنِ پاک بھی کرتا ہوں۔ میں اللہ کی ذات سے مایوس بھی نہیں ہوں۔ باباجی! برائے مہربانی میرے خط کا جواب اِسی شمارے میں دیجیے گا۔ میں بہت پریشان ہوں۔ اللہ آپ کو لمبی زندگی عطا فرمائے۔ (آمین!)

☆ بیٹے فرمان! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ نمازِ فجر کے بعد ایک بار سورۃ رحمٰن پڑھو اور دُعا کرو۔ اللہ پر بھروسا رکھو' وہ بہتر کرنے والا ہے۔ کبھی اپنی جانب سے تو کوئی کمی مت چھوڑنا' خوب محنت کرو' ضرور صِلہ ملے گا انشاء اللہ!

☐ فریدہ احمد۔ کراچی۔

○ محترم باباجی! السلامُ علیکم! کے بعد عرض ہے کہ ہم اکثر و بیشتر آپ کا کالم پڑھتے ہیں۔ ہمیں یہ کالم بہت اچھا لگتا ہے۔ آپ جس طرح مسلمانوں کو اللہ کے قریب کرتے ہیں' اللہ آپ کو اِس کا اَجر دے گا۔ باباجی! میں اپنی بہن کے مسئلے کے لیے رابطہ کر رہی ہوں۔ برائے کرم جواب ضرور دیجیے گا۔ باباجی! میری بہن کی شادی کو تقریباً 9 یا 10 سال ہوگئے ہیں۔ اُن کا شوہر باہر ملک میں کام کرتا ہے۔ باباجی! مسئلہ یہ ہے کہ وہ میری بہن کو وہیں بلانا چاہتا ہے اور کاغذات بھی بن گئے ہیں مگر روانگی کی تاریخ سے پہلے ہی کاغذات میں کوئی رکاوٹ آجاتی ہے اور کینسل ہوجاتے ہیں۔ برائے کرم اِس سلسلے میں ہماری مدد کریں۔

☆ بیٹی فریدہ! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ بہن سے کہو' نمازِ فجر کے اور عشاء کے بعد ایک ایک بار سورۃ مزمل پڑھے اور دُعا کرے۔ بروز جمعہ بعد نمازِ عصر سفید مٹھائی پر حضور اکرم ﷺ کے نام کی فاتحہ دے کر بچوں میں تقسیم کردے۔ یہ عمل نہایت پابندی کے ساتھ ایک ماہ کرے' پھر مجھے مطلع کرے۔

☐ شازیہ۔ کراچی۔

○ محترم باباجی! السلامُ علیکم! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری شادی کو آٹھ سال ہوگئے ہیں۔ میں نے یہ شادی اپنی پسند سے کی تھی۔ میرے یا اُن کے گھر والے راضی نہ تھے۔ میرا ایک بیٹا ہے سات سال کا۔ باباجی! میں نے شادی کے بعد بہت دکھ اٹھائے ہیں۔ اتنی میری عمر نہیں ہے جتنے میں دکھ اٹھا چکی ہوں۔ دو مرتبہ میں نے خودکشی کی کوشش کی مگر موت نے بھی مجھے قبول نہیں کیا۔ میرے شوہر مجھے بہت زیادہ مارتے پیٹتے ہیں۔ چاقو' چھری' ڈنڈا جو بھی ہاتھ لگے' مار دیتے ہیں۔ کتنی مرتبہ میرا سر پھاڑ دیا ہے۔ گندی سے گندی فحش گالیاں دیتے ہیں۔ میری بیوہ ماں کو طوائف جیسے لفظ بولتے ہیں۔ ہم چھ بہنیں اور ایک ہی چھوٹا بھائی ہے۔ میرے گھر جا کر اُن سے لڑتے رہتے ہیں۔ میرے گھر والے مجھ سے بہت تنگ آئے ہوئے ہیں۔ میری امی مجھے کہتی ہیں کہ تو مرجا تو اچھا ہے۔ میرے شوہر 7,000/ روپے تنخواہ میں سے صرف مجھے 2,500/ روپے دیتے ہیں۔ میں خود نوکری کرتی ہوں۔ میں اپنا اور بیٹے کا کپڑا' جوتا ہر چیز خود کرتی ہوں۔ وہ پھر بھی مجھے اچھا نہیں سمجھتے ہیں۔ میں اپنی پوری تنخواہ اپنے گھر پر لگا دیتی ہوں۔ میرے شوہر کے تمام گھر والے سوائے ایک بڑی بہن کے' لاہور میں ہیں۔ اِس بڑی بہن کے گھر میں ہم کرائے پر رہتے ہیں۔ میرے شوہر ہر تین یا چار مہینے بعد اپنے گھر لاہور جاتے ہیں حتیٰ کہ عیدیں بھی اپنے گھر والوں کے ساتھ مناتے ہیں۔ میں اپنے بچے کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں انہیں لاہور جانے کے لیے اپنے پاس سے پیسے دیتی ہوں۔ میرا بچہ بھی

ا ساس کمتری کا شکار رہنے لگ گیا ہے اور اَب میرے
ا سری اولاد ہونے والی ہے۔ میرا خوف سے برا حال
ہے کہ میں آنے والے کا خرچہ کیسے اٹھاؤں گی؟ کیونکہ
مجھے نوکری چھوڑنی پڑے گی۔ میں اگر دس دن بھی گھر بیٹھ
جاتی ہوں تو میرا شوہر مجھے طعنے دینے لگتا ہے کہ میرا کھا
رہی ہو۔ باباجی! کیا بیوی' شوہر کی ذمے داری نہیں ہوتی
ہے؟ میں آپ کو کیسے بتاؤں کہ میرا دل کتنا زخمی ہے۔
محلے والے روز کی لڑائیوں سے ہمارا مذاق اڑاتے ہیں۔
ں نے بہت سے عامل مولویوں کو اپنا مسئلہ بتایا ہے۔
ب نے میرے پیسے کھائے ہیں' کسی نے میرا کام نہیں
کیا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ میرے شوہر پر جادو کیا گیا ہے'
کوئی کچھ کہتا ہے' لیکن مجھے تو پورا یقین ہے کہ میرا شوہر
ذہنی مریض ہے۔ اُس پر جنونی دورے پڑتے
ہیں۔ باباجی! خدا کے لیے' آپ مجھے بتائیں کہ میرے
ساتھ کیا مسئلہ ہے؟ ہم دونوں کی کیوں نہیں بنتی ہے؟ کوئی
کہتا ہے کہ تمہارے ستارے نہیں ملتے ہیں' تم اپنا نام بدل
لو۔ باباجی! مجھے کوئی ایسا تعویذ یا مختصر وظیفہ بتائیں کہ جس
سے میرے شوہر کا غصہ بالکل ختم ہو جائے اور وہ مجھ سے
محبت کرنے لگیں۔ میرا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ آٹھ سال
سے میں اپنے گھر میں اکیلی نہیں رہ سکتی ہوں۔ جب میں
دوپہر میں سونے کے لیے لیٹوں میں مجھے لگتا ہے کہ کوئی میرے
دل کو نوچ رہا ہے۔ گھبرا کر میں برقع پہن کر گھر سے باہر چلی
جاتی ہوں۔ اَب میری دوسری اولاد تین مہینے بعد ہونے والی
ہے۔ میں یہ چاہتی ہوں کہ میں روزانہ گھر سے باہر نہ نکلا
کروں۔ میرا اپنے گھر میں دل لگے' خاص طور پر میں اکیلے
گھبرایا کروں۔ غموں نے مجھے بہت اکیلا کر دیا ہے۔
باباجی! کوئی ایسی دُعا بھی بتا دیں کہ اگر نوکری چھوڑ دوں تو
گھر بیٹھے روزی لگ جائے کیونکہ میرے شوہر میرا کوئی
خرچ نہیں دیتے۔ آپ مجھے یہ بھی بتا دیں کہ وظیفہ میں کروں
یا میری والدہ بھی کر سکتی ہیں؟ میں معافی چاہتی ہوں کہ میں
نے اتنا لمبا خط لکھا ہے لیکن خدا کے واسطے' اسے پورا شائع
کیجیے گا۔ میں آپ کو ساری عمر دُعائیں دوں گی۔

☆ بیٹی شازیہ! ایک بات یاد رکھو' زندگی ایک بار ملتی
ہے' بار بار نہیں ملتی لہٰذا اپنی اور اپنی اولاد کی زندگی برباد
نہ کرو۔ آج صرف شوہر جوتے مار رہا ہے' کل اولاد
بھی ایسا ہی کرے گی۔ ظاہر ہے' بچے جو دیکھتے ہیں' وہی
سیکھتے ہیں۔ شوہر سے آرام سے بات کرو اور اگر وہ باز نہ
آئے تو فیصلہ کر لو۔ ہر وقت آیت الکرسی کا ورد ضرور کیا
کرو۔ یہ ورد زچگی تک جاری رکھو۔

□ بیٹی۔ سیالکوٹ۔

○ باباجی! السلام علیکم! میں آپ کو پہلی بار خط لکھ رہی
ہوں۔ میں ایک لڑکے سے بے حد پیار کرتی ہوں اور
جہاں تک میں جانتی ہوں' وہ بھی مجھ سے پیار کرتا ہے۔
ہم لوگ کزن ہیں اور ہماری موبائل فون پر بات ہوتی
ہے لیکن گھر والوں کی طرف سے فون پر بات کرنے کی
اجازت نہیں۔ شروع شروع میں مجھے اُس نے فون کیا مگر
اَب نہیں کرتا اور میں روز یا دو تین دن بعد فون کر لیتی
ہوں اور میں چاہتی ہوں کہ استخارہ کر کے بتائیں کہ کیا وہ
مجھ سے پیار کرتا ہے یا صرف ٹائم پاس کر رہا ہے اور کیا وہ
مجھ سے شادی کرے گا اور میری شادی کب ہوگی اور کیا
میری شادی اُسی سے ہوگی؟ اگر نہیں تو پھر کس سے ہوگی؟
آپ کی مہربانی ہوگی۔

☆ بیٹی.....! اگر والدین کی عزت پیاری ہے تو اپنا
رویہ درست کر لو۔ جس راستے پر تم چل رہی ہو وہ صرف
بدنامی تک پہنچاتا ہے۔ ساری زندگی اپنے اور غیر سب
طعنے دیں گے لہٰذا نماز کی پابندی رکھو۔ بکثرت توبہ استغفار
پڑھا کرو۔ اللہ سب خیر کرے گا۔

□ ثمر۔ کراچی۔

○ جناب باباجی! السلام علیکم! باباجی! آج کل میں
بے حد پریشان ہوں۔ میرے تین بچے ہیں۔ میرا بیٹا
اَب میٹرک کا امتحان دے گا۔ باباجی! میرا بیٹا پہلے
پڑھنے میں بہت اچھا تھا لیکن اَب نہ جانے اُسے کیا ہو گیا
ہے؟ میری پوری توجہ اپنے بچوں پر رہتی ہے۔ میں اپنے
بیٹے کو اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان بنانا چاہتی ہوں۔ آج میرے
بیٹے کا ششماہی امتحان کا رزلٹ آیا ہے' وہ ایک پیپر میں
فیل ہو گیا ہے اور باقی مضمون میں بھی نمبر زیادہ اچھے نہیں
آئے ہیں۔ ٹیچر کا کہنا ہے کہ یہ کلاس میں پڑھائی کے
وقت توجہ نہیں دیتا جبکہ باباجی! میں نے اپنے بیٹے کے
لیے 4 ہزار روپے کی ٹیوشن بھی لگائی ہوئی ہے۔ میرے
مالی حالات بہت خراب ہیں۔ ٹیوشن کے پیسے میری بہن
دیتی ہے۔ باباجی! میرا بیٹا قرآن پاک بھی گھر پر حفظ
کر رہا ہے۔ قاری صاحب گھر پر آتے ہیں۔ میں یہ بھی

قارئین کے نام کھلا خط

محترم قارئین!

''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ میں نے خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اوّلین شمارے سے یہ سلسلہ شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نا صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کر دینے والے معجزے بھی دیکھے۔

ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پل یہی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کر جاؤں کہ میرے دُکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعۂ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزقِ حلال کما سکیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کر دیے۔ مگر اب..... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کر جاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔ مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے..... آیئے اور اپنے باباجی کا ساتھ دیجیے.....

ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرایئے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا قدم..... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

نہیں کہہ سکتی کہ میرے بیٹے کا ذہن کمزور ہے۔ پڑھائی کے لیے اس کے پاس بہت وقت ہوتا ہے۔ میری آپ سے التجا ہے کہ آپ میرے بیٹے کے لیے ایسا آزمودہ وظیفہ دیں کہ اس کا دل خوب پڑھائی میں لگے۔ میری آدھی زندگی بے حد پریشانیوں میں گزری ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ میرے بچے اچھا پڑھ لکھ جائیں۔ میں اپنے بیٹے کی میٹرک میں اعلیٰ پوزیشن چاہتی ہوں۔ خدارا آپ میری مدد کریں۔

☆ بیٹی ثمر! اللہ تمہیں اولاد کی خوشیاں دیکھنا نصیب فرمائے۔ بیٹی! ہر نماز کے بعد الحمد شریف اور چاروں قل پڑھ کر تصور میں بیٹے پر دم کرو۔ حسب استطاعت صدقہ خیرات ضرور دیا کرو۔ بچے کو نہار منہ 6-4 بادام ضرور کھلاؤ۔ بیٹی! یہ بہت پرانی چیزیں ہیں مگر بہت آزمودہ ہیں۔

□ عظمیٰ شاہ۔ دادو۔

o بابا! آداب! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری دو بیٹیاں ہیں' دونوں کی عمریں بالترتیب 23 اور 24 سال ہیں۔ اُن کی شادی کے لیے پریشان ہوں۔ رشتے تو اتنے ہیں لیکن کوئی بات نہیں بنتی ہے۔ کوئی وظیفہ بتائیں جسے میں خود پڑھ سکوں۔

☆ بیٹی عظمیٰ.....! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ میں نصیحت کروں گا کہ دونوں بچیوں کے لیے مجھ سے تعویذ منگوالو۔ تفصیل جوابی خط میں تحریر کی جائے گی۔

□ بشیر بلور۔ کوہاٹ۔

o محترم باباجی! السلام علیکم! بعد سلام عرض ہے کہ میں ایک مسئلہ لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ باباجی! یہ میری زندگی کا سوال ہے۔ عرض یہ ہے کہ مجھے بچپن سے ہی فوج میں جانے کا بہت ہی زیادہ شوق رہا ہے۔ میں نے F.Sc بہت ہی اچھے نمبروں سے پاس کیا اور 4 مہینے پہلے فوجی ٹریننگ میں حصہ لیا۔ میں نے بہت ہی محنت کی لیکن ٹریننگ میں' میں ناکام ہوگیا۔ باباجی! میں بہت ہی دل برداشتہ ہوا لیکن میں ناامید نہیں ہوا اور میرے دوستوں نے مجھے بہت ہی حوصلہ دیا اور کہا کہ ایک مرتبہ محنت کر کے قسمت آزما لو۔ باباجی! اب ستمبر میں پھر فوجی ٹریننگ ہو رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میں ایک دفعہ پھر اس ٹریننگ میں حصہ لوں اور اس دفعہ میں پہلے سے بھی زیادہ محنت کروں گا لیکن باباجی! مجھے آپ کی دعاؤں کی بھی بے حد ضرورت ہے اور میں چاہتا ہوں' مجھے آپ اپنا بیٹا سمجھ کر ایسا وظیفہ دیں کہ جس کو پڑھنے کے بعد میں اس ٹریننگ میں کامیاب ہو جاؤں۔

☆ بیٹے بشیر! اللہ تمہیں ضرور کامیابی عطا فرمائے گا۔ بکثرت یَا حَافِظُ کا ورد کیا کرو۔ مدت 41 دن ہے۔

□ بیٹی۔ ٹنڈو جام۔

o محترم باباجی! السلام علیکم! سلام کے بعد عرض یہ ہے کہ یہ میرا آپ کو دوسرا خط ہے۔ امید ہے کہ آپ میرے پہلے خط کی طرح اس کا جواب بھی ضرور دیں گے اور میرے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا بھی ضرور کریں گے۔ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کی مشکلوں کو آسان کرے اور آپ جیسے بزرگوں کا سایہ ہمیشہ ہمارے سروں پر قائم رکھے۔ (آمین!) باباجی! میرے دو مسئلے ہیں۔ پہلا مسئلہ میرے بھائی کا ہے۔ باباجی! میرے بھائی نے انٹر کا پیپر دیا ہے۔ اُس نے فوج میں درخواست بھی دی تھی جو منظور ہوگئی۔ اُس کا ٹیسٹ وغیرہ بھی ہوا ہے جس کا جواب 15-16 اکتوبر کو تک آجائے گا۔ آپ اُس کے لیے دعا کریں کہ وہ فوج میں بھرتی ہو جائے اور اُسے ٹریننگ میں کوئی مشکل پیش نہ آئے کیونکہ وہ جسامت کے لحاظ سے بہت کمزور ہے اور تھوڑا بہت کام کرتا ہے تو اُس کا سانس پھول جاتا ہے۔ آپ اُس کے لیے کوئی ایسا وظیفہ بتائیں کہ وہ فوج میں بھرتی ہو جائے۔ وظیفہ ایسا ہونا چاہیے جو ہم آرام سے کر سکیں۔ اگر فوج میں نہیں تو کہیں اچھی سی جگہ نوکری مل جائے۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ دوسرا مسئلہ میرے کزن کا ہے جو میرا منگیتر بھی ہے۔ اُس کے بارے میں' میں نے آپ کو پہلا خط لکھا تھا جس کا مجھے جواب بھی ملا ہے۔ باباجی! میں نے اپنے پہلے خط میں لکھا تھا کہ اُسے کہیں نوکری ہی نہیں ملتی اور اگر کہیں مل بھی جائے تو تنخواہ بہت کم ملتی ہے جس سے گھر کا خرچ بہت مشکل سے چلتا ہے۔ باباجی! آپ نے ایک وظیفہ بتایا تھا جو آپ نے لکھا تھا کہ وہ خود کرے۔ وہ وظیفہ (41) دن کا تھا۔ باباجی! آپ کی بڑی مہربانی ہوگی کہ آپ کوئی ایسا وظیفہ بتائیں جو میں خود کر سکوں۔ باباجی! وہ آج کل کام کی تلاش میں ہے۔ جہاں بھی اُسے کام کا پتا چلتا ہے' وہ وہاں پر جاتا ہے

مگر جواب میں انکار ملتا ہے۔ بابا جی! آپ کوئی ایسا وظیفہ بتائیں جس سے اُسے چھوٹا موٹا کام مل جائے اور اگر سرکاری نہیں تو کوئی اچھا سا کام مل جائے جس کی تنخواہ اُس کی ضرورت کے مطابق ہو۔ بابا جی! وظیفہ میرے لیے ہی ہونا چاہیے۔ وہ خود نہیں کرسکتا۔ آپ کی بہت مہربانی ہوگی۔ اِس خط کا جواب ستمبر کے شمارے میں ضرور دیں۔ آپ کی بہت مہربانی ہوگی۔

☆ بیٹی! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ جو وظیفہ بیٹے کو دیا تھا' وہ تم کرو اور بھائی سے کہو یَا فَتَّاحُ کا بہت وِرد کرے۔ مدت 1 4 دن ہے۔

□ گل جان۔ ایبٹ آباد۔

○ السلام علیکم! میرا نام گل شیر ہے۔ میری عمر 30 سال ہے۔ میرا ایک ضروری مسئلہ ہے' آپ برائے مہربانی اِس کا حل بتائیں' نہیں تو میری زندگی تباہ ہوجائے گی۔ میری بیوی کا نام ''م'' ہے۔ عمر 26 سال ہے۔ ہماری شادی کو نو سال گزر چکے ہیں۔ شادی سے پہلے میری بیوی اسپتال کے ایک وارڈ انچارج سے محبت کرتی تھی ○ مجھے ہمارا بابا جی علیہ السلام علیکم! تو میں بھائی آپ خیریت انکار کردیتا۔ اُس لڑکے کا نام عمر ہے۔ شادی شدہ تین بچوں کا باپ ہے۔ شادی کے نو سال کے بعد میری بیوی کی اُس لڑکے سے ملاقات ہوئی۔ وہ اُسے کسی وارڈ میں لے گیا' محبت کی باتیں کرنے لگا' اِس دوران اُن دونوں سے زنا جیسا جرم ہوا۔ میری بیوی نے اِس واقعے کے سال بعد مجھے یہ بات بتائی کہ ''میرا ضمیر ملامت کررہا ہے اِس لیے آپ کو یہ بات بتارہی ہوں کہ اُس لڑکے نے مجھ سے زبردستی زنا کیا ہے۔ میرا کوئی قصور نہیں' مجھے معاف کردیں اور اس شخص کو بھی معاف کردیں۔ نہیں تو اگر کسی کو پتا چل گیا تو قیامت آجائے گی۔'' میں نے اُس کو اُس وقت تو معاف کردیا مگر یقین کریں کہ میں اِس دنیا سے مایوس ہوگیا ہوں۔ میری زندگی لٹ گئی ہے۔ دل کو کسی لمحے بھی سکون نصیب نہیں۔ میں اپنی بیوی سے بہت محبت کرتا ہوں۔ ہمارے چار بچے ہیں۔ میں اگر اپنی بیوی کو طلاق دیتا ہوں تو بچے تباہ ہوجائیں گے۔ لوگ پوچھیں گے کہ تم نے اپنی بیوی کو طلاق کیوں دی؟ میری بیوی سچے دل سے توبہ کرچکی ہے۔ کئی دفعہ معافی مانگ چکی ہے مگر میں کیا کروں' دل کرتا ہے' اس کو اپنی زندگی سے نکال دوں کیونکہ یہ میری امانت میں خیانت کرچکی ہے۔ آپ بتائیں' میں کیا کروں؟ دوسرا یہ کہ ہمارے گھر میں میری بیوی کے بھانجے کا آنا جانا تھا۔ ہر وقت ہمارے گھر میں میری غیر موجودگی میں دو تین گھنٹے گھر میں ہوتا تھا۔ اَب میرے گھر والوں نے میری بیوی پر الزام لگایا ہے کہ اس کے اپنے بھانجے سے ناجائز تعلقات ہیں۔ بابا جی! آپ بتائیں' میں کیا کروں؟ کیا کوئی عورت اپنے بھانجے سے ناجائز تعلق رکھ سکتی ہے؟ میری بیوی کا کہنا ہے کہ اس پر جھوٹا الزام لگا ہے۔ بابا جی! خدارا' اِس مسئلے کا حل ضرور بتائیں۔ نہیں تو میں خودکشی کرلوں گا۔ مجھے آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔

☆ بیٹے گل! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ تم نے جو کچھ لکھا ہے' اگر وہ درست ہے تو بیٹے! بڑے افسوس کی بات ہے کہ ایسی عورت تمہارے بچوں کی پرورش کررہی ہے؟ بیٹے! تمہاری نسلیں تباہ ہوجائیں گی۔ بروقت فیصلہ کرو اور غلاظت کو بچوں سے دور کردو۔

□ شازیہ رحمٰن۔ کوئٹہ۔

○ السلام علیکم! آٹھ سال ہوگئے ہیں میرے شوہر کو فوت ہوئے' اُس وقت سے میں ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' پڑھ رہی ہوں۔ ایک دو دفعہ میں نے خط لکھا تھا مگر جواب نہ ملنے کی وجہ سے ناامید ہوگئی تھی۔ بابا جی! میں بہت زیادہ پریشان عورت ہوں۔ زندگی کا پتا نہیں چلا' کب جوانی آئی اور کب ختم ہوگئی؟ شادی ہوئی' انیس سال سخت تکلیفیں دیکھیں۔ خاوند بھی ہمدرد نہیں تھا۔ تین بچے تھے' دو بیٹیاں اور ایک بیٹا۔ جب الگ ہوئے تو خاوند فوت ہوگیا۔ کافی جائیداد تھی مگر بچے بہت نافرمان تھے' خاص کر بیٹا۔ میرے دیور کی زمین بیچ کر سارہ پیسا لے لیا۔ پچھلے سال میرا بیٹا اغواء ہوگیا تھا۔ اس کے ہم نے 20-25 لاکھ روپے قرض لے کر دیئے ہیں۔ سال ہوگیا ہے' اَب ہم نے وہ پیسے واپس دینے ہیں۔ ہماری فیکٹری ہے' وہ اچھی قیمت پر نہیں بک رہی۔ قرض کی ادائیگی کے لیے کوئی ایسا وظیفہ دیں کہ قرض ختم ہوجائے۔ میرا بیٹا آٹھ سال تک فیکٹری چلاتا رہا مگر ایک پیسے کا بھی حساب نہیں دیتا تھا۔ اگر کبھی حساب مانگتی تو مجھ سے مہینوں بات نہیں کرتا اور بہنوں سے بہت زیادہ نفرت کرتا ہے۔ نہ آتے سلام کرتا ہے اور نہ جاتے۔

نے جو بتایا' پڑھتی رہی مگر کچھ بھی اثر نہیں ہوا۔ جب حساب کروایا تو کہتے ہیں' اس کا ستارہ بہت سخت ہے۔ بڑی بیٹی کی شادی کردی ہے۔ اَب بیٹے کی منگنی کی ہے۔ اگر یہ ایسا کرتا ہے اور کل بیوی آئے گی تو وہ بھی ایسی ہوگی۔ بہت پریشان ہوں۔ آٹھ سال بہت دوڑی ہوں مگر کچھ بھی ہاتھ نہیں آیا۔ سخت تکلیفیں دیکھی ہیں اپنوں سے اور اولاد سے۔ گھر آتا ہے نہ ہمارے ساتھ کھانا کھاتا ہے نہ بات کرتا ہے' بس ہر وقت غصے میں ہے۔ اس نے کبھی بھی عزت نہیں کی۔ سال ہوگیا ہے' اس نے ابھی تک کوئی کام نہیں شروع کیا۔ تیار سب کچھ ملتا ہے پھر بھی خوش نہیں ہے۔ بس اَب میرے دل سے بالکل دُعا نہیں نکلتی۔ خاندان میں سب کو دیکھتی ہوں' سب اپنی ماؤں کی اتنی عزت کرتے ہیں۔ سب سمجھا کر بھی تھک گئے ہیں مگر کچھ فائدہ نہیں۔ اِن آٹھ سالوں میں ایک پیسا بھی نہیں کما کر دیا۔ دو دفعہ لاکھوں روپیا دیا مگر نقصان ہوجاتا تھا مگر پھر بھی اس نے کوئی سبق نہیں لیا۔ اَب تو میرے پاس بھی کچھ نہیں۔ ابھی اِن دو بہن بھائیوں کی شادی کرنی ہے۔ اَب میرے دل سے بالکل اُس کے لیے دُعا نہیں نکلتی۔ جس دن اغواء ہوا' گھر سے نکل رہا تھا۔ بات تو خود نہیں کرتا۔ سلام بھی نہیں کیا مگر کیوں' میرے دل سے آہ نکل گئی تھی۔ چار مہینے اس پہ اتنے ختم ہوتے کہ کوئی حساب نہیں۔ بات بنتی تھی' پھر ختم ہوجاتی تھی۔ اُس نے مجھے بہت دُکھی کیا ہوا ہے۔ باباجی! بہت امید سے خط لکھ رہی ہوں۔ کوئی ایسا وظیفہ دیں کہ بیٹا میرا اور بہنوں کا فرماں بردار ہوجائے۔ بہنوں کو تو پوچھتا بھی نہیں۔ ہمارا اللہ کے بعد اس کا آسرا ہے۔ اور قرض بھی اتر جائے۔ اِس دوران چچا نے پوچھا بھی نہیں۔ یہ بہت خودسر ہوگیا۔ ہمارے ساتھ تو بات بھی نہیں کرتا۔ آپ مہربانی کرکے استخارہ کریں کہ یہ ٹھیک ہوجائے گا کہ ساری زندگی میری ایسی گزرے گی؟ چچا آتا ہے' زمین بیچ کر پیسا لے جاتا ہے۔ میں نے تو سب کچھ اللہ پر چھوڑ دیا ہے۔ بس میرا بیٹا ٹھیک ہوجائے۔ اگر اس کو کچھ ہوگیا تو دکھ میرا ہے۔ بہت پڑھتی ہوں مگر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ پانچ وقت نماز' قرآنِ پاک' اپنے گھر میں مدرسہ کھولا ہوا ہے۔ شکر ہے' اللہ نے اِسی طرف لگایا ہوا ہے۔ قرآنِ پاک تفسیر کے ساتھ پڑھ رہی کرنے والا بن جائے۔ میں اپنے اللہ سے بہت راضی ہوں۔ جتنا شکر کروں کم ہے۔ پتا نہیں کس وجہ سے اُس پر کچھ اثر نہیں ہوتا؟ باباجی! بہت امید کے ساتھ آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ آپ استخارہ کریں' میرا بیٹا ٹھیک ہوجائے گا؟ اگر آپ تعویذ دیں کہ گھر کا ماحول ٹھیک ہوجائے۔ سب کہتے ہیں' تیرے بیٹے کے ستارے بہت سخت ہیں۔ یہ کبھی بھی ٹھیک نہیں ہوگا۔ گھر میں آپس میں کوئی بھی بات نہیں کرتا۔ اتنا بڑا گھر ہے مگر بہت خوشی رہتی ہے۔ کبھی گلے لگاتی ہوں بیٹے کو' کبھی پیار کرتی ہوں مگر کچھ بھی اثر نہیں ہوتا۔ جائیداد کے بھی کوئی ایسا وظیفہ دیں کہ صحیح صحیح فیصلہ ہو۔ ہر ایک کو اپنا ٹھیک حصہ مل جائے کیونکہ قیامت کے دن نہ بیٹے نے بخشوانا ہے اور نہ بیٹی نے اور میرے حصے میں جو آئے تو دُعا کریں کہ ایک حصہ میرا' باقی اللہ کے نام کے۔ بس یہ دُعا کریں اللہ مجھے بیٹے کا محتاج نہ کریں۔ کوئی ایسا سخت مؤثر وظیفہ دیں کہ میرے بچے میرے تابع دار ہوجائیں۔

☆ بیٹی شازیہ! تمہارا دُکھ میں سمجھ سکتا ہوں۔ اَب اولاد کو مت آزماؤ۔ جو شخص خود اغواء ہوجائے اور پھر ماں سے پیسا نکال لے' تم ایسی اولاد سے کوئی امید مت رکھو۔ سارا پیسا اور جائیداد اپنے نام رکھو اور اپنے بعد شرعی تقسیم کردو۔ شادی کے سلسلے میں بھی وہ خود جب کما کر لائے' تب کرو۔ چلتے پھرتے یَا رحمٰنُ کا بہت وِرد کیا کرو اور بچوں سے صرف ضرورت کے تحت بات کرو۔ مجھے ایک ماہ بعد مطلع کرو۔

□ سلمیٰ مراد۔ کراچی۔

○ محترم باباجی! السلامُ علیکم! باباجی! میں نے آپ کو کتنے ہی خط لکھے لیکن اَب تک کسی خط کا جواب نہیں ملا۔ ہر مہینے آپ کے جواب کی شدت سے منتظر رہتی ہوں۔ محترم باباجی! میرے دو مسئلے ہیں۔ باباجی! میرے شوہر کے ہر کام میں رکاوٹ رہتی ہے۔ میرے شوہر ہر کسی کے کام آتے ہیں لیکن لوگ اپنا کام نکلوا کر آنکھیں پھیر لیتے ہیں جس کی وجہ سے اِن کو بہت افسوس ہوتا ہے۔ میرے شوہر کے ذریعے سب کے کام ہوتے ہیں لیکن اُن کے کام نہیں ہوتے۔ وہ ہر وقت مایوس اور پریشان رہتے ہیں۔ پہلے کسی سے استخارہ نکلوایا تھا۔

انہوں نے بند فل اخلاقی تھی۔ بابا جی! میرا دوسرا مسئلہ بہت اہم ہے' وہ یہ کہ ہمارے گھر کے سامنے' آگے پیچھے' دائیں بائیں زیادہ تر دکانیں' گیرج ڈپو وغیرہ ہیں۔ وہاں واحد گھر ہمارا ہے۔ پیچھے کا بھی دروازہ نہیں ہے کہ بندہ پیچھے کا دروازہ استعمال کرے۔ بابا جی! اصل مسئلہ یہ ہے پہلے تو یہ دکانیں اتنی نہیں تھیں جو مسئلہ ہوتا' اب زیادہ تر علاقہ کمرشل ہوگیا ہے۔ گھر کے سامنے ڈبو ہے جس کی وجہ سے لڑکوں کا رش لگا رہتا ہے۔ لڑکے گندی گالیاں نکالتے ہیں جس کی آواز سب ہمارے گھروں میں آتی ہے۔ بابا جی! رات کو بالکل ہی سنسان ہوجاتا ہے جس کی وجہ سے ہمارے اکیلے گھر میں تین مرتبہ لڑکوں نے اترنے کی کوشش کی ہے لیکن اللہ کے فضل سے کامیاب نہیں ہوئے۔ اللہ بہت کرم کرتا ہے۔ ایک تو ہمارا گھر لیز بھی نہیں ہے لیکن میرے سسرال والے 40 سال سے یہاں رہتے ہوئے آئے ہیں۔ بابا جی! کچھ سمجھ نہیں آتا ہے' کیا کریں؟ اگر بیچ کر جائیں گے تو معلوم نہیں آگے اور پریشانی نہ ہو؟ بابا جی! اس لیے میں یہ چاہتی ہوں کہ ہمیں دوسری جگہ کوئی اچھا مکان مل جائے۔ مکان بکنے اور دوسری جگہ مکان ملنے کے لیے کوئی وظیفہ بتائیں جس سے ہمارا کام بن جائے۔ بابا جی! آپ کو میں بتا نہیں سکتی' میرے شوہر مکان کے سلسلے میں کتنے پریشان رہتے ہیں۔ اللہ سے ہاتھ اٹھا اٹھا کر دُعا کرتے ہیں کہ مکان کا کوئی وسیلہ کردیں۔ بابا جی! ہماری دو بچیاں ہیں۔ ہر بندہ عزت سے ڈرتا ہے۔ میرے شوہر اکیلے ہیں۔ بابا جی! پلیز' پلیز' پلیز' میرے مسئلے پر ضرور غور کرنا' مجھے خط کا جواب ضرور دیجیے گا۔ بابا جی! اگر میرا خط آپ تک پہنچ جائے تو ستمبر کے شمارے میں ضرور ضرور جواب دیجیے گا' شکریہ!

☆ بیٹی سلمیٰ! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ مجھے بذریعۂ خط مطلع کرو کہ گھر کس قیمت میں بیچنا چاہتی ہو؟ ہر نماز کے بعد 7 تسبیح یَا واحدُ کی 3 تسبیح پڑھو اول و آخر دُرود شریف 3-3 بار۔ مدت ایک ماہ ہے۔

☆☆.....☆☆

علاج اور مکمل شفاء

میرے عزیزو!

اللہ تعالیٰ! سب کو اپنی امان میں رکھے۔

☆ اگر آپ اپنے جسم کے اندرونی اور بیرونی زخموں کا مکمل علاج چاہتے ہیں۔

☆ اگر آپ بالوں کی بیماریوں، سکری اور بال خورے سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

☆ اگر آپ دانتوں کی گوناگوں تکالیف میں مبتلا ہیں۔

☆ اگر آپ موٹاپے جیسی موذی بیماری کا شکار ہیں۔

آپ سب کے لیے خوش خبری ہے کہ اللہ کے فضل و کرم سے ان تمام عوارض کا مکمل علاج اور دوائیں موجود ہیں۔ ان شاء اللہ شفا ہوگی۔ علاج معالجے اور دواؤں کی طلب کے لیے جوابی لفافے کے ساتھ اپنا مسئلہ تحریر کریں۔

II C-88۔ فرسٹ فلور، خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

معروف شعراء کے مجموعہ کلام پر سیر حاصل تبصرے

نیل کے ساحل کی سیپیاں

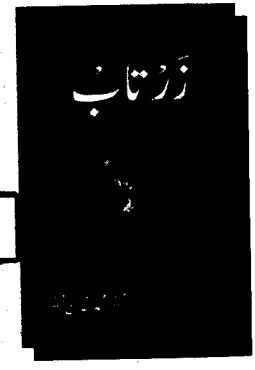

دل کو گرما دینے والی شاعری کی ایک بین مثال

ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی

نامور امریکی شاعر ولیم اسٹیفرڈ (William Stafford) سے ایک مرتبہ کسی نے پوچھا ''آپ نے شاعر بننے کا فیصلہ کب کیا؟'' اسٹیفرڈ نے جواب دیا ''یہ سوال ہی غلط ہے'' اور وضاحت کی ''ہر شخص پیدائشی طور پر شاعر ہوتا ہے۔ وہ یہ جاننے کی جستجو میں رہتا ہے کہ الفاظ کس قسم کی آوازیں پیدا کرتے ہیں اور کیسے کام کرتے ہیں۔ وہ الفاظ کا خیال رکھتا ہے اور ان سے حظ اٹھاتا ہے۔ مَیں وہی کچھ کرتا رہا جو ہر شخص کرتا ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ دوسروں نے ایسا کرنا کیوں ترک کر دیا؟'' یہ تصور کہ شاعری ایک فطری عمل ہے اور شعر، شاعر کے نہاں خانہ دماغ میں پہلے سے موجود ہوتا ہے ہمارے ایک صاحبِ کمال شاعر رضی اختر شوق نے اس سہل لیکن فکر انگیز انداز میں پیش کیا تھا۔

میں تو بس لفظ سے اک دھند ہٹا دیتا ہوں
شعر پہلے سے خیالوں میں لکھا ہوتا ہے

اس ابتدائی گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ بے ساختگی اور برجستگی کے بغیر دل کو چھو لینے والی شاعری ممکن نہیں۔ شعر کی اصطلاح میں بات کریں تو ''آمد'' شاعری (Poetry) ہے اور ''آورد'' قافیہ پیمائی (Versification)۔ اول الذکر کا اثر دیرپا ہوتا ہے جبکہ ثانی الذکر کا لحاتی۔ مَیں نے ان اصولوں اور پیمانوں پر پاکستان کے ایک سینئر اور شکستہ دل شاعر جناب ظفر محمد خان ظفر کے مجموعۂ کلام ''زرتاب'' کا جائزہ لیا تو حسرت موہانی کے اس قولِ فیصل کا قائل ہو گیا کہ

شعر دراصل ہیں وہی حسرت
سنتے ہی دل میں جو اتر جائیں

مَیں نے جو خان ظفر کو ''شکستہ دل'' کہا ہے تو اصلاً کہا ہے، اصطلاحاً نہیں جیسا کہ بیشتر شعرا اپنے کلام میں حزنیہ کیفیت پیدا کرنے کی خاطر خود پر عارضی اور بناوٹی دل شکستگی طاری کر لیتے ہیں۔ خان ظفر تین سال قبل ایک ایسے اندوہ ناک سانحے سے گزرے جس میں ان کا متاعِ جان و دل لٹ گیا۔ ان کی رفیقِ حیات (جو اُن کی رفیقِ کار بھی تھیں) ایک حادثے کے نتیجے میں انہیں داغِ مفارقت دے

گئیں۔ محبت تو بہت چھوٹا لفظ ہے، ان دونوں زن و شوہر کو ایک دوسرے سے جنون کی حد تک عشق تھا۔ اہلیہ حسن آرا ظفر کے انتقال کے نتیجے میں ظفر صاحب کی زندگی میں جو خلا پیدا ہوا اس نے ان کے اعصاب کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ زیرِ نظر کتاب کے شعری اور نثری دونوں حصوں میں جو والہانہ پن نظر آتا ہے وہ کہیں کہیں قاری کی آنکھیں بھی بھگو دیتا ہے۔ ظفر صاحب اپنی بیوی سے کس قدر گہری وابستگی (Attachment) رکھتے تھے اُس کا اندازہ اِس سے لگائیے کہ انہوں نے کتاب کے دو صفحات میں مرحومہ کا جو سوانحی خاکہ مرتب کیا ہے اس میں ان کے قد کی پیمائش اور جسم کی رنگت کے بارے میں بھی لکھ دیا ہے۔ غالب بھی شاید ایسے ہی کسی اندوہناک سانحے سے گزرے تھے جو کہا کہ

تاب لائے ہی بنے گی غالبؔ
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

متوقع طور پر کتاب کا انتساب حسن آرا ظفر کے نام ہے۔ نثر کے دو کرب ناک جملوں کے بعد اس قسم کے دل گداز اشعار ملتے ہیں

چاند اپنی چاندنی لے جا خلا زاروں کے بیچ
زندگی کی شام ہے اب حُسن آرا کے بغیر
سانس تیرے بعد بھی آتا رہا جاتا رہا
جان! لیکن زندگانی کا مزہ جاتا رہا

اس کتاب کی پوری شاعری ''تاریخی'' ہے... اس لحاظ سے کہ ہر غزل/نظم کے بعد اس کی تاریخِ تخلیق درج ہے۔ بعض غزلوں اور نظموں کے انفرادی اشعار کی مختلف تاریخیں لکھ دی گئی ہیں۔ اس طرح دیکھیں تو ان میں سے کچھ کئی کئی سال میں مکمل ہوئی ہیں۔ ان تاریخوں کی مدد سے خانِ ظفر کے کلام کو موضوعاتی طور پر دو ادوار میں بآسانی تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ یعنی شریکِ حیات کی وفات سے قبل کا دور اور شریکِ حیات کی وفات کے بعد کا دور۔ قبل از وفات شاعری کے موضوعات میں ہمہ گیریت نظر آتی ہے۔ کتاب کے ابتدائی 185 صفحات میں ظفر صاحب کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں مشاہیر کی آرا، پیغامات، منظوم تاثرات، اہلیہ مرحومہ کے تعلق سے خود ظفر صاحب کا ایک مضمون، قطعہ تاریخ وغیرہ شامل ہیں۔ 450 صفحات پر محیط اس کتاب میں شاعری کے حصے کا باقاعدہ آغاز صفحہ 187 کی غزل سے ہوتا ہے جو 1962ء میں کہی گئی تھی۔ یہیں سے ظفر صاحب کی شعر گوئی کا آغاز بھی ہوا۔ لہٰذا اس غزل میں قدرے ناہمواری پائی جاتی ہے۔ موصوف کو اس غزل کے وہ اشعار قلم زد کر دینے چاہیے تھے جن کے اسلوب میں فصاحت کا فقدان ہے۔ تاہم انہوں نے مشقِ سخن جاری رکھی چنانچہ 1968ء کی غزل میں پختگی کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس غزل کے دو اشعار دیکھیے

بے خبر! درسگاہِ عالم میں
ہر قدم امتحان ہوتا ہے
منزلیں خود سلام کرتی ہیں
حوصلہ جب جوان ہوتا ہے

دورِ اوّل (2010ء تک پھیلا ہوا ہے) کی غزلیں روایتی موضوعات کی حامل ہیں لیکن ان میں حسن و عشق کے مضامین کا غلبہ ہے مثلاً

پھر اُس کے عشق نے کہلائی اک تازہ غزل
پھر اُس کے حُسن نے اچھا سا استعارہ دیا
تری تلاش سراسر محال ہے تسلیم!
تمام عمر تری پھر بھی جستجو ہوگی
نہ پوچھو! کیا سرِ آفاق وہ چشمِ غزالی ہے
محبت ہی محبت ہے، محبت بھی نرالی ہے
مَیں ہوں، مری نظر ہو، وہ شہرِ جمال ہو
گر یہ نہیں تو کوئی طلسمِ خیال ہو
وہ جانِ گلستاں بھی ہے چمن میں؟
بہارو! کم سے کم اتنا بتا دو

شاعری کا یہ پورا حصہ اتنا رومانٹک ہے کہ خان

صاحب خود کہتے ہیں۔

اتار رومان تیرے شعروں میں
راز کچھ تو ظفر کھلا ہوتا

ان کی غزل میں دیگر مانوس موضوعات اسلوب کی انفرادیت کے ساتھ ملتے ہیں۔ مثلاً:

دردوغم:

نہ گر جانا کہیں دیوارِ غم، دیکھ
ترے سائے میں ٹھہرایا گیا ہوں

رازِ ہستی:

سمجھ سکے نہ ظفر ہم سراب ہستی کو
خرد نے یوں تو ہمیں لاکھ بار اشارہ دیا

ہجر اور فراق:

دوست! قسمت میں مری تجھ سے بچھڑ کر جینا
ہو گیا پھول سے خوشبو کا جدا ہو جانا

اخلاق واخلاص:

جھانکا نہ ہم نے اپنے گریباں میں کبھی
ہم دوسروں کے عیب و ہنر دیکھتے رہے

اگر اخلاص سے خالی ہو دل افرادِ خانہ کا
اجڑ جاتا ہے ہنستا بستا گھر آہستہ آہستہ

گریہ وزاری:

روتے روتے تجھے رات بھر ہو گئی
چشمِ بیتاب! بس کر! سحر ہو گئی

سفرِ آخرت:

رہِ ملک میں عدم میں ساتھ دیتا ہے کسی کا کون؟
بچھڑتے جاتے ہیں سارے ہمسفر آہستہ آہستہ

خان ظفر نے اپنی غزلوں میں بعض جدید نوعیت کے موضوعات پر بھی کامیاب طبع آزمائی کی ہے مثلاً:

آلودگی:

کیوں آگ لگاتے ہو تم آئل کے کنوؤں کو
تیزاب کی برسات کا تم کو نہیں ڈر کیا

امن عالم:

جہل نے پنجرے سے دنیا کے
امن کی فاختہ اڑا دی ہے

احترام انسانیت:

نام خدا! تم ایک کام کرو
انسانیت کا احترام کرو

مشینوں کی ''برکات'':

فیض خود کار مشینوں کا نہ پوچھ!
لوگ بے کار ہوئے جاتے ہیں

حب وطن:

اے قائد کی تعبیر! اے اقبال کے خواب!
میں قرباں تجھ پر ہُوا چاہتا ہوں

توازن:

توازن کی بدولت ہیں سلامت دہر کے منظر
توازن ٹوٹتے ہی سب نظارے ٹوٹ جائیں گے

قلم کی حرمت:

ہے امانت قوم کی تیرا قلم
پتھروں کو پھول تُو لکھا نہ کر

اتحاد ملی:

باہم وطن میں دست و گریباں ہو کے تم
اپنی ہنسی جہان میں اڑوا رہے ہو کیوں

اخوت:

بھرو افشاں اخوت کی، بکھیر و رنگ چاہت کے
کہ قرنوں سے ظفر انسانیت کی مانگ خالی ہے

حصہ دوم کی شاعری جوان کی بیگم کی دردناک رحلت کے بعد شروع ہوئی اس امر کی غماز ہے کہ ان کے دل و دماغ نے اس صدمے کا گہرا اثر قبول کیا۔ جون ایلیا نے کہا تھا

یہ مجھے چین کیوں نہیں پڑتا
ایک ہی شخص تھا جہان میں کیا؟

ظفر صاحب کے تعلق سے ہمیں اس بات کا جواب اثبات میں ملتا ہے۔ اس حصے کی شاعری پڑھ کر قاری محسوس کرتا ہے گویا ایک حادثے کے نتیجے میں شاعر کی ذات ادھوری رہ گئی اور وہ کھوئی ہوئی

ذات کی مسلسل تلاش میں ہے۔ اس کی سوچ، اس کی کھوج حتی کہ اس کی سانسوں پر بھی حسن آرا کا قبضہ ہے۔ وہ اپنی بقیہ زندگی اس غم کے سہارے گزارنے کا خواہاں ہے اور اس کہاوت کو جھٹلانا چاہتا ہے کہ Time is the greatest ho (وقت سب سے بڑا معالج ہے)۔ مندرجہ ذیل اشعار میرے اس نقطہ نظر کی ترجمانی کرتے ہیں۔

داغ زخموں کے پڑے جسمِ حسیں پر کتنے
داغ کوئی نہ پڑا ہوتا تو اچھا ہوتا

باغِ ہستی اجڑا رہنے دے ظفر کا اے بہار!
ہاں، ترا کیا کام ہے اب حسن آرا کے بغیر

شعر کہہ کر شعرِ تازہ کی میں پاؤں کس سے داد!
تو نہیں تو شعر خوانی کا مزہ جاتا رہا

کوئی ساتھی نہیں تنہائی کا
شبِ غم، مار نہ ڈالے، جاناں!
یاد وہ آئیں تو کیا کریں
بھول نہ پائیں تو کیا کریں
جاتے جاتے ظفر کی آنکھوں میں
چاند تارے سجا گیا اک شخص

ظفر محمد خان ظفر تقریباً 36 سال پاکستان کے خلائی تحقیق کے ادارے (SUPARCO) سے بحیثیت ایک سینئر افسر وابستہ رہے۔ انہوں نے ملکی اور غیر ملکی مقتدر تعلیمی اداروں سے سائنس کی اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں اجرامِ فلکی (ستارے، سیارے، خلا وغیرہ) کا بیان جا بجا در آتا ہے۔ انہوں نے اپنی اس نوع کی شاعری کو ''سائنسی کلام'' قرار دیا ہے۔ چنانچہ اس میں زمین، آسمان، سورج، چاند، مریخ، اوزون، کہکشاں جیسے الفاظ اور ان سے وابستہ کیفیات کا کثرت سے ذکر ہوا ہے۔ مثلاً

سوئے مریخ و قمر جب ہمیں چلنا ہوگا
کششِ ارض کے جالوں سے نکلنا ہوگا

جنوبی پول پر 'اوزونی چادر' میں 'ہوا ہے 'ہول'
قیامت کا نہیں ادراک، حیرانی نہیں جاتی

ذرّات کے اندر ہیں ابھی راز نہاں اور
پوشیدہ ہیں عالم میں کئی کاہکشاں اور

کیا ہے نصب ستاروں میں کس نے برقی نظام
کہاں سے روشنی آئی ہے کہکشاں کے لیے

بیسویں صدی میں انسان نے چاند پر قدم رکھ دیا تھا۔ اب یورپ کی ایک غیر منافعتی تنظیم (Mars One) نے انسان کو مریخ کے سفر پر بھیجنے کا اعلان کیا ہے۔ یہ یک طرفہ سفر ہوگا جس میں واپسی کی ٹیکنالوجی شامل نہیں۔ جو یہاں سے گیا وہ پھر وہیں کا ہو جائے گا۔ تنظیم کو اس کے باوجود دو لاکھ سے زیادہ درخواستیں موصول ہوئیں جن میں سے 705 شایقین کا انتخاب کیا گیا ہے جو چار چار کے گروپوں ہوں میں ہمیشہ کے لیے وہاں جائیں گے۔ کرایہ بھی سن لیجیے، پہلے گروپ کا چھ ارب ڈالر اور بقیہ ہر ایک کا چار ارب ڈالر ہوگا۔ روانگی 2024ء سے شروع ہو جائے گی۔ ظفر صاحب جیسا خلائی سائنسداں انسانیت کے اتنے عظیم (متوقع) کارنامے پر بھلا کیسے آنکھیں بند رکھ سکتا تھا جواب صرف ایک عشرے کی دوری پر ہے۔ یہ شعر دیکھیے

اکیسویں صدی میں بہ فیضِ عروجِ فن
مریخ پر رسائی مشتِ غبار ہے

صورت حال اس وقت دل چسپ ہو جاتی ہے جب ان کا سائنس آشنا قلم واردات قلبی بھی سائنسی انداز میں رقم کرتا ہے مثلاً

کیا تم کو بتائیں! تمہیں معلوم تو ہوگا
آہوں کے مزائل جو ستاروں پہ چلیں گے

تم پہ قربان کہکشائیں لاکھ
چاند تاروں کی اک ردا کیا ہے

ہم نے کاٹی ہیں ہجر کی راتیں
ہم کو معلوم ہے خلا کیا ہے

''زرتاب'' میں کچھ ایسا بھی کلام ملتا ہے جو دوسرے مشاہیر شعرا کی مقبول زمینوں میں کہا گیا ہے۔ان میں شاد عظیم آبادی، اقبال، مصطفیٰ زیدی، مخدوم محی الدین اور عبید اللہ علیم خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ظفر صاحب نے کمالِ مستعدی سے معیار کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔شاد کی زمین کے یہ اشعار دیکھیے

مَیں محوِ خوابِ ہستی تھا عدم میں
صدائے کُن سے چونکایا گیا ہوں
سرِ ہستی دلِ بے تاب دے کر
سرِ دنیا مَیں تڑپایا گیا ہوں

بعض نظمیں شخصیات سے منسوب کی گئی ہیں۔ان میں سب سے پہلی شخصیت تو ظاہر ہے حسن آرا (مرحومہ) کی ہے۔ان کے علاوہ جوش، قائد ملت لیاقت علی خان، خواجہ ریاض الدین، اختر شیرانی، خالد علیگ، حکیم سید محمود احمد برکاتی، ڈاکٹر عبدالقدیر خان، پروفیسر (ڈاکٹر) عبدالسلام اور دیگر شامل ہیں۔انہوں نے اپنے حسبِ ذیل شعر میں پوری پاکستانی قوم کے جذبے کی ترجمانی کی ہے

اے ارضِ پاک تجھ پر کروڑوں سلام
تحفے میں تو نے بخشے قدیر اور سلام

''زرتاب'' میں غزلوں اور نظموں کے علاوہ قطعات اور ہائیکوز بھی شامل ہیں۔ظفر صاحب کی جدت پسند طبیعت نے ہائیکو کو بھی تین حصوں میں تقسیم کر دیا یعنی ہائیکو نظم، ہائیکو غزل اور صرف ہائیکو۔ایک ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

شہر کا اک کنگال
علم کے موتی چن چن کر
ہو گیا مالا مال

پاک وطن کی شان
اس شب کو بنا، جس شب میں
اترا تھا قرآن

جانِ وفا کا خط
نامِ ظفر کے آیا تھا
اک نو لکھا خط

ظفر محمد خان ظفر ایک کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعر ہیں۔ان کے کلام میں غم کا الاؤ تو ہے لیکن کہیں بھی مردم بیزاری یا خلوت گزینی کا تاثر نہیں ملتا۔یہ عزم، حوصلہ، محبت، اخوت، ایثار اور اخلاص کا علم بردار ہے۔بے شک غمِ جاناں ان کا پسندیدہ موضوع ہے لیکن وہ غمِ دوراں سے بھی پہلو تہی نہیں کرتے ہیں۔وہ اپنے ارد گرد وقوع پذیر ہونے والے حالات سے نہ صرف بخوبی آگاہ ہیں بلکہ اصلاحِ احوال کے خواہاں بھی ہیں جس کی بھرپور کوششیں زیرِ تبصرہ مجموعے میں نظر آتی ہیں۔وہ سائنس کے آدمی ہوتے ہوئے بھی نغمہ و گل کی باتیں کرتے ہیں جو اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ سائنسدانوں کا بھی دل ہوتا ہے۔متنوع موضوعات و مضامین کے ساتھ ساتھ ظفر صاحب کے ہاں زبان و بیان کی خوبیاں بھی بکثرت ملتی ہیں۔اس پر اسلوب کی انفرادیت نے ان کی شاعری کو ہم عصروں میں ممتاز کر دیا ہے۔مختلف اصنافِ سخن اور شاعری کے رموز و نکات پر انہیں اتنا عبور حاصل ہے کہ انہوں نے چند نئی بحریں خود بھی تشکیل دی ہیں اور ان میں یادگار اشعار کہے ہیں۔انہوں نے مستند نقادانِ فن سے جو خراجِ تحسین وصول کیا ہے بلا شبہ وہ اس کے مستحق قرار پاتے ہیں۔ان سب پر مستزاد یہ کہ کتاب کی پیشکش بے مثال ہے۔صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس پر بہت محنت کی گئی ہے چنانچہ بہت سے الفاظ بالالتزام اِعراب لگا کر لکھے گئے ہیں تاکہ مفہوم کا درست ابلاغ ہو سکے۔ظفر صاحب کے مندرجہ ذیل شعر میں تعلّی سے زیادہ ایک مسلمہ حقیقت کا اظہار پایا جاتا ہے

شعر اپنے کیوں پسند آئیں نہ محفل کو ظفر
سیپیاں لائے ہیں چن کر نیل کے ساحل سے ہم

☆☆.....☆☆

اٹھائیسواں دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ

وہ تقریب جس کا انتظار کیا جاتا ہے۔

وہ تقریب جس میں ملک بھر سے قلم کاروں کا کارواں، اپنے محبت کرنے والوں کے روبرو ہوتا ہے۔

قلم کاروں کے قلم کا حق ادا کرنے کی ایک ادنیٰ سی کوشش۔

بہت جلد.....

اٹھائیسویں دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ کی تقریب اپنے روایتی رنگ میں جلوہ گر ہوگی۔

"بس تھوڑا سا انتظار....."

نگر نگر ڈگر ڈگر گھومتی دیکھتی آنکھوں کی روداد

ماضی کا سحر! سونڈا کا قبرستان

صدیوں کی داستانیں سنا رہا ہے

ابوبکر شیخ

میں سونڈا کا قبرستان دیکھنے جب سفر کرتا وہاں پہنچا تو شام ہو رہی تھی۔

ذرا تصور کریں جب رچرڈ برٹن سخت سردیوں کے موسم میں اس علاقے 'سونڈا' سے گزرا تھا تب شب و روز کیسے ہوں گے؟ وہ تحریر کرتا ہے کہ..... 'ہم صبح سے تین بار راستہ بھول چکے ہیں۔ سخت سردی ہے اور ہم پہاڑیوں

سے اترتے ہیں زرخیز زمین آجاتی ہے۔ چار سو خاموشی ہے اور بس مختلف پرندوں کی بولیاں سن رہے ہیں۔ کہیں کہیں گندم کے کھیت بھی نظر آتے ہیں۔

لیکن اب اس علاقے میں کوئی خاموش نہیں۔ راستے ہیں کہ آتی جاتی گاڑیوں کے شور سے بھرے پڑے ہیں۔ مجھے نہیں پتہ کہ 'تحفتہ الکرام' کے مصنف کی بات میں کتنی صداقت ہے کہ اس شہر کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس خطے میں ایک کامل بزرگ رہتے تھے جو 'سرسونڈر' کے راگ کو بے حد پسند کرتے تھے اور خوش ہوکر حاجت مندوں کی مرادیں پوری کیا کرتے تھے۔ چنانچہ عام لوگوں کی زبان پر یہ خطہ اسی راگ کے نام سے مشہور ہوگیا۔ جب جام تماچی نے اس شہر کی بنیاد رکھی تو اس نے بھی اس کا یہ ہی نام رکھا۔

طغی' جو ایک موچی اور غلام تھا ترقی کرتا اچھے عہدوں پر پہنچ گیا' اور جب اسے ذمے داری دے کر 1347ء میں گجرات بھیجا گیا تو اس نے وہاں قتلغ خان سے مل کر اپنے محسن محمد تغلق سے بغاوت کردی' مگر 'کاڈی' کی جنگ ہار کر' کچھ' کی طرف بھاگ گیا جہاں 'سمہ جاڑیجوں' کا راج تھا اور ان کے سندھ کے سومروں اور سموں سے اچھے تعلقات تھے جس کی وجہ سے طغی کو ٹھٹھہ پہنچانے کے لیے کچھ کے 'جاڑیجوں' نے مدد کی۔ محمد تغلق طغی کو سبق سکھانے اور ٹھٹھہ پر حملہ کرنے کے جنون میں سونڈا آپہنچا۔ بارشوں کا موسم تھا۔ کہا جاتا ہے کہ مچھلی کھانے کی وجہ سے اس کی طبیعت خراب ہوگئی اور 20 مارچ 1351ء میں اس کا انتقال ہوگیا۔ جس کے ساتھ ہی سومرا سرداروں کا زمانہ بھی اپنے اختتام کو پہنچا۔

ہر دور کی اپنی خوبصورتیاں اور بدصورتیاں ہوتی ہیں کچھ زمانوں کی جھولیوں میں مثبت عمل زیادہ ہوتے ہیں اور کچھ زمانوں کی جھولیوں میں کانٹے بہت ہوتے ہیں۔ ہم اگر تعمیر کے حوالے سے ایک سرسری جائزہ لیں تو موہن جوداڑو اور ہڑپہ کی تہذیب سے لے کر بارہویں صدی کے آخر تک فن تعمیر کی تقریباً پانچ ہزار برس کی شاندار تاریخ موجود ہے۔ تاریخ کے اوراق سے پتہ چلتا ہے کہ آریوں کے آنے کے بعد فن تعمیر ایک جمود کا شکار ہوئی' اس کے اسباب یہ تھے کہ یہ آریہ مقامی لوگوں سے زیادہ تیز مزاج' مسلح اور جھگڑالو تھے..... تیرہ سو سے پانچ سو قبل مسیح تک مٹی سے بنی اینٹوں اور لکڑیوں سے عمارتیں تعمیر ہوتی رہیں' گھر اور عبادت گاہیں بنتی رہیں مگر اب ان کا کوئی نام و نشان نہیں ملتا۔ اشوک کے زمانے میں فن تعمیر کو ایک نیا راستہ ملا۔ پہلے جو عمارت سازی تھی وہ سادہ تھی مگر اس زمانے میں باریک اور نفیس پھول اور بوٹوں کی سنگ تراشی کا فن اپنے کمال کو پہنچا۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی لکھتے ہیں 'سندھ' ہندوستان کا وہ حصہ رہا جہاں انسانی تہذیب نے سب سے پہلے آنکھ کھولی جیسا کہ سندھ میں بدمت' جین مت اور برہمنوں کے اثرات موجود تھے' اس لیے ان سب کا اثر اسلامی فن تعمیر پر بھی ہوا اگر ہم مسجدوں کی تعمیر کو دیکھیں تو ترکی' ایران' مصر اور ہند کی تعمیر کا اثر ہمیں نظر آئے گا۔'

ٹھٹھہ سے حیدرآباد جانے والے راستے پر 35 کلومیٹر کا سفر کرکے میں اس پہاڑی پر پہنچا جس کے جنوب میں سونڈا کا چھوٹا سا شہر اور پہاڑی کے مغرب میں سونڈا کے نام سے پکارے جانے والا وہ وسیع قبرستان پھیلا ہوا تھا۔ ہزاروں قبریں ہیں جو پیلے رنگ میں ایک جیسی نظر آتی ہیں۔ تیز دھوپ ہو بارشیں ہوں یا ٹھنڈی چاندنی کی راتیں یہ قبریں صدیوں سے آنکھیں موندے یہیں پڑی ہیں اور ان قبروں پر سنگ تراشی کا نازک و نفیس کام اپنی خوبصورتی اور نزاکت میں لاجواب ہے۔ قبروں پر پیلے پتھر کی سلوں پر جنگ کے مناظر کندہ ہیں۔

ہر قبر اپنی کہانی خود سناتی ہے' بس آپ کے پاس دل سے سننے والے کان اور آنکھیں ہونی چاہئیں جو صدیوں کے آر پار دیکھ سکیں۔ قبر کی سنگ تراشی آپ کو بتادے گی کہ یہ قبر کسی سردار کی ہے' کسی عورت کی ہے یا جنگجو کی۔ ڈاکٹر غلام علی الانا اس سلسلے میں تحریر کرتے ہیں' قبرستان میں پتھر کی بنی ہوئی کچھ قبروں کے دائیں' کچھ کی طرف گھڑ سوار کی تصویریں بھی تراشی گئی ہیں' جن کے ایک ہاتھ میں ڈھال اور دوسرے ہاتھ میں نیزہ ہے۔ کچھ قبروں پر دستار کی شبیہہ تراشی گئی ہیں جن کے متعلق کارٹر کا خیال ہے کہ یہ سرداروں کی

قبروں کی نشانیاں ہیں۔ عورتوں کی قبروں کی پہچان کے لیے تاڑ کی ڈالیوں کی شکلیں تراشی گئی ہیں۔ وہ قبریں جن پر سات فٹ اونچے پتھر کے ستون گاڑھے گئے ہیں وہ قبریں جنگ میں مارے جانے والوں کی ہیں۔

سندھ اور بلوچستان میں اس طرز کے سینکڑوں قبرستان ہیں۔ سلمان رشید ان قبروں کے متعلق تحریر کرتے ہیں کہ 'ہم اگر سرسری طور پر ایک اندازہ لگائیں تو سندھ اور بلوچستان میں مکلی' سانڈا' جھرک' راج ملک' شاہ کپور' چوکنڈی' میمن گوٹھ' تونگ جیسے ایک سو سے بھی زائد قبرستان ہیں۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ کلہوڑا' جوکھیا اور نومڑیا (برفت) مغلوں کے زمانے میں طاقتور تھے۔ ان قبیلوں کا ذکر ہمیں سمہ دور میں بھی ملتا ہے۔ یہ اکثر مغلوں سے لڑتے اور گزرتے ہوئے تجارتی قافلوں پر حملہ کرتے۔ اگر کلہوڑا دور پر نظر ڈالی جائے تو گبول' لاشاری' پنہور' جاکھرا بھی ان کے مددگار رہے۔ ان قبیلوں کی یادگاریں اور قبرستان ہیں جو اس حوالے سے ایک تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔

سارے محققین اس بات پر متفق ہیں کہ یہ فن تعمیر سمہ دور میں یہاں آیا اور اس فن تعمیر پر گجرات کی عمارت سازی کا مکمل اثر تھا۔ سندھ میں سمہ دور فن تعمیر کے لیے ایک انتہائی شاندار دور ثابت ہوا۔ مکلی اور ٹھٹھہ میں زیادہ تر تعمیرات اس دور کی یادگار ہیں۔ سترہویں صدی کے قبرستانوں پر سنگ تراشی کا یہ فن بڑی تیزی سے پھلا پھولا۔ پتھروں کے تختوں پر گھڑ سواروں اور دوسری چیزوں کی تصویریں بننا شروع ہوئیں۔ سمہ سردار اس فن کو گجرات سے لائے 'ارغونوں' ترخانوں اور بلوچ سرداروں نے اس فن کو عروج پر پہنچایا مگر پھر وہی ہوا جو ہر کمال کے ساتھ ہوتا ہے۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں یہ فن اپنے کمال کے زوال کی آخری سانسیں لینے لگا۔ اسباب بہت ہو سکتے ہیں مگر حرفِ آخر یہ ہے کہ اس فن پر زوال کی شام آ گئی۔ سونڈا کے اس قدیمی قبرستان کے حوالے سے ٹھٹھہ کے آرکیالاجی کے ماہر اور محقق ڈاکٹر محمد علی مانجھی سے بات ہوئی تو ان کا کہنا تھا کہ 'اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک قدیمی قبرستان ہے۔ سمہ دور کا جب ہم کہتے ہیں تو یقیناً یہ صدیوں پرانا قبرستان ہے جہاں سنگ تراشی کا فن اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ مگر ایک بات ضرور ذہن میں رکھنی چاہیے کہ یہ کسی ایک مخصوص ذات یا قبیلے کا قبرستان نہیں ہے۔ یہاں ارد گرد جو قومیں اور قبیلے آباد ہیں ان سب کی قبریں یہاں ہیں۔ یہاں جنگوں میں شہید ہونے والے مرد اور عورتوں کی قبریں ہیں' سرداروں کی قبریں ہیں اور عام لوگوں کی بھی قبریں ہیں۔''

میں نے جب قبرستان کی خستہ اور ناگفتہ بہ حالت کے متعلق ڈاکٹر صاحب سے پوچھا تو جواب آیا۔

''بہت پہلے یہاں چوکیدار تھا مگر اب شاید دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ اب یہ قومی شاہراہ قدیم آرکیالوجی سائٹ ہے مگر جو حالت ہے وہ آپ بھی دیکھ رہے ہیں' بس کیا کیا جائے۔'' ایک بے بسی اور دکھ ڈاکٹر صاحب کے جواب میں تھا۔

میں نے اپنی زندگی کے جتنے بھی دن صحبتیں اور شامیں ان قبرستانوں' مقبروں اور قلعوں میں گزاری ہیں چاہے وہ سخت سردیاں ہوں یا جون جولائی کی چلچلاتی دھوپ میں جب بھی یہاں آیا خود کو ایک عجیب سے سحر میں جکڑا ہوا محسوس کیا۔ میں سوچتا ہوں کہ آج سے صدیوں پہلے جب یہ منظر تراشے گئے ہوں گے تب وہ پل کیسے ہوں گے؟ سردی کا موسم ہوگا یا گرمی کا؟ وہ سنگ تراش جب یہ تراش رہا ہوگا تو اس کے چہرے کے کیفیت کیسی ہوگی؟ چار سو دور دور تک وہ کیا دیکھتا ہوگا؟ ان لمحوں میں کون سے پرندے بولتے ہوں گے؟ یا اس وقت کون سی سیاسی سورشوں کی باتیں شہر کی گلیوں میں گردش کرتی ہوں گی؟

یہ فقط قبرستان' مقبرے یا قلعے نہیں ہیں بلکہ ان میں صدیوں کے موسم اور لمحے قید ہیں اور ان میں ایک سحر چھپا ہوا ہے جو آپ کو بار بار بلاتا ہے اور آپ اس سحر میں جکڑے پھر ان قبرستانوں اور مقبروں پر چلے جاتے ہیں۔ یہ سحر ہمارا ماضی ہے جو ہم کو نہ بھی نظر آئے مگر اس سے ہمارا ایک رشتہ ہے جس کو ہم اپنے آپ سے الگ نہیں کر سکتے۔

☆☆.....☆☆

اس ٹریول گائیڈ میں مختلف ممالک کے بارے میں دلچسپ معلومات فراہم کی جائیں گی

تھائی لینڈ ایک دنیا

دیس دیس گھومیے.....!

زین شمسی

امید ہے کہ آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ جیسے کہ آپ سے وعدہ کیا تھا کہ ہر ماہ ہم آپ کو ایک نئے ملک اور نئی جگہ سے متعارف کرائیں گے تو جناب وعدہ وفا کرتے ہوئے اس ماہ ہم ایک ایسے ملک کا ذکر کرنے جا رہے ہیں جو دنیا بھر میں اپنی خوبصورتی کی وجہ سے مشہور ہے، جی ہاں ساؤتھ ایسٹ ایشیا میں واقع

تھائی لینڈ' اور موجودہ حالات میں ایک خاصی وجہ شہرت بھی ہے اور وہ ہے میانمار یعنی برما سے اس کی سرحدوں کا ملنا' میانمار وہ ملک ہے جہاں آج کل

مسلمانوں کی نسل کشی کا سلسلہ جاری ہے۔ اتفاق کی بات ہے کہ کچھ دن پہلے تھائی لینڈ جانے کا موقع ملا۔ تھائی لینڈ کے معنی ہیں آزاد لوگوں کے رہنے کی جگہ اس ملک کا پرانا نام سیام ہوا کرتا تھا۔ یہ ملک تاریخ میں کبھی بھی کسی کا غلام نہیں رہا۔

یہاں کی کرسی بھات کہلاتی ہے۔ مہنگی اور برانڈڈ مصنوعات کے ساتھ ساتھ لوکل اشیا بھی وافر مقدار میں موجود ہیں۔ یعنی ہر شخص تھائی لینڈ میں آ کر خوب شاپنگ کر سکتا ہے۔ ویسے تو تھائی لینڈ ایک بہت بڑا ملک ہے اور 7 دن میں پورا گھومنا ناممکن ہے۔ میرے شروع کے تین دن ایک کریبی نامی چھوٹے سے شہر میں گزرے۔ جو کہ سمندر اور پہاڑوں کے درمیان واقع خوبصورت شہر ہے۔ بس دل سے یہ ہی دعا نکلی کہ کاش ہمارے ملک میں بھی امن ہوتا کہ دنیا بھر سے لوگ پاکستان کی بھی خوبصورتی دیکھنے آئیں۔

کریبی کا ماحول بہت پُرسکون ہے لوگ بھی زیادہ نہیں تھے اور شور بھی برائے نام تھا۔ رات کے اندھیرے میں سمندر کے کنارے پیدل چلنے کا مزہ ہی الگ تھا۔ کہیں لوگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ تو کچھ گانے سنتے ہوئے واک کر رہے تھے۔ بہت ہی پرسکون ماحول تھا۔ تین دن کے بعد اُس خوبصورت شہر کو چھوڑ کر بینکاک جانے کا وقت آیا بالکل بھی دل نہ تھا لیکن سفر جاری رکھنا بھی ضروری تھا۔

رات 10 بجے کریبی کے ہوائی اڈے سے روانہ ہوا اور شہر کے سب سے کمرشل جگہ (Sukhumvit) پر آمد ہوئی جو کہ ایک بالکل ہی انوکھا منظر تھا دنیا بھر کے لوگ تفریح کرنے اس شہر کا رخ کرتے ہیں بے شمار لوگ، خوب ہل چل کریبی جیسی پرسکون جگہ کے بعد ایک ایسی جگہ آنا شروع میں عجیب سا لگا لیکن پھر سوچا کہ ابھی تو چار دن اور ہیں اتنی جلدی رائے قائم نہیں کرنی چاہیے سب سے اچھی بات جو مجھے محسوس ہوئی وہ صفائی پر توجہ ہے۔ چھوٹے

شہر ہوں یا دارالخلافہ سب صاف ستھرے، لوگ سیدھے سادھے سے ہیں اور اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ مردوں کی طرح خواتین بھی محنتی ہیں۔ اور ہمہ وقت مصروف نظر آتی ہیں۔

ہر طرح کے ہوٹلز دستیاب ہیں یعنی آپ اپنی جیب کے حساب سے ٹھہر سکتے ہیں۔ دیسی کھانے باآسانی دستیاب ہیں یہ الگ بات ہے کہ زیادہ انڈین ریسٹورنٹ ہیں۔ سیاح زیادہ تر واٹر پارک، سفاری اور مچھلی گھروں کا رخ کرتے ہیں۔

پتا بھی نہ چلا اور بینکاک کے چار دن بھی گھومتے گھومتے گزر گئے۔ جو خوشی ترقی یافتہ اور خوبصورت ممالک دیکھ کے ملتی ہے وہ دکھ بھی دیتی ہے کہ اگر ہمارے ملک پر بھی تھوڑی توجہ دی جائے تو تھائی لینڈ جیسے ملک کو بھی بہت پیچھا چھوڑا جاسکتا ہے اور ٹورزم کی مد میں کافی زرمبادلہ کمایا جاسکتا ہے۔

7 دن کیسے گزرے پتہ بھی نہ چلا اور واپس جانے کی گھڑی آ پہنچی۔ پاکستان جانے کی خوشی اپنی جگہ مگر یہ احساس بھی شدید تھا کہ کاش میرا وطن بھی اُن ممالک میں شامل ہو جہاں دنیا بھر سے سیاح آتے ہیں اور پھر تعریفوں سے بھرپور ویڈیوز سوشل میڈیا پر ڈالتے ہیں۔

دنیا کے کسی بھی ملک کے سفر کے بعد یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ ہمارا ملک بے انتہا حسین ہے بس ہمیں اس کی قدر کرنی چاہیے۔ محبت صرف الفاظ سے ظاہر نہ ہو بلکہ ہمارے رویے ثابت کریں کہ ہم سچے پاکستانی ہیں جو اپنے وطن کے ذرے ذرے سے محبت کرتے ہیں۔ مجھے اگر دوبارہ موقعہ ملا تو میں اب زیادہ دن کے لیے تھائی لینڈ کا سفر کروں گا۔

تو جناب ایک ہفتہ کا یہ مختصر سفرنامہ تمام ہوا امید کرتا ہوں کہ پڑھنے والوں کو پڑھ کر مزہ آیا ہوگا۔ اگلے ماہ کسی اور ملک کے سفرنامے کے ساتھ ملاقات ہوگی۔

☆☆.....☆☆

ان خاص لوگوں کی کہانیاں اور باتیں جن کے کام نے زمانے پر اپنے اثرات مرتب کیے

خون آشام

دہشت کی علامت بن جانے والے بالی وڈ اسٹار کا احوال زیست

راجہ

رات کے اس پچھلے پہر چہار سو سناٹے کا راج تھا۔ نیم اندھیرے میں ڈوبی ہوئی گلیوں اور سڑکوں پر جیسے ہو کا عالم تھا اس گمبھیر سناٹے میں وقفے وقفے سے جب کسی کتے کے بھونکنے کی آواز گونجتی تو ماحول کی

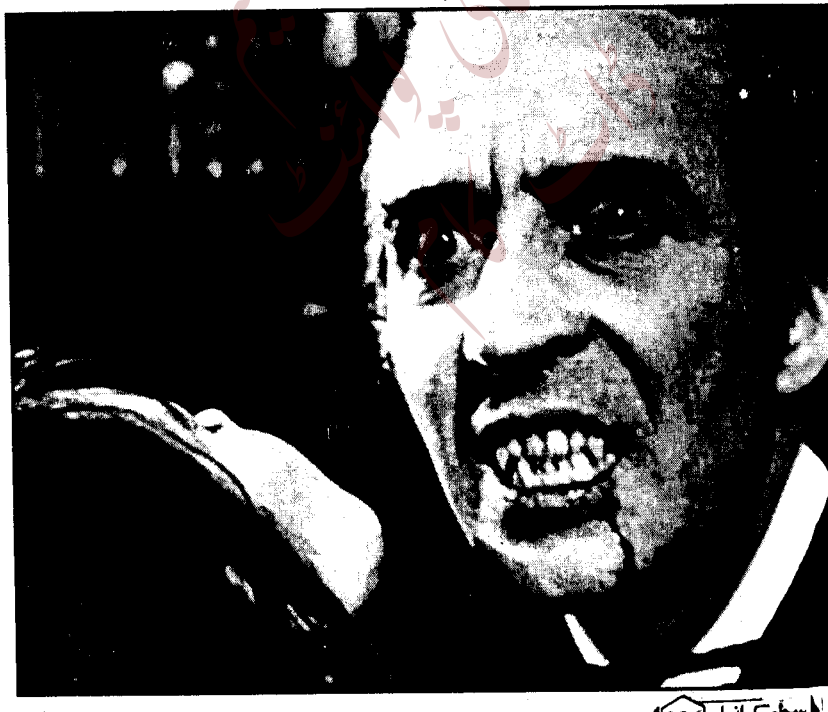

پراسراریت میں مزید اضافہ ہوجاتا تھا۔ دور تک اندھیرے اور ملگجی سی روشنی میں اس سڑک کا منظر انتہائی خوفناک تھا۔ اسٹریٹ لائٹس کی مدہم روشنیاں سڑک کے دونوں جانب لگے درخت اور ان سے ٹکراتی ہوا کی سرسراہٹ جب فضا میں گونجتی تو یوں محسوس ہوتا جیسے سینکڑوں' ہزاروں چڑیلیں اور بھوت بین کررہے ہوں۔ اس مہیب سناٹے میں کوئی گاڑی زن سے گزرتی تو جیسے یہ آسیبی سین ایک لمحے کے لیے تھم سا جاتا، البتہ سڑک پر کسی ذی روح کے آثار تک نہیں تھے۔ درختوں کی اوٹ سے جھانکتی گھروں کی کھڑکیاں بھی اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھیں اور یہ گھر اس ملگجے ماحول میں کسی دیو کا تاثر پیش کررہے تھے۔ سڑک پر وقفے وقفے سے گزرنے والی گاڑیوں کے سوا کوئی اور سرگرمی نہیں تھی۔ یہ سڑک شہر کے مضافاتی علاقے کی تھی جہاں انسانی آبادی برائے نام تھی۔ فاصلے فاصلے سے چند ایک مکان بنے ہوئے تھے جن کے مکین خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ یہ مکانات اس پہاڑی ٹیلے کے دامن میں تھے جو رات کے اندھیرے میں یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے کوئی بڑا سا ہیولا رات کے اس سناٹے میں کسی چوکیدار کی طرح پورے ماحول پر نظریں رکھے ہوئے ہے۔ یکایک اس ہیبت ناک سناٹے میں کسی دھماکے کی آواز گونجی۔ دراصل سڑک پر سے گزرنے والی ایک کار کا ٹائر برسٹ ہوا تھا اور تیز رفتاری سے دوڑتی گاڑی پہلے لہرائی اور پھر ڈرائیور کی مہارت نے کام دکھایا کہ کسی درخت سے ٹکرائے بنا بریک کی چرچراہٹ کے ساتھ ایک جھٹکے سے رکی اور دوبارہ سناٹے کا راج ہوگیا تاہم اس وقتی شور نے آس پاس کے مکینوں کی نیند میں کوئی خلل نہیں ڈالا۔ گاڑی میں سے ایک سایا سا برآمد ہوا یہ ادھیڑ عمر کا ایک منحنی سا شخص تھا۔ وہ جھومتا ہوا چلتا' گھوم کر گاڑی کے اس سائیڈ پر آگیا جہاں کار کا ٹائر برسٹ ہوا تھا۔ پچکے ہوئے ٹائر کو دیکھ کر اس نے غصے سے گاڑی پر لات رسید کی اور اگلے لمحے ہی اس کا پاؤں تکلیف کی شدت سے دہرا ہوگیا۔ لات اس کے اندازے سے کچھ زیادہ ہی شدت سے لگی تھی جس سے گاڑی کا تو کچھ نہیں بگڑا بلکہ اسے اس اندھیری رات میں تارے نظر آگئے۔ اس نے غصے اور تکلیف کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ اپنا تھیلا کھولا اور چند گھونٹ حلق سے نیچے اتارے جس سے اسے کچھ ریلیکس ملا۔ کچھ لمحے وہ اردگرد ویرانی بھرے ماحول کا جائزہ لیتا رہا اور پھر لڑکھڑاتے قدموں سے گاڑی کے پچھلی جانب بڑھا۔ ڈگی کھولی اس میں سے اسپیرو ویل اور جیک وغیرہ نکالنے لگا۔ اپنی مطلوبہ چیزیں نکال کر جب اس نے ڈگی بند کی تو گاڑی کے آگے اسے کوئی کھڑا نظر آیا چونکہ وہ پچھلی سائیڈ پر تھا اور درمیان میں گاڑی چنانچہ اس نے ایک طرف سے دیکھنے کی کوشش کی کہ کون کھڑا ہے، کسی دوسرے کی موجودگی سے اس گاڑی والے کو اپنے اندر خوشی کی رمق محسوس ہوئی تھی کہ چلو وہ جو کوئی بھی تھا ٹائر بدلنے میں اس کی مدد کرسکتا تھا۔ اسی خیال کے تحت وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اس کی جانب بڑھا جہاں اسے وہ کھڑا نظر آیا تھا، نشے میں دھت، چندھیائی ہوئی آنکھوں سے اس نے اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کی تو تھوڑے فاصلے پر اسے ٹوپی والے اوور کوٹ میں ملبوس ایک لمبے قد کا شخص کھڑا نظر آیا، اس لباس پر گاڑی والے کو حیرت ہوئی کیونکہ بارش کا موسم نہیں تھا مگر پھر بھی اس شخص نے اوور کوٹ پہنا ہوا تھا بہرحال کندھے جھٹکتے ہوئے وہ آگے بڑھا اور جب قریب پہنچا تو دیکھا کسی قدر چوڑے چہرے والا ایک بندہ اس کے سامنے کھڑا تھا، اس کی آنکھوں میں کچھ ایسی سفاکیت تھی کہ اسے اپنے جسم میں خوف کی لہر دوڑتی محسوس ہوئی۔ اگلے لمحے اس اوور کوٹ والے نے دانت نکوسے تو دونوں طرف کی باچھوں سے دو نوکیلے دانت نکل کر باہر آگئے بالکل اسی طرح جیسے کتے کے دانت ہوتے ہیں، یہ منظر دیکھ کر اس کار والے شرابی کے پسینے چھوٹ گئے اس نے الٹے قدموں بھاگنے کی کوشش کی مگر وہ ایسا نہیں کرپایا، اسی لمحے وہ اوور کوٹ والا مخصوص رفتار سے چلتا ہوا قریب آیا اور اپنے نوکیلے دانت اس گاڑی والے منحنی شخص کی گردن پر رکھ دیئے' وہ تڑپنے لگا مگر اوور کوٹ والی انسان نما مخلوق

علامت بن جانے والے کرسٹوفر لی کے بارے میں عام اور پوری طرح سے غلط تاثر یہ قائم ہوگیا تھا کہ ان کی اصل شخصیت میں بھی ایسا ہی کھردرا پن اور سرد پن ہے جیسا کہ ڈریکولا میں نظر آتا ہے حالانکہ ایسا نہیں تھا بلکہ وہ اپنے آن اسکرین امیج سے یکسر مختلف انتہائی نرم مزاج اور محبت کرنے والی مہربان شخصیت کے حامل تھے۔ اس مختصر سی بائیوگرافی میں ہالی ووڈ فلم نگری کے اس لیجنڈ اسٹار کی زندگی کا بھرپور احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس سے ان سے جڑے کئی ابہام دور ہوں گے اور یہ بھی پتہ چلے گا کہ ان کے کیریر میں صرف ڈریکولا ہی نہیں بلکہ انہوں نے بہت سا ایسا کام کیا ہے جو انہیں دوسرے اسٹارز سے منفرد اور الگ کرتا ہے لیکن ڈریکولا کا سایا ان پر ایسا چھایا کہ اس میں کرسٹوفر لی کی پروفیشنل و پرسنل لائف پوری طرح سے چھپ جاتی ہے۔ سو اسی طرح چھپے ہوئے گوشے کو اس لائف اسٹوری میں نہاں کیا گیا ہے

ابتدائی زندگی

لندن کے علاقے بلگراویا میں 27 مئی 1922 کو پیدا ہونے والے کرسٹوفر لی نے برطانوی شاہی فوج کے ایک لیفٹیننٹ کرنل جیفری ٹرولوپ کے ہاں آنکھ کھولی۔ کرسٹوفر لی کی ماں کاؤنٹیس ایٹھلے ماری ایک انتہائی دلکش خاتون تھی اس کے بیش بہا حسن کے باعث کئی نامی گرامی مصوروں نے اس کے عمدہ پورٹریٹ بنائے جبکہ ایک فنکار نے خوبصورتی میں اپنی مثال آپ اس کا ایک مجسمہ بھی تخلیق کیا۔ تاہم لی کو بچپن میں ماں اور باپ دونوں کا پیار اکٹھے زیادہ عرصے نصیب نہیں ہوسکا۔ وہ ابھی محض چار برس کا تھا کہ اس کے والدین میں علیحدگی ہوگئی اور اس کی دلکش ماں اسے اور اس کی بہن کو لے کر سوئٹزرلینڈ آگئی جہاں لی کو مس فشر کی اکیڈمی میں داخل کرادیا گیا۔ کچھ عرصے بعد لی کی ماں اپنے دونوں بچوں کو لے کر واپس لندن آگئی یہاں کم عمر لی کا تعلیمی سلسلہ کوئنز لیگ کے ایک پرائیویٹ اسکول سے شروع ہوا ان ہی دنوں ماں نے ایک بینکر ہرکولٹ جارج نامی شخص سے دوسری شادی رچالی۔ لی کا یہ سوتیلا باپ جیمز ہانڈ کے ناولوں سے

مزے سے خون پینے میں مصروف تھی۔

مندرجہ بالا منظر حقیقی نہیں بلکہ شہرہ آفاق کلاسک مووی ڈریکولا کا ہے۔ ڈریکولا پر ہالی ووڈ فلم نگری میں بہت سی فلمیں بن چکی ہیں اور ان میں سے زیادہ تر کامیاب ہوئی ہیں۔ ایک وقت تھا کہ خون آشام ڈریکولا کے اس خیالی کردار نے یورپ میں ایسی ہلچل مچائی ہوئی تھی کہ لوگ اس اصل کردار سمجھنے لگے تھے۔ اس وقت اکثر یورپ میں کئی علاقوں میں ڈریکولا کے دیکھے جانے کی خبریں منظر عام پر آتی تھیں حالانکہ یہ کردار پوری طرح سے تصوراتی تھا اس کردار کو سب سے پہلے انگریز مصنف برام اسٹوکر نے اپنے ناول کاؤنٹ ڈریکولا میں متعارف کرایا جو کہ 1897 میں شائع ہوا تھا اس ناول نے شہرہ آفاق مقبولیت حاصل کی چنانچہ فلم والوں کا دھیان بھلا اس انوکھے کردار کی طرف کیوں نہ جاتا۔ جب بات ہو ڈریکولا فلموں کی تو ذہن خود بہ خود اس کردار کو پلے کر کے دنیا بھر میں مشہور کرنے والے ہالی وڈ اسٹار کی جانب چلا جاتا ہے یہ لیجنڈ فلم اسٹار اب اس دنیا میں نہیں لیکن ڈریکولا کے کردار کو پوری طرح حقیقی انداز میں جس طرح کرسٹوفر لی نے ادا کیا ہے اس نے اسے لافانی کیریکٹر بنا دیا ہے۔ اس خوفناک کریکٹر کو پلے کر کے دہشت کی

شہرت پانے والے رائٹر آئن فلیمنگ کا انکل تھا یوں آئن اس کا سوتیلا کزن کہلایا جارج سے شادی کے بعد لی کی ممی اپنے دونوں بچوں کے ہمراہ فلیم کے علاقے میں شفٹ ہوگئی اور یہ لوگ معروف ایکٹر ایرک مسٹرن کے پڑوسی بن گئے چنانچہ بچپن میں ہی لی کو بڑے ایکٹرز سے ملنے کا موقع حاصل ہوا جب لی نو برس کا ہوا تھا اس کا داخلہ سمر فیلڈز اسکول میں کرادیا گیا یہی وہ اسکول تھا جہاں اسٹیج پلے ز میں لی نے ایکٹنگ شروع کی۔ اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران اس نے کنگز کی اسکالرشپ کے لیے اپلائی کیا تاہم ریاضی میں کمزور ہونے کی وجہ سے انٹرویو میں اس کا گیارہواں نمبر آیا اور یوں اسے اسکالرشپ نہیں مل پائی کیونکہ دس سیٹس تھیں اور وہ گیارہویں نمبر پر آیا تھا اس طرح اسے ایٹون جیسے کالج میں داخلہ نہ مل سکا چونکہ لی کا سوتیلا باپ اس کی فیس ادا نہیں کرسکتا تھا اس لیے لی نے سکالرشپ کے لیے کوشش کی تھی جس میں ناکام رہا تھا چنانچہ آگے تعلیم کے لیے نوجوان لی نے ویلنگٹن کالج میں داخلہ لیا اور وہاں کی اسکالرشپ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا اسکول میں تو لی نے اسنچر پلے ز میں چھوٹے موٹے کردار ضرور کیے البتہ کالج میں ایکٹنگ سے دور رہا۔ البتہ عمر کا یہ وہ دور تھا جب لی کی توجہ کھیلوں کی جانب ہوگئی اور اس نے ہاکی، فٹبال، ربگی اور باکسنگ میں دلچسپی لینا شروع کردی۔

کالج کے زمانے میں اسے رولز توڑنے میں خوب مزہ آتا تھا جس پر کئی بار سزا بھی ملی تھی لیکن اسے ویلنگٹن کالج کو ایک سال پہلے ہی خیر باد کہنا پڑا کیونکہ سوتیلے باپ کی مالی حالت انتہائی پتلی ہوچکی تھی اور وہ دیوالیہ ہوگیا تھا یوں لی کی ماں نے دوسرے شوہر سے بھی علیحدگی اختیار کرلی چنانچہ نوجوان لی کو جاب کرنا پڑی جبکہ بہن پہلے ہی ایک ادارے میں سیکریٹری کی حیثیت سے کام کررہی تھی خیر کچھ کوششوں کے بعد اسے کلرکی ایک جاب مل گئی انہی دنوں دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہوا تو کرسٹوفر لی نے رضا کارانہ طور پر اس جنگ میں حصہ لیا جنگ کے بعد وہ پھر سے کلرک کی جاب کرنے لگا اسی دوران اسے ایئر فورس ہوا باز بننے کا خیال آیا تو اس نے رائل ایئر فورس میں رضا کارانہ شمولیت اختیار کرلی اس کی ٹریننگ ہوئی اور اس نے امتحان بھی پاس کرلیا مگر جب پہلی سولو فلائیٹ کا وقت آیا تو اس کی طبیعت خراب ہوگئی۔ سر درد سے پھٹنے لگا اور آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھانے لگا چنانچہ اسے ہوا بازی کے لیے نااہل قرار دے دیا گیا اس پر نوجوان لی کو بے حد مایوسی ہوئی بعد میں اس نے اس حوالے سے اپیل بھی کی مگر اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا پر اس نے پولیس فورس جوائن کرلی اور کچھ ہی دنوں میں اسے ایئر کرافٹ مین کے طور پر ترقی دے کر ساؤتھ افریقہ بھیج دیا گیا 1943 میں لی کو پائلٹ آفیسر کے طور پر کمیشن ملا اور اس نے باقاعدہ جنگ میں حصہ لیا جس میں اس نے کئی بار موت کو بہت قریب سے دیکھا بعد میں اسے فلائٹ لیفٹننٹ بنا دیا گیا جب جنگ کا اختتام ہوا تو لی 1946 میں ریٹائر ہوگیا۔

فلم کیریر کی شروعات

فوج سے ریٹائرمنٹ کے بعد جب لی واپس لندن آیا تو اسے کلرکی کی پرانی جاب دوبارہ آفر کی گئی مگر اس نے یہ کہتے ہوئے یہ آفر مسترد کردی کہ اتنا ایڈونچر انجوائے کرنے کے بعد اب وہ آفس ورک کے لیے خود کو مناسب نہیں سمجھتا۔ فوج میں رہتے ہوئے لی کو کئی زبانوں پر عبور حاصل ہوچکا تھا اور وہ انہیں فر فر بول لیتا تھا ان ہی دنوں ایک روز وہ اپنے ایک کزن کے ساتھ لنچ کررہا تھا اور اسے جنگ کے قصے سنا رہا تھا کہ اچانک اس کزن نے مشورہ دیا کہ تم ایکٹر کیوں نہیں بن جاتے، لی کو یہ آئیڈیا پسند آیا مگر جب اس نے ماں سے اس حوالے سے بات کی تو اس نے بیٹے کے ایکٹر بننے کو پسند نہیں کیا تاہم ماں کے اعتراض کے باوجود لی نے اپنے کزن کے فلم میکر دوست سے ملاقات کی جس نے اسے اوپر سے نیچے تک بغور دیکھا اور پھر لی کو جوزف سوملو نامی شخص کے پاس بھیج دیا گیا جس نے لی کو دیکھتے ہی کہا کہ لمبے قد کی وجہ سے وہ ایکٹر بننے کے قابل نہیں تاہم سوملو نے پر بھی اسے ایک اور بندے کی طرف ریفر کیا جس نے لی کے ساتھ سات سال کا کنٹریکٹ سائن کرلیا چنانچہ

1947 میں کوریڈو آف مررز سے لی کے فلمی کیریر کی ابتدا ہوئی اس مووی میں اس نے چارلس کا کیریکٹر پلے کیا تاہم یہ کردار بے حد مختصر تھا اور فلم میں اسے محض ایک ڈائیلاگ ہی بولنے کا موقع ملا تھا بہر حال اس طرح وہ سپورٹنگ اور بیک گراؤنڈ کریکٹر کرنے لگا۔ اس طرح چھوٹے موٹے کردار لی نے تقریباً دس برس تک کیے اس دوران لوگ اس کے لمبے قد کا مذاق اڑاتے تھے اور کئی فلم میکرز اسی بنیاد پر اکثر کہتے تھے کہ وہ اس قد کے ساتھ بڑا ایکٹر نہیں بن سکتا لیکن لی اس قسم کی باتوں پر مایوس ہونے کے بجائے وہ خود سے عہد کرتا تھا کہ ایک روز وہ سب کو غلط ثابت کرے گا گویا اس پر جتنی تنقید ہوئی اس نے اتنا ہی جوش بھر جاتا اس نے ان دس سالوں میں اپنے طور پر دیکھ دیکھ کر بہت کچھ سیکھا اور سنیما کی بنیادی تکنیک سے خوب واقف ہوگیا 1948 کی ہیملٹ میں اسے ایک مختصر کردار کرنے کا موقع ملا لیکن فلم کے کریڈٹ لسٹ میں اس کا نام شامل نہیں تھا چند سال بعد 1951 میں اسے ایک اسپنش مووی کیپٹن ہوریا ٹیو میں کاسٹ کیا گیا اس فلم میں لی کی کاسٹنگ اس بنا پر ہوئی تھی کہ وہ اسپنش زبان بہت اچھی طرح بول لیتا تھا چنانچہ اسے اسپنش کیپٹن کا اہم و مرکزی کردار مل گیا تاہم کرسٹوفر لی کے کیریر میں بریک تھرو 1952 میں اس وقت آیا جب اسے لوگس فیئر بینک کی فلموں میں چانس ملا۔ اسی برس اسے مولن رف میں بھی کاسٹ کیا گیا یہ مووی آسکر ایوارڈ کے لیے نامزد بھی ہوئی۔ اگلے ایک عشرے تک لی نے تیس سے زیادہ فلمیں کیں اور اپنے کیریر کو آگے بڑھایا۔

ڈریکولا کا روپ

پچاس کے عشرے میں ہیمر فلم پروڈکشن کمپنی برطانیہ کی بڑی کمپنی تھی اس پروڈکشن کمپنی کی ہارر مووینز نے بہت مقبولیت حاصل کی۔ ہیمر کمپنی کی پہلی مووی جو کرسٹوفر لی نے کی وہ 1957 کی کرس آف فرینکسین تھی جس میں لی نے ایک عفریت کا کردار ادا کیا اس مووی میں لی کے کو اسٹارز میں پیٹر کیوشنگ بھی شامل تھا بعد میں یہ دونوں بیس سے زیادہ فلموں میں ایک ساتھ آئے اور دونوں میں اچھی دوستی بھی ہوگئی۔ ہیمر کمپنی کی فلموں سے لی کو جو شہرت ملی اس نے اسے بڑا اسٹار بنا دیا اور وہ ہارر فلموں کا ایک منفرد ایکٹر کے طور پر ابھر کر سامنے آیا 1958 میں اس کی ایک اور خوفناک مووی کو ریڈورز آف بلڈ منظر عام پر آئی تاہم جس مووی نے لی کو شہرت کی بلندیوں پر پہنچایا وہ تھی ڈریکولا۔ اس فلم نے نہ صرف برطانیہ بلکہ پورے یورپ میں دھوم مچادی تھی۔ یہی نہیں امریکہ میں بھی اس مووی کے خوب چرچے ہوئے اور یہی وہ مووی تھی جس نے کرسٹوفر لی کے کیریر کو ایک نئی سمت دی اور وہ کیریر کے اس مقام سے اس کے نئے سفر پر گامزن ہوگیا ڈریکولا کے بعد لی نے ایک اٹالین و فرنچ موی انکل میں بھی کچھ اسی قسم کا رول نبھایا 1959 کی اس مووی کے بعد تقریباً چھ برس تک لی کی کوئی ہارر فلم نہیں آئی۔ پھر 1965ء میں ہیمر کمپنی کی ڈریکولا ..... پرنس آف ڈارکنیس کے ذریعے ڈریکولا کے رول میں اس کی واپسی ہوئی اس فلم میں لی کے کیریکٹر کو کوئی ڈائیلاگ نہیں بولنا پڑا بس وہ رات کے اندھیرے میں نکلتا اور خون چوس کر غائب ہو جاتا تھا اس بنا ڈائیلاگ والے کردار کو بھی لوگوں کے خوب پسند کیا یعنی وہ فلم میں بغیر کچھ بولے ہی سب کا پسندیدہ کہلایا بنا ڈائیلاگ کے اس کردار کے حوالے سے لی نے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ فلم میں اس کے کریکٹر کے ڈائیلاگ تھے مگر وہ اتنے سطحی تھے کہ اسے پسند نہیں آئے اور اسی لیے بنا ڈائیلاگ کے پوری فلم کر ڈالی جبکہ لی کے بیان کے برخلاف مذکورہ مووی کے رائٹر جمی سنکسٹر کا دعویٰ تھا کہ ڈریکولا کے اس کردار میں کوئی مکالمہ نہیں تھا اس فلم کے بعد بھی کرسٹوفر نے مزید کئی ڈریکولا مووینز کیں اور سب ہی کامیاب ہوئیں تاہم اس حوالے سے ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ پرنس آف ڈارکنس کے بعد وہ مزید اس قسم کی فلمیں کرنا نہیں چاہتا تھا مگر ہر بار پروڈیوسر نے مسٹر لی کو جذباتی طور پر بلیک میل کیا اور وہ مجبوراً ہر بار ڈریکولا کا کردار نہ چاہتے ہوئے بھی کرنے پر راضی ہوئے اس بارے میں تفصیل بتاتے ہوئے ایک بار کرسٹوفر لی نے

انکشاف کیا کہ وہ ہر بار جب بھی ہیمر پروڈکشن کمپنی کے صدر جمی کیریپرز کا فون آتا اور وہ بتاتے کہ اگلی ڈریکولا مووی میرے لیے تیار ہے تو میں صاف انکار کر دیتا کہ اس طرح کی فلموں سے گنگ آ گیا ہوں اور کچھ مختلف کرنا چاہتا ہوں تاکہ اپنی ورسٹائل حیثیت منوا سکوں مگر مسٹر جمی میرے جواب پر ہسٹریائی انداز میں چلاتے ہوئے کہتے کہ لی یہ تم کیا کہہ رہے ہو، معلوم ہے تمہارے انکار سے کتنے لوگ بیروزگار ہو سکتے ہیں؟ مسٹر جمی کا یہ جملہ سن کر میں پوچھتا وہ کیسے تب وہ بتاتے کہ انہوں نے اگلی ڈریکولا مووی ایک بڑے امریکی ڈسٹری بیوٹر کو بیچ دی ہے اور انہیں بتا دیا ہے کہ اس فلم میں کرسٹوفر لی ہی ڈریکولا کے کردار میں ہے اب سوچو تم یہ مووی نہیں کرو گے تو کتنے لوگوں کا دھندا بند ہو جائے گا۔ مسٹر جمی کی یہ جذباتی بلیک میلنگ ہر بار کامیاب رہتی اور میں پھر سے ڈریکولا بننے پر تیار ہو جاتا۔ اس طرح اپنے کیریر میں ایک کے بعد ایک ڈریکولا مووی کرتا گیا۔ لی کی کچھ ڈریکولا فلمیں ناکام بھی ہوئیں جیسا کہ 1972 کی ڈریکولا اور 1973 کی دا مسٹیک رائٹس آف ڈریکولا نامی فلمیں باکس آفس پر نرم رہیں تاہم چند ناکامیوں کے باوجود کرسٹوفر لی ڈریکولا کے روپ میں پوری طرح کامیاب دکھائی دیتے ہیں مسٹر لی نے اپنے کیریر میں دس مرتبہ خون آشام کردار نبھایا جس میں سے سات فلمیں ہیمر پروڈکشن کمپنی کی تھیں۔ ہیمر کمپنی کے ساتھ لی کا اشتراک بہت کامیاب رہا ڈریکولا کے علاوہ انہوں نے ہیمر کی دیگر فلموں میں بھی کام کیا مثلاً شرلاک ہومز کا مشہور زمانہ کردار بھی پورٹرے کیا مگر کیا کیا جائے کہ کرسٹوفر لی کی ڈریکولا کی حیثیت سے جو پہچان بن گئی تھی ان کے تمام کیریر پر حاوی ہو گئی انہوں نے جیمز بانڈ سیریز کی مووی میں بھی ولن کے عمدہ رولز پلے کیے مگر ڈریکولا کے دہشت انگیز سائے سے وہ اپنا پیچھا نہیں چھڑا سکے چنانچہ تقریباً 250 فلمیں کرنے والے کرسٹوفر لی کو اگر آج بھی دنیا بھر میں پہچانا جاتا ہے تو صرف اور صرف ان کے ڈریکولا والے کردار کی وجہ سے حالانکہ یہ کردار انہوں نے محض دس فلموں میں

کیا
خدا نے آپ کو
حسن کی
دولت
سے نوازا ہے؟
کیا آپ کو
لباس
پہننے کا سلیقہ آتا ہے؟
تو پھر آپ
کراچی
ماہنامہ
سچی کہانیاں
کے سرورق کی زینت کیوں نہ بنیں؟؟
آج ہی ہمارے فوٹو گرافر سے رابطہ قائم کیجیے۔
021-35893121-22
C II-88 خیابان جامی فیز 7۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، کراچی

کیے مگر اس کی چھاپ پورے کیریر پر نظر آتی ہے۔ اس بات کا دکھ مسٹر لی کو آخری دم تک رہا کہ دنیا میں ان کی پہچان ایک دہشت کی علامت کے طور پر بنی اور لوگوں نے ان کے وہ کیریکٹرز فراموش کر دیے جو ڈریکولا سے ہٹ کر تھے لیکن ساتھ ہی وہ اس بات پر نازاں رہے کہ ایک تصوراتی کردار کو انہوں نے اس طرح اسکرین پر زندہ و جاوید کیا کہ یورپ کے لوگ آج بھی ڈریکولا کو ایک حقیقت مانتے ہیں۔ ہالی ووڈ میں ڈریکولا پر آج بھی فلمیں بن رہی ہیں مگر جو مقبولیت کرسٹوفر لی کے حصے میں آئی وہ کسی اور کو نصیب نہیں ہو سکی۔ دہشت اور اسرار کی دنیا کے حوالے سے جب بھی ذکر ہوگا تو وہ کرسٹوفر لی کے ذکر کے بنا ادھورا رہے گا۔

جناح کا زندہ کردار

بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح پر بائیوپک جناح پلان کی گئی تو اس تاریخی کیریکٹر کے لیے ایکٹر کی تلاش شروع ہوئی جو کرسٹوفر لی پر جا کر ختم ہوئی چنانچہ انہیں اس بڑے کردار کے لیے کاسٹ کر لیا گیا گو کہ اس پر تنقید ہوئی کہ ڈریکولا سے شہرت پانے والے ایک ایکٹر کو مسٹر جناح کا رول دے دیا گیا مگر جب یہ فلم منظر عام پر آئی تو تنقید کرنے والوں کی زبانیں بند ہو گئیں کہ مسٹر کرسٹوفر لی نے مسٹر جناح کے زندہ کردار میں ایسے رنگ بھرے تھے کہ یوں لگتا تھا جیسے سکرین پر جناح صاحب بنفس نفیس موجود ہوں اس کردار کو پورٹرے کرنے کے بارے میں مسٹر لی کا کہنا ہے کہ وہ جناح کو اپنے پورے کیریر کا بہترین کردار مانتے ہیں کیونکہ اس زندہ کیریکٹر کی خاطر مسٹر لی نے جان توڑ محنت کی قائداعظم کے چلنے پھرنے بات کرنے تقریر کرنے حتیٰ کہ کھانسنے تک کے انداز کو ہو بہو ادا کرنے کے لیے بھرپور محنت کی یوں مہینوں کی کوششوں کے بعد وہ اس کردار میں خود کو ڈھالنے میں کامیاب ہوئے۔ بقول کرسٹوفر لی مسٹر جناح کا کردار ان کے لیے کسی بھی طرح بڑے چیلنج سے کم نہیں تھا اور وہ اس حوالے سے خود پر بھاری ذمہ داری محسوس کر رہے تھے۔

اس فلم کی شوٹنگ کے دوران کئی ایسے مرحلے بھی آئے کہ یہ بڑا اسٹار جذباتی ہو گیا جیسے کہ ایک سین میں جب مسٹر جناح بھارت سے آنے والے مہاجرین کے قافلے کو دیکھتے ہیں اور اس میں انہیں ایک بچی بھی نظر آئی ہے جو بیل گاڑی پر بیٹھی ہے اور اس کی ماں ہجرت کے دوران بلوائیوں کا نشانہ بن گئی ہے تو یہ سین فلمبند کراتے ہوئے مسٹر لی حقیقتاً رو پڑے تھے اور جو آنسو اسکرین پر نظر آئے وہ اصلی تھے۔ اس فلم کو کرنے سے انہیں اندازہ ہوا کہ پاکستان بنتے وقت اس خطے کے مسلمانوں کو کیسی کیسی تکلیفات اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی لیے تو مسٹر لی مسٹر جناح کو اپنے کیریر کی بیسٹ پرفارمنس کہتے ہیں۔

زبردست سنگر بھی:

بھاری آواز رکھنے والے مسٹر لی کے حوالے سے یہ بات بھی بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ وہ ایکٹنگ کے ساتھ ساتھ سنگنگ میں بھی خوب ماہر تھے اور کئی فلموں میں ان کی آواز میں گانے ریکارڈ کیے گئے جو کہ میوزک کے متوالوں کے معیار پر ایک دم کھرے اترے۔ ان کی سنگنگ میں مہارت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ انہیں ایک میوزک البم پر ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ انہیں کئی نامی گرامی سنگرز کے ساتھ آواز سے آواز ملانے کا اعزاز بھی حاصل ہے یعنی وہ گلوکاری میں اپنی مثال آپ تھے۔ کئی البمز کے علاوہ ان کے کریڈٹ پر سنگل گانے بھی ہیں مگر پھر وہی بات کہ ڈریکولا کی چھاپ میں ان کی یہ خوبی بھی کہیں گم ہو گئی اور بہت کم لوگوں کو علم ہے کہ گلوکاری کے میدان میں بھی کرسٹوفر لی نے اپنی صلاحیتوں کا زبردست اظہار کیا ہے۔

ازدواجی زندگی

برٹش یا ہالی ووڈ فلم اسٹارز کی ذاتی زندگی عموماً رنگینیوں سے عبارت ہوتی ہے ان اسٹارز کی زندگی میں چار چھ معاشقے اور دو چار شادیاں تو لازمی نظر آتی ہیں لیکن کرسٹوفر لی کی زندگی اس معاملے میں دوسروں سے قطعی مختلف ہے اس اسٹار کی لاء میں ڈھیروں ڈھیر معاشقے کھائی نہیں دیتے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اس معاملے میں وہ کتنے سنجیدہ انسان تھے ان کی زندگی

میں صرف دو خواتین آئیں جس میں سے پہلی خاتون ہنرٹی روزن تھی جس سے ان کی ملاقات پچاس کے عشرے کے اوائل میں اسٹاک ہوم کے ایک نائٹ کلب میں ہوئی تھی اس حسینہ کو دیکھتے ہی مسٹر لی دل ہار بیٹھے اور یوں یہ دونوں منگنی کے بندھن میں بندھ گئے تاہم ہنریٹی کے باپ کی وجہ سے ان کی شادی تاخیر کا شکار ہوتی چلی گئی کہ لی کے سسر نے انہیں داماد کا درجہ دینے سے پہلے اچھی طرح لی کی چھان بین کرنا چاہی تھی اس سلسلے میں اس نے اپنے ایک دوست کو یہ ذمے داری سونپی کہ وہ لی کا سخت انٹرویو کرے تاکہ اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جانکاری مل سکے یہی نہیں لی کی تحقیق کے لیے پرائیویٹ جاسوسوں کی خدمات بھی حاصل کیں اور جب سسر پوری طرح مطمئن ہوگیا تو اس شادی کے لیے راضی ہوا لیکن شادی سے کچھ دن پہلے لی نے یہ منگنی توڑنے کا حیران کن فیصلہ کیا اس حوالے سے اس نے یہ وجہ بتائی کہ وہ ایک ایکٹر ہے اور اداکار کی معاشی حالت ہمیشہ غیر محفوظ ہوتی ہے اس صورت میں شاید وہ ہنریٹی روزن کو وہ خوشیاں نہ دے پائے جس کی وہ حقدار ہے لہٰذا اسے اس سے بہتر شخص مل سکتا ہے۔ اس کی منگیتر کو یہ بات سمجھ میں آ گئی اور یوں یہ شادی ہوتے ہوتے رہ گئی۔

1960 میں کرسٹوفر لی کی ملاقات برگٹ نامی خاتون سے ہوئی وہ ماڈل رہ چکی تھی اس ملاقات میں کیوپڈ کا تیر چل گیا اور پھر چٹ منگنی پٹ بیاہ کے مصداق سال بھر کے اندر اندر دونوں رشتہ ازدواج کے بندھن میں بندھ گئے۔ 17 مارچ 196 کو یہ دونوں ایک ہوئے۔ اس شادی کے نتیجے میں لی کی ایک بیٹی کرسٹینا ارکا ہوئی یہ شادی شدہ تعلق اس وقت ٹوٹا جب لی اس دنیا سے رخصت ہوئے۔

2013 میں گارجین جیسے جریدے نے پچاس خوش لباس معمر افراد کی فہرست شائع کی تو اس میں لی اور برگٹ کی جوڑی بھی شامل تھی۔

ایک عہد ہوا تمام

اس جہان فانی میں کسے دوام ہے سب کچھ فنا ہوجانا ہے اور باقی رہ جانے والی وہ پاک ذات۔

زندگی کی 93 بہاریں دیکھنے والے کرسٹوفر لی نے ایک بھرپور زندگی کو انجوائے کیا اور آخر 7 جون 2015 کو دل کے دغا دینے کے باعث وہ زندگی کی بازی ہار گئے یوں فلم نگری کے اس عظیم ستارے کے عہد کا اختتام ہوا جس نے ایک دہشتناک تصوراتی کیریکٹر کو پردۂ سیمیں پر ادا کر کے اسے گویا حقیقت کا روپ دیا۔ مسٹر لی کی وفات کی خبر چار دن بعد عام افراد تک پہنچائی گئی کیونکہ پہلے فیملی ممبرز کو آگاہ کرنا ضروری تھا جو دور دراز علاقوں میں رہتے تھے

حرف آخر

ڈریکولا کے کلاسک کیریکٹر سے شہرہ آفاق مقبولیت حاصل کرنے والے کرسٹوفر لی کی اس مختصر سی سوانح حیات میں بہت کچھ شامل نہیں کیا جاسکتا تو وجہ صفحات کی کمی تھی تاہم اس زندہ کہانی میں کوشش کی گئی ہے کہ اس عظیم فنکار کی زندگی کا خلاصہ اس طرح پیش کیا جائے کہ پڑھنے والوں کو اس ڈریکولا نیم اسٹار کے متعلق خاص خاص باتیں معلوم ہوجائیں۔ کرسٹوفر لی نے 93 سالہ زندگی بہت ہی بھرپور انداز میں گزاری، فوج میں رہے، ایئر فورس میں پائیلٹ بنے۔ دوسری جنگ عظیم میں حصہ لیا اور موت سے کئی بار آمنا سامنا ہوا فلم ورلڈ میں 250 کے قریب فلمیں کیں جن میں ایکشن رومینس، تھرل اور سسپنس ہر قسم کی فلمیں شامل ہیں سنگر کی حیثیت سے بھی اپنی مہارت کا خوب مظاہرہ کیا کئی میوزک البمز اور سنگل گیت ان کے کریڈٹ پر ہیں ان کی سماجی لائف بھی خاصی بھرپور رہی لیکن ان سب کے باوجود وہ دنیا بھر میں ڈریکولا کے حوالے سے جانے جاتے ہیں یعنی اس تصوراتی کردار کا سایہ ان کے تمام اچھے کاموں پر ایسا چھایا کہ کرسٹوفر لی کے ذکر پر لوگوں کو اور کچھ یاد ہی نہیں رہتا سوائے ایک خون آشام انسان نما مخلوق کے جسے ڈریکولا کہتے ہیں۔

یہ بات اپنی جگہ کسی المیے سے کم نہیں کہ ہمہ جہت صلاحیتوں کا مالک ایک باکمال انسان محض دس ڈریکولا موویز کی بنیاد پر دہشت کی علامت بن گیا۔

☆☆.....☆☆

دنیا کی مختلف زبانوں سے ترجمہ کی گئی کہانیاں

وہ بلائے جان

FRANCIS GARFILED

نجیب عمر

سورج غروب ہو چکا تھا۔ دھندلکا پھیلنا شروع ہوا۔ مغرب کے سمت آسمانوں پر آخری شفق کی لالی دیکھی جا سکتی تھی لیکن یہ گداز روشنی اس آراستہ کمرے میں داخل نہیں ہو رہی تھی۔

کلاڈیا اپنے چیسٹ بورڈ کی جانب جھکی۔ اس کے لہراتے بالوں نے جسے وہ بار بار برش کیے جارہی تھی، اس کے چہرے پر ایک شامیانہ تان دیا تھا۔ برش کرنے کا یہ عمل اسے طمانیت اور سرور سے دوچار کررہا تھا۔ اس کے بال آئل لیمپ کی روشنی میں چمک رہے تھے۔

کمرے کے دوسری جانب گارلینڈ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے چھوٹے اور بھورے بالوں کو جلدی جلدی کنگھی کرکے سمیٹ کر گھنگریالے بالوں کے شیطانی گچھے سر پر سجالیے۔ شکر ہے کلاڈیا مجھے تمہاری طرح طویل بالوں کو سنوارنے کی مشقت نہ اٹھانی پڑی۔

''تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔'' کلاڈیا نے قہقہہ لگاتے جواب دیا ''ہم دونوں مقابل پر اس کے اثر سے واقف ہیں۔''

دونوں نے ہلکا پھلکا میک اپ کیا۔ کلاڈیا نے اپنی روپالی آنکھوں پر گہرا نیلا مسکارا لگایا جبکہ گارلینڈ نے اپنی زرد پلکوں پر براؤن۔ ہر ایک نے اپنے ہونٹوں کو سرخی مائل گلابی لپ اسٹک سے آراستہ کیا۔ ہونٹوں کو سکوڑ کر اور پھر مسکرا کر اسے ہموار کیا۔

لباس زیب تن کرنے کے بعد تنگ سیڑھیاں اتر کے نیچے بڑے پارلر میں آئیں۔ آہستہ آہستہ لیکن نہایت خاموشی سے۔ اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ انہوں نے تیل کا جگ اٹھا کر چاروں طرف گھوم گھوم کر قدیم گول شیشوں سے مزین لیمپ میں تیل ڈال کر انہیں روشن کیا۔ زرد روشنی نے میز سے دیوار تک لکڑی کے چوڑے فرش کو چمکا دیا۔ کلاڈیا نے گھنٹوں ان قدیم لیمپوں کو گھٹنوں کے بل جھک کر گھس گھس کر چمکایا تھا۔ اپنی اس ترتیب پر فخر محسوس کررہی تھی۔ گارلینڈ نے ایک پیالہ رنگین پھولوں سے بھر کر مہاگنی کے میز پر سجادیا جو ایک مزین صوفے کی پشت سے لگا ہوا تھا۔ اس نے دو خوشبودار موم بتیاں ہولڈر میں رکھ کر اسے روشن کردیا جس سے پارلر کی فضا خوابناک اور رومان پرور ہورہی تھی۔

وہ پھر اکٹھے کھڑی ہوئیں اور نرم نرم روشنی کا اثر دیکھنے لگیں۔ کلاڈیا سرخ ساٹن جبکہ گارلینڈ گہرے شوخ نیلے رنگ میں غضب ڈھارہی تھی۔ انہوں نے ایک دوسرے کو تنقیدی نگاہوں سے دیکھا اور کسی قسم کے نقص سے مبرا پایا۔

''میں اپنے مخصوص راستے پر جانے کے لیے باہر نکلنا پسند کروں گی۔'' گارلینڈ نے بتایا۔ اس نے اپنی اونچی ایڑی والے سینڈل کو نظریں جھکا کر دیکھا اور کہا ''یہ زیادہ اونچے نہیں ہیں اور میں جلد لوٹ آؤں گی۔''

''باہر دیکھنے کے لیے زیادہ کچھ نہیں ہے۔'' کلاڈیا نے اضافہ کیا۔ ''اب یہاں چہل قدمی کے لیے زیادہ لوگ نہیں آتے۔ ایک عرصہ ہوا ہم اکٹھے نکلا کرتے تھے۔''

''میں غالباً جذباتی ہورہی ہوں۔'' گارلینڈ نے مسکرا کر کہا ''اس کی آنکھیں کسی خفیہ خوشی سے ایک لمحے کو چمکیں۔'' یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میں کسی کو اپنے ساتھ لے آؤں۔''

''میں یہاں انتظار کروں گی۔ ممکن ہے کسی کی کال آجائے۔'' کلاڈیا نے اسے یقین دلایا۔

لکڑی کا بڑا بیرونی دروازہ چرچرایا اور گارلینڈ کی پشت پر بند ہوگیا۔

وہ سلیٹی پورچ سے گزر کر تیزی سے سیڑھیاں اترتے قدیم سنگلاخ سڑک تک آگئی۔ نیلے پھولوں کی بیل سے آراستہ یہ راستہ جو جگہ جگہ اگ آئی تھیں۔ علاوہ اس کے انگور اور زرد گلابی پھولوں کی بیلوں نے درختوں کو گھیرا ہوا تھا۔ شاہ بلوط کے خزاں رسیدہ پتے جھڑ رہے تھے۔ ایک پرانا سفید و گلابی پھولوں کا درخت لان کے کناروں کو ڈھانپے ہوئے تھا۔ گارلینڈ احتیاط سے اپنا راستہ بناتے آگے بڑھ گئی۔

دور کسی اُلو نے اپنا پیغام نشر کیا۔ گارلینڈ خود پر مسکراتی موسم گرما کی اس شام کے لیے اس نے کوئی کھلا لباس نہیں پہنا تھا لیکن ریشمی لباس کے گداز کالر نے اس کی گردن کو پوری طرح سے گھیرا ہوا تھا اور وہ لباس کے قربت کے احساس سے لطف اندوز ہورہی تھی۔ اس نے رات کی مشکبار فضاؤں میں ایک گہرا

سانس لیا۔

درختوں سے گرتے پتے، بارش کے قطروں کی مانند آواز پیدا کررہے تھے۔ گرچہ آسمان میں تھوڑے سے آوارہ بادل بھی تھے۔ پرانی سڑک کے انتہائی سرے اور سڑک کے ساتھ ساتھ مکانوں پر چند روزہ ہلال چمک رہا تھا۔ یہ وکٹورین طرز کے مکان کہلاتے ہیں جو ویران تھے اور بھوت بنگلہ جیسا منظر پیش کررہے تھے۔ کسی بھی کھڑکی سے روشنی نہیں آرہی تھی۔ گارلینڈ واحد متحرک مخلوق اس ماحول میں نظر آرہی تھی۔ کسی زمانے میں پرانے شہر کے کنارے آباد ایک شاندار علاقہ ہوا کرتا تھا اور اس کی ساری رونقیں الرٹی کالج کی وجہ سے تھیں۔ لیکن اب لوگ یہاں سے چلے گئے اور بربادی نے ڈیرے جمالیے۔ شہری آبادی کی مسلسل توسیع نے اطراف کے علاقوں کو گم کرنا شروع کردیا تھا۔

اچانک گارلینڈ کی سماعت جاگ اٹھی۔ آوازیں بہت دھیمی اور پست اس نے دو اونچے قد کے نوجوانوں کو اپنی طرف آتے دیکھا چاند کی مدھم روشنی میں ان کا سراپا ابھرا وہ حسین تھے اور جامہ زیب بھی۔ بندھے ہوئے جسم کے ورزشی کھلاڑی معلوم ہوتے تھے۔ اس نے ان میں اپنے لیے کوئی کشش نہیں دیکھی لیکن اسے اپنے جسم میں جذبات کی لہر اٹھتی ہوئی محسوس ہوئی۔

وہ لوگ قریب آچکے تھے۔ اب وہ انہیں سن سکتی تھی۔

ایک کم سن آواز نے اعلان کیا ''میرے چچا Whit یہاں آیا کرتے تھے جب وہ کالج میں تھے۔'' اس نے یہ بھی بتایا۔ ''یہ علاقہ گلابی پہاڑی Pink Hill کہلاتا ہے۔ یہاں تمہاری خوب آؤ بھگت ہوگی۔''

ان سے آگے بڑھ کر اچانک وہ واپس مڑی اور گھر کی جانب لپکی۔ اس نے اپنے قدم تیز کرلیے۔ ایک لمحے کو اس نے سوچا اسے خوش ہونا چاہیے یا غم گزیدہ۔

اگرچہ اس نے اپنی قوت لمس نہیں آزمائی تھی لیکن وہ اپنے متناسب جسم اور اس کی کشش سے واقف تھی۔ جب وہ دوبارہ ان کے سامنے سے گزری تو ان کے لیے کلمات تحسین ادا کیے۔

ان میں لمبے، سیاہ داڑھی والے نے شرماتے ہوئے جواب دیا۔

''خوبصورت شام، میں نے صحیح کہا؟''

گارلینڈ مسکرائی، کاش اس کے ڈمپل ہوتے تو وہ انہیں روشن کرلیتی۔

''جی ہاں ہوا میں خنکی ہے۔ مجھے اب گھر واپس جانا چاہیے تاکہ میں گرم چاکلیٹ یا کافی تیار کرسکوں۔'' اس نے جلدی جلدی جواب دیا

وہ ان سے دور ہوتے ہوئے آگے نکل آئی۔ ایسا لگا جیسے وہ اطمینان سے گارلینڈ کے پیچھے ہولیے۔ داڑھی والا کچھ کہہ رہا تھا۔ دوشیزہ نے اپنے کان اس کی آواز پر لگادیے۔

وہ کہہ رہا تھا ''بہرحال ہم اس تجربے کے قریب ہیں جس کی ہمیں تلاش تھی۔''

دوسرا سادے بالوں والا، ورزشی کھلاڑی نے کچھ بہت مدھم اور ملائم لہجے میں کچھ بولا جسے گارلینڈ سن نہیں سکی لیکن اس نے محسوس کیا دونوں متفق تھے۔

ہموار، پتھریلے فرش پر اپنے قدموں پر نگاہیں جمائے وہ آگے بڑھتی گئی۔ پرانے فرش پر بیشمار دراڑیں تھیں۔ اسے یقین ہوگیا کہ وہ دونوں اس کے پیچھے آرہے ہیں۔ اس نے دوبارہ اپنے جسم میں گرم جوشی کی لہر محسوس کی اور خود کو دوبارہ کم سن محسوس کیا۔ اتنی کم سن جتنا وہ دکھائی دینا چاہتی تھی۔

اب وہ گھر کے لان میں، سیڑھیوں پر اور دروازے میں مٹکتے ہوئے داخل ہوئی۔

اس نے آواز لگائی ''کلاڈیا ہمیں ساتھی مل گئے۔''

کلاڈیا نے گھر کی ترتیب پر ایک تحسین آمیز نگاہ دوڑائی اور مسکرائی۔ ایک سرد مسکراہٹ اور تیزی سے پکاری ''مجھے بتاؤ۔''

دو واقعی حسین نوجوان میرے پیچھے چلے آرہے ہیں ایک چمکتے بالوں والا فٹبال کے کھلاڑیوں جیسا کسرتی جسم کا مالک۔ دوسرا اونچے قد، داڑھی والا نفیس حلیے میں، ہمیں ان کی خاطر کرنا ہوگی۔''

''بالکل صحیح، شراب کی ایک بوتل میز پر ہے، میرے بنائے ہوئے پنیر کے بسکٹ، کلاڈیا نے لیمپ کی روشنی میں میز کا جائزہ لیا۔

''ہم ان کی توقع سے زیادہ خاطر کریں گے۔''

باہر پورچ پر آتے قدموں کی چاپ سنائی دی اور ہچکچاتی سرگوشی۔

''وہ بہت ہینڈسم ہیں۔'' گارلینڈ نے ریمارکس دیا۔

ایک لمحے کی خاموشی پھر محتاط لیکن متواتر کھٹکھٹاہٹ دروازے پر، گارلینڈ نے اندازہ کیا چچا Whit کے تربیت یافتہ مہذب نوجوان۔

''او۔کے، اب چلو'' کلاڈیا نے گارلینڈ پر فاتحانہ تاثر اچھالا اور کہا۔

''ملاقات کے اصولوں کو نہیں بھولنا چاہیے۔''

وہ تیزی سے دروازے پر بڑھی۔ اس کا لباس طویل تھا، فرش کو چومتا ہوا۔ متناسب جسم کے نشیب و فراز اور دائروں کو نمایاں کرتا۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنے ظاہرہ پر مغرور اور حسن کے ترجیح کا اعلیٰ معیار بھی قائم کیے ہوئے۔

اس نے دروازہ کھولا۔ لیمپ کی روشنی نے دو نوں جوانوں کے بشرے کو منور کیا۔

گارلینڈ نے نہایت مناسب طریقے سے ان کا استقبال کیا جو وہ عمدہ تراش کے سوٹ اور کھلے گریبانوں کے قمیض میں ملبوس تھے۔

اونچے قد والے نوجوان کی چھوٹی سی چپکی ہوئی داڑھی تھی جو اس کے وقار اور ذہانت میں اضافہ کر رہی تھی۔ دوسرا مناسب قد لیکن چوڑے شانے اور گٹھے ہوئے کسرتی جسم کا مالک۔

وہ بلاشک الربی کالج کے ابتدائی سالوں کے طالب علم تھے۔ مستقبل کی امیدوں سے دونوں سرشار۔

''حضرات! شام بخیر۔''

کلاڈیا نے مہمان نوازی کے جذبے سے مملو مسکراہٹ پیش کی۔

''مادام! شام بخیر۔'' گہرے رنگ والے نے ایک نمائندے کی حیثیت سے جواب دیا۔

کلاڈیا نے سوچا یہ گارلینڈ کے حصے میں آئے گا اور اس کے لیے وہ مضبوط جسم والا۔

''جی'' اونچے قد والے نے بولنے کی کوشش کی ''ہم نے سوچا'' پھر اس نے گھبرا کر خاموشی اختیار کر لی۔

''ہم چہل قدمی کرتے ہوئے ادھر نکل آئے تھے۔'' دوسرے نے کہا۔

''میں گائی ہوں اور یہ لاری' ہم دونوں طالب علم ہیں۔''

لاری نے اضافہ کیا ''ہم الربی میں نو آمدید ہیں۔''

''میں سمجھی'' کلاڈیا نے انہیں سہارا دیا ''کیا آپ لوگ اندر تشریف نہیں لائیں گے۔''

''جی مادام'' گائی نے احسان مندی سے جواب دیا۔

دونوں اکٹھے اندر داخل ہوئے اور ساتھ ساتھ کھڑے ہو گئے ان کی مسکراہٹ میں اعتماد کی کمی تھی۔

کلاڈیا نے ان کی پشت پر دروازہ بند کر دیا۔

لاری نے متجسس نگاہوں سے پارلر کا جائزہ لینا شروع کیا۔

''یہ ایک عمدہ جگہ ہے۔'' اس نے ستائش کی ''اور شاندار ماضی سے جڑا ہوا ہے۔''

''شکریہ!'' گارلینڈ نے مسکرا کر جواب دیا۔

''آیئے یہاں تشریف رکھیں۔ اگرچہ آپ لوگوں کے لیے یہ صوفہ زیادہ موزوں نہیں۔''

وہ جھجکا لیکن صرف ایک لمحے کے لیے اور پھر صوفے کی طرف بڑھا۔

اس نے خوبصورت چمکیلا سوٹ پہنا ہوا تھا۔

وہ اور گارلینڈ دونوں ساتھ ساتھ بیٹھ گئے اور کلاڈیا نے گائی کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا۔

''مجھے تم کچھ جانے پہچانے لگتے ہو۔'' اس نے اپنی نقرئی آنکھیں اس پر جماتے ہوئے کہا۔

''وہ اسٹیٹ میں فٹ بال کھیلا کرتا ہے۔ یہاں ملاقات کے لیے آیا ہوا ہے۔''

''ہوسکتا ہے تمام فٹبالر ایک جیسے لگتے ہوں۔'' گائی جواباً مسکرایا۔ ''میں الربی فٹ بال کھیلنے ہی آیا ہوں' میں یہاں کچھ کر دکھانا چاہتا ہوں' اگر کرسکا۔''

صوفے میں لاری کے ساتھ گارلینڈ نے اپنی شخصیت کا ایک نیا رنگ پیش کیا، جیسے ایک بٹن دبا کر سب کچھ آزاد کر دیا ہو۔

''اس شراب سے کیا میں تمہارے لیے ایک گلاس تیار کروں۔''

اس سے پہلے کہ لاری جواب دیتا، اس نے کہا ''یہ بہت عمدہ ہے' لاؤ میں خود ہی نکال دیتی ہوں۔'' اس نے بوتل اٹھائی اور گلاس میں انڈیلنا شروع کیا۔ اس کے ہاتھوں میں خفیف سی جنبش تھی۔ پھر اس نے گلاس اس کی جانب بڑھا دیا۔

لاری چسکی لے کر بولا ''بہت لذیذ۔''

''جی ہاں، ہمارے دوستوں کے لیے ایک خاص چیز۔''

''ہم یقیناً اس کی ستائش کریں گے' مادام'' اس نے کہا اور دوبارہ چسکیاں لینے لگا۔

''تم مجھے گارلینڈ کہہ سکتے ہو۔''

کلاڈیا نے گائی کو ایک نہایت آرام دہ، بازو والی کرسی پر بٹھا دیا تھا اور خود اس کے بازو پر ٹک گئی۔ پھر ان کے درمیان سرگوشی اور مدھم ہنسی کا تبادلہ ہونے لگا۔

''لاری'' گارلینڈ نے کہا ''مجھے لگتا ہے تم اکثر ادھر آتے رہے ہو۔''

''میرا حلیہ دھوکا دینے والا ہے۔'' بھوری آنکھیں اس پر جماتے ہوئے بولا۔

''میں آج سے قبل ایسی خوبصورت جگہ پر کبھی نہیں پایا گیا۔''

گارلینڈ مزید اس کی جانب کھسک آئی ''اپنے بارے میں مجھے بتاؤ۔''

''او، میں الربی میں نو آمد ہوں۔ میرے متعلق جاننے کے لیے کچھ خاص نہیں ہے۔''

''نہیں کچھ تو ہوگا۔'' وہ مزید قریب آ گئی ''کالج کیمپس میں ہونا ہی سنسنی خیز ہے، چلو چلو مجھے مزید بتاؤ۔''

اس نے ایک ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ لاری نے اس کے نازک ہاتھ کو دونوں ہاتھوں میں گرمجوشی سے دبایا۔

''دیکھیں، نیا سال قدرے غیر متوازن ہوتا ہے۔'' اسے بات کرنے میں مشکل ہو رہی تھی۔ اس نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ ''الربی میں کچھ بھی مبہم نہیں ہے۔ کچھ زیادہ نہیں لیکن دوسرے سال میں جانے سے قبل تھوڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔''

گارلینڈ نے اپنے نازک بازو کو اس کے کاندھے پر سے گزارتے اس کی انگلیوں کو ہلکی سی تھپک کے ساتھ گننا شروع کر دیا۔

کمرے کے دوسرے سرے پر کلاڈیا، گائی کے ساتھ تھی اور گائی کے کانوں کو کھینچ رہی تھی یعنی ان کے تعلقات معمول سے آگے بڑھ چکے تھے۔

''یہ واقعتاً بہت عمدہ مکان ہے۔'' لاری نے آہستہ سے کہا اور ہونٹ ترکرتے اضافہ کیا ''یہ نہایت حسین بھی ہے۔''

گارلینڈ کے ذہن میں دفعتاً خیال آیا کہ وہ ایک حسین اور پیاری لڑکی کی شکل میں ایک نہایت ہی قبیح عمل کے لیے آگے بڑھ رہی ہے۔ اپنی آسانی کے لیے اس نے اظہار نہیں کیا۔

اب اس نے دوبارہ ابتدا کی۔

اس نے سرگوشی کی ''تمہیں یہاں آنا اچھا لگا۔''

اسے یقیناً سمجھنا چاہیے کہ کیا ہونے والا ہے۔ لیکن وہ پوری طرح سے متوقع متضاد جذبات میں غرق ہو رہا تھا۔ کیا انکل Whit نے اسے یہ سب نہیں بتایا۔ کم از کم کچھ تو بتایا ہی ہوگا۔ اس نے چاروں طرف لیمپ سے روشن کمرے پر نظر دوڑائی۔ ماحول کسی حد تک مدھم آلود تھا۔ اس کی داڑھی لگی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔

''اچھا لاری!'' گارلینڈ نے کہا ''تم میرے ساتھ آؤ۔''

اس نے اٹھ کر اس کا ہاتھ تھاما۔ اسے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے میں مدد دی۔ وہ مسکرایا۔ اسے کلاڈیا اور گائی سے دور لے جانا چاہیے۔

وہ آرام کرسی میں مزے سے دھنسے ہوئے تھے۔ گارلینڈ نے ایک لیمپ اٹھایا اور ہال کی جانب رہنمائی کی۔

''بہت خوب!'' یہ گول گھومتی سیڑھی جیسے کسی تاریخی فلم کا منظر ہو۔

''کیا واقعی؟''

سیڑھی گھومتی ہوئی اوپر اندھیرے میں گم ہو رہی تھی۔ گارلینڈ اسے اطمینان سے اوپر لیے جا رہی تھی۔ لاری اس کی رہنمائی کو انجوائے کر رہا تھا۔ وہ اسے ہانکتے، قالین کے ادھڑے ہوئے حصوں سے بچاتے اور سیڑھی کے ریلنگ کے پایوں سے دور رکھتے اوپر ہال تک لے آئی۔ اس نے لیمپ سنبھالا ہوا تھا جس کی روشنی میں قالین کے بدرنگ گلاب نظر آ رہے تھے۔

''یہاں.....'' اس نے کہا ''یہ رہا میرا کمرا۔''

اس نے بھاری دروازہ کھولا اور اسے اندر کی جانب دھکیلا۔ وہ ڈیوڑھی سے گزر کر اندر آ گئے۔ اس نے لیمپ کو باہر نکلی وکٹورین کھڑکی کے سامنے میز پر رکھ دیا۔

''میں قسم کھاتا ہوں' گارلینڈ' یہ نہایت شاندار ہے چار ستونوں والا بستر، بنچ، یہ قیمتی ہوگا کیونکہ یہ قدیم ہیں۔''

''مجھ سے زیادہ پرانے۔'' وہ مسکرائی۔

''تم قدیم نہیں گارلینڈ، تم حسن کا مرقع ہو۔''

''اور تم بھی۔'' اس نے نہایت دیانت داری سے جواب دیا۔

دونوں بستر پر بیٹھ گئے۔ اس پر گہرے نیلے رنگ کی مخمل کی چادر بچھی ہوئی تھی جس کے کنارے پر ہلکے طلائی رنگ کے مٹروں والے جھالر لگے ہوئے تھے۔ لاری پوری طرح سے مرعوب ہو چکا تھا۔

''میں بیان نہیں کر سکتا یہ سب کتنے پیارے ہیں۔'' اس نے لکنت آمیز لہجے میں کہا۔

''تو پھر کوشش بھی مت کرو۔ اب اپنی ٹانگیں اوپر بستر پر رکھ لو۔ یہ ٹھیک ہے، اب آرام کرو۔''

وہ پشت میں دھنس گیا۔ اس نے ڈھیلے ڈھالے کالر والے شرٹ کو مزید کھول لیا۔

''تمہاری گردن بھی خوبصورت ہے۔''

''ارے نہیں وہ گائی ہے جس نے مسلسل ورزش کر کے اور وزن اٹھا کر اپنا جسم بنایا ہے۔''

''اسے کلاڈیا کے لیے چھوڑ دو' تم میرے لیے ہو۔''

دروازے کے باہر کچھ مدھم کھڑکھڑاہٹ ہوئی، گارلینڈ نے کوئی توجہ نہیں دی۔

لاری اب خاموش ہو چکا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ گارلینڈ اس کی گردن پر جھکی۔ اس کی نرم اور ملائم انگلیاں اس کی کنپٹی اور گردن سہلانے لگیں۔ وہ ترتیب سے ایک ردھم میں سانس لے رہا تھا۔ جیسے وہ سو چکا ہو۔ گارلینڈ اس کے اور قریب ہو گئی۔ اس کے ہاتھ اس کی گردن پر۔ اس کی انگلیاں اینٹھ گئیں۔ اس نے ناخن گاڑ دیے۔

لیمپ کی روشنی میں اس کے سرخ ہونٹ چمک رہے تھے۔ وہ جدا ہوئے۔ اس کے دانت لمبے اور تیز دھار ہوتے گئے۔ وہ گنگنانے لگی۔ اس کا منہ اس کی گردن پر جا کر کھلا۔

دروازے کے باہر آوازیں مدھم لیکن غیر انسانی تھیں۔

گارلینڈ تیزی سے کھڑی ہوئی' دروازے تک گئی۔ اس نے ایک درز بھر کھولا۔

چند ہیولے باہر تھے، نوکیلے کرخت چہرے، چیتھڑوں میں ملبوس۔

''اچھا'' وہ زیرِ لب بولی۔ ''کیا تم انتظار نہیں کر سکتیں۔''

''مجھے اندر آنے دو'' ان میں سے ایک بولی۔ ان کی آنکھیں زرد لیکن چمک رہی تھیں ''ہم بھوکے ہیں۔ بھوکے ہیں۔''

''کیا تم انتظار نہیں کر سکتیں؟'' گارلینڈ نے دوبارہ پوچھا۔

''میں ختم کر لوں گی تو تم بچا کھچا حاصل کر سکتی ہو۔''

اس نے دروازہ بند کر لیا اور تیزی سے چلتی ہوئی وہاں پہنچی جہاں لاری منتظر تھا۔ بے حس و بے حرکت۔ خوابوں میں مصروف۔

☆☆.....☆☆

سینئر صحافی شاعر اور ملکوں ملکوں گھومے تجزیہ کار

محمود شام کی زیر ادارت

ماہنامہ

انتہاؤں میں رابطہ

اطراف

کراچی

جولائی 2014ء سے باقاعدگی سے شائع ہونے والا

بین الاقوامی معیار کا پہلا قومی میگزین

☆ ہمارا عزم یونیورسٹیوں، دینی مدارس، تحقیقی اداروں، تربیت گاہوں سے پھوٹنے والی روشنی عوام تک پہنچانا

☆ دنیا بھر میں پاکستان اور عالم اسلام پر شائع ہونے والی تازہ ترین کتابوں کی تلخیص

☆ پاکستان کے سیاستدانوں، تعلیمی اداروں، سرکاری محکموں کے بارے میں عالمی تحقیقاتی اداروں کی بے لاگ رپورٹیں، آسان اردو میں

☆ ملک میں سرگرم ایک لاکھ سے زیادہ این جی اوز کی سرگرمیوں سے سجا عوام نامہ

☆ مصوری ☆ سفارت کاری ☆ کتابیں ☆ کامیاب زندگی ☆ فن تعمیر ☆ تندرستی

☆ پاکستان کے اضلاع ☆ موسیقی ☆ بچے اور ہمارے بچے ☆ طنز و مزاح ☆ اردو ادب سے انتخاب

☆ نیوز ایجنٹس کو معقول کمیشن

لائبریریوں، یونیورسٹیوں، دینی مدارس کو خصوصی رعایت

جو کچھ آپ کے اطراف میں ہے..... ماہنامہ 'اطراف' میں ہے

نمونے کی مفت کاپی کے لیے خط لکھئے

سوئیٹ نمبر 508، لینڈ مارک پلازا، آئی آئی چندریگر روڈ۔ کراچی

Email: mahmoodshaam@gmail.com Web Site: www.atraafmagazine.com

Ph: 0092 21 32274661

Mob:0300-8210636

دنیا کی مختلف زبانوں سے ترجمہ کی گئی کہانیاں

دیویی کا انتقام

PROSPER MERIMEE

تشنہ بریلوی

کون نہیں جانتا کہ فرانس ایک بہت خوبصورت ملک ہے۔ انسانی حسن کے ساتھ قدرتی حسن بھی آپ کو چپے چپے پر نظر آئے گا۔ نیز فرانس کے باشندوں نے اپنے ملک کو مزید پرکشش بنانے کے

کرتے ہیں کہ اسے L A - Belltu France حسینۂ فرانس کا خطاب دے چکے ہیں۔

بحیرۂ روم کے کنارے فرانس کا جنوبی حصہ جہاں اسپین سے اس کی سرحد ملتی ہے "لانگ داک روسی یان (Languedoc Roussillon) کہلاتا ہے اور بہت پراسرار سمجھا جاتا ہے یہ وہی علاقہ ہے جہاں آٹھویں صدی میں عرب' بربر حملہ آوروں کو فرینکٹ سلطنت کے سربراہ شارل مارٹل نے شکست دے کر بقول مؤرخ گبن "Gibon" یورپ کو عیسائیت کے لیے محفوظ کرلیا تھا ورنہ پورے یورپ پر ان کا غلبہ ہوجاتا۔

میں اس علاقے کے ایک ممتاز رئیس موسیو ژاک (jaques Michaud) کی دعوت پر یہاں آیا تھا۔ پیشے کے اعتبار سے میں عمارت کار ہوں لیکن آثار قدیمہ' مجسمہ سازی' مصوری سمیت فنون لطیفہ کے تمام شعبوں سے گہری وابستگی رکھتا ہوں۔ موسیو ژاک میشو کے بارے میں سنا تھا کہ وہ بھی آثار قدیمہ اور آرٹ میں بہت دلچسپی لیتے ہیں لہذا میں ان سے ملنے کے لیے خاصا بے تاب تھا۔ میرے لیے ایک گائیڈ کا انتظام کیا گیا تھا تاکہ میں آسانی سے منزل تک پہنچ سکوں۔

اب ہم پہاڑی کا آخری ڈھلان طے کررہے تھے اور ایل "L" کا خوبصورت قصبہ ایک رنگین تصویر کی طرح میری نگاہوں کے سامنے پھیلا ہوا تھا۔ قصبہ کے سفید مکان کھیتوں کی ہریالی اور سرخ پھولوں کی جھاڑیوں کے درمیان نہایت دلکش نظر آرہے تھے۔ سارے قصبے پر ایک معصوم سی فضا چھائی ہوئی تھی اور ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے میں دنیاوی جنت کی سیر کررہا ہوں۔

قصبے میں داخل ہوکر گائیڈ مجھے پر پیچ گلیوں میں لے کے آگے بڑھتا جارہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا "کیا تم موسیو ژاک میشو کے مکان پر پہلے بھی آچکے ہو۔"

"درجنوں بار آچکا ہوں۔"

"بہت اچھے' شریف انسان ہیں' ہاتھ کے کھلے ان کی بیوی مادام میشو بھی بہت مہربان خاتون ہیں۔ ان کا ایک بیٹا بھی ہے۔" یہ کہہ کر گائیڈ کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔

"تم ہنس کیوں رہے ہو؟"

"شاید اسی کی شادی کی تقریب میں آپ کو بلایا گیا ہے۔ موسیو الفانسے ایک ایسی لڑکی سے شادی کررہا ہے جس سے اسے بالکل محبت نہیں ہے۔"

س "تو کیا اس کے والدین شادی کے لیے زور دے رہے ہیں؟"

"نہیں جناب! وہ خود شادی کے لیے بے تاب ہے' مدھوا زیل پیو گیرگ کی ماں ایک بہت بڑی جائیداد اور نقدی چھوڑ کر مری ہے جو اب بیٹی کی ملکیت ہے۔"

"اوہ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ صاحبزادے دولت کے پجاری ہیں۔"

گائیڈ ایک منٹ خاموش رہا پھر بولا "موسیو آپ شادی کی تقریب میں شرکت کرنے آئے ہیں یا وہ مورتی دیکھنے؟"

"مورتی؟" میں نے حیرت سے کہا "مجھے تو کسی مورتی کا علم نہیں۔ یہ کیا قصہ ہے؟"

گائیڈ نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

"اب سے پندرہ روز قبل محترم میشو نے مجھے اور میرے ایک ساتھی کال کو ایک درخت کھودنے کے لیے اپنے محل میں بلایا تھا سخت سردی پڑ رہی تھی۔ اور ہم دونوں مستعدی کے ساتھ درخت کی جڑ کھود رہے تھے اور دل میں سوچ رہے تھے کہ اسے بڈھے قباکی کو درخت کھدوانے کی کیا ضرورت پڑ گئی، کیا وہ اپنی قبر کے لئے یہ جگہ پسند کرتا ہے۔

میرے دوست کی کدال کھودتے کھودتے کسی ایسی چیز پر پڑی کہ فضا میں ایک جھنکار کی آواز بلند ہوئی، ہم دونوں بہت حیران ہوئے اور گڑھے میں جھانک کر دیکھا..... ایک ہاتھ باہر نکلا ہوا تھا۔ یہ ہاتھ کسی ایسی ہستی کا معلوم ہوتا تھا جس کا اس دنیا سے

نہیں بلکہ دوزخ سے تعلق ہو۔ میں بھاگا بھاگا بڈھے کے پاس گیا اور اسے یہ واقعہ سنایا۔ بڈھا بھی دوڑا دوڑا آیا اور اس نے اب اپنی نگرانی میں پھر گڑھا کھدوانا شروع کیا۔

یہ ایک انتہائی خوبصورت دوشیزہ کا نیم عریاں مجسمہ تھا، میشو صاحب نے بتایا کہ یہ شارلمان کے زمانہ کی ''وینس'' ہے اور انتہائی مقدس ہے''۔

''یہ قصہ سنا کر گائڈ نے میری طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھا لیکن مجھے خاموش پا کر اس بات کو میری نظر میں اہم بنانے کے لئے پھر بولا'' ویسے تو ہم قبائلی اہل فرانس کے سامنے حقیر کیڑے ہیں مگر جناب میں مودبانہ عرض کروں گا کہ ایسا بت فرانس کو بھی نصیب نہ ہوا ہوگا''۔

میں نے صرف مسکرانے پر اکتفا کی لیکن گائڈ نے اپنے ترکش سے ایک اور تیر نکالا۔ ''اور معزز سیاح! یہ بت ہر اس شخص سے انتقام لیتا ہے جو اس کا ادب نہیں کرتا۔ میرے ساتھی کا کدال اس کے جسم سے ٹکرایا تھا جب وہ گھر پہنچا تو اس نے اپنے پاؤں میں بے حد درد محسوس کیا اور ڈاکٹر نے بتایا کہ اب وہ اس ٹانگ سے کبھی بھی چل نہیں سکتا۔ معزز سیاح کیا آپ کو یقین نہیں آیا؟ یہ وینس کا مجسمہ ضرور اس قصبہ میں کوئی انوکھا اور دہشت ناک واقعہ کھڑا کرے گا۔

موسیو میشو کا شاندار محل..... سترھویں صدی کی معماری کا شاہکار میرے سامنے تھا۔ میں گائیڈ کو اجرت اور انعام دے کر محل میں داخل ہو گیا اور ایک منٹ کے بعد بعد خو کو موسیو میشوان کی معزز بیوی مادام میلنی اور جوان عمر صاحبزادے الفانسے کو سامنے پایا۔

یہ حضرات میری آمد سے بہت مسرور تھے کیوں کہ بقول ان کے اتنے مشہور فرانسیسی فنکار کا ان کے مکان میں قدم رنجہ فرمانا توقع سے بڑھ کر تھا۔

میرا میزبان میرے لئے سراپا سپاس بنا ہوا تھا..... اس نے اپنے پرانے طرز کے محل نما مکان کی مجھے سیر کرائی۔ دوسری منزل سے اترتے ہوئے بولا۔ آپ کے قیام کا انتظام کون سے کمرے میں کیا جائے'' پھر خود ہی بولا۔

''معزز فرانسیسی فنکار کے لئے اوپر والا دائیں بازو والا کمرہ موزوں رہے گا، کیوں کہ اس کے باہر کا منظر تصورات کو اکسانے کے لئے بہت موزوں ہے۔''

کھانے کی میز پر میرے میزبان نے میرے ساتھ ایسا سلوک کیا جیسے میں اس کا پرانا خاندانی دوست ہوں، اس کی بیوی میرے سامنے مختلف کھانے چنتی رہی، وقتاً فوقتاً اپنے شوہر کو ٹوکتی رہی کہ وہ مجھے زیادہ باتوں میں نہ لگائے ورنہ میں بھوکا رہ جاؤں گا۔

مجھے معلوم ہوا کہ میرے میزبان کے صاحبزادے کی شادی پرسوں اس صوبہ کی سب سے خوبصورت اور امیر لڑکی سے ہونے والی ہے..... صاحبزادہ محبت وغیرہ کے زیادہ قائل نہ معلوم ہوتے تھے انہوں نے اپنے دل اور دماغ کی پرورش پر زیادہ زور نہیں دیا تھا البتہ جسم کو خوب ڈھالا تھا۔ وہ زیادہ حسین نوجوان نہیں تھے لیکن ان پر ایسی عورتیں بڑی آسانی کے ساتھ عاشق ہو سکتی تھیں جو مرد میں صرف جسم دیکھنا پسند کرتی ہیں، مگر میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس کی ہونے والی بیوی کس قسم کی دوشیزہ ہے..... اگر ایسا ہے تو بہتر ہے ورنہ اس کو ایک اکتا دینے والا شوہر ملے گا اور وہ اپنی ازدواجی زندگی سے فرار اختیار کرنے کی کوشش کرے گی۔

میں ان دونوں کی شادی کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک میرا دھیان اس بت کی طرف جا نکلا جس کا ذکر میرے گائڈ نے کیا تھا، میرا اشتیاق بڑھا اور میں نے سوچا کہ مناسب طور پر معزز میزبان سے اس بارے میں گفتگو کی جائے..... ممکن ہے وہ بہت قیمتی مجسمہ ہو، یا کسی مشہور اطالوی بت تراش کا شاہکار۔

قہوہ پیتے ہوئے اور سگار کا نیلا دھواں منہ سے نکالتے ہوئے میرے میزبان نے اس بت کے بارے میں مجھے بتایا۔ جناب من! وہ بت ایک مقدس تحفہ ہے جو میرے نصیب میں آیا ہے یہ دوسری بات ہے کہ اس صوبہ کے جاہل عوام اس کو منحوس تصور کرتے

ہیں..... میں نہایت مسرت کے ساتھ وینس کے اس مجسمہ سے آپ کی ملاقات کراؤں گا۔ اس پر ایک پراسرار عبارت بھی لکھی ہوئی ہے جو اب تک میری سمجھ میں نہیں آئی ہے وہ لاطینی زبان ہے اور اس صوبہ کے باشندوں کو لاطینی سے کوئی واسطہ نہیں ہے مگر میرے قابل فرانسیسی مہمان ضرور اس عقدے کو حل کر سکیں گے۔

مادام میشو نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا ''تم اس سیاہ بت کو مقدس کہتے ہو، اسے آسمانی تحفہ سمجھتے ہو مگر میں اس بت سے نفرت کرتی ہوں، یہ ضرور ہمارے اوپر کوئی مصیبت نازل کرے گا، تمہیں یاد نہیں کہ اس خبیث عورت نے ایک مزدور کو زخمی کر دیا تھا۔''

ہاں اس مقدس دیوی نے مزدور کی ٹانگ توڑ دی تھی لیکن اس مزدور نے اس کی شان میں گستاخی کی تھی، اس کی سزا اسے ملی، میں اس مجسمہ کی قوت سے واقف ہوں اور اس کا احترام کرتا ہوں اس لئے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا، اگر لوبان مل جائے تو میں اس پر اس وقت ہی دو سفید کبوتروں کو قربان کر دوں۔

اس پر مسز پیری ہوا پر نے برا سا منہ بنا لیا اس گفتگو میں رات زیادہ ہو گئی اور میں شب بخیر کہہ کر دوسری منزل کی طرف روانہ ہو گیا جہاں میرا کمرہ تھا، کمرہ نہایت نفاست کے ساتھ سجا ہوا تھا میرا پلنگ پرانے زمانے کے کسی بادشاہ کے چھپر کھٹ جیسا تھا جو ۷ فٹ لمبا ۶ فٹ چوڑا اور قد آدم اونچا تھا۔ میں نے رات کی ٹھنڈی ہوا سے پھیپھڑوں کو تازہ کرنے کے لئے کھڑکیاں کھول دیں اور منہ نکال کر باہر دیکھنے لگا۔ میرے سامنے کافی گو پہاڑ تھا جو رات کے سناٹے میں کسی الف لیلوی دیو کی طرح معلوم ہو رہا تھا، چاند پوری تابناکی سے چمک رہا تھا، میں اس نظارے میں محو تھا کہ اچانک میری نظر ایک پراسرار سایہ پر پڑی جو باغ میں نصب تھا، بہت جلدی میں نے سمجھ لیا کہ یہ وہی مجسمہ ہے جس کا تذکرہ نہ صرف اس مکان میں ہے بلکہ سارے صوبہ میں ہے یہ مجسمہ ایک جھاڑی میں رکھا ہوا تھا مگر اوپر سے صاف نظر آ رہا تھا میں فاصلہ کی وجہ سے اس کو پوری طرح نہ دیکھ سکا۔

اس اثنا میں قصبہ کے دو نوجوان ادھر سے گذرے اور ٹینس کورٹ پاس کر کے بت کے قریب آئے ان میں سے ایک نے بلند آواز میں مجسمہ کی تعریف کی، وہ بت سے ہم کلام ہوا اور علاقائی زبان میں اس کے حسن کی تعریف کرنے لگا اس کے بعد اس کا لہجہ تلخ ہو گیا اور وہ بولا ''تم ہی وہ عورت جو ہو جس نے کال کی ٹانگ توڑ کر اسے چلنے سے معذور کر دیا۔''

ایک دو منٹ کے بعد یہ دونوں نوجوان واپس ہو رہے تھے دس پانچ قدم چلنے کے بعد اس جذباتی نوجوان نے اپنے ساتھی سے کہا ''میں نے مجسمہ کو الوداع نہیں کہا، یہ کہہ کر اس نے اندھیرے میں کوئی حرکت کی، ایک سیکنڈ بعد خاموش فضا میں ایک ایسی آواز بلند ہوئی جیسے گرجا میں اچانک سیکڑوں گھنٹیاں بجنے لگیں، میں اس صورت حال پر غور کر ہی رہا تھا کہ اس جذباتی نوجوان کی درد بھری آواز فضا میں بلند ہوئی ''ارے اس مجسمہ نے پتھر واپس میرے سر پر دے مارا'' یہ کہہ کر وہ اور اس کا دوست دونوں تیزی سے بھاگ گئے۔

گرجے کے گھنٹوں اور کاروانوں کے جرس کی آوازیں رفتہ رفتہ خاموشی میں ڈوب گئیں اور پھر وہی سناٹا چھا گیا۔

جب میں صبح سو کر اٹھا تو میرا میزبان میرے کمرے میں بیٹھا ہوا سگار پی رہا تھا۔ وہ بہت دیر سے میرے بیدار ہونے کا انتظار کر رہا تھا لیکن اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ مجھ جیسے ''معزز فرانسیسی فنکار'' کو خواب سے جگا سکے۔

میں نے مناسب الفاظ میں اس سے معافی مانگی اور ناشتہ کرنے کے بعد پانچ منٹ میں کپڑے بدل کر اس کا بت..... محبت کی دیوی کا مجسمہ دیکھنے کے لئے تیار ہو گیا، اب میرے دل میں بہت اشتیاق پیدا ہو چکا تھا کیوں کہ کل رات والے سین کا اثر اب تک میرے دل پر تھا لیکن میں نے موسیو میشو کو اس سے آگاہ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

مجسمہ کے سامنے کھڑے ہو کر میں نے اس کے سراپے پر ایک ناقدانہ نظر ڈالی یونانی محبت کی دیوی

حسن کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی اس کے جسم کے پیچ وخم نہایت فن کاری کے ساتھ واضح کیے گئے تھے اس کا بالائی جسم عریاں تھا اور زیریں حصہ ایک ریشمی ملبوس سے ڈھکا ہوا تھا دیوی کا بایاں ہاتھ اس حسین ملبوس کو سہارا دے رہا تھا اور دایاں ہاتھ زمین کے متوازی تھا اس کی گردن دائیں طرف کو خمیدہ تھی اور اس شفاف گردن پر اس کا چہرہ سیکڑوں قیامتوں کو سمیٹے ہوئے تھا۔

دیوی بے حد حسین تھی اس کا حسن واقعی دل کی دھڑکنوں میں اضافہ کر دیتا تھا لیکن میں نے محبت کی دیوی کے چہرے پر وہ بات نہیں پائی جو وینس کے دوسرے مجسموں میں تھی وینس کا مجسمہ امن اور سکون اور محبت کا پیغام دیتا ہے لیکن یہ دیوی امن سکون اور محبت کے بجائے اپنے چہرے سے نفرت، شیطانیت اور انتقام کے جذبات آشکارا کر رہی تھی وہ ایک مجسم طنز معلوم ہو رہی تھی میں نے اس بات کو خاص طور پر نوٹ کیا مگر میرا میزبان اس سے بے خبر تھا وہ میرے سامنے مجسمے کی بطور شاہکار فن تعریف کر رہا تھا کہ کاسنی رنگ کا یہ مجسمہ حقیقتاً شاہکار تھا۔

آپ نے مجسمہ پسند فرمایا وہ مجھ سے بولا ''اب اس طرف متوجہ ہو جائیے یہ عبارت ملاحظہ فرمائیے۔''

یہ کہہ کر اس نے ایک عبارت کی طرف اشارہ کیا لاطینی زبان میں مجسمہ کے پیروں کے قریب یہ لکھا ہوا تھا۔

''Et clamor oneus ad te vemait"

''کیوا مانٹم''

میں نے غور کیا اور بتایا کہ اس لاطینی فقرے کا سلیس ترجمہ یہ ہو سکتا ہے ''میری فریاد وغاں شاید تم تک پہنچ جائے۔''

اس جملہ سے کیا مراد ہے میشو نے استفسارانہ انداز میں پوچھا پھر رک کر بولا ''خیر ایک دوسری عبارت بھی موجود ہے یہ کہہ کر اس نے مجھے مجسمہ کے داہنے ہاتھ پر ایک دوسری عبارت دکھائی۔ لکھا تھا:

Exegi monmentum aere perenuis

اس کا ترجمہ یوں کیا

''میں نے ایک یادگار مجسمہ تیار کیا گیا ہے جو فنا نہیں ہو سکتا۔''

مزید معلوم ہوا کہ میرون ایک مشہور مجسمہ ساز گذرا ہے اور یہ مجسمہ بھی اسی کی کاوش کا نتیجہ ہے میرون ایک ''ناکام محبت'' کے نام سے مشہور ہے ہم اس سلسلے میں غور کر رہے تھے کہ کھانے کی گھنٹی بجی اور ہمیں مجبوراً واپس ہونا پڑا واپس ہوتے ہوئے میں نے مجسمے پر ایک اچٹتی نظر ڈالی اس کی آنکھیں انتقامی جذبے کی آئینہ دار تھیں شاید اس کے خوبصورت ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ بھی تھی کھانے سے فارغ ہو کر الفانسے کے ساتھ میری تفصیلی ملاقات ہوئی یہ نوجوان دل کا بڑا اچھا تھا اس کو کھیل کود شہسواری اور ٹینس سے لگاؤ تھا وہ اپنے صوبے میں ٹینس کا مشہور کھلاڑی تھا اس کی شہسواری کے قصے بھی صوبے میں کافی مشہور تھے اس کو اس بات کی بھی خوشی تھی کہ اس کی شادی اگلے روز ایک ایسی لڑکی سے ہونے والی تھی جو اس کی خاندانی دولت کو دس گنا کر دے گی میں نے الفانسے کی اس ذہنی کیفیت پر تعجب اور افسوس کیا اس کی خود غرضی اور ساتھ ہی ساتھ بے نفس اور معصومیت پر میں بہت حیران تھا۔

دوران گفتگو میں وہ بہت جلد مجھ سے بے تکلف ہو گیا شروع شروع میں تو وہ ادھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا اپنی شہسواری اور کھیل کود کے قصے سناتا رہا اس کے بعد اس نے اس موضوع گفتگو بدل کر ہیرے جواہرات کا ذکر چھیڑ دیا اور پھر اپنی جیب سے ایک بہت بڑی ہیرے کی انگوٹھی نکالی انگوٹھی یقیناً بہت خوب صورت تھی لیکن وہ کسی دلہن کو پہنانے کے قابل ہرگز نہ تھی میں نے انگوٹھی کو دیکھتے ہوئے کہا ''یقیناً یہ ایک بہت خوبصورت اور قیمتی انگوٹھی ہے مگر ہمارے پیرس میں دولہا دلہن کو بہت سادہ انگوٹھی پہناتا ہے یہ انگوٹھی تو دلہن کے لیے مناسب نہیں''

''یہ دلہن کی پسند پر منحصر ہے۔'' وہ بولا ''وہ اسے پہنے یا نہ پہنے البتہ میں اسے ضرور پیش کروں گا۔''

اگلے دن شادی کی گہما گہمی شروع ہوگئی ہمیں دس بجے مادام موزیل پیوگریگ کے مکان پر پہنچنا تھا اور ان کے ساتھ کھانا کھانا تھا۔ شادی سے پہلے دولہا والے دولہن کے ہاں کھانا کھاتے ہیں مہمانوں میں میرا نام بھی شامل تھا کیوں کہ میں اس خاندان کا دوست تھا۔

دلہن کے یہاں ہمارا شاندار استقبال کیا گیا۔

دلہن کی عمر ۱۸ سال تھی وہ حسین تھی اور شوخ بھی الفانسے مجھے اس کے لیے مناسب نہیں معلوم ہوا میں نے دل میں غور کیا کہ ایسی خوب صورت اور دلربا دوشیزہ ایک ایسے شخص سے بیاہی جارہی ہے جو اس سے بالکل محبت نہیں کرتا جسے گھوڑوں سے زیادہ انس ہے۔

شادی کی رسم جمعہ کے دن تھی اہل فرانس جمعہ کو شادی کے لیے مناسب تصور نہیں کرتے لیکن اس صوبے کے باشندے ایسے توہم میں گرفتار نہیں تھے

اگلے دن شادی کا پروگرام یہ تھا دس بجے تک ہم سب کو تیار ہوکر میئر کے دفتر جانا تھا جہاں رسم شادی ادا کی جانے والی تھی اس کے بعد گرجا جانا تھا اور گرجے سے واپس آکر تفریحی پروگرام تھا۔

میں دوسرے دن صبح آٹھ بجے بیدار ہوکر وینس کے مجسمے کے سامنے بیٹھا ہوا اس کے چہرے کا خاکہ کھینچنے کی کوشش کررہا تھا اگرچہ مجھے بہت سے کامیاب خاکے کھینچنے کی مشق تھی لیکن اس دیوی کے چہرے کا اتار چڑھاؤ اس کے چہرے کی سختی اور اس کی آنکھوں کی انتقامی کیفیت میں کاغذ پر منتقل نہیں کرسکا۔

الفانسے جو آج دولہا بننے والا تھا میرے قریب آکر کھڑا ہوگیا اور بولا ''آپ میری بیوی کی تصویر اتاریں گے، وہ بھی تو بہت خوبصورت ہے''۔

قبل اس کے کہ میں کچھ جواب دوں ٹینس کورٹ نے الفانسے کو اپنی طرف متوجہ کرلیا، دو اراگونی باشندے اس صوبے میں آئے تھے اور انہوں نے الفانسے کو چیلنج کیا تھا۔

تصویر کشی میں ناکام ہوکر میں بھی ٹینس کورٹ پر آگیا اور میں نے بہترین کھلاڑیوں کے شاندار میچ کو دلچسپی کے ساتھ دیکھنا شروع کیا۔ آراگونی باشندے اس صوبے کو ہرانے کے لئے آئے تھے اور الفانسے کو اپنے صوبہ کے وقار کا خیال تھا اس لئے دونوں کے کھیلوں میں بجلی کی سی چمک تھی، دونوں جان توڑ کر کھیل رہے تھے اور اراگونی جیتے ہوئے معلوم ہورہے تھے۔

اپنی ہار ہوتے ہوئے دیکھ کر الفانسے کو جوش آگیا اس نے اپنی انگلی سے وہ بھاری انگوٹھی اتاری اور بولا۔

اس انگوٹھی کی وجہ سے میرا ایک پوائنٹ ضائع ہوگیا، اور یہ کہہ کر قبل اس کے کہ میں انگوٹھی اس کے ہاتھ سے لینے کے لئے آگے بڑھوں اس نے انگوٹھی وینس کے مجسمہ کی تیسری انگلی میں پہنادی، اور واپس آکر پہلے سے زیادہ انہماک اور توجہ سے کھیلنے لگا۔

الفانسے نے اراگونی باشندوں کو ہرادیا اور سب تماشائی خوشی سے چلا اٹھے، الفانسے نے صوبہ کی لاج رکھ لی تھی۔

آپ مزید کھیلیں گے' الفانسے ہنس کر بولا۔ مگر میں آپ کو کچھ پوائنٹ دے کر کھیلوں گا۔''

اس جملہ کو اراگونی کھلاڑیوں نے اپنی ہتک محسوس کیا اور ان کی آنکھیں غصہ سے چنگاریاں چھوڑنے لگیں۔ میرے دل میں گمان گذرا کہ اب شاید یہ کھلاڑی الفانسے سے لڑپڑیں گے یا شاید اس پر حملہ کردیں کیوں کہ اراگونی باشندے بہت لڑاکا اور باغیرت ہوتے ہیں۔

اس اثناء میں الفانسے کی ماں نمودار ہوئی اور اس کو دیکھ کر الفانسے کھیل چھوڑ کر کپڑے تبدیل کرنے اور برات کے ساتھ دولہا بن کر جانے کے لئے تیار ہوگیا۔

جب ہم میئر کے دفتر پہنچے تو شادی کی ساری تیاریاں مکمل تھیں، الفانسے میرے قریب بیٹھا ہوا تھا اس نے میرے کان میں سرگوشی کی ''میں بھی کتنا بے وقوف ہوں' وہ انگوٹھی میں وینس کی انگلی میں ہی چھوڑ آیا ہوں۔''

میں نے اس بات کو زیادہ اہمیت نہ دی۔

شادی کی رسم بڑے تزک و احتشام سے منائی گئی ، دلہن کو دولہا کی طرف سے ایک دوسری انگوٹھی پہنائی گئی جو الفانسے کو اس کی کسی فرانسیسی محبوبہ نے محبت کی یادگار کے طور پر دی تھی، رسم شادی کے بعد دوسری حرکتیں ہوتی رہیں جن سے مجھے بہت کوفت ہوئی، بہر حال ہم لوگ رات کے ۸ بجے واپس گھر پہنچے، موسیو ژاک میشو کا قدیم محل نہایت اعلیٰ پیمانہ پر سجایا گیا تھا بہت سے مہمان جمع تھے جنہوں نے دولہا دولہن کا شاندار استقبال کیا۔

دولہا کے گھر پر بھی بہت سی فضول رسمیں سرانجام دی گئیں، ہر ہر رسم کے اختتام پر سارے مہمانوں نے قہقہے لگائے۔ رات گئے تک یہ ہنگامہ ہوتا رہا اور میں اپنے آپ کو اس تمام مجمع میں بے مصرف تصور کر رہا تھا کیوں کہ میں ان قہقہوں کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔

جب میں سونے کے لئے اپنے کمرے کی طرف آ رہا تھا تو الفانسے سے میری ملاقات ہوئی اس کی آنکھوں میں مسرت کے بجائے تحیر اور خوف تھا۔

''کیا بات ہے'' میں نے اس سے پوچھا، تم دولہا کی طرح مسرور کیوں نہیں ہو؟''

اس نے کمزور آواز میں کہا'' مجھے رہ رہ کر اس مجسمہ کا خیال آ رہا ہے اور مجھے خوف محسوس ہو رہا ہے''۔

''تمہارا دماغ اپنی جگہ نہیں معلوم ہوتا'' میں ہنسا ''اور شاید تم بہت زیادہ شراب بھی پی گئے ہو؟''

نہیں جناب! میں نے وینس کی انگلی میں سے اپنی انگوٹھی اتارنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ اتری نہیں اور شاید آپ کو تعجب ہو وینس نے اپنی انگلی اس طرح موڑی ہے کہ میں انگوٹھی اتار ہی نہیں سکتا''۔

میں نے الفانسے کی باتوں پر زیادہ توجہ نہیں دی اور واپس اپنے کمرے میں لوٹ آیا سارے دن کی ہڑ بونگ سے میں تھک گیا تھا اس لئے ٹھنڈی ہوا کھانے کے لئے کھڑکی کھول کر لمبے لمبے سانس لینے لگا۔

وینس کے مجسمہ پر میری نظر پڑی وہ رات کے سناٹے میں ساکت کھڑا تھا، ایک بے جان بت کی طرح، میں نے الفانسے کی شادی کے متعلق سوچنا شروع کیا، اس نے ایک ایسی لڑکی سے شادی کی ہے جس سے وہ بالکل محبت نہیں کرتا اور لڑکی بھی اس سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتی، یہ شادی کس طرح کامیاب ہو سکتی ہے اس سوچ میں گھرا ہوا میں بستر میں داخل ہو گیا اور نیند سے ہم آغوش ہونے کی کوشش کرنے لگا۔

میں نیند سے ہم آغوش ہوا ہی تھا کہ سیڑھیوں پر بہت سے قدموں کی آواز سنائی دی، دلہن اپنے کمرے میں پہنچائی جا رہی تھی دلہن کو اس کے کمرے میں داخل کر دیا گیا، دروازہ بھیڑنے کی آواز آئی اور اس کے بعد پھر سیڑھیوں پر بہت سے قدموں کی وہی چاپ سنائی دی اب دلہن کمرے میں اکیلی تھی۔

دو چار منٹ خاموشی طاری رہی، میں نے نیند کی ایک جھپکی ہی لی تھی کہ سیڑھیوں پر ایک بہت بھاری چاپ نے مجھے چونکا دیا۔ کوئی اوپر چڑھ رہا تھا اس کے قدموں تلے لکڑی کی سیڑھیاں لچک رہی تھیں اور کرخت آواز پیدا ہو رہی تھی، اس کرخت آواز پر مجھے بہت غصہ آیا اور میں نے دل میں کہا۔

''اس نوجوان کھلاڑی کو بالکل تمیز نہیں ہے۔''

رات کو کئی مرتبہ سوتے سوتے میری آنکھ کھلی۔

صبح سویرے مرغ کی بانگ سنائی دی اور مرغ کی بانگ کے ساتھ ہی سیڑھیوں پر وہی بھاری قدم اترتے ہوئے سنائی دیئے، لکڑی کی سیڑھیاں ایک بار پھر شور بلند کرنے لگیں اور ایک منٹ تک یہ کرخت آواز چھائی رہی اور اس کے بعد وہ قدم خاموشی میں ڈوب گئے۔

میں نے دل میں الفانسے کو لتاڑا'' کیا جنگلی آدمی ہے یہ'' اتنے صبح سویرے کمرے سے نکل گیا۔ اس کو چلنے کی بھی تمیز نہیں'' اگرچہ صبح ہو چکی تھی لیکن میری نیند پوری نہ ہوئی تھی اس لئے میں نے ایک اور غوطہ لینے کی کوشش کی، مگر اس اثناء میں دوسرے سرے سے چیخنے چلانے اور رونے کی آوازیں بلند ہوئیں اور سارے مکان میں ایک قیامت برپا ہو گئی۔ میں تیزی کے ساتھ بستر سے اچھل کر کھڑا ہو گیا اور کپڑے بدل کر فوراً دوسرے سرے کی طرف بھاگا۔

دلہن کے کمرے میں گھر کے سارے مہمان بھرے ہوئے تھے اور اس کمرے سے رونے چلانے کی

آوازیں آرہی تھیں، میں تیزی کے ساتھ اس کمرے میں داخل ہوا ''میرے معبود یہ کیا ہوگیا ہے''۔

قبل اس کے کہ کوئی شخص جواب دے اور جواب دینے کی فرصت ہی کسے تھی، میں نے فرش پر الفانسے کو پڑا ہوا پایا، اس کا جسم آدھا عریاں تھا اور بالکل ساکن تھا۔

الفانسے کی بدنصیب ماں اپنے بیٹے کی جوانمرگی کے صدمے سے پاگل ہوگئی تھی اور دیوانوں کی طرح سر کے بال نوچ رہی تھی۔ ایک رات کی دلہن اب بیوہ ہوگئی تھی اور اس کی اندوہناک سسکیاں دلوں کو چیرے ڈال رہی تھیں، وہ غم سے بے قابو ہورہی تھی اور خادمائیں اس کو سنبھالے ہوئے تھیں۔

میں نے الفانسے کے جسم کو اچھی طرح دیکھا بھالا، اس کے جسم پر زخم کا کوئی نشان نہیں تھا، مگر وہ واقعی مردہ تھا البتہ اس کے قتل کا سبب کسی کو نہ معلوم تھا، میں سوچنے لگا۔

اس ہنس مکھ نوجوان کا دشمن کون ہوسکتا ہے۔ اور میں کوئی فیصلہ نہ کرسکا۔

اچانک میرا پیر فرش پر کسی سخت چیز سے ٹکرایا میں نے دیکھا فرش پر وہی انگوٹھی پڑی تھی جو الفانسے اپنی دلہن کو پہنانا چاہتا تھا اور ٹینس کھیلتے ہوئے اس نے یہ انگوٹھی ویس کی انگلی میں پہنا دی تھی اور بقول اس کے جب اس نے دیومی کی انگلی سے انگوٹھی اتارنے کی کوشش کی تو اس میں کامیاب نہ ہوسکا تھا۔

اس سوچ و بچار میں میرا ذہن ان دو اراگونی باشندوں کی طرح مبذول ہوگیا جن کے ساتھ الفانسے نے اپنا آخری ٹینس میچ کھیلا تھا، جب الفانسے نے ان سے دوبارہ کھیلنے کے لئے کچھ پوائنٹ دینے کی پیش کش کی تھی تو ان دونوں قبائلی باشندوں کا چہرہ غصہ سے سرخ ہوگیا تھا اور انہوں نے اس کو اپنی ہتک محسوس کیا تھا، کہیں ان دونوں قبائلیوں نے ہی تو اپنا انتقام نہیں لیا ہے یہ قبائلی بہت منتقم مزاج ہوتے ہیں۔

میں معزز موسیو ڈاک میشو اور ان کی بیوی سے تعزیت کرکے اپنے کمرے میں چلا آیا بے چارہ موسیو ڈاک میشو اپنے بیٹے کی جواں مرگی کے صدمے سے ادھ موا ہوگیا تھا اس کی ساری زندہ دلی بجھ کر رہ گئی تھی اور وہ ایک ہی دن میں بے حد بوڑھا ہوگیا تھا۔

حادثے کی تفتیش کرنے کے لیے سرکاری افسران موقع پر پہنچ گیے تھے انہوں نے سارے محل کو چھان مارا مکان کی پشت پر ان کو قدموں کے نشان بھی ملے تھے جو کسی ننگے پیر کے تھے اور ویس کے مجسمے پر جا کر ختم ہوجاتے تھے۔

ایک افسر میرا بیان لینے بھی آیا میں نے اپنا بیان دیا اور دستخط کرنے کے بعد پوچھا جناب آپ نے دلہن کا بھی بیان لیا ہے۔

''جی ہاں'' وہ بولا ''وہ بے چاری تو اس صدمے کی تاب نہ لاکر پاگل ہوگئی ہے اس کا بیان کسی صحیح الدماغ آدمی کا بیان نہیں ہوسکتا آپ سنیں گے اسے۔''

''ضرور'' میں ہمہ تن گوش ہوگیا۔

افسر نے بولنا شروع کیا بے چاری مادام الفانسے جو ایک رات کی راحت بھی حاصل نہ کرسکی اپنے بیان میں کہتی ہے کہ وہ دروازے کی طرف پیٹھ کیے ہوئے بستر پر بیٹھی تھی۔

دروازہ کھلا وہ سمجھی کہ اس کا شوہر ہے۔ اس نے منہ نہیں موڑا جو شخص کمرے میں داخل ہوا وہ اس کے بستر پر بیٹھ گیا، اس کا وزن اتنا زیادہ تھا کہ مضبوط مسہری چرچرائی شاید دس منٹ اسی طرح گذر گئے دلہن نے منہ موڑ کر نہیں دیکھا آنے والا شخص بھی خاموشی کے ساتھ بیٹھا رہا اتنے میں دروازہ دوبارہ کھلا اور دولہن نے الفانسے کی آواز سنی:

''میں اپنی پیاری بیوی کو آداب بجالاتا ہوں۔''

فوراً ہی دلہن نے ایک چیخ سنی اور جو کوئی اس کے بستر پر بیٹھا ہوا تھا وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

دلہن اس وقت خوف سے کانپ رہی تھی مگر اس نے ہمت کرکے اپنی گردن موڑ کر دیکھا اس نے کیا دیکھا کہ اس کا شوہر الفانسے اس شخص کی گود میں پڑا ہے جو اس کے بستر پر بیٹھا تھا یہ ایک دیو تھا جی ہاں دیو اور جناب محترم دیو بھی کون شاید آپ یقین نہ کریں دلہن کہتی ہے کہ یہ وہی ویس تھی جو موسیو ڈاک میشو کے باغیچے میں کھڑی ہے، وہی کانسی کے رنگ کا آہنی مجسمہ.....!

☆☆.....☆☆